اللہ اکبر

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کشف المحجوب (اردو)

رسالہ

تصوف کی لازوال و شہرہ آفاق کتاب

مصنف

زبدۃ العارفین ابو الحسن سید علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مولانا عبدالرؤف فاروقی

ناشر اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ اردو بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	**کشف المحجوب**
مصنف	:	زبدۃ العارفین ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ
مترجم	:	جناب مولانا عبدالرؤف فاروقی
پروف ریڈنگ	:	قاری محمد عبدالاحد۔ بادامی باغ، لاہور۔
کمپوزنگ		نوید جاوید۔
ناشر	:	اسلامی کتب خانہ، فضل الٰہی مارکیٹ،
	:	اُردو بازار، لاہور۔

نوٹ

ہماری قارئین سے درخواست ہے کہ ہماری تمام تر کوشش (اچھی پروف ریڈنگ ،معیاری پرنٹنگ) کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ کہیں کوئی لفظی غلطی یا کوئی اور خامی رہ گئی ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں اس غلطی یا خامی کو دور کیا جائے۔

شکریہ!

(ادارہ)

فہرست

مضمون	صفحہ
حمد ونعت	9
استخارہ کی اہمیت	11
نفسانی خواہشات سے اجتناب	12
وجہ تسمیہ	14
ابواب کی تقسیم	16
اللہ سے طلب مدد	17
کشف المحجوب کی ابتداء	19
پہلا باب	
علم کی اقسام	26
علم وشریعت	28
اقوال صوفیاء	32
دوسرا باب	
فقر	37
فقر اور اس کا مقام	37
فضیلت فقر وغنا اور مشائخ کا اختلاف	40
مشائخ کے اقوال	45

مضمون	صفحہ
تیسرا باب	
تصوف کے بیان میں	52
حضرت ابوبکر صدیقؓ امام الصوفیاء	53
حضرت حارثؓ کا ایمان۔	57
صوفی کے معنی۔	60
چوتھا باب	
مرقعہ پوشی کے بیان میں۔	72
گدڑی پہننے کی شرائط۔	78
گدڑی علامت فقر نہیں	81
پانچواں باب	
فقر وصفت میں اختلاف	90
چھٹا باب	
ملامت کا بیان	94
حقیقت ملامت	94
ملامت کے اسباب	96
ساتواں باب	
صحابہؓ میں سے صوفیا کے آئمہ	105

مضمون	صفحہ
حضرت صدیق اکبرؓ	105
حضرت فاروق اعظمؓ	108
حضرت عثمان ذوالنورینؓ	110
حضرت علی کرم اللہ وجہہ	112

آٹھواں باب

رسول اللہ ﷺ کے خاندان میں	114
صوفیاء کے آئمہ	
سیدنا حضرت حسنؓ	114
سیدنا حضرت حسینؓ	118
حضرت زین العابدینؓ	120
قصیدہ	122
سیدنا حضرت محمد باقرؓ	125
سیدنا حضرت محمد جعفرؓ	128

نواں باب

اصحاب صفہ کے ذکر میں۔	131

دسواں باب

تابعین میں تصوف کے امام۔	134
حضرت اویس قرنیؓ	134
حضرت ہرم بن حیانؓ	136
حضرت حسن بصریؓ	138
حضرت سعید بن المسیبؓ	141

مضمون	صفحہ

گیارھواں باب

تبع تابعین میں سے آئمہ تصوف	143
حضرت حبیب عجمیؒ	143
حضرت مالک بن دینارؒ	144
حضرت حبیب بن اسلم الراعیؒ	146
حضرت ابوحازم مدنیؒ	147
حضرت محمد بن واسعؒ	148
حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ	150
حضرت عبداللہ بن مبارکؒ	155
حضرت فضیل بن عیاضؒ	158
حضرت ذوالنون مصریؒ	163
حضرت ابراہیم بن ادہمؒ	167
حضرت بشر حافیؒ	170
حضرت بایزید بسطامیؒ	172
حضرت حارث بن اسدؒ	174
حضرت داؤد ابن طائیؒ	176
حضرت سری سقطیؒ	177
حضرت شقیق بن ابراہیم الازدیؒ	179
حضرت عبدالرحمن الدارانیؒ ۔	180
حضرت معروف بن فیروز الکرخیؒ	182
حضرت حاتم اصمؒ ۔	184

مضمون	صفحہ
حضرت امام شافعیؒ	185
حضرت امام احمد بن حنبلؒ	187
حضرت احمد بن الحواریؒ	189
حضرت احمد بن خضرویہ البلخیؒ	192
حضرت عسکر بن الحسینؒ	194
حضرت یحییٰ بن معاذ الرازیؒ	195
حضرت عمر بن السالم نیشاپوریؒ	197
حضرت حمدون بن احمدؒ	200
حضرت منصور بن عمارؒ	201
حضرت احمد بن عاصم انطاکیؒ	203
حضرت عبداللہ بن خفیفؒ	204
حضرت جنید بغدادیؒ	206
حضرت احمد بن محمد نوریؒ	209
حضرت سعید بن اسماعیلؒ	212
حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰؒ	215
حضرت ابومحمد رویم بن احمدؒ	216
حضرت یوسف بن حسین رازیؒ	217
حضرت سمنون بن عبداللہؒ	218
حضرت ابوالفوارس شاہ شجاع کرمانیؒ	220
حضرت عمرو بن عثمان المکیؒ	221
حضرت سہل تستریؒ	223
حضرت محمد بن فضل البلخیؒ	224
حضرت محمد بن علی الترمذیؒ	225
حضرت محمد بن عمر الوراقؒ	227
حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخراز	228
حضرت علی بن محمد الاصفہانیؒ	229
حضرت محمد بن اسمعیل خیر النساجؒ	231
حضرت ابوحمزہ خراسانیؒ	232
حضرت ابوالعباس احمد بن مسروقؒ	234
حضرت ابوعبداللہ بن احمد	235
اسماعیل المغربیؒ	
حضرت ابوعلی بن الحسن بن	235
علی الجوزجانیؒ	
حضرت ابومحمد بن الحسین الحریریؒ	236
حضرت ابوالعباس احمد بن	238
محمد بن سہل الاملیؒ	
حضرت ابوالمغیث الحسین	239
بن منصور الحلاجؒ	
حضرت ابواسحاق ابراہیم بن	244
احمد الخواصؒ	
حضرت ابوحمزہ بغدادیؒ	245
حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ الواسطیؒ	246

مضمون	صفحہ
حضرت ابوبکر بن دُلف بن جحید ارشبلیؒ	247
حضرت ابومحمد بن جعفر بن نصیر الخالدیؒ	249
حضرت ابوعلی محمد بن قاسم الرود باریؒ	250
حضرت ابوالعباس قاسم بن	251
مہدی السیاریؒ	
حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیفؒ	252
حضرت ابوعثمان سعید بن سلام المغربیؒ	252
حضرت ابوالقاسم محمد بن	253
محمود النصر آبادیؒ	
حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصریؒ	255

بارھواں باب

مضمون	صفحہ
صوفیاء متاخرین کے آئمہ کے ذکر میں	256
حضرت ابوالعباس احمد بن محمد القصابؒ	256
حضرت ابوعلی بن الحسین بن محمد الدقاقؒ	258
حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانیؒ	259
حضرت ابوعبداللہ محمد بن علیؒ	260
حضرت ابوسعید فضل بن محمد المہنیؒ	260
حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلیؒ	262
حضرت ابوالقاسم عبدالکریم	264
ابن ہوازن قشیریؒ	
حضرت ابوالعباس احمد بن محمد	265
حضرت ابوالقاسم بن علی بن	266
عبداللہ گرگانیؒ	
حضرت ابواحمد المظفر بن حمدانؒ	268

تیرھواں باب

مضمون	صفحہ
متاخرین صوفیا کرام کا مختصر تذکرہ	270
متاخرین صوفیا اہل شام وعراق	270
صوفیاء اہل فارس	271
قہستان آذربیجان اور طبرستان کے صوفیاء	271
اہل کرمان کے صوفیاء	272
اہل خراسان کے صوفیا متاخرین	272
صوفیاء اہل ماوراءالنہر۔	273
اہل غزنی کے صوفیاء	273

چودھواں باب

مضمون	صفحہ
مذاہب صوفیا میں مختلف فرقوں کا	275
باہمی بیان	
رضا کی حقیقت۔	276
ارباب رضا کی قسمیں۔	278
مشائخ کے اقوال۔	280
حال اور مقام کے درمیان فرق	283
قصاری فرقہ۔	286

مضمون	صفحہ
طیفوری فرقہ۔	289
سکر اور صحو کا بیان۔	290
جنیدی فرقہ۔	296
نوری فرقہ۔	298
ایثار کا بیان۔	299
فرقہ سہلیہ۔	308
حقیقت نفس اور معنی ہوی	309
مشائخ کے اقوال۔	315
مجاہدہ نفس کا بیان۔	317
حقیقت ھوی۔	328
فرقہ حکیمہ۔	335
اثبات ولایت۔	335
ولایت کی تشریح اور درجات۔	338
مشائخ کے رموز۔	344
کرامت کا اثبات۔	349
معجزہ اور کرامت میں فرق۔	351
مدعی الوہیت کے ہاتھ پر معجزے	356
جیسے افعال کا ظاہر ہونا۔	
کرامات اولیاء کا بیان	364
انبیاء کی اولیاء پر فضیلت کا بیان	377

مضمون	صفحہ
انبیاء اور اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت	382
فرقہ خرازیہ۔	386
بقا اور فنا کا بیان۔	387
فنا و بقا میں مشائخ کے رموز۔	392
فرقہ خفیفہ۔	395
غیبت و حضور کا بیان۔	396
جمع اور تفرقہ کا بیان۔	402
جمع اور تفرقہ میں اختلاف۔	408
روح کا بیان	414

پہلا کشف حجاب

معرفت الٰہی۔	423
مشائخ کے رموز	434

دوسرا کشف حجاب

توحید کا بیان۔	439

تیسرا کشف حجاب

ایمان کی حقیقت۔	450

چوتھا کشف حجاب

نجاست سے پاک ہونے کا بیان	457
توبہ اور اس کے متعلقات۔	462

پانچواں کشف حجاب

نماز کا بیان۔	471

مضمون	صفحہ
محبت اور اس کے متعلقات	479

چھٹا کشف حجاب

زکوٰۃ کا بیان۔	494
جود و سخاوت کا بیان۔	498

ساتواں کشف حجاب

روزے کا بیان۔	503
بھوک اور اس کے متعلقات۔	510

آٹھواں کشف حجاب

حج کے بیان میں۔	513
مشاہدہ کا بیان۔	520

نواں کشف حجاب

صحبت۔ اس کے آداب و احکام۔	527
اقامت میں آداب توفیق۔	539
نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے آداب	566

دسواں کشف حجاب

صوفیہ کے کلام ان کی اصطلاحات	576
اور حقائق کا بیان۔	
مقام اور تمکین۔	581
علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔	597
علم و معرفت۔	599

مضمون	صفحہ
شریعت و حقیقت۔	599

گیارھواں کشف حجاب

سماع کا بیان۔	613
قرآن کا سماع۔	615
سماع میں صوفیہ کا اختلاف۔	636
سماع میں صوفیہ کے مراتب۔	637
وجد۔ وجود، تواجد اور اس کے آداب	647
رقص اور اس کے متعلقات۔	651
گدڑی کا بیان۔	653
سماع کے آداب۔	656

حمد ونعت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَةً وَّ هَیِّئۡ لَنَا مِنۡ اَمۡرِنَا رَشَدًا ط اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ کَشَفَ لِاَوۡلِیَائِهٖ بَوَاطِنَ مَلَکُوۡتِهٖ وَقَشَعَ لِاَصۡفِیَائِهٖ سَرَائِرَ جَبَرُوۡتِهٖ وَارَاقَ دَمَ الۡمُحِبِّیۡنَ بِسَیۡفِ جَلَالِهٖ وَاَذَاقَ سِرَّ الۡعَارِفِیۡنَ بِرُوۡحِ وِصَالِهٖ هُوَ الۡمُحۡیِیۡ لِمَوَاتِ الۡقُلُوۡبِ بِاَنۡوَارِ اِدۡرَاکِ صَمَدِیَّتِهٖ وَکِبۡرِیَائِهٖ وَالۡمُنۡعِشُ لَهَا بِرَاحَةِ رُوۡحِ الۡمَعۡرِفَةِ بِنَشۡرِ اَسۡمَائِهٖ ط وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَاَزۡوَاجِهٖ وَ ذُرِّیَّتِهٖ اَجۡمَعِیۡنَ o

ترجمہ:۔اے ہمارے پروردگار! ہم پر اپنی بے پایاں رحمت نازل فرما اور ہمارے ہر کام میں ہماری رہنمائی فرما۔تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اپنے دوستوں کے لئے عالم ملکوت کے راز آشکارا کر دیئے اور اپنے برگزیدہ بندوں پر عالم جبروت کے بھید کھول دیئے اور اپنے جلال کی تلوار سے اپنے عاشقوں کا خون بہایا اور اپنے عارفوں کے دل کو اپنے وصال کی لذت کا مزہ چکھایا۔وہی اپنی بے نیازی اور کبریائی کے انوار سے دلوں کی مردہ زمین کو زندگی بخشنے والا اور اسے اپنے مقدس ناموں اور معرفت کی روح پرور خوشبو سے نشو ونما دینے والا ہے۔اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ ان کی آل ان کے اصحاب اور ان کی ازواج مطہرات پر ہمیشہ اس کی رحمتوں کا نزول ہو۔شیخ علی بن عثمان بن ابی الحسن علی جلابی، غزنوی، ہجویری اللہ اس سے راضی ہو، عرض پرداز ہے کہ میں نے استخارہ کیا اور نفس کے گرد منڈلانے والی تمام اغراض وخواہشات کو دل سے دور کرتے ہوئے تمہاری درخواست کے مطابق اللہ تعالیٰ تمہیں نیک بخت کرے۔کام کرنے کے لئے مستعد ہو گیا اور اس کتاب

سے تمہاری مراد پوری کرنے کا پختہ عزم کر لیا اور اس کتاب کا نام "کشف المحجوب" رکھا جس سے تمہارا اصل مقصد واضح ہو گیا۔ اور تمہاری خواہش کے پیش نظر اس کتاب کو کئی ابواب میں تقسیم کر دیا اور میں اس کتاب کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد اور توفیق کی درخواست کرتا ہوں کہ اپنے قول اور عمل میں اپنی ذاتی صلاحیت اور قوت پر بھروسہ کرنا میرے نزدیک ہرگز مناسب نہیں کیوں کہ توفیق تو صرف اللہ ہی کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔

پہلی فصل

کتاب پر مصنف کا نام:۔ میں نے کتاب کی ابتدا میں اپنا نام دو چیزوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے، ان میں سے ایک تو خاص لوگوں کا حصہ ہے اور دوسری کا تعلق عام لوگوں سے ہے، جو عام لوگوں سے متعلق ہے وہ تو یہ ہے کہ جب تصوف کے علم سے ناآشنا لوگ اس موضوع پر کوئی ایسی نئی کتاب دیکھتے ہیں کہ جس میں متعدد مقامات پر مصنف نے اپنا نام نہ لکھا ہو تو اس کو اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔ جس سے مصنف کا مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ تصنیف و تالیف اور کسی مواد کو کتابی صورت میں جمع کرنے سے مصنف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ مصنف کا نام رہے اور کتاب کو پڑھنے اور اس سے تعلیم پانے والے لوگ اس کے لیے نیک دُعا کرتے رہیں۔

ذاتی تلخ تجربہ:۔ میرے ساتھ یہ سانحہ دو دفعہ پہلے پیش آ چکا ہے ایک دفعہ تو یوں کہ ایک شخص نے میرے اشعار کا دیوان مجھ سے مانگ کر لیا اور میرے پاس اس کا وہی ایک نسخہ تھا اس نے اس کی ترتیب کو تبدیل کر دیا اور اس کے شروع سے میرا نام اڑا دیا اور اس طرح میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرے۔

دوسری دفعہ کہ جب میں نے تصوف کے طریق میں "اللہ تعالیٰ اس کو آباد رکھے" ایک کتاب لکھی اور اس کا نام "منہاج الدین" رکھا، ایک ذلیل مدعی نے" کہ میں اس کا نام

لینا پسند نہیں کرتا۔ میرا نام اس کتاب سے اُڑا دیا اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرنے لگا کہ یہ کتاب اس نے خود لکھی ہے۔ اگرچہ اس کی جہالت کو جاننے والے خاص لوگ اس کے اس دعوے پر ہنستے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بے برکتی کو یہاں تک پہنچایا کہ اس کا نام اپنی بارگاہ کے طالبوں سے ہی خارج کر دیا۔

تاہم جو بات خواص کے ساتھ متعلق ہے اس کا معاملہ مختلف ہے کہ جب وہ ایک کتاب دیکھیں گے اور انہیں معلوم ہوگا کہ اس کتاب کا مصنف اس فن کا ماہر عالم اور محقق ہے تو اس کے حقوق کی اچھی طرح رعایت کریں گے اور اس کے مطالعہ کے بعد اسے یاد رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح پڑھنے والے اور مصنف دونوں کا مقصود اچھی طرح حاصل ہو جاتا ہے--------اور اللہ تعالیٰ ہی صحیح علم والے ہیں۔

دوسری فصل

استخارہ کی اہمیت:۔ اور یہ جو میں نے کہا کہ میں نے استخارہ کیا تو اس سے میری مراد اللہ تعالیٰ کے ان آداب کا لحاظ رکھنا ہے کہ جن کا اس نے اپنے پیغمبر ﷺ اور ان کا اتباع کرنے والوں کو حکم دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔ فَاِذَا قَرَأتَ الْقُرآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ (کہ جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو) اور استعاذۃ (شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنا) استخارۃ (اللہ سے بھلائی طلب کرنا) اور استعانت ہر معاملہ میں اللہ کی مدد چاہنا) ان سب سے مراد یہی ہے کہ تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جائے۔ اپنے تمام کاموں کو اللہ کے ہی سپرد کیا جائے اور یوں طرح طرح کی مصیبتوں سے نجات حاصل کی جائے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ہمیں قرآن کی تعلیم ارشاد فرمایا کرتے تھے اسی طرح استخارہ کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔

پس جب انسان اس حقیقت سے روشناس ہو جائے کہ کسی کام میں اس کی کامیابی اس کے ذاتی کسب اور تدبیر پر موقوف نہیں کیونکہ انسان کی بہتری کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور ہر قسم کی بھلائی یا برائی تقدیر الٰہی پر منحصر ہے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی ہونے اور اس سے مدد مانگنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ اس طرح وہ نفس امارہ کی شرارتوں اور سرکشی سے ہر حالت میں محفوظ ہو جاتا ہے اور اس کی اصلاح و بہتری کی نعمت حاصل کر لیتا ہے---لہٰذا ضروری ہے کہ بندہ اپنے تمام کاموں میں اللہ سے استخارہ کر لیا کرے تا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اسے غلطیوں اور آفتوں سے محفوظ رکھے۔ اور توفیق تو اللہ کی طرف ہی سے ہے۔

تیسری فصل

<u>نفسانی خواہشات سے اجتناب</u>:۔ اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں نے نفسانی امراض کو اپنے دل سے نکال دیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کسی نفسانی خواہش کے مطابق کیا جائے اس کی برکت اٹھ جاتی ہے اور دل صراط مستقیم سے ہٹ کر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے، اس طرح دو حالتوں میں سے ایک کا ظہور ہوتا ہے یا تو اس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے یا نہیں، اگر پوری ہو گئی تو بھی ہلاکت ہے۔ کیوں کہ دوزخ کے دروازہ کی کنجی یہی ہے کہ نفس کی مراد پوری ہو جائے، اور اگر نفس کی مراد پوری ہی نہ ہو تو اس سے بہتر تو یہ ہے کہ شروع سے ہی نفسانی خواہش کو دل سے نکال کر باہر کیا جائے کیوں کہ بہشت کی کنجی یہی ہے کہ نفس کی اغراض کو دل میں جگہ ہی نہ دی جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى "(اور جس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو یقیناً اس کا ٹھکانہ جنت ہے)

اور معاملات میں نفسانی اغراض یہ ہوتی ہیں کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

کے علاوہ کچھ اور مقصد بندہ کے پیش نظر ہو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے نفس کی نجات طلب نہ کرے اور نفس کے لئے سرکشیوں اور رعونت کی کوئی حد مقرر نہیں اور نہ ہی اس کی فریب کاریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ لہٰذا انشاء اللہ اس کتاب میں مناسب جگہ پر اس موضوع کو مستقل باب کی صورت میں بیان کیا جائے گا۔

چوتھی فصل

مقصد و نیت تالیف:۔ اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ تمہاری درخواست کے مطابق میں کمر بستہ ہوا اور اس کتاب کے ذریعہ تمہارا مقصد پورا کرنے کا پختہ عزم کر لیا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ جب تم نے مجھے سوال کا اہل سمجھا اپنے (ساتھ پیش آنے والے) واقعہ کے متعلق مجھ سے پوچھا اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے اس کتاب کو تالیف کرنے کی مجھ سے درخواست کی تو مجھ پر یہ واجب ہو گیا کہ میں تمہارے حسن ظن کا لحاظ رکھتے ہوئے تمہارے سوال کا حق ادا کروں لیکن چونکہ تمہارے سوال کا پورا پورا حق فوراً ادا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے عزم مصمم اور اخلاص نیت کو اولین حیثیت حاصل تھی تاکہ اس کتاب کی ابتدا سے ہی سوال کے پورا کرنے کا ارادہ اور جواب کا احترام و احساس ملحوظ خاطر رہے کیونکہ انسان کا ارادہ جب کام کے شروع میں حسن نیت سے وابستہ ہو تو اگر اس کام میں کوئی کمی بھی باقی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بندہ معذور سمجھا جائے گا۔ اسی لئے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ "نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِنْ عَمَلِہٖ" (مومن کی نیت اس کے اس عمل سے بہتر ہے جو بغیر نیت کے کیا جائے) اور اعمال میں نیت کا بڑا ہی دخل ہے اور اس پر یہی دلیل موجود ہے کہ بندہ ایک ہی نیت سے ایک حکم سے دوسرے حکم میں ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے ظاہر پر اس کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص روزہ کی نیت کے بغیر کچھ دن بھوکا رہے تو اسے اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا لیکن اگر وہ روزہ کی نیت کرنے کے بعد بھوکا رہے تو مقربان الٰہی میں شمار ہو جائے گا

باوجودیکہ ظاہری طور پر کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی مسافر کسی شہر میں اقامت کی نیت کے بغیر کچھ مدت تک ٹھہرا رہے تو وہ مقیم شمار نہیں ہوگا البتہ اگر وہ وہاں سکونت کی نیت کرلے تو مقیم سمجھا جائے گا۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے امور ہیں کہ نیت کے بغیر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر عمل کے شروع میں نیک عمل کی نیت ہونی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کو ہی صحیح علم ہے۔

پانچویں فصل

وجہ تسمیہ:۔ اور میں نے جو یہ کہا ہے کہ میں نے اس کتاب کا نام کشف المحجوب رکھا ہے تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ کتاب کے نام سے ہی اس میں موجود مضمون کی گواہی مل جائے خصوصاً اہل بصیرت جب اس کتاب کا نام سنیں تو انہیں علم ہو جائے کہ اس کتاب کا موضوع اور مقصد کیا ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اولیاء اللہ اور درگاہ الٰہی کے مقربین کے سوا باقی تمام اہل دنیا امر خداوندی کے اسرار و رموز سے پردہ میں رہتے ہیں اور چونکہ یہ کتاب راہ حق کے بیان، امر حق کی شرح اور بشریت کے حجابات کھولنے کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے اس نام کے علاوہ کوئی اور نام اس کے لئے مناسب ہی نہ تھا، اور در حقیقت حجاب کا کھولنا اسی طرح محجوب کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے جس طرح حجاب مکشوف کی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے یعنی جس طرح قرب و وصال، فرقت و دوری کی طاقت نہیں رکھتا۔

اسی طرح دوری بھی نزدیکی کی تاب نہیں لا سکتی، جس طرح سرکہ میں پیدا ہونے والا جانور جب دوسری چیز میں گرتا ہے تو مر جاتا ہے اس طرح دوسری چیزوں میں پیدا ہونے والے جانور کو اگر سرکہ میں ڈال دیا جائے تو وہ بھی زندہ نہیں رہتا چنانچہ حقیقت کی (پر مشقت) راہ پر چلنا صرف اسی کے لئے آسان ہے جس کی تخلیق ہی اس مقصد کے لیے عمل میں آئی ہو اسی لئے پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ کُل میسر لما خُلق لہٗ (ہر شخص کے لئے

وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے) اور اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو کسی خاص مقصد کیلئے پیدا کیا ہے تو اس کے حصول کا طریقہ اس کیلئے آسان کر دیا ہے۔

لیکن حجاب کی دو قسمیں ہیں، ایک حجاب رینی[1] کہ اس کا اٹھنا ہرگز ممکن نہیں (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے) اور دوسرا حجاب غینی[2]، اور یہ بہت جلدی اٹھ جاتا ہے، اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض انسان تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ذات ہی حق کا حجاب ہوتی ہے حتیٰ کہ ان کے نزدیک حق و باطل میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی ''صفت'' حق کا حجاب ہوتی ہے لیکن ان کی طبیعت ہمیشہ حق کی متلاشی اور باطل سے گریزاں رہتی ہے، پس ذاتی حجاب جس سے حجاب رینی مراد ہے وہ کسی صورت میں نہیں اٹھ سکتا۔ اور عربی لغت میں ''رین'' ختم اور طبع[3] سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ (ہرگز ایسا نہیں۔ بلکہ ان کے برے اعمال کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے پھر اس کا حکم ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُو اسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ'' (اے نبی! جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے) اس کے بعد ان کے اس عمل کی علت بیان فرمائی ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ نے مہر لگادی ہے ان کے دلوں پر) اور یہ بھی فرمایا'' طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی) اور حجاب صفتی کہ جو غینی حجاب ہے وہ کبھی کبھی اٹھ بھی سکتا ہے ذات کی تبدیلی نادرات میں سے ہے اور نادر ناممکن ہے اور جائز ہے۔

مشائخ اور صوفیاء نے رین اور غین کے معنی کو لطیف اشارہ میں بیان فرمایا ہے

---

[1] طبعی، پیدائشی اور فطری حجاب مراد ہے کہ رین عربی میں زنگ کو کہتے ہیں۔

[2] عربی میں ''غین'' اندھیرے کو کہتے ہیں یہاں عارضی حجاب مراد ہے۔

[3] ختم اور طبع (مہر لگانا) استعداد کا سلب کر لینا مراد ہے۔

چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الرَّیْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْمُوْطَنَاتِ وَالْغَیْنُ مِنْ جُمْلَةِ الْخَطَرَاتِ ''(کہ زنگ مستقل اور مضبوط اشیاء میں سے ہے اور تاریکی عارضی اندیشوں میں سے ہے) وطن مستقل اور خطر عارضی ہوتا ہے۔ چنانچہ پوری دنیا کے صیقل گر اور آئینہ ساز اکٹھے ہو کر بھی پتھر سے آئینہ نہیں بنا سکتے لیکن اگر آئینہ زنگ آلود ہو جائے تو صیقل کرنے سے بالکل صاف ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پتھر میں اصل تاریکی ہے جب کہ آئینہ میں اصل روشنی ہے اور اصلیت پائیدار ہوتی ہے لہٰذا پتھر آئینہ نہیں بن سکتا اور عارضی صفت کو بقا نہیں ہوتا لہٰذا آئینہ کا رنگ ختم ہو سکتا ہے...... پس میں نے یہ کتاب اس لئے لکھی ہے کہ یہ ان دلوں کے لئے صیقل کا کام دے۔ جو حجاب غین کی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں لیکن نور حق ان کے دلوں میں موجود ہے تاکہ اس کے مطالعہ کی برکت سے تاریکی کا وہ پردہ ان کے دلوں سے اٹھ جائے اور حقیقت معنی کی طرف راہ پالیں۔ اور وہ لوگ کہ حق کا انکار اور باطل کا ارتکاب جن کے خمیر اور ذات میں داخل ہو وہ حق کے واضح دلائل وشواہد کے باوجود راہ نہیں پاتے لہٰذا اس کتاب سے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے عرفان کی نعمت سے سرفراز پایا۔

چھٹی فصل

ابواب کی تقسیم:۔ باقی میں نے جو یہ کہا ہے کہ مجھ پر تمہارا مقصد واضح ہو گیا ہے اور تمہاری غرض سے متعلق تمام باتیں اس کتاب کے کئی اجزاء میں تقسیم ہو گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک سوال کرنے والے کا پورا مقصد معلوم نہ ہو اس کی مراد حاصل نہیں ہوتی کیونکہ سوال ذہن میں پیدا ہونے والے کسی اشکال کی وجہ سے ہی کیا جاتا ہے لہٰذا جب تک جواب سے یہ اشکال حل نہ ہو جائے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور اشکال کو جب تک اچھی طرح پہچان اور سمجھ نہ لیا جائے اس کا صحیح حل پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ تمہاری مراد سے تعلق رکھنے والے امور کئی اجزاء میں تقسیم ہو گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سوال تمام امور پر مشتمل ہو تو جواب بھی ان تمام امور پر حاوی ہونا چاہئے تا کہ سوال کرنے والا اپنے سوال کے تمام درجوں اور پہلوؤں اور پھر ان کے جوابات کو اچھی طرح سمجھ لے۔ اور پھر ایک مبتدی کے سامنے تو اس کی تمام اقسام اور حدود کی پوری پوری تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصاً تمہاری غرض اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت مند بنائے) کا تو تقاضہ ہی یہ ہے کہ میں اسے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کروں اور تمہارے سوال کے جواب میں ایک مستقل کتاب تصنیف کروں اور توفیق دینے والا تو صرف اللہ ہی ہے۔

ساتویں فصل

اللہ سے طلب مدد:۔ اور میں نے یہ جو کہا ہے کہ میں امداد اور توفیق اللہ تعالیٰ سے طلب کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا انسان کا کوئی حامی و مددگار نہیں جو نیکی کے کاموں کو سرانجام دینے کے لئے اس کی نصرت کرے اور مزید توفیق بخشے، اور توفیق کے معنی یہ ہیں کہ بندہ کے نیک اعمال میں اللہ تعالیٰ کی تائید و موافقت شامل حال ہو۔ اور توفیق الٰہی کی صحت پر کتاب وسنت کی گواہی اور دلیل موجود ہے نیز معتزلہ اور قدریہ جماعت کہ جو توفیق کو مہمل اور بے معنی لفظ سمجھتے ہیں کے علاوہ پوری امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے---اور مشائخ طریقت کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ "اَلتَّوفِیقُ هُوَ القُدرَةُ عَلَی لطَاعَةِ عندَ الاستعمال "(یعنی عمل کے وقت فرمانبرداری کی قوت پیدا ہو جانے کا نام" توفیق ہے جب انسان خدا کا اطاعت گزار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے پہلے سے کہیں زیادہ قوت اور طاقت عطا کی جاتی ہے اور اس طرح تمام حالات میں ہر قسم کی حرکات و سکنات اللہ تعالیٰ کے افعال اور مخلوق بن جاتے ہیں۔ پس توفیق الٰہی اس قوت کا نام

ہوا جس کے ذریعہ انسان اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ لیکن یہ کتاب اس مسئلہ کے بیان کا محل نہیں کیونکہ اس کتاب میں ایک اور چیز (تصوف) بیان کرنا مقصود ہے۔

اور اب میں اللہ عزوجل کی مشیت وتوفیق سے تمہارے اصل مقصود کی طرف توجہ کرتا ہوں لیکن اس سے متعلق کچھ کہنے سے پہلے تمہارے سوال کو بعینہ درج کرتے ہوئے اسی سے کتاب کا آغاز کرتا ہوں (اور توفیق تو اللہ کی جانب سے ہوتی ہے۔)

صورت سوال

- سائل ابوسعید ہجویری نے درخواست کی آپ میرے لئے تحقیق کے ساتھ بیان فرمائیں کہ طریقت اور تصوف کی حقیقت کیا ہے؟
- اہل تصوف کو کن کن مقامات سے گزرنا پڑتا ہے اور ہر مقام کی کیفیت کیا ہے؟
- اہل تصوف کے مختلف مذاہب واقوال اور رموز واشارات کیا ہے؟
- اللہ تعالیٰ کی محبت اور دلوں پر اس کے ظاہر ہونے کی کیفیت کیا ہے؟
- اللہ تعالیٰ کی ماہیت کی معرفت سے انسانی عقول کے حجاب کا سبب کیا ہے؟
- اس کی حقیقت کے ادراک سے نفس امارہ کو نفرت و بیزاری کیوں ہوتی ہے؟
- اور اس کی صفات سے واقف ہو جانے والوں کی روح کو اطمینان و آرام کیسے نصیب ہو جاتا ہے؟

نیز ان سوالات سے متعلق دوسرے تمام امور کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمائیے؟

کشف المحجوب کی ابتداء

حضرت علی ہجویریؒ کا جواب:۔ مسئول یعنی علی عثمان جلابی (اللہ اس پر رحم کرے) کہتا ہے کہ تم جان لو کہ درحقیقت ہمارے اس دور میں یہ علم مٹ چکا ہے خصوصاً ہمارے اس ملک میں کہ جہاں کے تمام لوگ نفسانی خواہشات میں مستغرق اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے راستہ سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور دور حاضر کے علماء اور وقت کے مدعیوں کے لئے اس راہ طریقت کے خلاف ایک اور صورت پیدا ہو چکی ہے۔ پس اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے غیر معمولی ہمت سے کام لو کہ بارگاہ الٰہی کے خواص کے سوا تمام اہل زمانہ کا ہاتھ اس کے حصول سے محروم ہے تمام اہل ارادت کی مراد اس سے ٹوٹ چکی ہے اس کے وجود سے تمام اہل معرفت کی معرفت معزول ہو گئی ہے سب عوام و خواص نے اس کی حقیقت کی بجائے صرف عبادت کو کافی سمجھ لیا ہے۔ دل و جان سے اس کے حجاب کے خریدار بن گئے۔ اور یہ کام اب تحقیق کی بجائے تقلید میں پڑ گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امر حق کی جستجو نے ان سے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے۔ پس عوام تو اسی پر مطمئن ہیں کہ انہیں (کسی محنت کے بغیر) حق کی معرفت حاصل ہو گئی ہے اور خواص اس پر خوش ہیں کہ ان کے دلوں میں اس کی تمنا، نفس میں اس کا شوق اور سینوں میں اس کی طرف رغبت موجود ہے اور شغل کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ شوق دیدار (الٰہی) اور سوز محبت ہے اور تصوف کے نام نہاد مدعی اپنے (بلند بانگ) دعوؤں کے باوجود تمام حقائق کی معرفت سے قاصر اور بیگانہ ہیں۔ جب کہ مریدوں نے مجاہدہ و ریاضت سے ہاتھ اٹھا کر اپنے فاسد تصورات کا نام مشاہدہ رکھ لیا ہے۔

میں نے اس سے پہلے اس علم (تصوف و طریقت) میں جتنی کتابیں لکھی تھیں وہ سب ضائع ہو گئی ہیں اور تصوف کے جھوٹے مدعیوں نے ان میں عوام کو پھانسنے کے لئے بعض باتیں چن کر باقی کو دھو کر ضائع کر دیا کیونکہ جس کے دل پر مہر لگ چکی ہو وہ حسد اور

انکار کو ہی نعمت خداوندی سمجھتا ہے اور ایک دوسرے گروہ نے ان عبارات کو دھو کر مٹایا تو نہیں لیکن انہیں پڑھا بھی نہیں اور ایک اور گروہ نے عبارات کو پڑھا تو سہی لیکن جب ان کا مطلب نہ سمجھا تو عبارتوں پر اکتفا کرتے ہوئے انہیں لکھ لیا تا کہ انہیں یاد کر کے یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہم تصوف و معرفت کا علم بیان کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ بالکل اندھیرے میں ہیں۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ علم طریقت کے حقائق اور رموز سرخ گندھک کی طرح ہیں جو بالکل کمیاب اور بیش قیمت ہوتی ہے لیکن اگر وہ میسر آ جائے تو اس کی چھ رتی کی مقدار کسی وزنی پتھر اور کانسی و تانبے کی بھاری مقدار کو سونا بنا سکتی ہے غرضیکہ ہر انسان اسی دوا کا طلب گار ہوتا ہے جو اس کے درد کا علاج ہو اور اس کے علاوہ اور کسی دوا کی اسے ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ ایک بزرگ نے کہا ہے شعر۔

فَکُلُّ مَنْ فِی فُؤَادِہٖ وَجَعٌ　　　یَطْلُبُ شَیْئًا یُوَافِقُ الْوَجَعَا

ترجمہ:۔ پس جس کے دل میں کوئی درد ہو تو وہ ایسی چیز ہی ڈھونڈتا ہے جو اس کے درد کے موافق ہو) جس شخص کی بیماری کا علاج معمولی درجہ کی چیزوں سے ہو سکتا ہو اسے موتی اور مروارید کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس میں شہد اور دوا المسک ملائیں۔ اور یہ علم طریقت تو اس لئے قیمتی اور کمیاب ہے کہ اس سے ہر شخص کو حصہ نہیں ملتا اور اس سے قبل بھی اس علم سے جاہل لوگوں نے مشائخ کی کتابوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے کہ جب بھی اسرار خداوندی کے خزانے ان کے ہاتھ لگے اور انہیں اس کے معانی کی سمجھ نہ آئی تو انہیں جاہل کلاہ سینے والوں اور ناپاک جلد سازوں کے سپرد کر دیا تا کہ وہ انہیں ٹوپیوں کا استر اور ابو نواس[1] جیسے شاعروں کے دیوانوں اور جاحظ[2] کے خرافات کی طرح اس کی جلد بندی کر دیں اور یقیناً اگر شاہی باز کسی بڑھیا کے مکان کی دیوار پر جا بیٹھے تو وہ اس کے پر اور بازو کاٹ ہی ڈالے گی...... اور خداوند عزوجل نے ہمیں اس زمانہ میں پیدا فرمایا ہے کہ جس میں لوگوں

[1] ایک شراب نوش شاعر جس کا دیوان واہیات شعروں کا مجموعہ تھا۔

[2] ابوعثمان عمر بن بحر الملقب بہ جاحظ مغربی (بہت سی کتابوں کا مصنف)

نے نفسانی خواہشات کا نام شریعت، طلب جاہ، حب دنیا اور تکبر کا نام عزت و علم، مخلوق کے سامنے ریا کاری کا نام خوف خدا، کینہ کو دل میں پوشیدہ رکھنے کا نام بردباری فضول جھگڑے کو مناظرہ آپس میں جنگ و جدال کا نام بزرگی، منافقت کا نام زہد، جھوٹی آرزو کا نام ارادت، طبعی ہذیان کا نام معرفت، دلی حرکتوں اور نفسانی وسوسہ کا نام محبت الٰہی الحاد کا نام فقر، انکار حق کا نام بزرگی، بے دینی کا نام فنا پیغمبر علیہ ﷺ کی شریعت کے ترک کا نام طریقت اور زمانہ والوں کی آفت کا نام مجاہدہ رکھ لیا ہے یہاں تک کہ معانی و مطالب کے جاننے والے ان سے بالکل الگ ہو گئے ہیں اور اہل دنیا نے اسی طرح غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ جیسا کہ اسلام کی پہلی ابتری کے وقت آل مروان نے رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اہل حقائق کے بادشاہ اور طریقت و باریک بینی کے امام، ابوبکر واسطی رحمتہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے۔ اُبْتَلِینا بِزمانٍ لَیْسَ فِیْهِ اٰدَابُ الْاِسلام وَلاَ اَخْلَاقُ الجَاهِلِیةِ وَلاَ اَحکَامُ ذَوِلی المَروَةِ (ہم ایسے دور میں آزمائش میں مبتلا کر دیے گئے ہیں کہ جس میں نہ تو اسلامی آداب ہیں، نہ اخلاق جاہلیت اور نہ ہی مروت و محبت کی باتیں۔ اور اسی قول کے موافق شبلیؒ فرماتے ہیں۔

جَعَلَ اللّٰهُ ذِوی الدُّنَیا مُنَاخَالِرَاکب فَکُل بَعیدِ الهِمّ فیها مُعذب" و مغلّبُ

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو صرف ایک شتر سوار کے اپنی اونٹنی بٹھانے کی جگہ (عارضی آرام گاہ) بنایا ہے چنانچہ دور دراز (آخرت) کا ارادہ رکھنے والا یہاں تنگی اور مصیبت ہی پائے گا۔

آٹھویں فصل

اللہ تعالیٰ تمہیں قوت نصیب کرے جان لو! کہ میں نے اس عالم کو "اللہ والوں کے لئے" اسرار الٰہی کا محل، موجودات کو اس کی امانتوں کی جگہ اور مخلوقات کو اس کے لطیف رموز کا مقام پایا ہے اور جواہر، اعراض، عناصر، فلکی اجرام، ارضی اجسام اور مختلف طبائع سب

کے سب ان اسرار کا حجاب ہیں اور مقام توحید میں ان میں سے ہر ایک کا اثبات شرک ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو محل حجاب میں رکھا ہے حتیٰ کہ ہر ایک کی طبیعت نے اپنی جگہ پر اسی کے حکم سے اطمینان پایا ہے اور اپنے وجود کی بنیاد پر توحید الٰہی سے حجاب میں رہ گئی ہے اور تمام ارواح اس عالم میں اس وجود کی آمیزش کی وجہ سے بے نیاز ہوگئی ہیں، اور تمام تر قربتوں کے باوجود اپنی نجات کے مقام سے دور رہ گئی ہیں یہی وجہ ہے کہ اسرار الٰہی تک پہنچنا انسانی عقل کے لئے مشکل ہوگیا اور قرب کے لطائف روحوں کے حق میں مخفی ہوگئے یہاں تک کہ انسان سایہ غفلت میں رہ کر اپنے وجود کی وجہ سے حجاب میں ہوگیا ہے اور اپنے محل میں ظلمانی حجاب کی وجہ سے عیب دار بن گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسَر (قسم ہے زمانہ کی بیشک انسان بڑے خسارے میں ہے) اور نیز فرمایا اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُولاً (بلاشبہ انسان بڑا ظالم اور جاھل ہے) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے خَلَقَ اللّٰہُ الخَلْقَ فِی ظُلْمَۃٍ ثُمَّ اَلْقٰی علیہِ نوراً (اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اپنے نور کا پرتو ڈال کر اسے روشن کر دیا) پس یہ حجاب ظلماتی عالم ناسوت میں خود اس کے اپنے مزاج کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور یہ اس کی طبیعت اور عقل کی وجہ سے ہے جو اس سے تعلق رکھتی اور اس میں تصرف کرتی ہے اسی لیے اس نے جہالت پر اکتفا کر لیا اور حق سے اس حجاب کو اپنے لئے دل و جان سے خرید لیا ہے لہذا وہ کشف کے جمال سے بے خبر اور اسرار الٰہی سے روگردانی کرتے ہوئے حیوانات کے مقام پر آرام کئے ہوئے اور اپنی نجات کے مقام سے راہ فرار اختیار کئے ہوئے ہے اس نے نہ تو توحید الٰہی کی بو سونگھی نہ جمال احدیت کا دیدار کیا اور نہ ہی توحید کا مزہ چکھا ہے۔ وہ ترکیب عناصر کی وجہ سے مشاہدہ حق کی تحقیق سے عاجز اور دنیا کے لالچ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت سے روگرداں ہوگیا ہے اور حیوانی خواہشات نے حیات ربانی کے بغیر اس کے نفس ناطقہ کو اس قدر مغلوب کر دیا ہے کہ اس کی تمام حرکات اور جستجو حیوانات کی سی ہوگئی ہے یہاں تک کہ وہ

اب کھانے سونے اور نفسانی خواہشات کی تابعداری کے سوا اور کچھ نہیں جانتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو ان تمام باتوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے "ذَرْهُمْ يَاكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْ وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (انہیں اس حال میں چھوڑ دیجئے کہ وہ کھائیں اور زندگی کے اسباب سے فائدہ اٹھائیں اور دنیا کی خواہش انہیں غفلت میں مبتلا کر دے پھر عنقریب ان کو سب حقیقت کا علم ہو جائے گا) اس لیے کہ ان کی طبیعت کے حکمران (نفس) نے مسند الٰہی کو ان پر مخفی کر دیا اور ان کے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی توجہ اور توفیق کی بجائے ذلت اور محرومی آ گئی حتیٰ کہ وہ سب سرکش نفس کے تابع ہو گئے جو سب سے بڑا حجاب اور برائی و شرارت کا سرچشمہ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ" بِالسُّوْءِ (بلاشبہ نفس امارہ برائی کا حکم دینے والا ہے)

اب میں کتاب کا آغاز کرتا ہوں اور مخفی مقامات اور حجابات سے تمہارا مقصود نکال کر تم پر ظاہر کرتا ہوں اور اسے لطیف انداز بیان سے واضح کر دیتا ہوں اور اہل صنائع کی عبارتوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ مشائخ کا کلام بھی اس کے ساتھ ملاتا جاؤں گا اور اس کی تائید میں عمدہ اور دلپذیر حکایات بھی بیان کروں گا تاکہ تمہیں تمہارا مقصود حاصل ہو اور علما ظواہر میں سے جو شخص بھی اس کتاب میں غور کرے اسے معلوم ہو جائے کہ علم تصوف کی بنیاد قوی اور اس کی شاخیں پھل دینے والی ہیں اور تمام مشائخ اہل علم ہوئے اور اپنے تمام ارادت مندوں کو تصوف کا علم حاصل کرنے پر ابھارتے اور پھر اس پر مداومت کرنے کی تحریص دلاتے رہے ہیں نہ وہ خود لغو اور بیہودہ باتوں میں مبتلا اور غلط راہ پر گامزن ہوئے اور نہ ہی اپنے مریدوں کو ایسا کرنے کی ترغیب دی کیونکہ بہت سے مشائخ طریقت اور علماء تصوف نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں اور اس کے معارف پر بڑی لطیف عبارات میں ربانی علم اور خداداد بصیرت سے مضبوط دلائل قائم کیے۔ اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

پہلا باب

اثبات علم

علماء کی تعریف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاء (بلاشبہ بندوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والے وہی لوگ ہیں جو علماء ہیں) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ طَلَبُ العِلم فریضۃ" عَلٰی کُلِ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃً (علم کی جستجو ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے) نیز حضور ﷺ نے فرمایا ہے اطلبوا لِعلم وَلَوْ کَانَ بالصین (علم کو تلاش کرو اگر چہ وہ چین ہی میں ہے، اور جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر بہت کم ہے اس لئے تمام علوم وفنون کا حاصل کرنا انسان پر فرض نہیں۔ مثلاً علم نجوم طب حساب اور علم بدیع کی تمام صنائع بدائع وغیرہ کا حاصل کرنا ضروری نہیں البتہ علم نجوم کا اس قدر سیکھنا ضروری ہے کہ رات کے وقت نماز کے اوقات معلوم ہوسکیں۔ اسی طرح بیماری سے حفاظت کے لئے علم طب، مسائل وراثت کو سمجھنے کے لئے علم میراث اور حیض وعدت وغیرہ کو سمجھنے کے لئے علم فقہ، غرضیکہ علم کا اس قدر سیکھنا ضروری اور فرض ہے جس سے عمل درست ہو جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غیر مفید علم سیکھنے والوں کی مذمت فرمائی ہے ارشاد ہے وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَایَضُرُّ ھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُم "(اور وہ لوگ ایسا علم سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دیتا اور کوئی فائدہ نہیں دیتا) اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسے علم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کی ہے ارشاد فرمایا "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ (اے اللہ میں بے فائدہ علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں) پس تھوڑے علم سے بہت سا عمل کرنا چاہئے۔ اور علم کے ساتھ عمل بھی ہونا چاہئے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے للمتعبد بِلافقہٍ کالحمار فی طاحُونِہٖ "(علم دین کے حاصل کئے بغیر عبادت کرنے والا بغیر خراس کے گدھے کی طرح ہے) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بے علم عبادت گذار کو خراس کے گدھے سے مشابہ قرار دیا

ہے جو جتنا بھی گھومے اپنے پہلے قدموں پر ہی رہتا ہے اور آگے فاصلہ طے نہیں کر سکتا۔
میں نے عوام میں ایک ایسا طبقہ پایا ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ عمل کو علم سے برتر سمجھتا ہے حالانکہ یہ دونوں باطل ہیں، کیونکہ عمل بغیر علم کے عمل ہی نہیں ہوتا بلکہ عمل اسی وقت عمل بنتا ہے جب اس کے ساتھ علم شامل ہوتا کہ انسان اس کی وجہ سے مستحق ثواب ہو سکے مثلاً نماز۔ کہ جب تک پہلے ارکان طہارت۔ پاک پانی کی پہچان سمت قبلہ کی معرفت، کیفیت، نیت اور ارکان نماز کا علم نہ ہو اس وقت تک وہ نماز ہی نہیں ہوئی۔ پس جب عمل درحقیقت علم کے بغیر عمل ہی نہیں ہوتا تو جاہل کس طرح عمل کو علم سے جدا کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ علم کو عمل سے افضل سمجھتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ عمل کے بغیر علم بھی علم نہیں کہلاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَٰبَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (پہلی کتاب کے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں) اللہ تعالیٰ نے عالم بے عمل کا نام علماء کی فہرست سے نکال دیا ہے کیوں کہ علم کا حصول اور حفظ یہ سب بھی تو عمل ہی میں شامل ہے اس پر انسان مستحق ثواب قرار پاتا ہے اور اگر عالم کے قول و فعل سے اس کے علم کا تعلق نہ ہو تو اسے اس میں کچھ بھی ثواب حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ جو لوگوں کو ان کے علم کی وجہ سے بلند مرتبہ سمجھتا ہے اور ان کے اعمال کا کوئی خیال نہیں رکھتا اور علم کی گہرائیوں سے ناواقفیت کی وجہ سے عمل کو اس سے جدا کرتا ہے ایسے لوگ علم اور عمل دونوں سے عاری ہوتے ہیں یہاں تک کہ جاہل یہی سمجھنے لگتا ہے کہ قال (علم) کی نہیں صرف حال (عمل) کی ضرورت ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ علم ہونا چاہئے عمل کی ضرورت نہیں۔
حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے راستے میں پڑا ہوا ایک پتھر دیکھا اس پر لکھا تھا مجھے الٹ کر پڑھ'' پس میں نے اسے پلٹا تو اس پر لکھا تھا اَنْتَ لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَكَيْفَ تَطْلُبُ مَالَا تَعْلَمُ '' (تو جانی ہوئی چیز پر تو عمل نہیں کرتا پھر

اس چیز کو کیسے تلاش کرتا ہے جسے نہیں جانتا) یعنی اس چیز پر عمل کر جس کو تو جانتا ہے تا کہ اس کی برکت سے نامعلوم کا علم حاصل کرے۔ اور انسؓ بن مالک کا فرمان ہے هِمةُ العلماءِ الدِّرَايَة وهمة السفها الروایة (علما کا کام علمی مسائل میں تحقیق وتدبر اور جاہلوں کا کام صرف روایتوں کو نقل کرنا ہے) اس لئے کہ علما میں جہالت کے لوازم نہیں ہوتے اور جو لوگ علم سے دنیوی مرتبہ اور ظاہری عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے کیونکہ دنیوی مرتبہ وعزت جہالت کے لوازم میں سے ہے اور کوئی مرتبہ علم کے مرتبہ سے اعلیٰ اور بلند نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اگر علم حاصل نہ ہو تو لطیفہ رحمانی کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور جب علم موجود ہو تو وہ تمام مقامات، مشاہدات اور مراتب کا سزاوار ہو جاتا ہے واللہ اعلم بالصواب۔

دوسری فصل

علم کی اقسام:۔ جان لو! کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم الٰہی اور دوسرا علم مخلوق! مخلوق کا علم بذات خود لاشئ محض ہے اور یہ علم الٰہی کی جستجو سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم اللہ کی صفت ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے لہذا اس کی صفت علم بھی قدیم ہے اور اس کے اوصاف کی کوئی حد وانتہا نہیں اور ہمارا علم ہماری صفت ہے جو ہمارے ساتھ قائم ہے اور ہمارے اوصاف کی حد وانتہا متعین ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے وَمَا اُوْتِيتُم مِنَ الْعِلمِ اِلاَّ قَلِيْلاً (تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) غرضیکہ علم مدح کی صفات میں سے ہے اس کی حد یہ ہے کہ معلوم چیز کا یہاں تک احاطہ کر لیا جائے کہ اس کو بیان کرنے پر قدرت حاصل ہو جائے اور علم کی عمدہ ترین تعریف یہ ہے ''العلم صفة يصير الجاهلُ بِهَاعَالِماً (علم ایک صفت ہے جس سے جاہل انسان عالم بن جاتا ہے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے واللّٰهُ مُحِيط'' بِالْكٰفِرِيْن (اللہ تعالیٰ کافروں کو اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہے) یعنی کوئی چیز بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد

فرمایا ہے واللّٰہُ بِکُلِّ شَئٍ عَلِیم" (اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے) اور اس کا علم ایک ہی ہے جس کی وجہ سے تمام معلومات و موجودات کو وہ جانتا ہے اور مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ شریک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا علم نہ تو تجزی اور تقسیم کے قابل ہے اور نہ ہی اس کی ذات سے جدا ہے اور اس کے فعل کی عمدہ ترتیب اس کے علم کی دلیل ہے کیونکہ اپنی ترتیب واستحکام میں اپنے فاعل کے علم کا محتاج ہے پس اس کا علم تمام اسرار پر حاوی اور ظاہری امور پر محیط ہے طالب کو چاہئے کہ تمام افعال اس طرح سرانجام دے کہ گویا خدا اس کو اور اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے جیسا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے اعمال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔

حکایت:۔ بیان کرتے ہیں کہ بصرہ کا ایک رئیس ایک روز اپنے باغ میں گیا تو اس کی نگاہ اپنے کسان (باغبان) کی عورت پر پڑ گئی اور اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا، چنانچہ اس کے خاوند کو کسی کام پر بھیج دیا اور عورت سے کہا کہ تمام دروازے بند کر دو" عورت نے کہا باقی سب دروازے تو بند کر دوں لیکن ایک دروازہ میں بند کرنے کی سکت نہیں رکھتی" اس نے پوچھا" وہ کون سا دروازہ ہے؟ عورت نے جواباً کہا وہ دروازہ جو ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے یہ سن کر رئیس شرمسار ہوا اور توبہ کی۔

حکایت:۔ حاتم اصم (اللہ ان سے راضی ہو) نے فرمایا کہ "میں نے چار علم حاصل کر کے باقی تمام علوم دنیا سے نجات پائی ہے لوگوں نے سوال کیا" وہ چار علم کونسے ہیں؟ فرمایا پہلا یہ کہ میں نے جان لیا کہ میرا رزق جو مقدر ہو چکا ہے اور اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی لہذا میں زیادہ کی جستجو سے بے فکر ہو گیا ہوں" دوسرا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ خدا کا مجھ پر حق ہے جسے میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا لہذا میں اس کی ادائیگی مین مشغول ہوں۔ اور تیسرا یہ کہ مجھے ایک تلاش کرنے والا (یعنی موت) ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ لہذا میں نے اس کی تیاری کر لی ہے (یعنی نیک اعمال کرتا ہوں) اور چوتھا یہ کہ میں نے جان لیا ہے کہ میرا ایک مالک ہے جو میرے تمام احوال سے واقف ہے لہذا مین اس سے شرم کرتا ہوں

اور ایسے کاموں سے اجتناب کرتا ہوں جن سے اس نے منع کیا ہے کیونکہ بندہ جب یہ جانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے تو وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گا جو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے اسے شرمندگی وندامت سے دوچار کر دے۔

تیسری فصل

علم وشریعت:۔ بندہ کو احکام الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کا علم ضرور ہونا چاہئے، اور انسان پر علوم وقت کا حصول بھی فرض ہے۔ اور جو علم بوقت ضرورت کام آتا ہے اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن! اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم اصول اور دوسری علم فروع، علم اصول کا ظاہر کلمہ شہادت ہے اور باطن معرفت الٰہی کی تحقیق! اور علم فروع کا ظاہر دینی معاملات کو عمل میں لانا اور باطن نیت (عقیدے) کا درست کرنا۔ لیکن یہ لازم وملزوم ہیں" ان میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے کے بغیر محال ہے۔ حقیقت کا ظاہر باطن کے بغیر منافقت ہے اور اس کا باطن ظاہر کے بغیر زندقہ (بے دینی) ہے۔ اور شریعت کا ظاہر، باطن کے بغیر نقصان اور باطن ظاہر کے بغیر محض ہوس ہے۔---- پس علم حقیقت تین ارکان پر مشتمل ہے (پہلا) ذات الٰہی اس کی واحدانیت اور اس سے تشبیہہ کی نفی کا علم (دوسرا) اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام کا علم (تیسرا) اللہ تعالیٰ کے افعال اور ان کی حکمت کا علم"

اور علم شریعت کے بھی تین ارکان ہیں (اول) کتاب الٰہی کا علم (دوم) سنت نبوی علیہ التحیہ والسلام کا علم (سوم) اجماع امت کا علم۔

اور خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے افعال کو ثابت کرنے کا علم ضروری ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (جان لو! کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) نیز یہ ارشاد "وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ" (جان لو! کہ اللہ ہی تمہارا آقا اور مالک ہے) نیز یہ فرمان اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ (کیا آپ

نے اپنے پروردگار کی طرف نہیں دیکھا کہ اس نے سائے کو کس طرح پھیلایا ہے اور یہ ارشاد ربانی اَفَلاَ یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ''(کیا یہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح عجیب وغریب پیدا کیا گیا ہے اور اسی طرح کی اور بہت سی آئتیں جو افعال الٰہی میں غور وتدبر کرنے کی دعوت دیتی ہیں تا کہ تم ان سے فاعل (حقیقی) کی صفات کو پہچان سکو۔۔۔اور نیز رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے مَنْ عَلِمَ اَنَّ اللّٰہَ رَبُّہ' وَاَنَا نبیُّہ' حَرَمَ اللّٰہُ لَحْمَہٗ وَدَمَہ' النار ''جس نے جان لیا کہ اللہ اس کا پروردگار اور میں اللہ کا نبی ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس کا گوشت اور خون دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، لیکن علم ذات الٰہی کے لئے شرط یہ ہے کہ عاقل، بالغ انسان یہ خوب جان لے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود موجود ہے قدیم ہے نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا، نہ اس کے ۔ ت ہے نہ مکان، اس کی ذات ہر نقصان سے پاک ہے مخلوق میں اس جیسا کوئی نہیں۔ نہ اس کی بیوی ہے نہ بچے اور جو کچھ تمہارے وہم وگمان اور تصور میں آتا ہے اس کا پیدا کرنے والا قائم رکھنے والا اور مالک صرف وہی ہے۔ جیسا کہ اس کا فرمان لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْر ''(کوئی چیز اس کی مانند نہیں اور وہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے) لیکن صفات الٰہی کے علم کے لئے شرط یہ ہے کہ تو جان لے کہ اس کی صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور دائمی وابدی ہیں جیسا کہ علم قدرت، حیات، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور بقا...... چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اِنَّہ' عَلِیْم'' بِذَاتِ الصُّدُوْر ''(بلاشبہ وہ سینوں کے راز جاننے والا ہے) نیز فرمایا فَعَّال'' لِمَا یُرِیدِ (وہ جو چاہے کرنے والا ہے) نیز فرمایا وَھُوَ الْحَیُّ لَا اِلٰہَ اِلاَّ ھُوَ'' وہی ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں) نیز ارشاد فرمایا قَوْلُہُ الْحَقُّ وَلَہُ الْمُلْکُ اس کا فرمان حق اور اس کی حکومت ہے)

باقی اس کے افعال کے اثبات کا علم یہ ہے کہ تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کو اور اس کے افعال کو پیدا کرنے والا ہے۔ چنانچہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وَاللّٰہُ

خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (اور اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو بھی تمام جہان کو (عدم سے) وجود دینے والا وہی ہے۔ خیر و شر کا اندازہ کرنے اور نفع و نقصان کو پیدا کرنے والا وہی ہے اسی لئے اس نے فرمایا اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْئٍ (اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے)۔

اور احکام شریعت کے اثبات کی دلیل یہ ہے کہ تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے پاس خارق عادت معجزے لے کر آئے اور ہمارے رسول محمد ﷺ حق ہیں اور ان کے معجزے بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ ظاہری اور پوشیدہ امور کے متعلق انہوں نے ہمیں خبر دی وہ سب کچھ حق ہے۔

شریعت کا پہلا رکن کتاب (قرآن مجید) ہے جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا فِیْہِ اٰیَات" مُحْکَمَات" ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰب (اس قرآن میں محکم آیتیں ہیں (جن کا مطلب ظاہر ہے وہی کتاب کا اصل ہیں) اور دوسرا رکن سنت نبویؐ ہے جیسا کہ فرمایا "وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمہیں روکیں رک جاؤ!) اور تیسرا رکن اجماع امت ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے لَاتَجْتَمِعُ اُمَّتِی عَلَی الضَّلَالَۃِ عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِالْاَعْظَمِ (میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی تم پر لازم ہے کہ (اہل حق علماء کی) سب سے بڑی جماعت کی پیروی کرو۔ غرضیکہ حقیقت کے احکام بہت زیادہ ہیں اگر کوئی شخص ان سب کو جمع کرنا چاہے تو ہرگز نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ اللہ عزاسمہ کے لطائف کی کوئی انتہا نہیں۔

چوتھی فصل

سوفسطائیہ کا مذہب:۔ جان لو کہ ملحدوں کا ایک گروہ "اللہ ان پر لعنت کرے" جنہیں سوفسطائیہ کہا جاتا ہے "ان کا مذہب یہ ہے کہ" کسی چیز کا صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا حتی کہ کسی کو اپنی ذات کا بھی علم حاصل نہیں" ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ یہ علم کہ کسی چیز کا علم صحیح

طور پر حاصل نہیں ہوسکتا'' صحیح ہے یا نہیں؟ اگر وہ جواب دیں کہ ''صحیح ہے'' تو گویا انہوں نے علم کو خود ثابت کر دیا۔ اور اگر وہ جواب دیں کہ ''صحیح نہیں'' تو جو بات صحیح ہی نہ ہو اس کو حق کے معارضہ و مقابلہ میں پیش کرنا محال ہے اور ایسے شخص کے ساتھ گفتگو کرنا عقلمندی نہیں......

اور ملحدوں کا ایک اور گروہ ہے جو اسی طریق تصوف سے تعلق رکھتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ہمارا علم کسی چیز میں درست نہیں لہٰذا اس علم کو ثابت کرنے کی بجائے اس کو ترک کر دینا ہمارے لئے زیادہ بہتر ہے لیکن ان کا یہ قول ان کی حماقت اور جہالت پر مبنی ہے کیونکہ علم کا ترک دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو علم کی وجہ سے ہوگا یا جہالت کی وجہ سے...... اگر علم کی وجہ سے ہے تو (سمجھ لو کہ) علم نہ تو علم کی نفی کرتا ہے اور نہ ہی اس کی ضد ہوتا ہے پس علم کے ہوتے ہوئے علم کا ترک نفی ہی نہیں۔ باقی رہ گئی جہالت تو یہ طے شدہ بات ہے کہ علم کی نفی جہالت ہے اور علم کا ترک بھی جہالت تو جاہل تو بہر حال قابل مذلت ہوگا اور جہالت تو کفر اور باطل کا قرینہ ہے کیونکہ حق کا جہالت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ جہالت و ترک علم تمام صوفیہ و مشائخ کے عقیدہ کے خلاف ہے اور جب تمام لوگوں نے ملحدین کا یہ قول سنا تو اس پر عمل کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اہل تصوف کا یہی مذہب اور یہی روش ہے چنانچہ صوفیا کے متعلق ان کا اعتقاد تشویش کا شکار ہو گیا اور وہ لوگ حق اور باطل میں تمیز نہ کر سکے اس لئے ہم نے ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔ تا کہ وہ اپنی گمراہی میں مبتلا رہیں۔ اگر دین ان کا گریبان پکڑتا تو اس سے بہتر راہ عمل اختیار کرتے۔ اور دین کی رعایت کو یوں ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور دوستان حق کو اس نگاہ سے نہ دیکھتے اور اپنے اوقات عزیز کو اس سے بہتر طور پر گزارتے اگر ملحدین کے کسی گروہ نے اولیائے کرام کے ساتھ اس طرح کا تعلق قائم کر لیا ہے کہ صوفیا کی نیک سیرتی کی بدولت انہیں اپنی دنیوی مصیبتوں سے نجات مل جائے اور ان کی عزت کے زیر سایہ (امن و عافیت کی) زندگی بسر کرتے رہیں تو ان کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ تمام اولیاء کرام کو ملحدوں پر قیاس کریں اور ان کے معاملہ میں بے فائدہ جھگڑوں میں مبتلا ہو

کر ان کی عزت کو پاؤں تلے روندتے پھریں...... میرا (یعنی علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کا) ایک مرتبہ مدعیان علم میں سے ایک ایسے شخص کے ساتھ مناظرہ ہوا جس نے کلاہ غرور کا نام عزت، نفسانی خواہشات کی اتباع کا نام سنت رسول ﷺ اور شیطان کی موافقت کا نام ائمہ شریعت کی سیرت رکھا ہوا تھا۔ دوران مناظرہ اس نے کہا کہ ملحدین کی بارہ جماعتیں ہیں ان میں سے ایک اہل تصوف کی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر ایک جماعت صوفیاء کی ہے تو باقی گیارہ گروہ تم لوگوں میں سے ہیں۔ تاہم اہل تصوف صرف ایک جماعت ہو کر بھی جس طرح اپنی حفاظت کر سکتے ہیں تم گیارہ گروہ ہو کر بھی اس طرح اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ سب خرابیاں اہل زمانہ کی دین سے غفلت اور اس دور میں پیدا ہونے والے ان فتنوں کا فطری نتیجہ ہے جو اس وقت برپا ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں (اولیاء) کو ہمیشہ ان لوگوں کے درمیان پوشیدہ اور دنیا میں ان لوگوں کو اولیاء سے دور رکھا ہے۔ پیروں کے پیر اور مریدوں کے آفتاب (حضرت علی بن بندار رحمتہ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ فَسَادُ الْقُلُوْبُ عَلٰی حَسْبِ فَسَادِ الزَّمَانِ وَاَھْلِہٖ (دلوں کی خرابی زمانہ اور اہل زمانہ کی خرابی کے مطابق ہوتی ہے)

اب ہم ان صوفیائے کرام کے اقوال پر مشتمل ایک فصل بیان کرتے ہیں تاکہ اس گروہ کے منکرین میں ایسے شخص کو تو تنبیہہ ہو جائے جس کے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی سچی مہربانیوں کی نعمت آئی ہو۔ اور توفیق تو اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

پانچویں فصل

اقوال صوفیاء۔ محمد بن فضل بلخی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد ہے اَلْعِلْم ثَلَاثَۃٌ "عَلم" مِنَ اللّٰہِ وَ عِلم" بِاللّٰہِ (علم کی تین قسمیں ہیں ا۔ وہ علم جو اللہ کی طرف سے عطا ہو، (۲) وہ علم جو اللہ کی معیت میں حاصل ہو، (۳) وہ علم جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق ہو)

علم باللہ وہ معرفت کا علم ہے کہ تمام انبیاء اولیاء نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو اسی کے ذریعہ پہچانا ہے اور جب تک خود ذات خداوندی کی طرف سے انہیں اس معرفت کی توفیق عطا نہیں ہوئی یہ پہچان بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ علم و اکتساب کے تمام اسباب و ذرائع حق تعالیٰ کی ذات وصفات سے منقطع (مختلف) ہیں اور بندے کا علم حق تعالیٰ کی معرفت کا سبب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کی معرفت کا سبب بھی خود اس کی رہنمائی اور بندہ کو اس کے آگاہ کرنے کے بغیر ممکن نہیں۔

اور علم من اللہ، شریعت مطہرہ کا علم ہے کہ اس کی طرف سے ہمیں نیک اعمال کا حکم دینا اور ان کو بجالانے کی ہمت تاکید کرنا ہے۔

اور علم مع اللہ حق کے مقامات اس کے طریق اور اولیاء کرام کے درجات کو بیان کرنے کا علم ہے بس علم شریعت کو قبول کئے بغیر معرفت الٰہی کا حصول نہیں ہوسکتا اور شریعت پر عمل کرنا مقامات حق کے اظہار کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

اور ابوعلی ثقفی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''اَلْعِلْمُ حَیَاتُ الْقَلْبِ مِنَ الْجَهْلِ وَنُوْرُ الْعَیْنِ مِنَ الظُّلْمَةِ'' جہالت کی موت سے دل کے زندہ ہونے اور ظلمت کفر سے ایمان کی آنکھ کے روشن ہونے کا نام علم ہے) جس شخص کو معرفت خداوندی کا علم حاصل نہیں اس کا دل جہالت کے باعث مردہ ہے اور جس کو شریعت کا علم حاصل نہیں اس کا دل جہالت کی بیماری میں مبتلا ہے پس کافروں کا دل مردہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے ناواقف ہیں اور اہل غفلت کا دل بیمار ہے کہ وہ اس کے احکام سے بے خبر ہے۔

اور ابوبکر وراق ترمذی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''مَنِ اکْتَفٰی مِنَ الْعِلْمِ دُوْنَ الزُّهْدِ قَدْ تَزَنْدَقَ وَمَنِ اکْتَفٰی بِالْفِقْهِ دُوْنَ الْوَرَعِ فَقَدْ تَفَسَّقَ'' (جو شخص علم کلام (توحید الٰہی) کی صرف عبارات پر ہی اکتفا کرتا ہے اور زہد وتقویٰ اختیار نہیں کرتا وہ زندیق (بے دین) ہے اور جو شخص پرہیزگاری اپنائے بغیر شریعت اور علم فقہ پر اکتفا کر لیتا

ہے وہ فاسق ہو جاتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ مجاہدہ وعمل کے بغیر توحید الٰہی کا اقرار جبر[1] ہے اور حقیقی موحد وہ ہوتا ہے جو قول میں جبری اور عمل میں قدری[2] ہوتا کہ اس کا طرز عمل جبر و قدر کے درمیان ہو جائے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو اس پیر نے بیان کی ہے (اللہ اس پر رحمت کرے) "التَوحِیدُ دُونَ الجبرِ وَفَوقَ القدرِ" (توحید کا عقیدہ نظریہ جبر سے نیچے اور نظریہ قدر سے اوپر ہے یعنی دونوں کے درمیان پس جو شخص عمل کو اختیار کئے بغیر محض علم توحید کی عبادت پر اکتفا کرتا ہے اور اس کے مخالف امور سے اجتناب نہیں کرتا وہ ضرور بے دین ہو جاتا ہے لیکن علم فقہ میں ہر برائی سے اجتناب شرط ہے اور جو شخص بغیر پرہیز گاری صرف ظاہری علم فقہ وشریعت حاصل کرے، احکام کی تاویلوں میں مصروف رہے اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہو اور سہولت حاصل کرنے کے لئے مذہب کی پرواہ کئے بغیر مجتہدین کے اقوال کی تلاش میں لگا رہے۔ وہ بہت جلد فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ غفلت کے باعث سامنے آتا ہے۔

اور شیخ المشائخ حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ کہ "اِجْتَنِبْ صُحْبَةَ ثَلاثَةِ اَصْنَافٍ مِّنَ النَّاسِ العلماءِ الغَافِلِيْنَ و الفقراءِ المُداهِنِيْنَ وَالمَتَصَوفَةِ الجاهِلَين" (تین قسم کے لوگوں کی صحبت سے بچو! غافل علما خوشامدی فقیروں اور جاہل صوفیوں کی صحبت سے)

غافل علما وہ ہیں جنہوں نے دنیا کو دل کا قبلہ بنا لیا ہے اور شریعت کے آسان امور کو اختیار کر کے ظالم بادشاہوں کی پرستش کو اپنا وطیرہ اور ان کے درباروں کو اپنے لئے طواف گاہ بنا لیا ہے۔ لوگوں کی نگاہ التفات حاصل کرنے کو اپنا محراب بنا کر غرور اور اپنی دانائی پر فریفتہ اور اپنے کلام کی باریکیوں میں محو ہو گئے ہیں (نیز) دین کے آئمہ اور اساتذہ

[1] جبریہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کا ہر فعل محض خدا کی تقدیر کے ماتحت ہے۔
[2] قدریہ۔ وہ گروہ ہے جس کا عقیدہ ہے کہ ہر کام انسان محض اپنی ذاتی قدرت سے انجام دیتا ہے۔

کے معاملہ میں لعن وطعن کی زبان دراز کر کے دین کے بزرگوں کی گستاخیاں کرتے ہیں۔ کلام کی زیادتی اور مبالغہ آمیزی میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ اگر دونوں جہاں (کی خوبیاں) ترازو کے پلڑے میں رکھ دیئے جائیں تو ان کی نگاہ میں ان کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی کیونکہ انہوں نے کینہ اور حسد کو ہی اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ غرضیکہ درحقیقت یہ لوگ علم سے خالی ہیں کیوں کہ علم تو ایک ایسی صفت ہے کہ جس کو حاصل کرنے والا ہر قسم کی جہالت کی باتوں سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

اور خوشامدی و چاپلوس فقیر وہ ہیں کہ جب کوئی انسان ان کی خواہش کے مطابق کام کرے تو وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اگرچہ وہ کام باطل ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی شخص ان کی خواہش کے خلاف کوئی کام کرے تو وہ اس فعل کی وجہ سے اس کی مذمت کرتے ہیں خواہ وہ کام حق ہی کیوں نہ ہو۔ اور لوگوں سے اپنے برتاؤ اور اپنے اعمال کی وجہ سے طمع کرتے ہیں کہ انہیں کوئی بلند مرتبہ مل جائے۔ اور خدا کی مخلوق کو باطل امور اور نافرمانی کے کاموں کی تلقین کرتے ہیں۔

اور جاہل صوفی وہ ہیں۔ جو نہ تو کسی مرشد کی صحبت میں رہیں نہ کسی بزرگ سے آداب سیکھیں اور نہ زمانہ کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ بس اپنی کور باطنی کے باعث نیلا (فقیرانہ) لباس زیب تن کر کے اپنے آپ کو لوگوں میں ڈال دیا ہے اور اپنی بے عزتی پر اظہار مسرت کرتے ہیں اور اپنی حماقت کے باعث سب لوگوں کو اپنے جیسا سمجھتے ہیں لہذا حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے کی راہیں ان پر مخفی رہتی ہیں۔ پس یہ تینوں گروہ جن کا اس توفیق یافتہ مرشد نے ذکر کیا اور اپنے مریدوں کو ان کی صحبت سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں گروہ اپنے دعوائے تصوف میں جھوٹے اور اپنے طریق میں ناپسندیدہ ہیں۔

اور حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں "عَمِلْتَ فِی المجاھدۃِ ثَلٰثِیْنَ

فَمَا وَجدتُ شَيئًا اَشَدَّ عَلَيّ مِنَ العلمِ وَمتَابعتِه "(میں تیس سال مجاہدے میں مصروف رہا ہوں لیکن علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے زیادہ کسی چیز کو اپنے لئے مشکل و دشوار نہیں پایا) الغرض طبیعت کے لئے آگ پر پاؤں رکھنا علم کے مطابق چلنے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اور جاہل کے لئے علم کا ایک مسئلہ سیکھنے سے پل صراط سے ہزار بار گزرنا زیادہ آسان ہے اور فاسق کے لئے علم کے ایک مسئلہ پر عمل کرنے کی بجائے دوزخ میں رہنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ پس تمہارے لئے لازم ہے کہ علم حاصل کرو اور پھر اس کو درجہ کمال تک پہنچاؤ اور بندہ کے علم کا کمال بھی علم الٰہی کے مقابلہ میں جہالت ہی ہے (لہذا اس سے متعلق) تمہیں اس قدر جاننا چاہئے کہ تم کچھ نہیں جانتے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ تو سوائے علم بندگی کے کچھ بھی نہیں جانتا اور بندگی ہی خدا اور بندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب ہے اور اسی مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

العجز عن ورکَ الاِدْراکِ اِدرَاکٌ"

وَالوَقَفُ فِی طَرِیْقِ الجَھْلِ اِشراکٌ"

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز و درماندہ ہونا ہی اس کی حقیقت کا ادراک ہے اور جہالت کی راہ میں ٹھہر جانا شرک ہے۔ یعنی جو شخص علم سیکھنے کی بجائے اپنی جہالت پر مصر رہے وہ مشرک ہے۔ اور جو سیکھتا ہے اور پھر کمال علم کی وجہ سے اس پر حقیقت کا ظہور ہو جاتا اور علم کا غرور اس سے دور ہو جاتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ معرفت الٰہی میں اس کا علم، عاجزی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ حقائق کی معرفت کے سلسلہ میں وہمی معلومات کا قطعاً اعتبار نہیں ہوتا، یہ عجز ہی اس کے لئے دریافت اور علم کی حقیقت سے واقفیت ہے۔

دوسرا باب

فقر

فقر اور اس کا مقام:۔ جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درویشی کو عظیم رتبہ اور درویشوں کو بلند مقام حاصل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (صدقات) "ان فقیروں کا حق ہیں جو اللہ کی راہ میں محصور کر دیئے گئے ہوں کہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے، ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے جاہل ان کو غنی سمجھتا ہے) اور نیز فرمایا ہے" ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ (اللہ نے ایک ایسے عبد مملوک کی مثال بیان کی ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں) اور یہ بھی فرمایا ہے" تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (ان کے پہلو خواب گاہوں (بچھونوں) سے الگ رہتے ہیں اور وہ خوف اور امید کی حالت میں اپنے رب کو پکارتے ہیں) اور رسول اللہ ﷺ نے بھی فقر کو پسند کیا اور فرمایا۔ ہے اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ (اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ مسکینی کی حالت میں وفات دے اور قیامت کے روز مجھے مسکینوں کے گروہ میں اٹھا) نیز آپ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ اُوْتُوْا اِمْنِیْ اَحِبَّائِیْ فَیَقُوْلُ الْمَلٰئِکَۃُ مَنْ اَحِبَّائُکَ فَیَقُوْلُ اللّٰہُ اَلْفُقَرَاءُ وَالْمَسَاکِیْنُ "(اے میرے دوستو! میرے قریب ہو جاؤ! فرشتے عرض کریں گے۔ اے اللہ آپ کے دوست کون ہیں؟ تو اللہ فرمائیں گے فقیر اور مسکین لوگ) اور اس مضمون کی آیات اور احادیث بہت سی ہیں اور اس حد تک مشہور ہیں کہ اثبات فقر میں بطور دلیل ان کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں) اور رسول اللہ ﷺ کے دور میں ایسے کئی مہاجر درویش موجود تھے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت و متابعت کے

شوق میں مسجد نبویؐ میں بیٹھے رہتے تھے اور انہوں نے دنیا کے تمام مشاغل کو ترک کر دیا تھا اور اپنی روزی کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کئے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کی صحبت اور ان کا حق ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا **اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَه**" (اے پیغمبرؐ! جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ کیجئے) اور نیز فرمایا **وَلَا تَعْدُ عَیْنَاکَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا** (اے نبیؐ! آپ ان فقراء سے آنکھیں نہ پھیریئے کیا آپ دنیاوی زندگی کی شان و شوکت کے طالب ہیں؟) یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ان میں سے کسی کو جہاں دیکھ لیتے تو فرماتے "میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں کہ ان کے واسطے میرے اللہ نے مجھے تاکید فرمائی ہے" پس اللہ تعالیٰ نے فقر کو بڑا بلند رتبہ اور درجہ عطا کیا ہے اور فقراء کو اس درجہ کے ساتھ مخصوص کیا ہے کیونکہ ان فقراء نے دنیا کے ظاہری و باطنی ہر قسم کے اسباب کو چھوڑ کر پوری طرح اسباب کو پیدا کرنے والے (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کر لیا ہے یہاں تک کہ ان کا فقر ان کے لئے فخر بن گیا کہ وہ اس کے چلے جانے پر نالاں و آبدیدہ اور اس کے آ جانے پر مسرور و خوش ہو گئے اور ان کو اس طرح سینے کے ساتھ لگا لیا کہ اس کے لوازم کے سوا ہر چیز کو ذلیل و خوار سمجھا۔

تاہم فقر کی ایک رسم ہے اور ایک حقیقت اس کی رسم (بظاہر) افلاس اور اضطرار ہے اور حقیقت خوش نصیبی اور اختیار ہے جس کسی نے صرف رسم کو اپنایا اور اس پر قناعت کر لی اور اسے مقصود حاصل نہ ہوا تو وہ حقیقت سے دور بھاگنے لگا۔ لیکن جس نے حقیقت کو پا لیا اس نے تمام موجودات سے منہ موڑ لیا اور کل (ذات خداوندی) کی رویت میں فنا ہو کر بقائے کل کی طرف پیش قدمی کی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے **مَنْ لَمْ یُعْرِفْ سِوٰی رَسْمِهٖ لَمْ یَسْمَعْ سِوٰی اِسْمِهٖ** (جو شخص فقر کی ظاہری علامت "رسم" کے سوا کچھ نہیں جانتا وہ اس کے اسم (نام) کے علاوہ کچھ نہیں سنتا) پس فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور نہ اسے اپنی

کسی چیز میں خلل ونقصان کا خدشہ ہو۔ وہ نہ تو دنیوی اسباب کے موجود ہونے سے غنی ہوتا ہے اور نہ ان کے نہ ہونے سے اس کا محتاج ہوتا ہے اس کے فقر کے نزدیک اسباب کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے، بلکہ اگر وہ ان اسباب کے نہ ہونے پر خوش ہو تو جائز ہے کیونکہ مشائخ نے کہا ہے کہ درویش جس قدر تنگ دست ہوا تنا ہی وہ خوش حال ہوتا ہے کہ اسباب کا وجود درویش کے لئے بہت برا ہے یہاں تک کہ جس قدر وہ کسی چیز کے لئے اپنے دروازے بند نہیں کرے گا اسی قدر اس پر گرفتار رہے گا پس اولیاء اللہ کی زندگی مخفی عنایات اور اسرار کے ساتھ قرب حق میں زیادہ بہتر ہے نہ کہ بیوفا اسباب دنیا کے ساتھ جو فاجروں (بدکاروں) کا گھر ہے پس دنیا کا ساز وسامان رضا الٰہی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

حکایت:۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش کی کسی بادشاہ سے ملاقات ہوگئی۔ بادشاہ نے فقیر سے کہا "تمہیں اگر کوئی حاجت درپیش ہے مجھ سے مانگ فقیر نے جواب دیا کہ! میں اپنے غلاموں کے غلام سے کوئی چیز طلب نہیں کرتا۔ بادشاہ نے کہا یہ کیسے ہے؟ درویش نے کہا حرص دنیا اور اس کی آرزو یہ دونوں میرے غلام ہیں۔ لیکن یہ دونوں آپ کے آقا ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اَلْفَقْرُ عِزٌ "لاھلِہٖ (فقر درویشوں کے لئے عزت ہے) پس جو چیز اپنے مستحق کے لئے باعث عزت ہے۔ وہی چیز نااہل کے لئے باعث ذلت ہوتی ہے اور فقر کی عزت اس میں ہے کہ اس کے اعضا لغزشوں سے اور اس کا حال ہر قسم کے خلل سے محفوظ ہو نہ اس کا جسم لغزش ومعصیت سے ملوث ہو اور نہ ہی اس کے دل وجان آفت زدہ ہوں کیونکہ اس کا ظاہری حال ظاہری نعمتوں میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کا باطن روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کا جسم روحانی اور اس کا دل ربانی ہو جاتا ہے اور مخلوق کو اس کے ساتھ کوئی تعلق اور نسل آدم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں رہتا کیونکہ وہ نہ تو مخلوق سے تعلق اور لگاؤ کی وجہ سے فقیر ہوتا ہے اور نہ ہی اس دنیا کی مال ودولت سے غنی ہوتا ہے بلکہ دونوں جہاں اس کے فقر کے ترازو کے پلہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے

اوراس کی ایک سانس بھی دونوں جہاں کی وسعتوں میں نہیں سما سکتی۔

دوسری فصل

فضیلت فقر و غنا اور مشائخ کا اختلاف:۔ فقر و غنا کی فضیلت میں مشائخ صوفیاء کا اختلاف ہے کہ ان دونوں صفات میں سے کون سی صفت زیادہ فضیلت کی حامل ہے چونکہ اللہ تعالیٰ غنی حقیقی ہے اور تمام صفات میں سے اس کی صفات کو کمال حاصل ہے اس لئے یحییٰ بن معاذ رازی احمد بن ابی الحواری، حارث المحاسبی، ابوالعباس ابن عطا، رویم بن محمد، ابوالحسن بن شمعون اور متاخرین میں سے شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المہینی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین سب اس پر متفق ہیں کہ غنا کو فقر پر فضیلت حاصل ہے اور اس کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ غنا صفت الٰہی ہے (جو پاک اور بلند و بالا ہے) اور اس کی ذات پر فقر کا اطلاق کرنا جائز نہیں۔ پس کسی ولی میں ایسی صفت جو خدا اور بندہ کے درمیان مشترک ہو وہ اس صفت سے اعلیٰ و افضل ہوتی ہے جس کی نسبت ذات حق تعالیٰ کی طرف کرنا جائز نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں بندہ اور خدا کے درمیان یہ اشتراک صرف رسمی ہے معنوی نہیں کیونکہ باہمی مماثلت کے بغیر معنوی اشتراک نہیں ہو سکتا لہذا چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات قدیم اور مخلوق کی صفات حادث ہیں اس لئے یہ دلیل باطل ہے۔ اور میں علی بن عثمان جلابی رحمتہ اللہ علیہ یہ کہتا ہوں کہ غنا کا نام صرف ذات خداوندی کے ہی لائق ہے اور مخلوق اس نام کی مستحق نہیں اور مخلوق کے لئے فقر کا نام ہی سزاوار ہے اور حق تعالیٰ پر اس کا اطلاق ناجائز ہے اور یہ جو کسی کو مجازی طور پر غنی کہہ دیا جاتا ہے تو اس طرح وہ حقیقی غنی نہیں بن سکتا۔ نیز اس سے زیادہ واضح دلیل یہ ہے کہ ہمارا غنا تو اسباب کا محتاج ہے اور ہم ان اسباب کو قبول کرتے ہیں لہذا ہم مسبب ہیں اور حق تعالیٰ اسباب کے پیدا کرنے والے ہیں لہذا ان کا غنا حقیقی ہے اور اسباب کا محتاج نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان اشتراک بالکل باطل ہے اور نیز جب حق تعالیٰ کی

ذات میں کسی کی شرکت جائز نہیں۔تو صفت میں کس طرح کسی کا اشتراک جائز ہوگا اور جب صفت میں اشتراک نہیں ہوسکتا تو اسم میں بھی اشتراک جائز نہ ہوگا۔ باقی رہ گیا صرف نام رکھنا سو نام تو خدا اور مخلوق کے درمیان ایک علامت ہوتا ہے اور اس کی کوئی حد نہیں، پس خدا تعالیٰ کا غنا یہ ہے کہ اس کو کسی کی ضرورت نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کوئی اس کے ارادے کو ٹالنے والا اور اس کی قدرت کو روکنے والا نہیں وہ موجودات کو بدلنے اور ان کی اضداد پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ہمیشہ اس صفت غنا سے متصف ہے اور ہمیشہ اس سے متصف رہے گا...... لیکن مخلوق کا غنا، اسباب زندگی کے حصول یا خوشی حاصل ہونے یا کسی مصیبت سے نجات پانے یا کسی چیز کے مشاہدہ سے آرام پانے کی وجہ سے ہوا کرتا ہے اور یہ سب باتیں حادث اور تغیر پذیر ہیں جستجو و حیرت کا سرمایہ اور عاجزی و ذلت کا محل ہیں۔ پس غنا کا اسم بندہ کے لئے مجازی اور حق تعالیٰ کے لئے حقیقی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے یَاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ (اے لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ ہی غنی، حمد و ثنا کا سزاوار ہے) نیز اس نے فرمایا ہے وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ (اللہ ہی غنی ہے اور تم محتاج ہو) عام لوگوں کے ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک دولت مند کو درویش پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں خوش بخت پیدا کیا ہے اور اس پر تونگری کا احسان فرمایا ہے۔ اس گروہ کے ہاں غنا سے دنیا کی کثرت۔ انسانی مقصود کا حصول اور شہوت پرستی مراد ہے اور اس پر بطور دلیل یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے غنا پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا اور فقر پر صبر کا حکم فرمایا ہے پس صبر مصیبت پر اور شکر نعمت پر ہوتا ہے اور نعمت مصیبت سے افضل ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نعمت پر شکر کا حکم نعمت پر اضافے کا موجب بنایا گیا ہے لیکن فقر پر صبر کو قرب الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اور شکر کو نعمت کی زیادتی کا سبب قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے لَئِنْ

شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ (اگرتم شکر کرو گے تو تمہارے لئے نعمت پر اضافہ کر دوں گا) جو شخص کسی نعمت پر کہ جس کی اصل غفلت ہے شکر کرے گا اس کی غفلت پر ہم غفلت کا اضافہ کر دیں گے اور جو شخص فقر میں کہ اس کی اصل مصیبت ہے صبر کا مظاہرہ کرے گا ہم اس کے قرب میں اور اضافہ فرمادیں گے۔ تاہم جس غناء کو صوفیا کرام فقر سے افضل کہتے ہیں وہ غنا نعمتوں کا پانا نہیں جیسا کہ عوام الناس سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ تو منعم حقیقی (خداوند تعالیٰ) کو پالینا ہے۔ پس منعم حقیقی کا پالینا الگ چیز ہے اور غفلت کا پالینا دوسری چیز ہے۔ شیخ ابوسعیدؒ فرماتے ہیں اَلْفَقْرُ هُوَ الْغِنَاءُ بِاللّٰه (اللہ تعالیٰ کے ساتھ غنی ہونے کا نام فقر ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدہ سے ہمیشہ کے لئے کشف حاصل ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ کشف کے ذریعہ حق کا مشاہدہ کرنے والے پر دوبارہ حجاب آ جانا ممکن ہے یعنی اگر یہ حجاب مشاہدہ کرنے والوں کو مشاہدہ حق سے محجوب کر دے تو کیا وہ مشاہدہ کا ضرورت مند ہو گا یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ وہ محتاج نہیں ہوگا یہ تو بالکل محال ہے اور اگر کہیں کہ وہ محتاج ہو گا تو ہم کہتے ہیں کہ جب اسے احتیاج لاحق ہوئی تو غنا جاتا رہا اس لئے فقر کی یہ تعریف درست ہوئی) اور نیز غنا باللہ صرف اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کی صفات کو دوام اور مقصد کو بقا حاصل ہو اور اوصاف انسانی پر غنا کا اطلاق درست ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ذاتی طور پر غنا کے قابل ہی نہیں۔ اس لئے کہ بشریت کا وجود ہی ضرورت و نیاز کا پیکر ہے اور احتیاج حادث ہونے کی علامت ہے لہذا غنی وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی صفت کو بقا حاصل ہو۔ اور جس کی صفت فنا ہونے والی ہو اس پر اس اسم کا اطلاق صحیح نہیں پس اَلْغَنِیُّ مَنْ اَغْنَاهُ اللّٰه (غنی وہی ہے جس کو اللہ غنی کرے) لہذا اغنی باللہ کی صورت میں فاعل بندہ ہو گا۔ لیکن مَنْ اَغْنَاہ اللّٰه کی صورت میں بندہ مفعول ہو گا اور فاعل بذات خود قائم ہوتا ہے لیکن مفعول کا وجود فاعل کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔

پس اپنی ذات کے ساتھ قائم ہونا صفت بشریت کا ثابت کرنا ہے اور قائم بحق

ہوتا بندہ کی صفت کا محو کرنا ہے (پہلی صورت غلط اور دوسری صحیح) اور میں علی بن عثمان جلابیؒ (اللہ تعالیٰ مجھے توفیق بخشے) کہتا ہوں کہ جب بندگی میں یہ بات درست ہے۔ کہ درحقیقت صفت بقا پر غنا کا اطلاق صحیح نہیں کیوں کہ دلائل مذکورہ سے آدمی کی صفت کا بقا محل علت اور سبب آفت ہوتا ہے اور صفت کا فنا خود غنا نہیں ہوسکتا کیونکہ جو چیز بذات خود باقی نہ ہو اس کا کوئی نام نہیں رکھا کرتے۔ پس غنا کا نام فنائے صفت رکھنا چاہئے اور جب صفت فانی ہوئی تو نام کا محل بھی باقی نہ رہا۔ غرض صفت غنا ذات حق سے متجاوز نہیں ہو سکتی اور صفت فقر بندہ سے متجاوز نہیں ہوسکتی لہذا بندہ پر نہ تو فقر کے اسم کا اطلاق ہوسکتا ہے نہ غنا کا۔

پھر جملہ مشائخ صوفیہ اور علما کی اکثریت فقر کو غنا پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ کہ قرآن سنت اس کی فضیلت پر ناطق ہیں اور امت کی اکثریت بھی اس پر متفق ہے۔ میں نے حکایات میں پایا ہے کہ حضرت جنیدؒ اور ابن عطا کے درمیان ایک دن اس مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ ابن عطاؒ نے اغنیاء کو افضل قرار دیا اور دلیل یہ پیش کی کہ اللہ تعالیٰ ان سے براہ راست حساب لیں گے۔ اور براہ راست حساب میں بلاواسطہ کلام محل عتاب میں ہوتا ہے اور عتاب تو دوست کی طرف سے دوست کو ہی ہوتا ہے لہذا غنی اللہ کے دوست اور فقیر سے افضل ہوئے) حضرت جنیدؒ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ غنی لوگوں سے حساب لیں گے تو فقیروں سے عذر چاہیں گے اور عذر حساب سے افضل ہوتا ہے اور یہاں ایک عجیب لطیفہ ہے کہ محبت کے معاملات میں عذر بیگانگی ہوتا ہے اور عتاب کرنا مخالفت اور دوست تو محبت کے اس مقام پر ہوتے ہیں کہ یہ دونوں چیزیں دوستانہ تعلقات میں ان کے لئے آفت اور مصیبت معلوم ہوئی ہیں۔ کیونکہ عذر نہ تو دوست کے کسی فرمان میں کوتاہی کے سبب ہوتا ہے اور دوست جب اپنا حق مانگتا ہے تو وہ عذر کرتا ہے اور عتاب، دوست کا حکم بجالانے میں قصور کی وجہ سے ہوتا ہے اس وقت دوست اس قصور پر عتاب کرتا ہے اور یہ دونوں امر محال ہیں۔ بےشک مطالبہ دونوں سے ہوتا ہے۔ فقیروں سے صبر کا اور امیروں سے شکر کا۔ لیکن دوستی میں

نہ تو دوست دوسرے دوست سے کچھ طلب کرتا ہے اور نہ ہی دوست اپنے دوست کے فرمان سے روگردانی کرتا ہے۔ کہتے ہیں ظَلَمَ مَنْ سَمّٰی ابن اٰمِیْرً اسمیرًا وَقَد سَمَّاہُ رَبُّہٗ فـقـیـراً (جس نے ابن آدم کا نام امیر رکھا اس نے ظلم کیا کیونکہ اللہ نے اس کا نام فقیر رکھا ہے) یعنی جس کا نام حق تعالیٰ نے فقیر رکھا وہ فقیر ہی ہے اگر چہ بظاہر وہ امیر ہی کیوں نہ ہو۔ ہلاک ہوا وہ شخص جس نے سمجھا کہ وہ امیر نہیں اگر چہ اس کی نشست گاہ تخت وسریر ہے۔ کیونکہ اغنیا صاحب صدقہ ہوتے ہیں اور فقرا صاحب صدق، اور صاحب صدق ہرگز (درجہ میں) صاحب صدقہ کی طرح (کم تر) نہیں ہوسکتا۔ پس درحقیقت سلیمان علیہ السلام کا فقر سلیمان علیہ السلام کے غنا کی طرح ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے انتہائی صبر کی وجہ سے انہیں ''نعم العبد'' (وہ بہت ہی اچھا بندہ ہے) فرمایا ہے اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کی حکومت کے درست ہونے پر انہیں ''نعم العبد'' فرمایا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگئی تو سلیمان علیہ السلام کے فقر کو ان کے غنا کی طرح کردیا۔

حکایت:۔ مصنف فرماتے ہیں کہ میں نے استاد ابوالقاسم قشیریؒ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ مردان حق نے فقر اور غنا کے متعلق کلام کیا ہے اور ہر ایک نے ان میں سے ایک بات اپنے لئے اختیار کر لی ہے لیکن میں اپنے لئے اس چیز کو اختیار کرتا ہوں جس کو اللہ تعالیٰ میرے لئے پسند فرمائیں اور مجھے اس میں بحفاظت رکھیں۔ اگر وہ مجھے دولت مند کریں تو میں غفلت شعار نہ ہو جاؤں اور اگر درویش بنا دیں تو لالچی اور روگرداں نہ بن جاؤں۔ پس غنا نعمت ہے اور غفلت اس میں آفت ہے اور فقر نعمت ہے اور کفر و حرص اس میں آفت ہے۔ اور فقر و غنا کے بارے میں یہ تمام باتیں اختلاف روش کے باوجود اچھی ہیں تاہم غور سے دیکھا جائے تو ماسوائے حق سے دل کا فارغ ہونا فقر ہے اور غیر اللہ میں دل کے مشغول ہونے کا نام غنا ہے جب ماسوی اللہ سے فراغت حاصل ہوگئی تو نہ فقر غنا سے بہتر ہوا، اور نہ

غنا فقر سے برتر ہوا۔ غنا کثرت متاع اور فقر قلت مال کا نام نہیں کیونکہ سامان دنیا سب اللہ تعالیٰ کی ہی ملکیت ہے۔ جب طالب حق نے ملکیت کو ترک کر دیا تو درمیان سے شرکت رفع ہوگئی اور وہ دونوں (فقر اور غنا) ناموں سے فارغ ہوگیا۔

تیسری فصل

مشائخ کے اقوال:۔ مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے فقر اور غنا کے متعلق اپنے اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے اور میں اس کتاب میں انشاء اللہ حتی الامکان ان کے اقوال بیان کروں گا۔

چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ کا ارشاد ہے "لَیْسَ الفقیر مَنْ خَلَا مِنْ الزَادِ اِنَّمَا الفقیر مَنْ خَلَا مِنَ المرادِ" (فقیر وہ نہیں جو دنیا کے ساز و سامان سے خالی ہاتھ ہو بلکہ وہ ہے جس کی طبیعت مراد سے خالی ہو) چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ اسے مال عطا فرمائیں اور اس کی مراد مال کی حفاظت ہو تب بھی وہ غنی ہے اور اگر اس کی مراد ترک مال ہو تو بھی وہ غنی ہی ہے کیونکہ یہ دونوں غیر کی ملک میں تصرف کی ہی صورتیں ہیں لیکن فقر تو مال کی حفاظت اور تصرف دونوں کے ترک کر دینے کا نام ہے۔

یحییٰ بن معاذ رازیؒ فرماتے ہیں کہ عَلَامَةُ الفقرِ خوفُ الفقر" (فقر کی علامت یہ ہے کہ بندہ ولایت کے کمال اور قیام مشاہدہ کی صفت زائل ہو جانے اور حق سے دور ہو جانے سے ڈرتا رہے) غرضیکہ اس کمال تک پہنچ جائے کہ اس سے جدا ہونے سے ڈرتا رہے۔ رویم بن محمد رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "مِن لُعْتِ الفقرِ حفظُ سِرِہٖ وَحَیَانَةُ نفسِہٖ وَادَاءُ فریضتِہٖ (فقر کی تعریف یہ ہے کہ فقیر اپنے باطن کی حفاظت کرے اپنے نفس کو دنیوی اغراض سے بچائے رکھے اور جو احکام اس پر فرض ہیں انہیں ادا کرتا رہے) چنانچہ جو کچھ اس کے باطن پر گزرے اس کے اظہار میں مشغول نہ ہو اور جو کچھ اس کے جسم پر گزرے باطن کو اس میں مشغول نہ کرے اور دل پر ہونے والی واردات کا غلبہ فرض کی ادائیگی سے

مانع نہ ہو اور درحقیقت یہ بشریت کے زائل ہونے کی علامت ہے کہ بندہ پوری طرح حق کے موافق ہو جائے اور یہ بات بھی صرف حق تعالیٰ کی توفیق سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ **اَفضَلُ المقامَاتِ اعتقَاد الصبُر علی الفقر** (سب سے افضل مقام، فقر پر صبر کا اعتقاد کرنا ہے) یہ درویش پر دائمی صبر کا اعتقاد کرنا بندہ کے لئے مقامات قرب میں سے سب سے افضل مقام ہے۔ پس درویشی پر صبر کا اعتقاد کرنا اعمال وافعال کی بربادی اور اوصاف کے فنا ہونے کی علامت ہے۔ تاہم اس قول کے ظاہری معنی ہیں "فقر کو غنا پر فضیلت دینا اور اس بات کا اعتقاد کرنا کہ طریق فقر سے ہرگز روگردانی نہ کروں گا۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ **الفَقِیر مَنُ لایَسُتغُنی بشیٔ دُوُنَ اللّٰهِ** (فقیر وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز سے بھی مطمئن نہیں ہوتا) یعنی فقیر اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی چیز سے آرام نہیں پاتا کیونکہ اس کی ذات کے علاوہ اس کا کوئی مقصود ومطلوب نہیں ہوتا اس لفظ کا ظاہری معنی یہ ہے کہ اس کی ذات کے علاوہ کسی چیز سے تو غنا اور تونگری حاصل نہیں کرسکتا۔ جب تو نے اس کو پالیا تو غنی ہوگیا۔ پس تیری ہستی حق تعالیٰ کے سوا ہے اور جب تونگری اس کے سوا (دنیا اور اس کے اسباب) کو ترک کئے بغیر حاصل نہیں کرسکتا تو (اس کا مطلب یہ ہے کہ) تو خود تونگری کا حجاب ہوا اور جب تک تو راہ سے اٹھ نہ جائے تو نگر کس طرح ہوسکتا ہے اور اہل حقیقت کے نزدیک یہ بات انتہائی باریک اور لطیف ہے اور اس قول حقیقی کا مفہوم یہ ہے کہ "**الفَقِیرُ اَنُ لا یَسُتَغنِی عَنهُ** (فقیر وہ ہے جو ذات حق سے کبھی مستغنی نہ ہو) یعنی فقیر وہ ہے جسے کبھی غنا حاصل نہ ہو۔ اور یہی وہ بات ہے جو اس پیر یعنی خواجہ عبداللہ انصاریؒ نے فرمائی ہے کہ "ہمارا غم ابدی ہے نہ ہماری ہمت ہرگز مقصود کو پاتی ہے اور نہ ہماری کلیت (حقیقت بشری) دنیا اور آخرت میں فنا ہوتی ہے اس لئے کہ کسی چیز کے حصول کے لئے اس کا ہم جنس ہونا ضروری ہے اور حق تعالیٰ کی ذات بشریت کی ہم جنس نہیں اور اس کے ذکر سے روگردانی غفلت ہے اور درویش غافل نہیں ہوتا۔ پس یہ ایک دائمی

آزمائش ہوگئی اور راستہ دشوار گزار ہے کیونکہ دوستی اس ذات کے ساتھ ہے جس کے دیدار کے لئے انسانی کوشش کو کوئی راہ نہیں اور اس کا وصال خلقت کی قدرت سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ماسوی کوئی چیز بقا اختیار نہیں کرسکتی اور ذات حق تعالیٰ کی بقاء میں کوئی تغیر جائز نہیں۔ فانی کبھی باقی نہیں ہوسکتا کہ ''مجانست کی وجہ سے وصل حاصل ہو جائے اور نہ باقی کبھی فانی ہوسکتا ہے کہ قرب حاصل ہو جائے۔ لہذا اولیاء اللہ کا کام سراسر دشوار اور محنت طلب ہے۔ پس لوگوں نے دل کی تسلی کے لئے ایک مضمون بنا سنوار رکھا ہے اور جان کے آرام کے لئے مقامات، منزلیں اور ان کے راستے بنا رکھے ہیں اور ان کے حصول کے لئے خود بخود خوبصورت عبارتیں تیار کر لی ہیں اور ان کے مقامات متعین کر لئے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو مخلوق کے اوصاف و احوال سے منزہ ہیں۔

اور ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نَعتُ الفَقِیر السَکُوتُ عِندَالقَدَمِ والبذل عندَالوجُودِ وقَال ایضًا الاضطِوابُ عَندَالوجود (فقیر کی صفت یہ ہے کہ چیز کی عدم موجودگی میں خاموش رہے اور موجودگی کی صورت میں اسے خرچ کرے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس چیز کے موجود ہونے کی صورت میں بیقرار رہے) یعنی فقیر جب کچھ نہ پائے تو خاموشی اختیار کرے اور جب پائے تو دوسروں کو اپنے اوپر فوقیت دے اور ان پر خرچ کرے۔ پس بڑی عظمت کا حامل کام یہ ہے کہ جس کو خوراک کی ضرورت ہو اور یہ مطلوب (خوارک) اسے میسر نہ ہو تو مطمئن رہے اور جب وہ مطلوب حاصل ہو جائے تو اس کو دے دے جسے وہ اپنی ذات سے زیادہ اس کا مستحق (ضرورت مند) سمجھتا ہے اور اس قول کے دو معنی ہیں۔

ایک یہ کہ نعمت دنیا کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر راضی اور مطمئن رہنا اور نعمت کے موجود ہونے کی صورت میں دوسروں پر خرچ کرنا یہ محبت الٰہی ہے اس لئے کہ راضی بہ رضا کا مطلب ہے کہ فرمانبرداری قبول کرنے والا، اور فرمانبرداری قرب الٰہی کی علامت ہے اور محبِ نعمت کا ترک کرنے والا ہوتا ہے کیونکہ نعمت دنیا میں فرقت

کی علامت موجود ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ نعمت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں سکون قلب، نعمت کے عدم انتظار کا نام ہے اور جب وہ نعمت موجود ہو تو چونکہ وہ ذات حق کا غیر ہے اور فقیر کو غیر اللہ کے ساتھ آرام نہیں اس لئے وہ اس کو ترک کر دے اور شیخ المشائخ ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید رحمۃ اللہ علیہ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے جو انہوں نے فرمایا کہ الفَقْرُ خلق القَلْبِ عَنِالَاشکالِ (دل کے ماسوا اللہ کی صورتوں سے خالی ہونے کا نام فقر ہے) جب اس کا دل ماسوا اللہ کے اندیشہ سے خالی ہو تو ماسویٰ اللہ کی جتنی شکلیں ہیں۔ انہیں باہر ہی پھینک دینا چاہئے۔

شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''اَلفَقرُ بَحرُ البَلاءِ وَبَلائہُ کُلُہ' عِز'' (درویشی مصیبت کا دریا ہے اور اس کی تمام مصیبتیں عزت ہیں) اور (حقیقی) عزت فقر کا یہی حصہ ہے کیونکہ فقیر عین مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اس کو غیر کی کیا خبر! یہاں تک کہ جب وہ مصیبت سے توجہ ہٹا کر مصیبت میں مبتلا کرنے والے (حق تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی مصیبت اس کے لئے عین عزت بن جاتی ہے اور اس کی عزت قربت، اس کی قربت محبت اور اس کی محبت سب مشاہدہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ طالب کا دماغ غلط خیال کی وجہ دیدار کا محل بن جاتا ہے کہ بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے۔ پس عزت والا بندہ وہ ہے جو دوست کی مصیبت کا بوجھ برداشت کرے کیونکہ بلا، حقیقت میں عزت اور نعمت حقیقت میں ذلت ہوتی ہے اس لئے کہ عزت وہ ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر کر دے اور ذلت وہ ہے جو اس کو وہاں سے غائب کر دے اور فقر کی آزمائش حضور حق کا اور غنا کی راحت اس سے دوری کا نشان ہے۔ پس بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے والا عزیز اور اس سے غائب ہونے والا ذلیل ہے اور وہ آزمائش جس کا مطلب مشاہدہ اور دیدار محبت ہو اس کے ساتھ جس طرح بھی تعلق حاصل ہو غنیمت ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''یَامَعشَرَ الفقَراءِ اِنَّکُم تُعرَفُونَ بِاللّٰہِ

وَتُکْرَمُوْنَ لِلّٰہِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَکُوْنُوْا مَعَ اللّٰہِ اِذَا خَلَوْتُمْ بِہٖ "(اے فقراء کے گروہ! تم اللہ کے واسطے سے پہچانے جاتے ہو اور اللہ کے لئے تمہاری عزت کی جاتی ہے پس دیکھو کہ خلوت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے) یعنی جب لوگ تمہیں درویش کہتے اللہ کے واسطے سے تمہیں پہچانتے، تمہاری عزت وتکریم کرتے اور تمہارے حقوق بجالاتے ہیں تو تمہیں غور کرنا چاہئے کہ تم درویشی کے حقوق کہاں تک پورے کر رہے ہو اور اگر لوگ تمہارے دعوے کے برعکس کسی اور نام سے پکاریں تو تمہیں ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس صورت میں تم نے بھی اپنے دعوے کا حق ادا نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ سب سے کمینہ وہ انسان ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ سمجھیں لیکن خود وہ اس کا بندہ نہ ہو۔ اور وہ انسان اچھا ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ سمجھیں اور وہ واقع میں بھی اس کا بندہ ہے لیکن سب سے عزت والا انسان وہ ہے جسے لوگ اللہ کا بندہ نہ سمجھیں لیکن حقیقت میں وہ اللہ کا بندہ ہو۔ جس شخص کو لوگ بندہ خدا سمجھیں لیکن وہ ایسا نہ ہو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو طبیب ہونے کا مدعی ہو۔ لوگوں کا علاج بھی کرے لیکن اس کی حالت یہ ہو کہ اسے کسی چیز کا علم نہ ہو اور وہ لوگوں کو اور زیادہ بیمار کر دے اور جب کبھی خود بیمار ہو جائے تو اپنا علاج نہ کر سکے اور دوسرے طبیب کا محتاج ہو۔ اور جس شخص کو لوگ بندہ خدا سمجھیں اور وہ ایسا ہی ہو اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو طبیب ہونے کا دعویدار ہو، لوگوں کا علاج بھی کرے اور جب خود بیمار ہو جائے تو اپنا علاج بھی خود کرے اسے کسی دوسرے طبیب کی ضرورت نہ ہو۔ اور جس شخص کو لوگ بندہ حق نہ سمجھیں لیکن حقیقت میں وہ بندہ خدا ہو اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو طبیب ہو اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہو اور وہ عوام میں مشغول ہونے سے فارغ ہو اپنے آپ کو موافق غذاؤں فرحت بخش شربتوں اور معتدل ہواؤں سے صحت مند رکھتا ہے تا کہ بیمار نہ ہو جائے حالانکہ لوگوں کی آنکھیں اس کے حال سے بند ہیں اور بعض متاخرین نے کہا ہے کہ "اَلْفَقْرُ عَدَمٌ بِلَا وُجُوْدٍ" (فقر، عدم بلا وجود ہے) اس قول کا معنی بیان نہیں کیا جا

سکتا کیونکہ معدوم، کوئی چیز نہیں ہوتا اور کسی چیز کے بغیر غیر چیز کی تعبیر نہیں کی جا سکتی پس یہاں صورت یہ ہوگی کہ فقر کوئی چیز نہیں اور تمام اولیاء اللہ کی عبارتیں اور ان کا اجتماع کسی اصول پر مبنی نہیں۔ کیونکہ فقر اپنی ذات میں فانی اور معدوم ہے اور یہاں اس عبارت میں نہ تو عین (ذات فقر) کا عدم مراد لیتے ہیں کہ عین سے آفت کا عدم مراد لیں اور آدمی کے تمام اوصاف آفت ہی ہیں جب آفت کی نفی ہوئی تو یہ صفت کا فنا ہوا اور صفت کا فنا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور اس تک نہ پہنچنے کو ان کے سامنے سے رفع کر دینا اور ان کی روش کے مخالف کو یہی چیز نفی عین معلوم ہوتی ہے اور انہیں ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اور میں نے متکلمین کی ایک جماعت کو دیکھا ہے کہ وہ اس معنی کی باریکیاں معلوم نہیں کر پائے اور اس پر ہنستے اور کہتے ہیں کہ یہ بات معقول نہیں اور میں نے دعویٰ کرنے والے ایک اور گروہ کو دیکھا ہے جو عقل میں نہ ہونے والی اس بات کو قبول کر کے اس پر اعتماد کئے ہوئے ہے۔ لیکن اصل کیفیت سے بے علم نہ ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ "الفقر عدم" بلاوجود۔ کہ فقر لاشئی محض ہے اس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں ان میں سے ایک تو اپنی جہالت کی وجہ سے حق تعالیٰ کا منکر ہو گیا اور دوسرے گروہ نے جہل کو حال بنا لیا ہے اور اسی میں مست ہو گیا ہے اور طبقہ صوفیا کی عبارات میں عدم اور فنا سے مراد بہرے اسباب اور بری صفات سے کنارہ کش ہونا اور عمدہ پاکیزہ صفات کا طالب ہونا ہے یہ نہیں کہ طلب کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی عدم سے عدم ذات مراد لیا جائے۔ الغرض درویش فقر کے جملہ معانی سے خالی اور اس کے تمام اسباب سے بیگانہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسرار ربانی کی گزرگاہ ہوتا ہے جب تک اس کے معاملات خود اس کے کسب سے سرزد ہوتے ہیں تو ان کی نسبت خود اسی کی طرف کی جاتی ہے اور جب اس کے امور اس کے کسب کے حال سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ فعل کی نسبت بھی اس سے منقطع ہو جاتی ہے اس وقت اس پر جو بھی حالت گزرتی ہے وہ نہ اس کے اپنے ارادے سے آتی ہے اور نہ اس کے ارادے سے جاتی

ہے۔ وہ کسی چیز کو خود اپنے اوپر نہ وارد کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے دور کر سکتا ہے کیونکہ یہ تمام حالات عین ذات حق کی طرف سے ہوتے ہیں خود اس کی علامت بن جاتے ہیں۔

میں نے متکلمین کا ایک ایسا گروہ بھی دیکھا ہے جو نفی وجود کو ہی عین فقر تصور کرتا ہے اور یہ ان کے اپنے کمال کی نفی ہے اور یہ بات انتہائی عجیب معلوم ہوتی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ عین فقر میں فقر کی نفی سے ہو سکتا ہے ان کی مراد صفت کی نفی ہو کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ طلب حقیقت کی نفی کو فقر وصفوت کا نام دیتے ہیں اور نفسانی خواہشات کا اثبات ان کے نزدیک نفی کل ہے گویا ان میں سے ہر شخص فقر کے حجابوں سے کسی ایک درجے پر رکا ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہی بات اس کے کمال ولایت کی علامت ہے اور اس بات کی محبت اور اس کا ارادہ تمام غائتوں کی غایت ہے۔ گویا ان کی محبت محل کمال کی محبت ہے۔ پس اس بات کے طالب کے لئے ان کی راہ پر چلنے۔ ان کے مقامات طے کرنے اور ان کی عبادات کے سمجھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تا کہ وہ محل خواص میں عام نہ رہیں کیونکہ جو عوام خواص کے بارے میں کچھ نہیں جانتے وہ اصول سے اعراض کرتے ہیں اور جو عوام فرع سے واقف نہیں وہ فروع سے روگردانی کرتے ہیں۔ جو کوئی فروع سے منہ موڑتا ہے اس کا تعلق اصول سے ہوتا ہے لیکن جو اصولوں سے ہی ناواقف ہو تو کہیں بھی اس کا ٹھکانہ نہیں ہوتا اور یہ تمام باتیں میں نے اس لئے یہاں بیان کر دی ہیں تا کہ تم ان حقائق کے معانی کو اچھی طرح سمجھ لو اور ان کی رعایت کرتے ہوئے ان کی راہ اختیار کرو اور ان کی حفاظت میں مشغول رہو...... اب میں اس جماعت صوفیاء کے چند اصول و رموز اور تصوف کے باب میں ان کے بعض اشارات کی وضاحت کرتا ہوں۔ اس کے بعد ان مردان حق کے اسما گرامی کا ذکر کروں گا۔ اس کے بعد مشائخ صوفیہ کا اختلاف مذاہب بیان کروں گا اور اس کے بعد حتی الامکان ان کے مقامات کے آداب و رموز بیان کروں گا تا کہ تجھ پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر اس تصوف کی حقیقت منکشف ہو جائے۔

تیسرا باب

فصل اول

تصوف کے بیان میں

اللہ عزوجل نے فرمایا ہے "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا " (رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے ہم کلام ہوتے لگتے ہیں تو وہ کہتے سلام ہے) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "مَنْ سَمِعَ صَوْتَ اَهْلِ التصوفِ فَلَایُوْ مِنَ عَلٰی دعائهم کُتِبَ عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الغافِلِین " (جو شخص اہل تصوف کی آواز سنے اور ان کی پکار پر یقین نہ کرے اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ غافلوں میں لکھا جاتا ہے) لوگوں نے اس اسم تصوف کی تحقیق میں بہت سی باتیں کہی ہیں اور متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ صوفی کو صوف کا لباس زیب تن کرنے کی وجہ سے صوفی کہا جاتا ہے ایک اور گروہ یہ کہتا ہے کہ صوفی کو اس لئے صوفی کہتے ہیں کہ وہ (قرب) الٰہی کی) صف میں ہوتا ہے۔ ایک گروہ کے مطابق اس کو اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ محبت و تعلق کی وجہ سے صوفی کہا جاتا ہے اور ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ اسم لفظ صفا سے مشتق ہے۔

ہر کسی کے نزدیک تصوف کے معنی کی تحقیق میں بہت سے لطائف ہیں۔ لیکن لغت کے اعتبار سے اس کا مفہوم ان معانی سے دور ہو جاتا ہے۔ پس صفا تمام چیزوں میں قابل تعریف ہے اور اس کی ضد کدورت ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "ذَهَبَ صَفْرُ الدُّنْیَا وَبَقِیَ کَدْرُهَا " (دنیا کی صفائی چلی گئی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی) اور کسی چیز کے لطائف و خوبی کا نام اس کی صفائی و پاکیزگی ہے، پس چونکہ اس قصہ (تصوف) والوں نے اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب (درست) کر لیا ہے اور اپنی طبیعت کا آفات سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے اس لئے ان کو صوفی کہتے ہیں اور یہ نام ان لوگوں کا "اسم علم"

ہے اس لئے کہ ان کا حق اس سے زیادہ و بزرگ ہے کہ ان کے معاملات کو مخفی رکھا جا سکے یہاں تک کہ (وصفی معنی پر دلالت کے لئے) ان کے اسم کے لئے بھی کسی ایسے مادہ سے ہی مشتق ہونا چاہئے (جس سے یہ مقصد حاصل ہو جائے) اور اس دور میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کو تصوف اور اہل تصوف سے حجاب میں رکھا ہے اور اس تصوف کی لطافت کو ان کے دلوں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک گروہ کا خیال یہ ہو گیا کہ اس کام میں صرف ظاہری احوال کی اصلاح ہے باطن کا مشاہدہ موجود نہیں اور ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ صوفی صرف ایک اسم ہے جس کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں یہاں تک کہ بیہودہ لوگوں کی دیکھا دیکھی ظاہر بین علماء نے بھی اس طریق تصوف کی اہلیت کا انکار کر دیا ہے اور اس حال کے حجاب ہی سے خوش ہو گئے ہیں حتیٰ کہ عوام نے ان کی تقلید کرتے ہوئے صفائی باطن کی طلب کو دل سے مٹا دیا ہے اور سلف و صحابہؓ کے مذہب کو بالائے طاق رکھ دیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ امام الصوفیاء

اِنَّ الصَفَا صفَةُ الصدیق! اِن اردت صوفیاً عَلَی التحقیق

ترجمہ:۔ اگر تم حقیقی صوفی بننا چاہتے ہو (تو تمہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پیروی کرنا ہوگی) کیونکہ بلاشبہ صفائے باطن حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صفت ہے اس لئے کہ صفائے باطن کی ایک اصل ہے اور ایک فرع! اس کی اصل دل کے اعتبار سے منقطع ہونا اور اس کی فرع بے وفا دنیا سے دل کا خالی ہونا ہے اور یہ دونوں چیزیں حضرت ابوبکر صدیق اکبر عبداللہ بن ابی قحافہؓ کی صفات ہیں۔ اس لئے کہ اہل طریقت کے امام وہی تھے اور ان کے دل کے غیر اللہ سے منقطع ہونے کا یہ عالم تھا کہ جب تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضرت علی اور مکان مصطفیٰ میں تشریف لے جاتے (وفات پا جانے) سے شکستہ دل ہو چکے تھے حتیٰ کہ حضرت عمرؓ تلوار کھینچے کہہ رہے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ پیغمبر ﷺ

فوت ہو گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔اس وقت صدیق اکبرؓ باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے فرمایا **الا مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحمداً فَاِنَّ مُحَمداً قدفَاتَ وَمَنْ عَبدَ ربَّ محمدٍ فانہ' حیی لایموت** (لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا پس (اس کے معبود) محمد ﷺ پر تو موت واقع ہو گئی اور جو شخص محمد ﷺ کے پروردگار کی عبادت کرتا تھا۔ تو وہ رب تو زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا) پھر آپؓ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی ''**وَمَا مُحَمَّد**'' **اِلَّا رَسُوْل**'' **قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْقُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ** ''(محمد ﷺ اللہ کے ایک رسول ہی تو ہیں۔ آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم دین سے ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟) یعنی جس شخص کے معبود محمد ﷺ تھے اس کا معبود تو چل بسا اور جو خدائے محمد ﷺ کی پوجا کرتا تھا اس کا معبود زندہ ہے ہرگز نہیں مرے گا اور جس آدمی نے فانی چیز کے ساتھ دل لگالیا تو فانی تو یقیناً فنا ہو جاتی ہے اور اس کے فنا ہو جانے پر اسے رنج والم حاصل ہو گا اور جس نے ہمیشہ باقی رہنے والے کے حضور اپنی جان سپرد کر دی تو جب اس کا نفس فنا ہو جاتا اور روح کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے تو وہ (اس کے باوجود) بقائے دوام سے باقی رہتا ہے پس جس نے حضرت محمد ﷺ کی ذات کو چشم آدمیت سے دیکھا جب وہ اس دنیا سے رحلت فرما گئے تو اس کے دل سے محمد ﷺ کی تعظیم بھی اٹھ گئی اور جس شخص نے آپ کی ذات کو چشم حقیقت سے دیکھا اس کے لئے حضور ﷺ کا اس دنیا میں رہنا اور اس دنیا سے تشریف لے جانا دونوں امر برابر ہیں کیونکہ اس نے حالت بقاء میں آپ کی بقا کو بواسطہ حق سبحانہ اور حالت فنا میں آپ کی فنا کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی سمجھا اور وہ ''محول'' تبدیل کئے ہوئے جسم (اقدس) سے اعراض کر کے ''محول'' (تبدیل کرنے والے حق تعالیٰ) کی طرف متوجہ ہوا۔ محول کا قیام محول کے واسطہ سے دیکھا اور اکرام حق کی مقدار آپ کی تعظیم کی نہ کسی مخلوق میں اپنا دل لگایا اور نہ اپنی نگاہ کسی مخلوق پر ڈالی کیونکہ شعر

مَنْ نَظَرَ اِلَی الخَلَقِ هَلَکَ وَمَنْ رَجَعَ اِلَی الحقِ مَلَکَ

ترجمہ:۔(جس نے مخلوق کی طرف نگاہ ڈالی وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا وہ فرشتہ بن گیا) یعنی مخلوق پر نظر رکھنا ہلاکت کی اور رجوع الی الحق فرشتہ ہونے کی علامت ہے۔

اور حضرت صدیق اکبرؓ کے دل کا دنیائے غدار سے خالی ہونے کا عالم یہ تھا کہ مال۔اسباب اور غلاموں میں سے جو کچھ آپ کے پاس تھا راہ حق میں دے دیا اور خود ایک گدڑی پہن کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پیغمبر ﷺ نے پوچھا ''مَاخَلَفْتَ لَعِیَالِکَ فقالَ اللّٰهُ وَرَسُوله ''(تم نے اپنے مال واسباب میں سے اہل وعیال کے لئے پیچھے کیا چھوڑا ہے؟ انہوں نے عرض کی ''دو بیش بہا خزانے چھوڑ آیا ہوں'' حضور ﷺ نے سوال کیا وہ کیا ہیں؟ عرض کی ایک اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوسری رسول اللہ ﷺ کی متابعت) جب ان کا دل دنیا کی خوبصورتی کے تعلق سے آزاد ہو گیا۔ تو انہوں نے اس کی کدورت سے اپنے ہاتھ کو بھی خالی کر دیا اور ایک صوفی صادق کی یہی صفت ہوتی ہے اور ان باتوں کا انکار حق سے انکار اور مکابرہ (ایک دوسرے پر بڑائی ظاہر کرنا) ہے اور میں کہتا ہوں کہ صفا کدر کی ضد ہے اور کدر بشری صفات میں سے ہے۔ پس فی الحقیقت صوفی وہ ہے جو کدورت بشریٰ سے (کنارہ کش ہو کر) آگے نکل گیا ہو۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے مشاہدہ اور ان کے حسن و جمال میں استغراق کی وجہ مصر کی عورتوں کی بشریت ان پر غالب ہو گئی تھی۔ لیکن جب اس غلبہ سے یہ بشریت سے گزر کر فنا بشریت پر جا کر ٹھہریں تو بے اختیار پکار اٹھیں ما ھذا بشراً (یہ کوئی بشر تو نہیں) انہوں نے نشانہ تو حضرت یوسف علیہ السلام کو بنایا لیکن اپنی حالت کا بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ طریقت رحمہم اللہ نے فرمایا ہے کہ ''لَیْسَ الصَفَا من صِفَاتِ البَشرِ لاَنَّ البشر مَدَر'' والمدر لا یخلوا مِنَ الکدرِ'' (صفائے باطن اوصاف بشریت میں سے نہیں کیونکہ بشر پیکر خاکی ہے اور وجود خاکی

کدورت سے خالی نہیں ہوسکتا) یعنی صفائے باطنی پیکر خاکی کی صفات میں سے نہیں کیونکہ خاک کا مدار کدورت کے بغیر نہیں (اس لئے) بشر کدورت سے نکل نہیں سکتا پس صفاء باطن کی مثال افعال سے بیان نہیں کی جاسکتی اور مجاہدات کی وجہ سے بشریت کو زوال نہیں ہوسکتا بلکہ صفت صفا کو احوال وافعال سے کوئی نسبت ہی نہیں اور نہ ہی اس کے اسم کا ظاہری اسماء و القاب سے کوئی تعلق ہے" **الصفا صفة الاحباب وَهُمْ شموس" بلاسحاب** "(صفائے باطن اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی صفت ہے اور وہ سورج ہیں جن پر بادل کا حجاب نہیں ہے) چونکہ صفا باطن اللہ کے دوستوں کی صفت ہے اس لئے دوست وہی ہے جو اپنی صفت سے فانی اور دوستوں کی صفت سے باقی ہے اور ایسے اولیاء اللہ کے احوال اہل حال پر روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ نے حبیب خدا حضرت محمد مصطفیؐ سے حضرت حارثہؓ کے بارے میں پوچھا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے" **عبد" نَوَّر اللّٰهُ قَلْبَه بالایمانْ** "وہ ایک ایسا بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے نور ایمان سے منور کر دیا ہے) یہاں تک کہ اس کا چہرہ اس نور ایمان کی تاثیر سے چاند کی طرح روشن اور اس کا وجود نور ربانی سے منور ہے۔ اہل طریقت میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں" **ضیاءُ الشمسِ وَالقمرِ اِذاشْتَرَ کَا نمُوْدِج" مِنْ صفاء الحُبِّ وَالتوحِیْدِ اِذَا اشْتَبَکَا** "(سورج اور چاند کی روشنی جب آپس میں مشترک ہو جائے تو وہ توحید اور محبت خداوندی کی صفائی کا نمونہ ہے جب یہ دونوں باہم مل جائیں) بلکہ چاند اور سورج کی روشنی کی اللہ حیار کی توحید اور محبت کے نور کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے کہ اس کی اس کے ساتھ نسبت کی جائے لیکن دنیا میں تو ان دو آنکھوں کے نور سے زیادہ ظاہر کوئی نور نہیں کہ جن کی رسائی صرف آسمان پر جلوہ نما چاند اور سورج تک ہی ہے لیکن توحید، معرفت اور محبت کے نور سے منور دل کے ذریعہ ہم عرش رحمان بلکہ امور عقبیٰ پر بھی اس دنیا میں ہی مطلع ہو سکتے ہیں۔ اہل طریقت کے تمام مشائخ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بندہ مقامات کی قید سے آزاد، احوال کی کدورت سے خالی

اور تغیر و تبدل کے مقام سے بری ہو جائے اور تمام پسندیدہ احوال سے موصوف ہو جائے اور پھر تمام اوصاف سے جدا ہو جائے یعنی بندہ کے دل میں اپنی کوئی صفت محمود نظر نہ آئے۔ نہ اس کی طرف دھیان دے اور نہ اس پر مغرور ہو اور اس کا حال ادراک عقول سے مخفی ہو اور اس کا وقت شکوک و ظن کے تصرف سے پاک ہو جائے تو اس وقت نہ حضور حق سے اس کی حاضر منقطع ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے وجود کے لئے ظاہری اسباب کی ضرورت باقی رہتی ہے "لِاَنَّ الصَّفا حضور" بلا ذهاب دوجود بلا اسباب "(بلاشبہ صفائے باطن بارگاہ الٰہی میں ایسی حاضری ہے جس پر کبھی زوال نہیں اور ایسا وجود ہے جو اپنے قیام میں ظاہری اسباب کا محتاج نہیں) یعنی وہ بارگاہ الٰہی کا ایسا حاضر ہوتا ہے جو کبھی غائب نہیں ہوتا اور ایسا موجود ہوتا جس کا وجود اسباب پر موقوف نہیں کیونکہ جس جگہ غیبت کا وقوع ہو جائے وہاں حاضری باقی نہیں رہتی اور جس کا وجود اسباب و ذرائع کا محتاج ہو وہ واجد نہیں کہلا سکتا۔ اور جب وہ اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو دنیا و آخرت میں فانی ہو جاتا ہے اور انسانیت کی روش میں ربانی ہو جاتا ہے اس وقت سونا اور مٹی کا ڈھیلا اس کے نزدیک برابر ہو جاتا ہے اور احکام شریعت میں سے جن امور کی حفاظت اور بجا آوری دوسری مخلوق پر دشوار ہوتی ہے وہ اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔

حضرت حارثؓ کا ایمان: ۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے پوچھا "کَیفَ اَصبَحتَ یَا حارثه" اے حارثہ تو نے صبح کیسے کی؟ "قَالَ اَصبَحتُ مُومِنًا بِاللّٰهِ حَقاً" انہوں نے عرض کی میں نے ایسے حال میں صبح کی کہ میں اللہ پر سچا ایمان رکھنے والا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اُنظُرُ ماتقولُ یَا حَارِثه اِنَّ لِکُلِّ شِیٔ حَقِیقَة" فَمَا حَقِیقَةُ ایمانِکَ" "اے حارثہ اپنے قول پر غور کر کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے پس تو بتا تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ حضرت حارثہؓ نے جواباً عرض کی "عَزَلتُ نفسی عن الدنیا فاستویٰ عندیٰ

حَجُرھَا وَذھَبھَا وَنفتھَا وَمَدرھَا فَاسھَرتُ لَیلی وَاظمَاف نَھارِی حَی حیرتُ کَانّی اَنظُر اِلی عَرشِ رَبّی بَارِزاً وَکَانِی اَنظُر الی اھل الجنۃِ یَتزاوَرُون فِیھَا وَکَانّی اَنظُرُ اِلی اَھْلِ النَارِ یَتصَارَعُونَ وَفِی رَوَایۃِ یَتعَاوَرُونَ ''میں نے اپنے نفس کو دنیا سے الگ کر لیا اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے پتھر اور سونا اور چاندی اور مٹی کا ڈھیلا میرے نزدیک سب برابر ہیں۔ پس میں رات کو بیدار اور دن کو روشن رہتا ہوں یہاں تک کہ میری حالت یہ ہوگئی ہے کہ گویا میں اپنے پروردگار کے عرش کو اپنے سامنے کھلا دیکھ رہا ہوں اور جنت والوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہاں آپس میں ملاقات کر رہے ہیں اور دوزخ والوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ وہاں آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور ایک اور روایت میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو شرمسار کر رہے ہیں اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ''عَرَفتَ فَالزِمْ قَالھَا ثَلثًا'' اے حارثہ تو نے اپنے رب کو پہچان لیا پس اس پر ملازمت کر (یہ تین دفعہ فرمایا)

اور صوفی نام ہے کاملین ولایت کا اور محققین اولیاء اللہ کو اب بھی اسی نام سے پکارتے ہیں اور شروع سے اسی نام سے پکارتے آئے ہیں اور مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ''مَنْ صَفَا الحبَّ فَھُوَ صافٍ وَمَنْ صَفَا الجیبَ فھو صوفی ''(جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کے ذریعہ صاف ہو جائے اس کو صافی اور جس کو محبوب (حقیقی) صاف کر دے اس کو صوفی کہتے ہیں یعنی جو شخص محبت خداوندی کی وجہ سے نفسانی خواہشات سے پاک صاف ہو جاتا ہے وہ صافی کہلاتا ہے اور جو شخص محبوب حقیقی حق تعالیٰ کی ذات میں مستغرق اور اس کے ماسوی سے بیزار ہو جاتا ہے وہ صوفی بن جاتا ہے۔ اور لغت کے اعتبار سے اس اسم (صوفی) کا اشتقاق کسی مادہ سے بھی درست نہیں بنتا کیونکہ یہ معنی (صوفی کی تعریف) اس سے کہیں زیادہ عظمت والے ہیں کہ ان کی کوئی جنس ہو جس سے یہ اسم مشتق ہو کہ اشتقاق تو مشتق اور مشتق منہ میں مجانست کو چاہتا ہے اور دنیا میں جو بھی کدر (موجود) ہے وہ صفا کی ضد ہے اور کسی چیز کا اشتقاق اس کی ضد سے نہیں ہوا کرتا۔ پس یہ معنی اہل

تصوف کے نزدیک اظہر من الشمس ہیں اور کسی عبارت یا اشارے کی محتاج نہیں ''لِاَنَّ الصُوفِی ممنوع عن العبارة ولاشارة '' (کیونکہ صوفی کی حقیقت اور مفہوم عبادت اوراشارہ کے ذریعہ بیان نہیں ہوسکتا) جب صوفی کی حقیقت ہر قسم کی عبارات سے ناممکن ہےاور تمام جہاں اس کی تعبیر بیان کرنے میں مصروف ہےتو پھر کوئی جانے یا نہ جانے اس اسم صوفی کو کیا خطرہ ہے؟ جب کہ اس کے معنی حاصل بھی ہو جائیں۔پس اہل کمال انہی (جو صوفی کے اوصاف کے حامل ہوں) کوصوفی کہتے ہیں اس صوفی سے تعلق اور محبت رکھنے والوں کو متصوف کا نام دیتے ہیں۔

تصوف کا لفظ تفعل کے باب سے ہےاور عربی میں باب تفعل تکلف کا تقاضا کرتا ہےاور یہ متصوف اسی اصل (تصوف) کی فرع ہےاوران دونوں میں جو فرق ہے وہ لغت اور معنی کے اعتبار سے واضح ہے''الصفاوَلاَیَة'' وَلَهَا ایة'' وَرَوَایة'' والتصوف حکایة لِلصَفَا بِلاَ شکایةِ'' (صفائے باطن ولایت ہےاوراس کی ایک علامت اور روایت ہے اور تصوف بلاشبہ صفائی قلب کی حکایت ہے) پس صفا کے معنی روشن اور ظاہر ہیں اور تصوف اسی معنی کی حکایت ہےاور اہل تصوف اس درجہ میں تین طرح کے ہوتے ہیں ایک ان میں سے صوفی۔ دوسرا متصوف اور تیسرا مستصوف ہوتا ہے۔پس صوفی وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات سے فانی لیکن حق تعالٰی کے ساتھ باقی ہو۔اور طبعی تقاضوں سے چھٹکارا حاصل کر کے حقیقت کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

متصوف وہ ہے جو مجاہدہ و ریاضت کے ذریعہ اس درجہ (صوفی) کا متلاشی ہو اور اپنے تمام معاملات میں ان صوفیاء کے طرز عمل کو پیش نظر رکھےاور متصوف وہ ہے جو مال و منال مرتبہ اور اپنی دنیا کے تحفظ کے لئے اپنے آپ کوصوفیاء کی طرح بنائے رکھنے میں مصروف ہو حالانکہ ان دونوں مرتبوں کی اسے کچھ خبر نہ ہو۔یہاں تک کہ صوفیا نے کہا ہے کہ'' اَلْمستَصوِفُ عِندَا لصوفِیَةِ کَالذُبَابِ وَعِند غیرِ ھِم کَالذِبَابِ ''(مستصوف)صوفیا

کے نزدیک مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک (مردار کھانے والے خونخوار) بھیڑیئے کی طرح حریص ہوتا ہے) پس صوفی واصل بحق ہوتا ہے اور متصوف اصول تصوف پر چلنے والا ہوتا ہے اور متصوف بالکل فضول اور بیہودہ ہوتا ہے۔ جس کو حق تعالیٰ کا وصل نصیب ہوگیا وہ اپنے مقصد کو پالینے اور مراد پر پہنچ جانے کی وجہ سے مراد سے بے مراد اور مقصود سے بے مقصود ہوگیا اور جس کو کہ اصول تصوف پر چلنا نصیب ہوگیا وہ احوال طریقت پر متمکن وقادر ہوگیا اور اس کے لطائف میں استحکام کے ساتھ ٹھہر گیا اور جس کے حصہ میں بیہودگی اور واہیات باتیں ہوں وہ ان تمام مقامات سے محروم ہوگیا اور محض اسم کی درگاہ پر بیٹھ گیا اور اسی میں الجھ کر حقیقت سے حجاب میں ہوگیا اور اس حجاب کی وجہ سے نہ تو اسے حق کا وصل نصیب ہوا اور نہ ہی طریقت کے اصولوں سے آگاہ ہو سکا۔ مشائخ صوفیاء کے نزدیک اس معنی کی تفصیل میں بہت سے رموز ہیں جن کو اگرچہ مکمل طور پر احاطہ میں لانا ممکن نہیں تاہم ان میں سے بعض رموز انشاء اللہ اس کتاب میں ہم بیان کریں گے اور اللہ سے ہی توفیق ہے۔

دوسری فصل

<u>صوفی کے معنیٰ</u>:۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اَلصُّوفِی اِذَا نَطَقَ بَانَ نُطْقُہٗ مِنَ الْحَقَائِقِ وَاِن سَکَتَ نَطَقَتْ عنه الجوارح بقطع العلائق" (صوفی جب بولتا ہے تو اس کا کلام اس کی حقیقت حال سے بالکل واضح ہو جاتا ہے اور جب وہ خاموش ہوتا ہے تو دنیاوی تعلقات سے اس کے انقطاع کو اس کی طرف سے اس کے اعضا بیان کرتے ہیں) یعنی صوفی وہ ہوتا ہے کہ جب وہ بولتا ہے تو اس کی گفتگو کا بیان اس کی حقیقت حال کے مطابق ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو خود اس میں موجود نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو اس کا معاملہ اس کی حالت سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے اور دنیوی تعلقات سے اس کے انقطاع کو اس کا حال بیان کر دیتا ہے یعنی اس کی گفتار تمام کی تمام

اصل صحیح پر مبنی ہوتی ہے اور اس کا کردار دنیا سے اس کی خالصتاً کنارہ کشی کو ظاہر کرتا ہے جب وہ بولتا ہے تو اس کا قول بالکل حق کے مطابق ہوتا ہے اور جب خاموش رہتا ہے تو اس کا فعل سراسر فقر ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ کا ارشاد ہے "التصوف نَعت" اَقَامَ العَبْدُ فیه "

"قیل نَعت" للعَبْد اَمْ لغت للحق. فقال نعت الحق حقیقة (نعت العبد اسما "(تصوف ایک ایسی صفت ہے جس میں بندہ قائم ہے کسی نے سوال کیا کہ یہ بندے کی صفت ہے یا خدا کی؟ جواب دیا کہ وہ حقیقتاً تو خدا کی صفت ہی ہے لیکن رسمی طور پر بندہ کی صفت ہے) یعنی تصوف کی حقیقت بندہ سے اس کی بشری صفات کے فنا کا تقاضہ کرتی ہے اور بندہ کی بشری صفات کا فنا ہونا حق تعالیٰ کی صفت کے بقا سے ہوتا ہے اور یہ حق تعالیٰ کی صفت ہوتی اور اس کی رسم بندہ سے ہمیشہ مجاہدہ کا تقاضا کرتی ہے اور دوام مجاہدہ بندہ کی صفت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لو کہ حقیقت توحید کے پیش نظر یہ صفت کسی بندہ کے لئے درست ہی نہیں کیونکہ بندہ کی صفات اس کے لئے دائمی نہیں ہیں اور مخلوق کی صفت سوائے اسم کے ظاہر نہیں ہوتی اس لئے کہ مخلوق کی صفات کو بقا حاصل نہیں بلکہ وہ فعل حق ہوتا ہے پس درحقیقت وہ صفت خداوندی ہوتی ہے اور اس کا معنی وہی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بندہ کو حکم دیا کہ روزہ رکھ لے اور روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کا نام صائم رکھا اور ظاہر کی اسم کے اعتبار سے تو روزہ اس بندے کی طرف سے ہے لیکن حقیقت کی رو سے یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ "الصومُ لِی وَاَنَا اَجزی بہ "(روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا) یعنی روزہ میری طرف سے ہے اس لئے کہ دنیا میں کئے جانے والے تمام افعال اسی کی ملک ہیں اور لوگوں کا ان افعال کو اپنی طرف منسوب کرنا رسمی رواج اور مجاز ہے، حقیقت نہیں۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں "التصوفُ ترکُ کُلِّ

حظٍ للنفس ''(نفس کی تمام لذتوں کو چھوڑ دینا تصوف ہے)اور یہ دوطرح کا ہوتا ہے ۔ایک اسم اور دوسرا حقیقت۔اوراس کے معنی یوں ہیں کہ اگر صوفی خود حظ نفس کو ترک کرتا ہے تو حظ نفس کا چھوڑنا بھی تو ایک حظ ہے اس طرح ترک حظ رسم و رواج ہوگا۔۔اور اگر حظ نفس جو صوفی کو چھوڑ دے تو یہ حظ نفس کا فنا ہوتا ہے اور اس معنی کا تعلق حقیقت مشاہدہ سے ہے۔ پس حظ نفس کو ترک کر دینا یہ بندہ کا فعل ہے اور فنا حظ (حظ کا بندہ کو چھوڑ دینا) خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔اور بندہ کا فعل اسم اور مجاز ہوتا ہے اور فعل حق تعالیٰ حقیقت ہوتا ہے۔اس قول سے حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا پہلے بیان ہونے والا قول بھی خوب واضح ہو جاتا ہے۔اور حضرت ابوالحسن نوری ہی فرماتے ہیں''الصُوفِيَة هُمَ الذِينَ صَفَتُ اَرواحهُمُ فَصَارُو فِي الصَفِ الاولِ بَيُنَ يَدَى الحَقِ ''(صوفی وہ لوگ ہیں کہ جن کی ارواح بشریت کی کدورت سے آزاد اور نفسانی خواہشوں سے پاک وصاف ہوگئی ہیں اور اس طرح خواہشات سے نجات پا کر حق تعالیٰ کے حضور صف اول میں اور اعلیٰ مقام میں آرام پانے کی سعادت حاصل کر چکی ہیں)اور غیر اللہ سے کنارہ کش ہو چکی ہیں اور یہی حضرت فرماتے ہیں کہ''الصوفی الذی لَایَمْلِک وَلاَ یُمْلَکُ ''(صوفی وہ ہے کہ اس کے قبضہ میں کوئی چیز نہ ہو اور وہ خود بھی کسی غیر اللہ کی ملکیت نہ ہو) اور یہی عین فنا ہے کیونکہ جو فانی الصفت ہو وہ نہ کسی کا مالک ہوتا ہے اور نہ مملوک۔کیونکہ ملک کا اطلاق موجودات پر ہی صحیح ہوتا ہے اور اس کی مراد یہ ہے کہ صوفی دنیا کے مال و متاع بلکہ آخرت کی زینت میں سے بھی کسی چیز کو اپنی ملک نہیں بناتا تاکہ اس طرح کہیں وہ خود ہی اپنے نفس کی ملک اور حکم کا غلام نہ بن جائے اور ایک سلطان اولوالعزم کی طرح غیر اللہ سے اپنا ارادہ منقطع کر لیتا ہے تاکہ غیر اللہ اس سے اپنی بندگی کی طمع منقطع کر لیں اور جو لوگ فنائے کل کے قائل ہیں یہی قول ان کی دلیل ہے ہم ان کی غلط فہمی کے مقام کو اس کتاب میں انشاء اللہ بیان کریں گے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے۔

ابن جلا رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''التصوف حقیقة لارَسم '' (تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کی ظاہری رسم کوئی نہیں) کیونکہ معاملات میں ظاہری رسم (تعریف) مخلوق کا حصہ ہے اوراس کی حقیقت حق تعالیٰ کا خاصہ ہے تو جب مخلوق سے منہ پھیر لینے کا نام تصوف ہوا تو لامحالہ اس کی ظاہری تعریف نہ ہوگی۔

اورابوعمرو دمشقی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''التصوفُ رُؤیةُ الکونِ بعینِ النقص بَل غَضُّ الطرفِ عَن الکَونِ '' (تصوف یہ ہے کہ موجودات کونقصان کی نگاہ سے دیکھا جائے بلکہ ان سے آنکھ بند کر لی جائے) بعض موجودات کو ناقص اور عیب دار دیکھے اور یہ صفت کے بقا کی دلیل ہے بلکہ ان سے آنکھ بند ہی کر لے اور یہ صفت کے فنا کی دلیل ہے کیونکہ نگاہ تو موجودات پر ہی ڈالی جاتی ہے جب موجودات ہی نہ رہیں گے تو ان پر نظر بھی نہ رہے گی اور موجودات دنیا سے آنکھ کا بند کر لینا بصیرت ربانی کا بقا ہے یعنی جو شخص اپنی ذات سے آنکھ بند کر لیتا ہے حق تعالیٰ کی طرف اس کی آنکھ کھل جاتی ہے کیونکہ موجود کا طالب اپنا بھی طالب ہوتا ہے اوراس کا کام اپنی ہی ذات سے متعلق ہوتا ہے اوراس کو اپنی ذات سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ (گویا وہ خود ہی طالب اور خود ہی مطلوب ہوتا ہے) پس ایک شخص اپنے آپ کو دیکھتا تو ہے لیکن ناقص دیکھتا ہے اور دوسرا شخص اپنی ذات سے اپنی آنکھ ہی بند کر لیتا ہے اور کچھ بھی نہیں دیکھتا۔ اور جو شخص دیکھتا ہے اگرچہ ناقص نظر سے ہی دیکھتا ہے پھر بھی اس کی نگاہ اس کا حجاب ہوتی ہے اور باوجود یکہ وہ دیکھتا ہے لیکن اپنی ناقص بینائی کی وجہ سے محجوب ہوتا ہے اور جو شخص دیکھتا ہی نہیں وہ اپنی نابینائی کی وجہ سے محجوب نہیں ہوتا۔ اور اہل تصوف وارباب طریقت کے نزدیک یہ بات مضبوط بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے (جس پر تصوف کی ساری عمارت کھڑی ہے) لیکن اس بات کی شرح کی یہ جگہ نہیں۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''التصوّفُ شِرکٌ لِاَنَّہٗ صِیَانَةُ القَلبِ مِنْ رویة الغیر وَلاَ غیر '' (تصوف شرک ہے کیونکہ وہ دل کو غیر اللہ کے دیکھنے سے

محفوظ رکھتا ہے حالانکہ غیر اللہ کا تو وجود ہی نہیں) یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کو ثابت کرنے میں غیر کی طرف دیکھنا شرک ہے۔ جب دل میں غیر اللہ کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں تو پھر اللہ کے ذکر سے دل کو محفوظ رکھنا محال ہے۔

حضرت حضری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "اَلتَصَوفُ صفاءُ البشرِ مِنْ کلورۃِ المخالفت" (تصوف مخالفت کی کدورتوں سے دل اور باطن کو پاک رکھنا ہے) یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ باطن کو حق کی مخالفت سے بچائے رکھے اس لئے کہ دوستی موافقت کا نام ہے اور موافقت مخالفت کی ضد ہے اور دوست کو پوری دنیا میں دوست کے حکم سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ اور جب مراد ہی ایک ہو تو پھر مخالفت کا تصور کیا کیا جا سکتا ہے۔

حضرت محمدؒ بن علیؒ بن الحسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں "اَلتصوف خُلُق° فَمَنْ زَادَ عَلَیْکَ فِی الخَلُقِ زَادَ عَلَیکَ فِی التَصوف" (تصوف خوش خلقی کا نام ہے پس جو شخص خوش خلقی میں تجھ سے زیادہ ہے وہ تصوف میں بھی تجھ سے زیادہ ہے) یعنی صوفی اچھے اخلاق کا مالک ہوتا ہے لہذا جو زیادہ حسن اخلاق والا ہے وہ زیادہ صوفی ہے۔ خوش خلقی دو طرح کی ہوتی ہے ایک حق تعالیٰ کے ساتھ اور دوسری مخلوق خدا کے ساتھ۔ حق کے ساتھ نیک خوئی اس کے فیصلوں پر راضی ہونے کا نام ہے اور مخلوق کے ساتھ حسن اخلاق یہ ہے کہ اللہ کے لئے ان کی صحبت کا بوجھ برداشت کیا جائے (یعنی ان کے حقوق ادا کئے جائیں) اور یہ دونوں صفات طالب کی طرف ہی لوٹتی ہیں اور طالب کی رضا اور ناراضگی سے مستغنی و بے نیاز ہونا حق تعالیٰ کی صفت ہے اور یہ دونوں اس کی واحدانیت کے پیش نظر اس سے وابستہ ہیں۔

ابو محمد مرتعش رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں "الصوفِی لَا یَسْبِقُ ھِمہ' خُطْرتہ' اَلْبَۃَ" (صوفی وہ ہے جس کا قصد اس کے قدم کے ساتھ ساتھ رہے) یعنی دونوں ایک ساتھ حاضر رہیں۔ اور دل وہاں حاضر ہو جہاں جسم حاضر ہے اور جسم وہاں موجود ہو جہاں دل موجود ہے اور (اسی طرح) دل وہاں حاضر ہو جہاں قدم اور قدم وہاں ہو جہاں دل حاضر

ہے۔اورقول وہاں حاضر ہو جہاں قدم اورقدم وہاں ہو جہاں قول حاضر ہواور یہی دل کے ہمیشہ حاضر رہنے کی علامت ہے بخلاف اس کے کہ جو کہتے ہیں کہ اپنے آپ سے غائب ہےاوراللہ کے حضور حاضر ہے۔ایسا نہیں بلکہ اللہ کے سامنے بھی حاضر ہےاوراپنے سامنے بھی حاضر ہے۔اور (صوفیاء کی اصطلاح) ''جمع الجمع'' سے بھی یہی مراد ہے کیونکہ جب تک اپنے آپ کا دیکھنا مستحق ہوتو اپنی ذات سے غیبت نہیں ہوتی اور جب اپنے آپ کا دیکھنا اٹھ گیا اوراپنی ذات سے غیبت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کے حضور کی حاضری بلاغیبت حاصل ہوگئی اور شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔''الصوفی لایری فی الدارین مَعَ اللّٰهِ غیر اللّٰه ''(صوفی دونوں جہانوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیراللہ کو نہیں دیکھتا) اور چونکہ مخلوقات میں بندہ کی ہستی بھی غیر اللہ میں شامل ہے لہذا جب صوفی غیراللہ کونہیں دیکھتا تو اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھتا اوراپنی نفی واثبات کی حالت میں اپنی ذات سے ہی فارغ ہو جاتا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں''التصوف مبنی" عَلٰی ثَمَانِ خِصَالٍ اَلسخا والرضا وابصر والاشارة والعربة ولبسُ الصوفِ واسیاحه والفقر اما السخا فلابراهیم واما الرضا فلاسماعیل واما الصبر فلایوب واما الاشارة فلزِکَرِیَا وَامَّا الغربة فلیحیی وامالبس الصوف فلموسی واما السیاحه فلعیسٰی واما الفقر فلمحمد صلی الله علیه وسلم و علیهم اجمعین ''(تصوف کی آٹھ خصلتیں ہیں(۱) سخاوت،(۲) رضا،(۳) صبر،(۴) اشارہ،(۵) غربت،(۶) صوف، پہننا،(۷) سیاحت اور(۸) فقر۔(۱) سخاوت۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا شیوہ ہے کہ انہوں نے اپنی متاع عزیز بیٹا اللہ کی راہ میں قربان کردیا)(۲) رضا۔حضرت اسماعیل علیہ السلام کا خاصہ ہے (کہ اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے)(۳) صبر،حضرت ایوب علیہ السلام کی خصلت ہے (کہ انہوں نے کیڑوں کی مصیبت پرصبر کا بے مثال مظاہرہ

کیا)(۴)اشارہ، حضرت ذکریا علیہ السلام کی رمز ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا''اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا '' (آپ تین دن تک لوگوں سے صرف اشارہ سے بات کریں گے)اور نیز اسی حالت میں فرمایا''اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ''(جب حضرت ذکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو خفیہ طور پر پکارا)(۵)غربت حضرت یحییٰ علیہ السلام کا وصف ہے کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی بے وطن اور اپنوں سے بیگانہ رہے۔(۶)اور سیاحت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اقتداء ہے کہ پوری زندگی تبلیغ حق کے لئے سیاحت میں اس طرح مجرد رہے کہ ایک پیالہ اور ایک کنگھی کے علاوہ کچھ بھی پاس نہ رکھتے تھے پھر جب انہوں نے ایک شخص کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی پیتے ہوئے دیکھا تو پیالہ پھینک دیا اور جب ایک اور آدمی کو اپنی انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے دیکھا تو کنگھی کو بھی پھینک دیا۔(۷)صوف پہننا تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع ہے کہ ان کا لباس ادنی کپڑے کا ہوتا تھا۔اور(۸)فقر، سو یہ حضرت محمد ﷺ کی اطاعت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا کہ آپ کوئی محنت نہ کریں اور ان خزانوں سے اپنی زینت فرمائیں (یعنی اسباب معاش حاصل کریں) تو آنحضرت ﷺ نے عرض کی کہ بارخدایا میں یہ خزانے نہیں چاہتا۔ مجھے ایک دن سیر کیجئے اور ایک دن بھوکا رکھئے۔ اور عمل و بندگی کے لئے یہی اصول بہت اچھے ہیں۔

حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں''الصوفی لا یوجَلُ بعدعدمه و لا یعدم بعدوجوده ''(صوفی وہ ہے جو اپنے عدم کے بعد موجود نہ ہو اور اپنے وجود کے بعد معدوم نہ ہو)یعنی صوفی جو کچھ حاصل کر لیتا ہے اسے ہرگز گم نہیں کرتا۔اور جو کچھ کھو دیتا ہے اسے دوبارہ ہرگز حاصل نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں اس کا حق کو پالینا نہ پالینے میں کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔اور اس کا نہ پانا کبھی پالینے میں تبدیل نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کا اثبات بغیر نفی کے اور نفی بغیر اثبات کے ہو جائے اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ اس کی

بشریت کی حالت اس سے بالکل ساقط ہو جائے اور اس کے حق میں جسمانی مشاہدات معدوم ہو جائیں اور تمام موجودات سے اس کے تعلقات منقطع ہو جائیں حتی کہ جو شخص تمام متفرق اور پراگندہ خیالات اپنی ذات میں جمع کرے اور اپنی ہی ذات سے قیام حاصل کرے اسی پر بشریت کے تمام اسرار ظاہر ہوتے ہیں اور یہ صورت اللہ تعالیٰ کے دو پیغمبروں میں ظاہر ہوئی۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے کہ ان کے وجود میں عدم نہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے ہوئے کہا تھا ''رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْ اَمْــــرِیْ '' (اے میرے پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور مجھ پر میرا معاملہ آسان فرما دے) اور دوسرے حضرت محمد ﷺ ہیں کہ آپ کے عدم میں وجود نہ تھا (یعنی ان کے مشاہدہ حق میں محویت کاملہ میں بے حضوری نہ تھی) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا ''اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ '' (کیا ہم نے آپ کے لئے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟) ان میں سے ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی آرائش و زینت کی خود التجا کی اور دوسرے محمد ﷺ نے خود آرائش کی خواہش نہیں کی اللہ تعالیٰ نے خود انہیں آراستہ کر دیا۔

علی بن بندار الصیر فی النیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''التَّصَـوُّفُ اِسقَاطُ الرُّوِیَهِ لِلْحِقِّ ظاهرا وباطِنًا '' (تصوف یہ ہے کہ صوفی اپنے ظاہر و باطن کو نہ دیکھے بلکہ سب کچھ حق تعالیٰ کے لئے دیکھے) یہاں تک کہ اگر ظاہر پر نگاہ ڈالے تو اس پر توفیق الٰہی کا نشان پائے گا اور جب غور سے دیکھے گا کہ ظاہر کے معاملات توفیق الٰہی کے مقابلہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے تو ظاہر کے تمام معاملات کو ترک کر دے گا اور جب باطن کو دیکھے گا تو اس میں بھی توفیق خداوندی کا نشان پائے گا۔ لیکن جب باطن کے معاملات پر غور کرے گا۔ اور اسے معلوم ہو گا کہ معاملات باطن کی بھی توفیق الٰہی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں تو باطن کو بھی ترک کر دے گا (لہٰذا اس وقت) صرف حق کو دیکھے گا اور جب صرف حق تعالیٰ کو ہی دیکھے گا تو پھر اپنے آپ کو ہرگز نہ دیکھے گا۔

اور محمد بن احمد المقری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "التصوف استعامۃُ الاحوالِ مَعَ الحق" (تصوف یہ ہے کہ صوفی کے تمام حالات حق تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہوں) یعنی صوفی کے احوال (کشف وغیرہ) اس کو اصلی حال (مشاہدہ حق) سے غیر کی طرف پھیر کر اسے کج روی میں نہ ڈال دیں اس لئے کہ جس کا دل احوال کے پھیرنے والے اللہ تعالیٰ کا شکار ہو جائے اس کے حالات اس کو استقامت کے درجہ سے نہ تو گراتے ہیں اور نہ ہی اسے دیدار حق سے باز رکھتے ہیں۔

تیسری فصل

ابو حفص حداد نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "التصوف کُلُّہُ اَداب" لِکُلِّ وَقْتٍ اَدَب" وَلِکُلِّ مَقام اَداب" اَداب" وَلِکُلِ حالٍ اَدَب" فَمَنْ لَزِمَ اَدابُ الاوقاتِ بَلَغَ مَبْلَغَ الرِّجالِ وَمَنْ ضیعَ الاداَبَ فَهُوَ بَعِیْد" مِنْ حَیث بِظُن القُرَبَ وَمزدور مِنْ حَیْث یَظُنُّ القُبول" (تصوف تمام کا تمام ادب کا نام ہے۔ ہر وقت مقام اور حال کے لئے آداب ہیں جو شخص اوقات کے آداب بجالانے کو اپنے اوپر لازم کر لے وہ مردان تصوف کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے اور جو آداب کو ضائع کر دے وہ اس درجہ سے دور ہوتا ہے اس حیثیت سے کہ اپنے آپ کو بہت قریب سمجھتا ہے اور اس حیثیت سے مردود ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مقبول بارگاہ الٰہی سمجھتا ہے اور یہ مطلب حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے زیادہ قریب ہے کہ جوانہوں نے کہا "لیسَ التصوُّفُ رسومًا ولا عُلوُمًا وَلٰکنَّہَ اَخلاق" (تصوف نہ تو صرف رسوم کا نام ہے اور نہ ہی محض علوم کا بلکہ وہ تو حسن اخلاق کا نام ہے) یعنی تصوف اگر کسی اسم کا نام ہوتا تو مجاہدہ وریاضت کے ذریعہ حاصل ہو جاتا اگر علم کا نام ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہو جاتا وہ تو بس اخلاق کا نام ہے کہ جب تک تو اس کا حکم اپنے اندر نہ چاہے اور اس کے معاملات اپنے ساتھ درست نہ کرے اور اس کا انصاف اپنی ذات سے نہ دے اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہو سکتا اسم اور اخلاق کے درمیان فرق یہ

ہے کہ اسم ایک ایسا فعل ہے جو تکلف اور اسباب پر اسی طرح مبنی ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر اس کے باطن کے خلاف ہوتا ہے گویا ایک ایسا فعل جو معنی سے خالی ہوتا اور اخلاق تو وہ ایک ایسا قابل تعریف فعل ہے جو تکلف و اسباب کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا ظاہر باطن کے موافق اور دعویٰ سے خالی ہوتا ہے۔

مرتعش رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں "التصوفُ حَسنُ الخلق" (تصوف نیک اخلاق کا نام ہے) اور یہ تین قسم پر ہوتا ہے۔

اول، اللہ کے ساتھ حسن خلق:۔ اور یہ ریا کاری کے بغیر اس کے احکام کی تعمیل سے حاصل ہوتا ہے (دوم) مخلوق کے ساتھ حسن اخلاق۔ اور یہ بزرگوں کا احترام کرنے چھوٹوں پر شفقت کرنے اور اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ بغیر کسی ذاتی لالچ کے مساویانہ سلوک اور انصاف کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور (سوم) اپنی ذات کے ساتھ نیک برتاؤ اور یہ خواہشات نفس و شیطان کی متابعت نہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور جو شخص ان تینوں باتوں میں اپنے آپ کو درست کرے وہ خوش خلق لوگوں میں شمار ہوتا ہے اور یہ جو میں نے کہا ہے اس بیان کے مطابق ہے کہ ایک شخص نے سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ ہمیں پیغمبر ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بتائیے! تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ قرآن سے پڑھو کہ اخلاق نبوی ﷺ کی نسبت خود خدا تعالیٰ نے خبر دی اور فرمایا ہے "خُذِ العَفوَ وَامُر بِالْمَعْرُوفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْن" (آپ عفو اختیار کیجئے نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے) حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں "هذا مَذهب" كُلُّه، جد" فَلاَ تُخَالِطُوهُ بشئٍ مِنَ الْهَزَل" (یہ مذہب تصوف تمام، معقول و عمدہ ہے اس میں بیہودہ باتوں کی آمیزش نہ کرو) یعنی تصوف میں رسمی صوفیوں کے معاملات میں نہ پھنسو اور ان رسمی صوفیوں کی تقلید کرنے والوں سے گریز کرو۔ لیکن جب عوام الناس نے اہل زمانہ پر نگاہ ڈالی اور انہیں زمانہ کے رسمی صوفی ہی نظر آئے۔ اور ان کے محور قص و سرود رہنے۔ ذاتی

مفادات کے لئے بادشاہوں کے درباروں میں جانے اور خوراک وخلعت کے لئے آپس میں جھگڑنے کا عوام کو علم ہوا تو وہ تمام صوفیاء سے ہی بداعتقاد ہو گئے اور کہنے لگے کہ اگر طریقہ تصوف کی یہی اصل ہے تو متقدمین صوفیاء بھی اس طریق پر چلے ہوں گے اور انہوں نے یہ معلوم نہ کیا کہ یہ فترت (وہ زمانہ جس میں کوئی نبی دنیا میں موجود نہ ہو) اور ابتلاو آزمائش کا زمانہ ہے جب لالچ، بادشاہ کو ظلم میں، طمع، عالم کو نافرمانی اور زنا کاری میں اور ریا کاری، زاہد کو منافقت میں مبتلا کر دے تو لامحالہ نفسانی خواہشات، صوفی کو بھی ناچ کو داور گانے بجانے میں ڈال دیتی ہیں...... جان لو کہ اگر چہ اہل طریقت تباہ ہو سکتے ہیں لیکن طریقت کی اصل کبھی تباہ نہیں ہوسکتی۔ اور یہ بھی جان لو کہ بیہودہ لوگوں میں سے کوئی گروہ اپنی بیہودگی کو اہل تصوف کی روش کے پردے میں چھپا دے تو اس سے ان نیک لوگوں کی روش میں بیہودہ پن نہیں آ سکتا۔

حضرت ابوعلی قزوینی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "التصوف ھو الاخلاق الرضیۃ" (تصوف پسندیدہ اخلاق کو کہتے ہیں) اور پسندیدہ کردار وہ ہوتا ہے کہ بندہ تمام حالات میں حق تعالیٰ سے خوش ہو اور اس کی رضا پر راضی رہے۔

ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "التَصوفُ ھُو الحریۃُ وَالفُتوۃِ وَترکُ التکلفِ وَالسَخاءُ وَبَذْلُ الدُنیا" (تصوف، حریت وجوانمردی ترک تکلف سخاوت اور متاع دنیا (راہ حق میں خرچ کرنے کا نام ہے) حریت یہ ہے کہ بندہ نفسانی خواہشات سے آزاد ہو جائے جوانمردی یہ ہے کہ بندہ جواں ہمتی کے دیکھنے سے الگ ہو جائے ترک تکلف یہ ہے کہ اپنے متعلقات اور دنیوی نعمتوں کے لئے کوشش نہ کرے اور سخاوت یہ ہے کہ دنیا کو اہل دنیا کے لئے چھوڑ دے۔

اور ابوالحسن قوشنج رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "التصوف الیوم اسم وَلاَ حَقیقۃ" و قد کَانَ حَقیقۃ" "(آج تصوف کا صرف نام رہ گیا اور کوئی حقیقت نہیں

حالانکہ پہلے زمانہ میں حقیقت تھی نام نہ تھا) یعنی صحابہؓ اور سلف صالحینؒ کے دور میں تصوف کا اسم تو مستعمل نہ تھا لیکن اس کا مفہوم ہر فرد میں موجود تھا۔ اور اب صرف نام رہ گیا ہے معنی نہیں ہیں۔ یعنی اس وقت تصوف کے معاملات مشہور معروف تھے اور دعویٰ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن اب دعویٰ تصوف معروف ہے اور معاملات تصوف کا نام ونشان نہیں۔

اب تک میں اس کتاب میں تصوف سے متعلق مشائخ طریقت کے اقوال کی اس قدر تحقیق سے بیان کر چکا ہوں جس سے (اللہ تمہیں سعادت مند بنائے) تم پر طریقت کی حقیقت واضح ہو جائے گی اور تصوف کے منکروں سے تم کہہ سکو گے کہ اس انکار سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر وہ صرف اسم تصوف کا انکار کرتے ہیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اسم اور مسمیٰ میں یگانگت کوئی ضروری امر نہیں اور اگر تصوف کی اصل اور اس کے معانی کا ہی انکار کرتے ہیں۔ تو یہ تو پیغمبر علیہ السلام کی پوری شریعت اور اس کے قابل تعریف خصلتوں کا انکار ہے اور میں تمہیں (اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے اولیاء کی سی سعادت عطا فرمائے) اس کتاب میں وصیت کرتا ہوں کہ تم اس کی پوری رعایت کرنا اور اس قدر انصاف کرنا کہ تصوف کا دعویٰ کم کرنا اور اہل تصوف کے ساتھ نیک اعتقاد رکھنا۔ (اور توفیق تو اللہ ہی کی طرف سے ہے)

چوتھا باب

مرقعہ پوشی کے بیان میں

جان لو کہ صوفیاء کا شعار مرقعہ (گدڑی) پہننا ہے اور مرقعات پہننا سنت ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "عَلَیْکُمْ بِلُبْسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلاوَةَ الایمَانِ فِی قُلُوبِکُمْ" (اپنے اوپر صوف پہننا لازم کرلو تم اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت پاؤ گے) نیز ایک صحابیؓ فرماتے ہیں "کَانَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم یَلْبسُ الصُّوفَ وَیَرکَبُ الحِمَارَ" (نبی ﷺ صوف پہنتے اور گدھے پر سواری فرمایا کرتے تھے) نیز رسول اللہ ﷺ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا "لاَ تستَخْلِقِی الثَّوبَ حَتی تَرْقِعِیهِ" (کپڑے کو ضائع نہ کر جب تک کہ اس میں پیوند نہ لگالو) اور فرمایا تم پر پشم کا لباس ہونا چاہئے تا کہ تم حلاوت ایمان پاسکو اور روایت میں ہے کہ پیغمبر ﷺ پشم کا لباس زیب تن کرتے اور گدھے پر سواری فرمایا کرتے تھے۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ کپڑوں کو اس وقت تک ضائع نہ کیا کرو جب تک ان میں پیوند نہ لگالیا کرو[1]۔

حضرت عمر بن خطابؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایسی گدڑی پہنا کرتے تھے جس میں تیس پیوند لگے ہوتے تھے اور حضرت عمرؓ ہی فرمایا کرتے تھے کہ بہترین لباس وہ ہے جو کم قیمت ہو، اور حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ وہ ایسا کرتہ پہنا کرتے تھے جس کی آستینیں ان کی انگلیوں کے برابر ہوتیں اور اگر کبھی اس سے بھی لمبا کرتہ پہننے کا اتفاق ہوتا تو اس کی آستینوں کا سرا پھاڑ دیا کرتے تھے۔

نیز اللہ عزوجل کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو کپڑا چھوٹا کرنے کا حکم آیا چنانچہ ارشاد ربانی ہے "وَثِیَابَکَ فَطَهِّر اَلی قَصْر" (اور اپنے کپڑوں کو کوتاہ کرو)

---

[1] عبارت میں کچھ جملے دوبارہ درج ہیں۔ اس تکرار کو ترجمہ میں ختم کیا جا سکتا تھا لیکن دیانت داری کا تقاضہ یہی تھا کہ فارسی نسخہ میں موجود عبارت کا من وعن ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا ہو سکتا ہے کاتب سے سہواً یہ جملے دوبارہ لکھے گئے ہوں۔ (مترجم)

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر بدری صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ایسے دیکھے ہیں جن سب کا لباس پشم کا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ تجرید دنیا سے قطع تعلقات کی حالت میں ہمیشہ اون کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے اور حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سلمان فارسیؓ کو کئی پیوند لگی گدڑی پہنے ہوئے دیکھا۔

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ہرم بن حیانؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت اویس قرنیؒ کو دیکھا کہ وہ اون کا لباس پہنے ہوئے تھے اور اس پر پیوند لگے ہوئے تھے اور حسن بصری مالک بن دینار اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سب صوف کی گدڑی ہی پہنا کرتے تھے۔

اور امام عالم حضرت ابو حنیفہ کوفی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے ''اور یہ روایت محمد بن علی حکیم ترمذی کی تصنیف ''تاریخ مشائخ'' میں لکھی ہوئی ہے کہ ابتدا میں آپ نے صوف کا لباس پہن کر گوشہ نشینی کا ارادہ فرمایا تھا یہاں تک کہ پیغمبر علیہ ﷺ کی خواب میں زیارت کی۔ حضور علیہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہیں مخلوق کے درمیان رہنا چاہئے کیونکہ تمہارے ہی ذریعہ میری سنت کا احیاء ہوگا'' اس وقت سے آپ نے گوشہ نشینی کا ارادہ تو ترک فرما دیا تاہم پھر بھی زیادہ قیمتی لباس کبھی نہیں پہنا اور داؤد طائی رحمتہ اللہ علیہ بھی صوف کا لباس ہی پہنا کرتے تھے اور وہ محقق صوفیاء میں سے تھے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ تعالیٰ صوف کی گدڑی پہنے امام اعظم حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آئے تو آپ کے احباب نے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا'' ہمارے سردار ابراہیم بن ادھم تشریف لائے ہیں۔ امام کے شاگردوں نے کہا کہ مسلمانوں کے امام کی زبان پر فضول اور ناحق بات نہیں آ سکتی ابراہیم کو یہ سرداری کیسے ملی؟ امام نے فرمایا'' وہ ہر وقت خداوند تعالیٰ جل ذکرہ کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور ہم لوگ اپنے جسموں کی خدمت میں لگے

رہتے ہیں اس لئے وہ ہمارے سردار بن گئے۔ اور اب اگر اہل زمانہ میں سے بعض کے نزدیک گدڑی اور خرقہ پہننے سے دنیوی جاہ و جمال مراد ہو اور ان کا دل ظاہر حال کے موافق نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے کہ پورے لشکر میں جنگجو مرد میدان تو ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح پوری جماعتوں میں محقق کم لوگ ہی ہوتے ہیں لیکن سب کو ان کے ساتھ ہی نسبت دی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک چیز میں تو صوفیوں سے مشابہت رکھتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''مَن تشبّہ بِقَوم فَھُوَ مِنھم'' (جس نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے) یعنی جو شخص کردار و اعتقاد میں کسی قوم کے ساتھ مماثلت پیدا کرتا ہے وہ اسی قوم میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ایک گروہ کی نگاہ ان کے ظاہری معاملات اور رسم پر پڑتی ہے اور دوسرے گروہ کی نگاہ ان کے ستر اور صفائی باطن کو دیکھتی ہے۔

غرض صوفی کی صحبت کا ارادہ کرنے والے شخص کا حال چار باتوں سے باہر نہیں ہوتا۔ ایک گروہ کو صفائی باطن، نورانیت دل، پاکیزگی طبع اور اعتدال مزاج ان کے اسرار باطن کے ساتھ نظر آتا ہے چنانچہ یہ لوگ محققین کا قرب اور ان کی رفعت شان کو دیکھتے ہیں اور اس بلند مقام کی عقیدت ان کے دامن گیر ہو جاتی ہے اور بصیرت باطن کی بنیاد پر ان کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہیں اور ان کے حال کا آغاز کشف احوال اور خواہش نفس سے مجرد ہونے اور نفس سے روگردانی کرنے سے ہوتا ہے۔

دوسرے گروہ کو ان صوفیاء کرام کے ظاہر حال کے ساتھ جسم کی درستی، دل کی پاکیزگی اور سکون اور سینہ کی سلامتی جلوہ نما نظر آتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگ ان کے شریعت پر عمل، تحفظ آداب اسلام اور حسن معاملات کو دیکھتے ہیں اور ان کی صحبت اختیار کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور اپنے حال کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ابتدا مجاہدہ اور حسن معاملہ سے ہوتی ہے۔

تیسرے گروہ کو انسانی مروّت، عمدہ ہم نشینی اور حسن اخلاق ان صوفیاء کی سیرت و

کردار کی طرف متوجہ کرتے ہیں چنانچہ وہ لوگ ان صوفیاء کرام کی ظاہری زندگی کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ عمدہ سلوک بزرگوں کی عزت وتکریم۔ چھوٹوں پر شفقت اور ہمسروں سے نیک معاملہ وغیرہ سے آراستہ اور دنیوی نعمتوں میں اضافہ کی طلب سے بے فکر اور قناعت پر خوش ہیں اور ان کی صحبت کا ارادہ کرتے اور طلب دنیا کی تکلیف اور کوشش کا طریقہ اپنے لئے آسان کر لیتے اور بافراغت اپنے آپ کو نیک بنالیتے ہیں۔

چوتھے گروہ کی حالت یہ ہے کہ اس کے افراد طبیعت کی سستی اور نفس کی سرکشی میں مبتلا ہونے کے باوجود وسائل و ذرائع کے بغیر دنیوی سیادت کی طلب، فضیلت کے بغیر صدارت کا قصد اور علم کے بغیر خصوصی مقام کی جستجو صوفیا کے احوال کی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہ سوچتے ہوئے کہ اس ظاہری حال کے علاوہ کوئی دوسرا کام ضروری نہیں صوفیاء کی صحبت کا ارادہ کرتے ہیں اور وہ صوفیائے کرام بھی ان کے ساتھ اپنے لطف وکرم اور نرمی کا برتاؤ کرتے اور مصالحت و درگزر سے کام لیتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں حالانکہ اس گروہ کے لوگوں کے دلوں میں حق بات میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا اور ان کے جسموں میں طریقت کی طلب کے مجاہدے کا کوئی نشان نہیں ہوتا اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کا اسی طرح احترام کریں جس طرح محقق صوفیوں کا کرتے ہیں اور ان سے اسی طرح مرعوب ہوں جس طرح خداوند تعالیٰ کے مقرب حضرات سے خوف کھاتے ہیں اور صوفیاء کرام کی صحبت وتعلق سے ان کی اصلاح کے پردے میں اپنی خرابیوں کو چھپانا چاہتے ہیں اور ان کا سا لباس زیب تن کر لیتے ہیں لیکن ان کا یہ بے عمل لباس ان کے جھوٹ اور فریب کاری پر شور مچاتا ہے کہ یہ جھوٹ کا لباس اور حشر ونشر کے روز حسرت وغرور کی پوشاک ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ط (جن لوگوں پر تورات پر عمل کرنے کا بار ڈالا گیا تھا پھر وہ اس بار کو نہ اٹھا سکے ان کی مثال اس

گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔اس قوم کی مثال بہت بری ہے جنہوں نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا)اور اس زمانہ میں اس گروہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔پس تم پر لازم ہے کہ جو کچھ تمہارے اختیار میں نہ ہو اس کو حاصل کرنے کا قصد نہ کرو کیونکہ اگر تم ہزار بار بھی طریقت کے قبول کرنے کے لئے کوشش کرو تو طریقت ایک لمحہ کے لئے بھی تمہیں قبول نہیں کرے گی اس لئے کہ یہ کام گدڑی پہننے سے نہیں عشق الٰہی میں جلنے سے ہوتا ہے۔جب طریقت سے کسی شخص کی آشنا ہو جائے تو اس کا امیرانہ لباس بھی گدڑی کی طرح ہو جاتا ہے اور جب کوئی طریقت سے بیگانہ ہوتا ہے تو اس کی گدڑی بھی بدبختی کا رقعہ اور قیامت کے روز شقاوت کا فرمان ہو جاتی ہے۔چنانچہ اس بزرگ پیر سے لوگوں نے کہا ''لِمَ لا تَلبِس المُرَقَّعَةَ قَالَ مِنَ النِفَاقِ اَنْ تَلبِسَ لِبَاس الفیتانِ وَلاَ تَدْخُلْ فِی خملِ اَثْقَالِ الفُتوةِ ''(آپ گدڑی کیوں نہیں پہنتے؟ تو انہوں نے جواب دیا یہ منافقت ہے کہ تو جوانمردوں کا سا لباس پہن لے لیکن جوانمردی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہ ہو) کیونکہ جوانمردی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے بغیر جوانمردوں کا لباس زیب تن کرنا منافقت ہے۔پس اگر یہ فقیرانہ لباس اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ تجھ کو پہچان لے کہ تو اس کا خاص بندہ ہے تو اللہ تعالیٰ تو بغیر لباس کے بھی تجھے پہچانتا ہے اور اگر یہ اس لئے ہے کہ لوگوں پر ظاہر کرے کہ میں خاصان الٰہی میں سے ہوں تو اگر تو واقعی اس کا مقرب ہے تو یہ حالت ریا ہوگی اور اگر تو ایسا نہیں ہے تو پھر یہ حالت یقیناً منافقت ہوگی اور یہ راہ پر صعوبت اور پر خطر ہے اور اہل حق اس چیز سے بالاتر ہیں کہ لباس کے ذریعہ شہرت حاصل کریں۔اَلصَّفَاءُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی اِنعامٌ وَ اِکْرَامٌ والصُّوفُ لِبَاسُ الاَنْعَامِ (صفائی قلب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ انعام واکرام کا مظہر ہے اور صوف جانوروں کا لباس ہے)پس ظاہری شکل وصورت ایک حیلہ ریا کاری ہے، کچھ لوگ ظاہری بناوٹ وآراستگی کو قرب الٰہی کے لئے حیلہ سمجھتے ہیں اور صوفیا کا لباس پہن کر اس

امید پر اپنے ظاہر کو سنوار لیتے ہیں کہ لوگ انہیں بھی صوفیاء میں شمار کریں۔ اس طریقہ کے مشائخ نے اپنے مریدوں کو گدڑیوں سے زیب وزینت دینے کا حکم دیا اور خود بھی ایسا ہی کیا ہے تاکہ مخلوق کے درمیان ممتاز ہو جائیں اور لوگ ان کے محافظ بن جائیں کہ اگر ایک قدم بھی شریعت و طریقت کے خلاف اٹھائیں تو مخلوق کی شرم سے ایسا نہ کر سکیں۔ غرضیکہ گدڑی اولیاء اللہ کی زینت ہے۔ عوام اس سے عزیز اور خواص اس سے ذلیل ہو جاتے ہیں۔ عوام کی عزت یوں کہ جب وہ گدڑی پہن لیتے ہیں تو لوگ ان کی عزت کرتے ہیں اور خواص کی ذلت اس طرح کہ جب وہ اسے زیب تن کر لیتے ہیں تو لوگ انہیں عوام کی نگاہوں سے دیکھتے اور ان پر اس کی وجہ سے ملامت کرتے ہیں۔ پس ''اَلْمَرقَعَةُ لِبَاسُ النِعَمِ لِلْعَوَامِ وَجَوْشَن البَلاَءِ للخواص ''(گدڑی عوام کے لئے نعمت کا لباس اور خواص کے لئے آزمائشوں کی زرہ بکتر ہے) اسی لئے تو عوام میں سے بہت سے لوگ بڑے بیقرار رہتے ہیں چنانچہ جب ان کا ہاتھ کسی دوسرے کام تک نہیں پہنچتا اور طلب جاہ کا کوئی اور ذریعہ نہیں پاتے تو اسی فقیرانہ گدڑی کے ذریعہ سرداری کی طلب کرتے اور اسی کو دنیوی نعمتوں کے جمع کرنے کے لئے سبب بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ خاصان الٰہی ریا کاری و سرداری کو ترک کرنے کا حکم دیتے ذلت کو عزت پر ترجیح دیتے اور مصیبت کو نعمت پر اختیار کرتے ہیں تاکہ یہ گدڑی ان کے لئے مصیبت اور عوام کے لئے نعمت بنے ''اَلْمرقَّعَة قمِیصُ الوَفالِاَهلِ الصَفَاء وَسِربَالُ السُرورِ لِاَهْلِ الْغُرُورِ ''(گدڑی اہل صفا کے لئے وفا کی قمیص اور اہل غرور کے لئے خوشی کا کرتہ ہے) کیونکہ اہل صفا اُسے پہن کر دونوں جہاں سے بے نیاز اور مرغوبات دنیا سے منقطع ہو جاتے اور اہل غرور اسے پہن کر حق سے حجاب میں اور اصلاح احوال سے الگ ہو جاتے ہیں۔

الغرض گدڑی سب کے لئے بہتری کی علامت اور کامیابی کا سبب ہے۔ اس سے سب کی مراد حاصل ہوتی ہے اگر کسی کے لئے صفائی باطن کا ذریعہ کسی کے لئے دنیوی

نعمتوں کے حصول کا سبب کسی کے لئے حق سے حجاب کا ذریعہ اور کسی کے لئے قرب الٰہی کا بچھونا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ نیک صحبت اور آپس میں محبت کی وجہ سے سب ہی کامیاب ہوں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ فرمان ہے "مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَھُوَ مِنْھُم" (جو کسی قوم سے محبت رکھے گا انہیں میں شمار ہوگا) اور قیامت کے روز ہر قوم کے دوست ان کے ساتھ اور ان کے زمرے میں ہوں گے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ تمہارا باطن حق کا طلب گار ہو اور رسومات سے اعراض کرے کیونکہ جو کوئی ظاہر پر ہی اکتفا کرتا ہے ہرگز حق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور یہ بھی جان لو کہ آدمیت کا وجود ربوبیت کا حجاب ہے اور یہ حجاب احوال کی گردش اور مقامات فنا میں ریاضت کے بغیر دور نہیں ہو سکتا اور اسی فنا کا نام صفا ہے اور جس کی صفت فنا ہو اس کے لئے کوئی لباس اختیار کرنا محال ہے اور تکلف سے زینت کرنا کوئی کمال نہیں۔ پس جس شخص کا فانی الصفت ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی طبیعت کی آفت اور خرابی دور ہو جائے تو اس کو صوفی کہو یا کوئی اور نام رکھ لو اس کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔

دوسری فصل

گدڑی پہننے کی شرائط: ۔ گدڑی پہننے کی شرائط یہ ہیں کہ گدڑی ہلکا پن اور سہولت کے پیش نظر پہنی جائے اور جب تک گدڑی کا اصل وجود موجود ہو جہاں سے پھٹ جائے وہاں ٹکڑا (پیوند) لگا لیا جائے۔ اور اس بات میں مشائخ (اللہ ان سے راضی ہوا) کے دو قول ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ ٹکڑوں کے سینے میں ترتیب کا لحاظ رکھنا شرط نہیں جہاں سے بھی سوئی کا سرا باہر نکل آئے اسے باہر کھینچ لیا جائے (سینے میں خاص ترتیب کے لئے) کسی تکلف کی ضرورت نہیں...... دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ چیتھڑے سینے میں اور ان کے تریب دینے میں سلیقہ شرط ہے۔ ترتیب کا لحاظ رکھنا اور ٹکڑوں کے سیدھا ہونے میں تکلف کرنا فقر کے معاملات میں سے ہے اور معاملہ کی صحت ہی اصل کے صحیح ہونے کی دلیل ہوتی ہے...... اور میں علی بن عثمانؒ نے شیخ المشائخ ابو القاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے طوس میں دریافت کیا تھا

کہ درویش کے لئے کم از کم کس چیز کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہ فقر کا سزاوار قرار پائے؟ فرمایا ''وہ تین ہیں کہ ان سے کم نہ ہونا چاہئے (اول) یہ کہ چیتھڑوں کو سیدھا سینا جانتا ہو، (دوم) سچی بات سننے کی سمجھ ہو، (سوم) زمین پر صحیح طریقے سے پاؤں رکھ سکے۔ اس وقت درویشوں کا ایک گروہ میرے ساتھ موجود تھا۔ جب ہم واپس ہوئے اور دروازہ پر پہنچے تو ان میں سے ہر ایک اس میں کچھ تصرف (تاویل) کر رہا تھا۔ اور جاہلوں کی ایک جماعت کو اس میں لالچ پیدا ہوا اور وہ کہنے لگے کہ فقر صرف چیتھڑوں کو سیدھا سینے اور زمین پر پاؤں مارنے (رقص کرنے) کا ہی نام ہے۔ اور ہر شخص یہی سمجھنے لگا کہ ہم طریقت کی باتیں سننا بھی جانتے ہیں اور لیکن چونکہ میرا دل شیخ کی طرف متوجہ تھا اس لئے ان کی بات زمین پر پھینکنا نہ چاہا اور ان سے کہا کہ آیئے ہم میں سے ہر شخص اس قول کے معانی سے متعلق کچھ بیان کرے۔ چنانچہ ہر شخص نے اپنا اپنا مفہوم بیان کیا۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا ''چیتھڑے کا صحیح سینا یہ ہے کہ اسے فقر کے ساتھ سیا جائے نہ کہ ظاہری زینت و ترتیب کے ساتھ۔ جب تم پیوند کو فقر کے ساتھ سیو گے تو بظاہر ٹیڑھا ہی کیوں نہ ہو درست ہوگا۔ اور درست بات سننا یہ ہے کہ اسے حال کے ساتھ سنا جائے نہ کہ قال کے ساتھ اور اس میں حق و سچائی کے ساتھ تاویل کریں نہ کہ بیہودہ بات کے ساتھ اور اسے دل سے سمجھیں نہ کہ عقل کے ساتھ اور زمین پر سیدھا پاؤں رکھنا یہ ہے کہ محبت الٰہی کے جذبہ میں سرشار ہو کر زمین پر پاؤں رکھا جائے نہ کہ ظاہر رسم اور لہو و لعب کے ساتھ۔ ان میں سے ایک شخص نے جب یہ بات شیخ المشائخ کے سامنے نقل کی تو انہوں نے فرمایا ''اَصَابَ عَلِی خَیَّرَ اللّٰہ'' (علی نے درست کہا اللہ اسے بھلائی دے) پس اس گروہ صوفیا کے نزدیک گدڑی پہننے سے مراد، دنیا کی محبت کم کرنا اور حق تعالیٰ کے ساتھ سچا فقر حاصل کرنا ہے اور صحیح آثار میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم سلام اللہ علیہ جب آسمان پر اٹھائے گئے اس وقت گدڑی ہی پہنے ہوئے تھے اور ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو صوف کی اس گدڑی کے ساتھ

خواب میں دیکھا کہ اس کے ہر چیتھڑے سے نور پھوٹتا ہے میں نے پوچھا اے مسیح علیہ السلام آپ کے اس لباس پر یہ نور کیسا ہے؟ تو فرمایا کہ یہ میرے اضطراب و مجبوری کے نور ہیں کہ ان میں سے ہر چیتھڑا میں نے ایک مجبوری اور ضرورت سے سیا تھا تو خداوند تعالیٰ نے میرے دل کو پہنچنے والی ہر تکلیف کو ایک نور بنا دیا ہے۔ اور نیز میں نے اہل ملامت میں سے ایک بوڑھے کو ماوراالنہر میں دیکھا کہ جو چیزیں آدمی کے کھانے اور پہننے کی ہیں نہ وہ انہیں کھاتا ہے نہ پہنتا ہے اور ایسی چیزیں اس کی خوراک تھیں جنہیں لوگ پھینک دیتے تھے جیسے بوسیدہ سبزی کڑوا کدو اور خراب شدہ گاجر وغیرہ قسم کی اشیاء اور پوشاک ان چیتھڑوں کی بناتا تھا جو راستے سے اٹھا کر انہیں دھو کر ایک گدڑی کی صورت میں بنا لیتا تھا۔ اور میں نے سنا ہے کہ مرو ارود میں متاخرین اہل طریقت میں سے بہت قوی حال اور نیک سیرت ایک پیر تھا اس نے بہت سے روی چیتھڑے اپنی ٹوپی اور مصلے میں لگا رہے تھے کہ ان میں بچھونے بچے دے رکھے تھے۔ اور میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اکاون سال تک ایک ہی جبہ پہنے رکھا جس میں بے تکلف چیتھڑوں کے پیوند لگاتے رہتے تھے اور عراقی لوگوں کی حکایت میں "میں نے دیکھا ہے کہ "ایک صاحب مشاہدہ اور دوسرا صاحب مجاہدہ درویش تھا۔ صاحب مشاہدہ درویش نے تو پوری زندگی صرف وہی چیتھڑے زیب تن کئے جو درویشوں کے لباس سے سماع کی حالت میں پھٹ کر گرتے تھے اور صاحب مجاہدہ درویش نے تمام عمر صرف انہی چیتھڑوں کا لباس پہنا جو درویشوں کے استغفار کرنے کی حالت میں ان کے لباس سے پھٹ کر گرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کا ظاہری لباس ان کی باطنی سیرت کے مطابق ہوتا تھا اور اسی کی نگہداشت کرنا فقر کی حالت ہے۔ اور شیخ محمد بن حنیف رحمتہ اللہ علیہ نے بیس سال تک ایک کھردرا ٹاٹ پہنے رکھا اور ہر سال میں چار چلے کھینچتے تھے اور ہر چلہ میں علوم حقیقت کے مخفی رازوں سے متعلق ایک کتاب تصنیف کرتے تھے۔ اور ان کے دور میں علماء طریقت و حقیقت کے محققین میں سے ایک بزرگ تھے جو فارسی لباس میں بیٹھتے تھے لوگ انہیں محمد بن

زکریاؒ کے نام سے یاد کرتے تھے وہ ہرگز گدڑی نہ پہنتے تھے۔لوگوں نے شیخ محمد حنیف رحمتہ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ گدڑی پہننے کی شرط کیا ہے اور اس کا پہنا کس کے لئے مسلم ہے؟ فرمایا"گدڑی پہننے کی شرط وہی ہے جسے محمد بن زکریا سفید پیراہن میں بجالا رہے ہیں اور اس کا پہننا بھی انہی کے لئے سزاوار ہے۔

تیسری فصل

گدڑی علامت فقر نہیں:۔لیکن اس گروہ کی اس عادت کو چھوڑ دینا اہل طریقت کی شرط نہیں اور صوفیاء جو اس حال میں پشم کا لباس بہت کم پہنتے ہیں اس کی دو وجوہ ہیں پہلی یہ ہے کہ جانوروں کے پاک و ناپاک جگہوں پر بیٹھنے کی وجہ سے پشم ناپاک ہو جاتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بدعتیوں[1] کے ایک گروہ نے پشم کے لباس کو اپنا شعار بنالیا ہے اور بدعتیوں کے شعار کی مخالفت کرنا اگر خلاف سنت نہ ہو تو بہت ہی اچھا ہے لیکن گدڑی کے سینے میں تکلف اس لئے روا رکھتے ہیں کہ ان (گدڑی پوش) صوفیا کا مقام مخلوق میں بڑا بزرگ ہے اس لئے ہر شخص نے اپنے آپ کو ان جیسا بنالیا ہے اور گدڑی پہن لی ہے اور ان سے ناپسندیدہ افعال ظاہر ہوتے ہیں اور ان صوفیاء کو اپنے مخالفین کی صحبت سے رنج ہوتا ہے اس لئے انہوں نے اپنے لئے ایک ایسا لباس پسند کرلیا ہے جسے ان کے سوا کوئی سی ہی نہیں سکتا اور اس کو ایک دوسرے کی پہچان کے لئے علامت بنالیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک درویش کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی گدڑی میں ایک ٹکڑا غلط خط میں لگا رکھا تھا اس بزرگ نے اس کو اپنی صحبت سے علیحدہ کر دیا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ صوفیاء کو طبع نازک اور مزاج لطیف کی وجہ سے طبیعت کی کجی پسند نہیں آئی اور جس طرح ناموزوں شعر ذوق لطیف کو پسند

---

[1] شریعت میں کسی نئی اور بے اصل چیز کو رواج دینا بدعت کہلاتا ہے۔حدیث پاک میں ہے۔ کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة و کُلّ ضلالة فی النار الحدیث (ہر نئی ایجاد شدہ چیز بدعت ہے۔ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں جانے والی ہے۔)

نہیں آتا اسی طرح ناموزوں فعل بھی طبع نازک کے لئے ناقابل قبول ہوتا ہے اور صوفیا کے ایک گروہ نے لباس کے وجود وعدم کا تکلف ہی نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گدڑی دی تو اسے پہن لیا۔ قبا عنایت فرمائی تو اسے زیب تن کر لیا اور اگر برہنہ چھوڑا تو برہنہ رہ لیا اور میں علی بن عثمان الجلابیؒ نے کبھی کسی طریقہ کو پسند کیا اور اپنے بعض سفروں میں اسی پر عمل کیا ہے اور حکایات میں آتا ہے احمد بن خضرویہ رحمتہ اللہ علیہ جب بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے آئے تو انہوں نے قبا پہن رکھی تھی اور جب شاہ بن شجاعؒ ابو حفصؒ کی زیارت کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے بھی ''قیمتی'' قبا ہی زیب تن کر رکھی تھی۔ تاہم یہ ان کا معین لباس نہ تھا کبھی کبھی وہ عبا (گدڑی) بھی استعمال فرمایا کرتے تھے اور کبھی پشمینہ کا لباس یا سفید پیراہن بھی پہن لیا کرتے تھے غرضیکہ جیسا لباس میسر آتا پہن لیتے کیونکہ انسان کا نفس جس چیز کا عادی ہو اس چیز سے اسے الفت سی ہو جاتی ہے اور جب کسی چیز کی اسے عادت ہو جائے گویا طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اس طرح وہ اس کے لئے حق سے حجاب بن جاتی ہے اسی لئے تو پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ''خیر الصیام صَومُ اَخِ داؤد علیہ السلام'' (بہترین روزہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ کس طرح ہوتا تھا؟ فرمایا داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن افطار کرتے تھے تا کہ نفس کو نہ روزہ رکھنے کی عادت ہو نہ افطار کرنے کی تا کہ روزہ حق سے حجاب نہ بن جائے اور اس معاملہ میں ابو حامد دست روزی کا حال بالکل درست رہا ہے کہ ان کے مرید جب انہیں کوئی لباس پہناتے تو وہ پہن لیتے لیکن جب کسی مرید کو اس لباس کی حاجت ہوتی تو ان کی حالت ''فراغت'' (مشاہدہ حق میں حالت جذب اور دنیا و مافیہا سے فارغ ہونے) کا انتظار کرتے جب ان پر یہ حالت طاری ہو جاتی تو مرید وہ لباس ان سے اتار لیتے آپ نہ پہنانے والے سے کہتے کہ کیوں پہنا رہا ہے اور نہ ہی اتارنے والے سے کہتے کہ کیوں اتار رہے ہو اور ہمارے اس زمانے میں بھی غزنی میں ایک بزرگ ہیں (اللہ اس

شہر کو محفوظ رکھے) ان کا لقب لو ید رحمۃ اللہ علیہ ہے وہ لباس پہننے میں اپنی پسند یا امتیاز کو جائز نہیں سمجھتے اور اس مقام میں وہ بالکل درست عمل کرتے ہیں۔ باقی یہ بات کہ ان صوفیا کے کپڑے اکثر نیلے رنگ کے ہوتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے طریق کی بنیاد سیر وسیاحت پر رکھی ہے اور سفید لباس سفر میں اپنی حالت پر نہیں رہتا اور اس کا دھونا بھی انتہائی دشوار ہوتا ہے اور ہر شخص اس کی لالچ بھی کر سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیلا لباس اہل ماتم و مصیبت کی علامت اور غمزدہ لوگوں کا لباس ہے اور دنیا محنت کا گھر، مصیبت کا پردہ سرا، غم کا مرکز، جدائی کی جھونپڑی اور آزمائش کا گہوارہ ہے چنانچہ جب حق کے متلاشی لوگوں نے دنیا میں اپنا دلی مقصود نہ دیکھا تو نیلا لباس زیب تن کر لیا اور وصال محبوب کے سوگ میں بیٹھ گئے اور ایک دوسرے گروہ نے اپنے عمل میں کوتاہی۔ اپنے دل میں خرابی اور زمانے میں تضیع اوقات کے علاوہ جب کچھ نہ دیکھا تو نیلا لباس اختیار کر لیا کہ مقصود کا فوت ہو جانا موت سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ کسی نے اپنے عزیز کی موت پر نیلا لباس پہنا تو کسی نے مقصد کے فوت ہو جانے پر نیلا لباس پہن لیا...... اور علم کے ایک جھوٹے مدعی نے ایک درویش سے کہا کہ تو نے یہ نیلا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟ اس نے جواب دیا ''پیغمبر ﷺ سے تین چیزیں دنیا میں باقی رہی ہیں۔ ا۔ فقر، ۲۔ علم اور شمشیر...... تلوار بادشاہوں نے حاصل کی لیکن اس کو موقعہ پر استعمال نہ کیا۔ علم علماء نے اختیار کیا لیکن صرف اس کے حصول پر ہی اکتفا کیا (عمل نہ کیا) اور فقر۔ فقراء کی جماعت نے اختیار کیا۔ اور اسے دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ میں نے ان تینوں گروہوں کی مصیبت پر نیلا لباس پہن لیا ہے۔

اور حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ بغداد کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ آپ کو پیاس محسوس ہوئی ایک دروازے پر آ کر پانی مانگا تو ایک لڑکی پانی کا کوزہ لے کر باہر آئی آپ نے پانی لے کر پیا۔ پھر اچانک اس کے چہرے کو دیکھا تو دل ساقی کے جمال کا شکار ہو گیا۔ آپ نے وہیں ڈیرا لگا دیا حتی کہ جب اس گھر کا

مالک آیا تو آپ نے اسے کہا۔اے جناب! میرا دل پانی پینے کو چاہتا تھا مجھے آپ کے گھر کی ایک لڑکی نے پانی پلایا اور میرا دل لے گئی۔اس نے کہا" وہ میری بیٹی ہے میں اس کو آپ کی زوجیت میں دے دیتا ہوں۔حضرت مرتعشؒ بڑی مسرت کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور نکاح کرلیا۔یہ گھر کا مالک بغداد کے دولت مندوں میں سے تھا۔آپ کو حمام میں بھیجا اور گدڑی اتروا کر عمدہ لباس پہنایا۔جب رات ہوئی حضرت مرتعشؒ اپنے اورادو معمولات ادا کرنے کے لئے نماز میں کھڑے ہوئے اور خلوت میں مشغول عبادت ہوئے تو اسی دوران آپ نے شور مچانا شروع کردیا کہ "ھَاتُوا مُرقعی "(میری گدڑی لاؤ)لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ آپؒ نے کہا"غیب سے میرے دل میں یہ آواز آئی کہ تم نے ایک نگاہ ہمارے غیر کو دیکھا تو ہم نے نیکی کا لباس اور گدڑی تمہارے ظاہر سے چھین لی اب اگر دوسری نظر ہمارے غیر پر ڈالے گا تو تمہارے دل سے محبت کا لباس بھی اتار لیں گے۔جس لباس کے پہننے سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اولیاء اللہ کے ساتھ مناسبت پیدا کرنی مقصود ہو تو اگر اس کے حقوق و آداب کو ملحوظ خاطر رکھ کر زندگی بسر کر سکتا ہے تو تجھے وہ لباس پہننا مبارک ہو۔ورنہ اپنے دین وایمان کی حفاظت کرنی چاہئے اور اولیاء کے لباس میں خیانت روا نہ رکھنی چاہئے کیونکہ سچا مسلمان کسی دوسرے دعوے کے بغیر اس ولی سے بہتر ہے جو ولایت کا جھوٹا مدعی ہو۔

بہر حال گدڑی کا پہنا دو گروہوں کے لئے درست ہے ایک تو دنیا سے تعلقات منقطع کرنے والوں کے لئے اور دوسرا مشتاقان دیدار الٰہی کے لئے...... اور مشائخ طریقت کی عادت کچھ یوں رہی ہے کہ جب کوئی مرید دنیوی تعلقات چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کو تین سال میں تین باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اگر وہ اس بات کو قبول کرلیتا ہے تو اسے مریدی کے لئے قبول فرمالیتے ورنہ کہہ دیتے کہ طریقت اس چیز کو قبول نہیں کرتی ہے وہ تین چیزیں یہ ہیں پہلے سال خدمت خلق، دوسرے سال خدمت حق، اور تیسرے سال اپنے دل کی نگرانی...... اور خدمت خلق وہ اسی وقت کرسکتا ہے کہ اپنے آپ کو خادموں

اور پوری مخلوق کو مخدوموں کے درجہ میں رکھے۔ یعنی کسی امتیاز کے بغیر سب کو اپنی ذات سے بہتر جانے اور سب کی خدمت کو اپنے اوپر واجب سمجھے نہ اس طرح کہ خدمت کرے اور اپنے آپ کو اس خدمت میں مخدوموں پر فضیلت دے کیونکہ یہ بات ایک کھلا نقصان واضح عیب اور زمانہ کی تمام آفتوں میں سے بڑی آفت ہے......اور حق تعالیٰ کی خدمت اس وقت کر سکتا ہے کہ اپنی دنیا و آخرت کی تمام لذتوں کو منقطع کر دے اور محض حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی پرستش کرے کیونکہ اگر آدمی اللہ تعالیٰ سے کسی اور چیز کے حصول کے لئے اس کی عبادت کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی ہی عبادت کرتا ہے نہ کہ خدا تعالیٰ کی......اور اپنے دل کی نگرانی اس وقت کر سکتا ہے کہ اپنے دل کو صرف حق تعالیٰ کی ذات سے وابستہ رکھے، اللہ تعالیٰ کی محبت کے سامنے دنیا کے تمام تفکرات کو دل سے دور کرے اور دل کو غفلت و معصیت کے مواقع سے محفوظ رکھے۔ جب یہ تینوں شرطیں کسی مرید میں پائی جائیں تو پھر ہی گدڑی کا پہننا حقیقی طور پر مسلم ہوتا ہے نہ کہ محض تقلید کے طور پر......
لیکن مرید کو گدڑی پہنانے والا (مرشد) ایسا مستقیم الحال ہونا چاہئے جو طریقت کے تمام نشیب و فراز طے کر چکا ہو، احوال طریقت کا ذوق چکھ چکا ہو۔ اعمال شریعت کا مزہ حاصل کئے ہوئے اور جلال خداوندی کا غلبہ اور جمال حق کا لطف دیکھے ہوئے ہو۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مرید کے حال پر مطلع ہو کہ انجام کار وہ کس مقام تک رسائی حاصل کرے گا۔ واپس لوٹ آنے والوں میں سے ہو گا۔ یا رستہ میں ہی ٹھہر جانے والوں میں سے ہو گا یا منزل مقصود سے ہمکنار ہونے والوں میں سے ہو گا۔ چنانچہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ یہ مرید طریقت کے سفر پر راہ سے ہی واپس لوٹ آئے گا تو اسے صاف کہہ دے کہ وہ اس کو شروع ہی نہ کرے اور اگر وہ راہ میں ہی ٹھہر جائے تو اسے آگے بڑھنے کا حکم دے اور اگر وہ منزل تک پہنچ جائے تو اس کی تربیت و پرورش کرے اور طریق کے مشائخ دلوں کے طبیب ہوتے ہیں اگر طبیب مریض کی بیماری سے واقف ہی نہ ہو سکے تو بیمار کو اپنے (غلط) علاج

سے ہلاک کر دے گا اس لئے کہ وہ اس کی پرورش نہیں کر سکتا اور اس کے خطرہ کے مقام سے واقف نہیں اور اس کی دوا۔ وغذا اس کی بیماری کے خلاف تجویز کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "اَلشَّیخ" فِی قَومِہٖ کَا النَبِی فِی اُمتِہٖ " (شیخ اپنی قوم میں اس طرح ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں) پس انبیاء کرام لوگوں کو بصیرت باطن سے اور ہر شخص کو اپنے اپنے درجے میں رکھتے ہوئے حق تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں اسی طرح شیخ کو بھی پوری باطنی بصیرت کے ساتھ اپنے مریدوں کی تربیت کرنی چاہئے اور ہر ایک کو اس (کی طبیعت) کے موافق دوا اور غذا دینی چاہئے۔ تاکہ دعوت الی الحق کا مقصد حاصل ہو۔ پس جب کوئی ولایت خداوندی کے کمال تک پہنچا ہوا مرشد اپنے مرید کو ان تین سالوں کی تربیت اور ریاضت ومجاہدہ کے بعد گدڑی پہنائے تو جائز ہے۔ اور گدڑی پہننے کی شرط وہی ہے جو کفن پہننے کی شرط ہے کہ جب زندگی کی لذتوں سے امید منقطع کرے اور دل کو ضروریات زندگی سے پاک کر لے اور اپنی تمام عمر خدمت حق کے لئے وقف کر دے اور خواہش نفس سے پوری طرح بیزار ہو اس وقت مرشد اس کو گدڑی جیسی خلعت پہنا کر عزت بخشے اور وہ مرید اس کے حق پر قائم رہے اور اس کا حق ادا کرنے کی پوری سعی کرے اور اپنی خواہشات کو اپنے اوپر حرام کرے۔ گدڑی سے متعلق بزرگوں نے بہت سے اشارات بیان فرمائے ہیں۔

شیخ ابو معمر اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں ایک کتاب لکھی ہے لیکن عام صوفی لوگ اس بارے میں بڑا مبالغہ کرتے ہیں۔ تاہم اس کتاب سے اقوال نقل کرنے کا ہمارا ارادہ نہیں بلکہ ہمیں تو طریقت کے مشکل مسائل کو کھولنا ہے اور گدڑی کے بارے میں بہترین اشارات یہ ہیں کہ گدڑی کا گلا صبر ہے۔ اس کی دو آستینیں خوف ورجا ہے۔ دو تریزیں۔ قبض وبسط سے کمر نفس کی مخالفت سے اس کی دونوں کرسیاں یقین کی صحت سے اور اس کی فراویز اخلاص سے بنی ہونی چاہئیں۔ اور اس سے بھی بہتر اشارات یہ ہیں کہ "گدڑی کا گلا" اہل دنیا کی محبت کے فنا ہو جانے سے دونوں آستینیں نفس کی حفاظت اور دل

کی عصمت سے دونوں تزویریں فقر و برگزیدگی سے۔ اس کی کمر۔ مشاہدہ حق میں محو ہو جانے سے اور کرسی بارگاہ خداوندی میں اطمینان پانے سے اور اس کی فراویز حق تعالیٰ کے مقام وصال میں قرار پکڑنے سے بنی ہونی چاہئے۔

جب باطن کے لئے تو نے اس طرح کی گدڑی تیار کر لی تو اپنے ظاہری وجود کے لئے بھی ایک گدڑی بنا لینی چاہئے، اور میری اس بارے میں ایک مستقل کتاب ہے جس کا نام ''اسرار الخرق والمونات'' ہے ہر مرید کے پاس اس کا ایک نسخہ ہونا چاہئے لیکن مرید نے جب یہ گدڑی پہن لی تو اگر غلبہ حال کے وقت اس گدڑی کو پھاڑ ڈالے تو وہ معذور ہے اور اس کا عذر قابل تسلیم ہے اور اگر اپنے اختیار اور شرائط طریقت کو جانتے ہوئے اس کو پھاڑ ڈالے تو اس کے لئے گدڑی رکھنا مناسب نہیں اور اگر رکھے گا تو یہ بھی زمانے کے دوسرے گدڑی پوشوں کی طرح کا ایک ہوگا جب ان میں سے ہوگا تو باطن (کی صفائی) کے بغیر صرف ظاہر پر اکتفا کرنے والا ہوگا۔ اس معنی کی حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے لباس پھاڑنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ان کا انتقال ہوتا ہے تو اس مقام کے حصول پر شکریہ کے طور پر اس لباس سے باہر آتے ہیں گدڑی کے سوا دوسرے کپڑے صرف ایک مقام کا لباس ہوتے ہیں اور گدڑی طریقت کے تمام مقامات کے لئے مکمل لباس ہے گویا کہ گدڑی طریقت فقر اور صفوت کے جملہ مقامات کا ایک جامع لباس ہے اور ان تمام مقامات سے باہر نکلنا ان سب مقامات سے بیزاری ظاہر کرنے کے مترادف ہے اگرچہ اس مسئلہ کے بیان کرنے کا یہ مقام نہیں کیونکہ اس کو خرقہ اور کشف حجاب السماع کے باب میں بیان کرنا چاہئے۔ پھر بھی یہاں اتنا اشارہ اس لئے کر دیا ہے تاکہ یہ لطیفہ فوت نہ ہو جائے۔ انشاء اللہ اپنے مقام پر اس کی پوری تفصیل بیان کریں گے۔ اور مشائخ طریقت نے یہ بھی فرمایا ہے کہ گدڑی پہنانے والے (مرشد) میں حقیقت و طریقت کی اتنی قوت ہونی چاہئے کہ جب وہ طریقت سے بیگانہ شخص کو شفقت کی نگاہ سے

دیکھے تو وہ طریقت سے آشنا ہو جائے اور اگر وہ کسی گنہگار کو گدڑی پہنا دے تو وہ اولیاء میں سے ہو جائے۔ ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ہمراہ آذربیجان کے ایک شہر میں جا رہا تھا کہ دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا وہ گندم کے ڈھیر پر کھڑے تھے انہوں نے اپنی گدڑیوں کے پلے بچھا دیئے تو کسان نے ان میں کچھ غلہ ڈال دیا۔ شیخ نے ان کی طرف توجہ کی اور یہ آیت پڑھی ''اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ'' (یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی کو خرید لیا۔ پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی نفع نہ دیا اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے) میں نے پوچھا اے شیخ یہ لوگ کس بے حرمتی کی وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہوئے ہیں؟ انہوں نے فرمایا ان کے پیروں کو زیادہ سے زیادہ مرید جمع کرنے کی حرص تھی اور انہیں دنیا کی دولت جمع کرنے کی اور کوئی حرص دوسری حرص سے بہتر نہیں ہوتی اور امور شریعت کو پیش نظر رکھے بغیر دعوت دینا اپنے نفس کی خواہشات کی پرورش کرنا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے باب الطلق کے بازار میں ایک انتہائی خوبصورت یہودی کو دیکھا میں نے کہا ''اے بار خدایا'' اس کو میرے کام میں لے آ کہ تو نے اسے کتنا صاحب جمال پیدا کیا ہے'' ابھی کچھ مدت ہی گذری تھی کہ وہ یہودی میرے پاس آیا اور کہنے لگا! یا شیخ! کلمہ شہادت مجھ پر پیش کیجئے چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہوا۔ اور شیخ ابو علی سینا رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ گدڑی پہننا کس کے لئے جائز ہے؟ آپ نے فرمایا اس شخص کے لئے جو حکومت الٰہیہ کے اسرار سے واقف ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ کے احکام و احوال میں سے دنیا میں جو چیز بھی جاری ہوتی ہے۔ فاعلان قضا وقدر اس کو ان سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ پس گدڑی صالحین کا شعار نیک لوگوں کی علامت اور فقراء و اہل تصوف کا لباس ہے اور فقر و صفوت سے متعلق اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص اولیاء اللہ کے لباس کو دنیوی دولت جمع کرنے کا ذریعہ

اور اپنی خرابیوں کے لئے پردہ بنا لے تو اس کے اس فعل کی وجہ سے اس لباس کے اہل صوفیاء کرام کو موردِ الزام ٹھہرانا مناسب نہیں اور اہل ہدایت کے لئے اتنی مقدار میں بیان ہی کافی ہے کیونکہ اگر میں اس کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو اس کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا...... اور توفیق تو اللہ کی طرف سے ہے۔

پانچواں باب

فقر وصفت میں اختلاف

فقر وصفوت کی تفصیل میں علماء طریقت کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک فقر صفوت سے افضل ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک صفوت، فقر سے افضل ہے، جو لوگ فقر کو صفوت پر فضیلت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ فقر اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ ہر چیز کے فنا اور ماسوی اللہ سے انقطاع کا نام ہے اور صفوت اس کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جب فنا حاصل ہو گئی تو مقامات سب نابود ہو گئے اور یہ مسئلہ بھی فقر وغناء کی طرح ہے اور ان کے متعلق اس سے پہلے گفتگو گزر چکی ہے اور جو لوگ صفوت کو فقر سے اعلیٰ سمجھتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ فقر ایک موجود چیز ہے جس کا نام رکھا جا سکتا ہے اور صفوت تمام موجودات سے تعلق منقطع ہو جانے کو کہتے ہیں اور جملہ موجودات سے انقطاع عین فنا ہے اور فقر عین بقا پس فقر اولیا اللہ کے مقامات میں سے ایک مقام ہوا اور صفوت ان کے کمالات میں سے ایک کمال۔ اور اس زمانہ میں اس کے متعلق کافی طویل بحثیں ہو چکی ہیں اور ہر شخص اس میں عجیب عجیب تاویلیں کرتا اور ایک دوسرے کے سامنے نادر اقوال پیش کرتا ہے۔ فقر وصفوت کی تفصیل میں واقع اختلاف تمام کا تمام صرف لفظی اختلاف ہے۔ حالانکہ مشائخ متفق ہیں کہ محض عبارت نہ فقر ہے اور نہ صفوت پس ان لوگوں نے محض عبارت کو ایک مذہب بنالیا ہے اور طبیعت کو معانی کے ادراک سے خالی کر لیا ہے اور حق کی بات کو نیچے پھینک کر خواہش نفس کی نفی کو نفی عین اور اس کے اثبات کو اثبات عین سمجھ لیا ہے۔ پس اپنی نفسانی خواہش کے قیام کی وجہ سے وہ خود ہی موجود و مفقود اور منفی و مثبت ہیں۔ طریقت جھوٹے مدعیوں کی اس طرح کی واہیات باتوں سے پاک ہے الغرض اولیاء اس بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں کوئی مقام باقی نہیں رہتا بلکہ جملہ درجات ومقامات فانی ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ عبارات اپنے معانی بیان کرنے سے عاجز آ جاتی ہیں اس طرح وہاں۔ پینا۔ ذوق، طمع قوت، ہوشیاری اور بے خودی کوئی چیز بھی باقی

نہیں رہتی۔ اس وقت وہ ایسے نام کے متلاشی ہوتے ہیں جس سے وہ ان معانی کو بیان کر سکیں جو نہ تو کسی اسم کے تحت آئے ہیں نہ کسی صفت کے تحت۔ اس وقت ہر شخص اس نام کو ان معانی پر چسپاں کرتا ہے جو اس کے نزدیک باعظمت ہو۔ لہذا وہاں تقدیم و تاخیر جائز نہیں ہوتی کہ کوئی کہہ سکے کہ یہ مقدم ہے یا وہ مقدم ہے کیونکہ مقدم و موخر ہونا تو ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کا کوئی نام ہو۔ پس ایک گروہ کے دل پر فقر کا نام پر عظمت تھا تو انہیں یہ مقدم معلوم ہوا کیونکہ اس نام کے ساتھ ان کا تعلق تواضع و انکساری کی وجہ سے تھا اور دوسرے گروہ کے لئے صفوت کا نام زیادہ مقدم دکھائی دیتا ہے اور ان کے دل پر اس کی عظمت زیادہ ہے کیونکہ یہ دنیوی، نفسانی آلائشوں اور خرابیوں کو فنا کرنے کا آئینہ دار ہے...... اور ان کی مراد ان دونوں ناموں سے اس معنی کی علامت ظاہر کرنا ہے جس کے بیان کرنے سے عبارت قاصر ہے حتی کہ ایک دوسرے کے ساتھ اس کے بارے میں اشاروں سے بات کرتے ہیں۔ اور انہوں نے تمام علامتوں کے ساتھ اپنی ذات کا کشف کیا۔ اس گروہ نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا کہ حقیقت تصوف کو فقر سے تعبیر کیا جائے یا صفوت سے۔ البتہ اہل عبارت اور اہل زبان و لغت نے اس کے معانی کی حقیقت سے بے خبر ہوتے ہوئے محض عبارت میں کلام کیا اور اسی میں الجھ کر رہ گئے اور ان دو ناموں میں سے ایک کو مقدم اور دوسرے کو موخر کیا حالانکہ یہ دونوں قول محض عبارت (لفظی) ہی تھے...... پس اولیاء کا گروہ تو معانی کی تحقیق کی طرف گیا اور یہ اہل لغت صرف عبارت کے اندھیرے میں ہی کھو کر رہ گئے۔ بہر حال جب کسی شخص کو تصوف کی حقیقت حاصل ہو جائے اور وہ اس کو اپنے دل کی توجہ کا مرکز بنا لے تو اسے فقیر کہیں یا صوفی۔ یہ دونوں اس حقیقت کے اضطراری نام ہیں۔ جو اسم کے تحت نہیں آ سکتی...... اور یہ اختلاف حضرت ابوالحسن سمنون رحمتہ اللہ علیہ کے وقت سے چلا آتا ہے کہ وہ جب کشف کی ایسی حالت میں ہوتے جو بقا کے ساتھ تعلق رکھتی ہے تو فقر کو صفوت پر مقدم رکھتے اور جب مشاہدہ کے اس مقام میں ہوتے جس کا تعلق فنا کے ساتھ ہے تو صفوت کو فقر پر

ترجیح دیتے۔اس وقت ارباب معانی ان سے پوچھتے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ جواب دیتے کہ جب طبیعت کو فنا میں پورا تنزل اور بقا کی طرف کامل بلندی حاصل ہوتی ہے تو میں صفوت کو فقر پر مقدم رکھتا ہوں اور جب میں ایسے مقام میں ہوتا ہوں جس کا تعلق بقا کے ساتھ ہوتا ہے تو صفوت پر فقر کو مقدم رکھتا ہوں کیونکہ فقر بقا کا نام ہے اور صفوت فنا کا۔ گویا میں اپنی ذات سے فنا اور بقا کا دیکھنا اس طرح فانی کر دیتا ہوں کہ میری طبیعت فنا سے بھی فانی ہو جائے اور بقا سے بھی فانی ہو جائے۔ یہ بات عبارت کے اعتبار سے تو بہت اچھی ہے لیکن درحقیقت نہ فنا کو فنا ہے اور نہ بقا کو فنا ہے کیونکہ جو باقی بالآخر فنا ہونے والا ہے وہ خود خالی ہے اور جو فانی انجام کار باقی رہنے والا ہے وہ خود باقی ہے اور فنا ایک ایسا اسم ہے جس میں مبالغہ محال ہے۔ کیونکہ اگر کوئی یوں کہے کہ فنا فنا ہو جاتی ہے تو یہ بات اسی معنی کے وجود کے اثر کی نفی میں مبالغہ ہے کیونکہ فنا میں جب تک کوئی اثر موجود رہتا ہے اس وقت تک وہ بھی فنا نہیں ہوتا۔ اور جب فنائے کلی حاصل ہو جائے تو فنا کی فنا ایک ایسی مہمل اور بے معنی عبارت ہے جس میں تعجب کے سوا کچھ نہیں۔اور بحث و تمحیص کے وقت یہ عبارت اہل لغت کی فضول باتیں ہیں۔ اگر چہ اپنی کتاب ''فنا و بقا'' میں ہم نے بھی اسی انداز میں کچھ لکھا ہے لیکن وہ بچپنے اور احوال کی تیزی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تاہم انشاء اللہ اس کتاب میں پوری احتیاط کے ساتھ اس کے احکام بیان کریں گے۔ علم طریقت میں فقر اور صفوت کا فرق یہی ہے جو بیان ہو چکا لیکن دنیا کے معاملات میں دنیا سے علیحدگی اور اس سے خالی ہاتھ ہونے کے لحاظ سے صفوت اور فقر بالکل مختلف چیزیں ہیں اور اس کی حقیقت محتاجی اور مسکینی کی طرف رجوع کرتی ہے اور مشائخ طریقت کی ایک جماعت کہتی ہے کہ فقیر (محتاج) مسکین سے بہتر ہے کیونکہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے۔''اَلصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِینَ اُحصِرُو فِی سَبِیلِ اللّٰهِ لا یَستَطِیعُونَ ضَربًا فِی الْاَرضِ ''(صدقات ان فقرا کا حق ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے ہیں کہ معاش کے لئے زمین میں چل پھر نہیں سکتے) اس لئے کہ مسکین تو وہ ہوتا ہے جس کے پاس

تھوڑا بہت سامان موجود ہو اور فقیر وہ ہے جس نے اسباب معیشت کو بالکل ہی ترک کر دیا ہو۔ پس فقر عزت ہے اور مسکنت ذلت ہے اور اسباب معیشت رکھنے والا طریقت میں ذلیل ہوتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے "تَعِسَ عَبْدَ الدُّنیا وَتعسَ عبدالدِرهَم وَتَعِسَ عَبدالخَمیصَةِ و الصطیقهِ" (ہلاکت ہو دنیا کے غلام کو۔ ہلاک ہو بندہ درہم کو۔ ہلاکت ہو بندہ دینار کو ہلاکت ہو سیاہ لباس والے کو اور پھٹے لباس کے بندہ کو) اور اسباب معیشت کا تارک عزیز ہوتا ہے کیونکہ اسباب معیشت والے کا اعتماد اسباب معیشت پر ہوتا ہے اور تارک اسباب معیشت کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے اور ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ مسکین فقیر سے افضل ہے اس لئے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے "اَللّٰهُمَّ احیِنِی مِسْکِیناً وَّ اَمِتْنِی مِسْکِیناً وَّاحْشُرنِی فِي زُمْرَةِ المساکین" (اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے روز مسکینوں کے زمرے میں مجھے اٹھا) پیغمبر ﷺ نے جب مسکین کو یاد کیا تو یہ کہا کہ اے میرے رب مجھے موت اور زندگی مسکینوں کی سی عطا فرما اور جب فقر کا ذکر کیا تو فرمایا "وَالفقه اَنْ یَکُون کُفْراً" (فقر اس بات کے قریب ہے کہ کفر ہو جائے) اس سبب کی وجہ سے فقر وہ ہے جو اسباب معیشت سے تعلق رکھتا ہو اور مسکین وہ ہے جو اسباب معیشت سے بالکل تعلق نہ رکھتا ہو اور شریعت میں فقہا کے ایک گروہ کے نزدیک مسکین صاحب بلغہ (زادراہ سامان) اور فقیر بالکل بے سرو سامان ہوتا ہے اور دوسرے گروہ کے نزدیک فقیر صاحب بلغہ اور مسکین بے ساز و سامان ہوتا ہے پس اس جگہ اہل مقامات مسکین کو صفی کہتے ہیں اور یہ اختلاف فقہاء (اللہ ان سے راضی ہو) کے اختلاف سے قریب ہے جس کے نزدیک فقیر بے سامان اور مسکین صاحب سامان ہے اس کے نزدیک فقر صفوت سے زیادہ افضل ہوگا اور جس کے نزدیک مسکین مجرد اور فقیر صاحب بلغہ ہے اس کے نزدیک صفوت فقر سے بہتر ہوگی یہ ہیں صوفیاء کے فقر و صفوت کے درمیان مختصراً اختلاف!

واللہ اعلم بالصواب۔

چھٹا باب

ملامت کا بیان

حقیقت ملامت:۔ مشائخ طریقت کے ایک گروہ نے ملامت کا طریق اختیار کیا ہے۔ اور ملامت کو اخلاص محبت میں بڑا اثر اور پورا عمل دخل حاصل ہے اور حق والے پوری دنیا میں مخلوق کی ملامت کے ساتھ خاص ہیں خصوصاً اس امت کے بزرگ اور رسول اللہ ﷺ کہ جو حق والوں کے مقتدا اور امام اور محبان الٰہی کے پیشرو تھے۔ جب تک ان پر برھان حق (نبوت) کا ظہور نہ ہوا تھا اور وحی الٰہی کی ابتدا نہ ہوئی تھی۔ تمام لوگوں کے نزدیک آپ بزرگ اور نیک نام تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوستی کی خلعت (نبوت) سے سرفراز فرمایا تو خلق نے آپ پر زبان ملامت دراز کی۔ ایک گروہ نے کہا کہ آپ کاہن (نجومی جوتشی) ہیں ایک گروہ نے کہا آپ شاعر ہیں۔ کسی گروہ نے کہا وہ دیوانہ ہے اور ایک گروہ نے کہا کہ وہ جھوٹا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی تعریف میں کہا ہے کہ وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے چنانچہ ارشاد ہے "وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" "(اور وہ ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے) اور اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح چلی آئی ہے کہ جو کوئی اس کی بات کہتا ہے ساری دنیا اس کو ملامت کرنے لگ جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ان کی ملامت میں مشغول ہونے سے بچائے رکھتا ہے اور یہ غیرت الٰہی ہے کہ اپنے دوستوں کو غیروں کی بری نگاہوں سے محفوظ رکھتا ہے تاکہ کسی کی نظر ان کے حال کی اصلی جمال پر نہ پڑ سکے اور اپنے دوستوں کو بھی اس طرح خود بینی (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) سے بچاتا ہے۔ تاکہ نہ وہ اپنا جمال دیکھیں اور نہ غرور وعجب میں مبتلا ہوں اور نہ تکبر وخود بینی کی برائی میں پڑیں۔ پس اس لئے مخلوق ان پر مقرر ہو جاتی ہے تاکہ ان پر زبان ملامت دراز

کڑے اوران کے اندر نفس لوامہ کو بھی ودیعت کر دیا گیا ہے تا کہ ان کے ہر فعل پر وہ ان کو ملامت کرتا رہے۔ اگر غلطی کا ارتکاب ہوتو وہ غلطی پر ملامت کرے اور اگر نیکی کا کام کریں تو اس میں کوتاہی پر اپنے آپ کو ملامت کریں اور راہ حق میں یہ اصل ایک ایسی قوی ہے کہ طریقت میں اس سے زیادہ مہلک اور مشکل کوئی آفت اور حجاب نہیں کہ بندہ اپنی ذات میں کمالات واوصاف دیکھ کر غرور میں مبتلا ہو جائے۔

اور یہ غرور اصل میں دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے پہلی مخلوق کی تعریف اور مدح سے اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ بندہ کا کردار لوگوں کو پسند آتا ہے تو وہ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں تو وہ اس پر مغرور ہو جاتا ہے اور دوسری چیز یہ کہ کسی کا کردار لوگوں کو پسند آتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ کو تحسین کے قابل سمجھنے لگتا ہے اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اپنے دوستوں پر یہ راستہ بند کر دیا ہے حتیٰ کہ ان کے کام نیک بھی ہوں تو بھی لوگ انہیں پسند نہیں کرتے اس لئے کہ وہ حقیقت حال سے ناواقف ہوتے ہیں اور اگر چہ راہ طریقت میں ان کے مجاہدے بہت زیادہ تھے پھر بھی وہ اپنی طاقت اور قوت سے انہیں خیال میں نہ لاتے تھے اور نہ اپنے آپ کو ان مجاہدوں کی وجہ سے پسند کرتے تھے تا کہ عجب اور غور سے محفوظ رہیں...... پس جو شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہو مخلوق اسے پسند نہیں کرتی اور جو بذات خود برگزیدہ بنتا ہو حق تعالیٰ اسے برگزیدہ نہیں بناتے۔ چنانچہ ابلیس کو مخلوق نے بھی پسند کیا اور فرشتوں نے بھی قبول کر لیا اور اس نے خود بھی اپنے آپ کو پسند کیا لیکن چونکہ وہ حق تعالیٰ کا پسندیدہ نہیں تھا اس لئے ان سب کا پسند کرنا اس کے لئے لعنت کا ثمرہ بنا لیکن اس کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے پسند نہ کیا اور کہنے لگے "اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا" (کیا آپ زمین میں اس کو پیدا کریں گے جو اس میں فساد پھیلائے گا؟) اور آدم علیہ السلام نے بھی خود اپنے آپ کو پسند نہ کیا اور کہا "رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا" (اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا) لیکن چونکہ

حضرت آدم علیہ السلام حق تعالیٰ کے پسندیدہ تھے اس لئے فرمایا ''فَنَسِیَ اٰدَمُ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا'' (پس آدم بھول گیا اور ہم نے اس کے لئے ارادہ نہیں پایا) اس لئے فرشتوں کا ان کو اور خود ان کا اپنے آپ کو ناپسند کرنا ان کے لئے حق تعالیٰ کی رحمت کا پھل لایا۔ تا کہ دنیا والے جان لیں کہ ہمارا حق تعالیٰ کا) مقبول مخلوق کے نزدیک متروک اور مخلوق کا مقبول ہمارے نزدیک نامقبول ہوتا ہے۔ اس لئے مخلوق کی ملامت دوستانِ حق کی غذا ہے کیونکہ اس میں قبولیت کی علامات ہیں اور حق تعالیٰ کے دوستوں کا مشرب بھی یہی ہے کہ مخلوق کی ملامت قربِ الٰہی کی علامت ہے اور جس طرح لوگ اپنی مقبولیت پر خوش ہوتے ہیں اولیاء اللہ مخلوق کے رد کرنے پر خوش ہوتے ہیں اور روایات میں پیغمبر ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے جبریل علیہ السلام سے اور انہوں نے خداوند تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا ''تَحْتَ قَبَائِی لَایَعْرِفُهُمْ غَیْرِی اِلاَّ اَوْلِیَائِی '' (میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں جنہیں میرے مقرب دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا)

پہلی فصل

ملامت کے اسباب:۔ تاہم ملامت کے تین اسباب ہیں (۱) راست روی، (۲) ارادہ کرنا، (۳) ترک کرنا۔ اور راست روی پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اچھے کام کرتا اور دین کی حفاظت کرتا اور شریعت کے معاملات کی رعایت کرتا ہے لیکن اس حالت میں لوگ اس کو ملامت کرتے ہیں۔ لوگوں کا اس کے بارے میں یہ عمل ہوتا ہے لیکن وہ ان سب سے فارغ یعنی بے پرواہ رہتا ہے اور ان کو ملامت کی توجہ نہیں دیتا...... اور ارادہ کرنے پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ جب کسی شخص کو لوگوں میں بڑا رتبہ حاصل ہو جائے اور ان کے درمیان نیکی کی علامت بن جائے اور پھر اس کا دل رتبہ کی طرف جھکے اور اس کی طبیعت لوگوں میں لگ جائے اس کے بعد وہ خود چاہے کہ اپنے دل کو لوگوں سے فارغ کر کے خدا

تعالیٰ کی طرف مشغول ہو جائے اور بتکلف ایسا کام کرے جس کا کرنا شریعت کے خلاف تو نہ ہو لیکن لوگ اس کی وجہ سے اس پر ملامت کریں اور اس سے نفرت کرنے لگیں۔ مخلوق میں یہ اس کی طرف سے قصد ملامت کی راہ ہے جس کی وجہ سے لوگ اس سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور ترک کرنے پر ملامت کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو کفر اور گمراہی طبعاً پسند آ جائے اور اس کی خاطر شریعت سے کنارہ کش ہو جائے اور اس کی متابعت چھوڑ دے اور یوں کہے کہ یہ تو لوگوں کی ملامت کا ایک راستہ ہے جو میں نے اختیار کیا ہے...... لیکن جو شخص دین میں راست روی، عدم منافقت اور ترک ریا کاری کا راستہ اختیار کرتا ہے اسے لوگوں کی ملامت کا کوئی خوف نہیں ہوتا وہ ہر قسم کے حالات میں اپنے قاعدہ پر رہتا ہے اور اس کو جس نام سے بھی پکارا جائے اس کے لئے برابر ہوتا ہے۔

اور میں نے حکایات میں پایا ہے کہ شیخ ابوطاہر حراقی رحمتہ اللہ علیہ ایک روز گدھے پر سوار بازار میں جا رہے تھے اور ایک مرید نے گدھے کی لگام پکڑ رکھی تھی۔ ایک شخص نے آواز دی کہ زندیق (بے دین) پیر آیا ہے۔ جب اس مرید نے یہ آواز سنی تو عقیدتمندی کی غیرت کے سبب اس شخص کو زخمی کرنے کا ارادہ کیا جس سے تمام بازار والے جوش میں آ گئے۔ شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے مرید سے کہا کہ اگر تو خاموش رہے تو میں تجھے ایک ایسی چیز سکھاؤں گا کہ تو ان کی تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ مرید خاموش ہو گیا جب اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچے تو مرید سے فرمایا وہ صندوق اٹھالا۔ وہ اٹھا لایا۔ اس صندوق میں خطوط تھے۔ صندوق کے جس حصے میں تمام لوگوں کے لکھے ہوئے خطوط تھے نکال کر مرید کے سامنے رکھ دیئے اور فرمایا ''غور سے دیکھ! ہر شخص کی طرف سے میری طرف بھیجا ہوا خط موجود ہے ان میں سے ایک نے مجھے شیخ الاسلام کے لقب سے مخاطب کیا ہے۔ ایک نے شیخ زکی ایک نے شیخ زاہد اور ایک نے شیخ الحرمین وغیرہ القاب سے مجھے مخاطب کیا ہے اور یہ سب میرے القاب ہیں نام نہیں۔ حالانکہ میں ان میں سے کسی لقب کے لائق نہیں ہوں ہر کسی نے اپنے

اعتقاد کے مطابق مجھے لقب دیا ہے اور اگر اس بے چارے نے اپنے اعتقاد کے مطابق مجھے کوئی بات کہی ہے اور میرے لئے کوئی لقب مقرر کیا ہے تو اس پر یہ جھگڑا کیوں اٹھایا ہے؟...... اور باقی یہ کہ جس شخص نے ملامت کو قصداً اختیار کرنے اور جاہ پسندی وعزت کو ترک کر دینے کا راستہ اپنایا ہو وہ ایسے ہی ہے جیسا کہ روایت کی گئی ہے کہ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں ایک روز اپنے کھجوروں کے باغ سے واپس آ رہے تھے اور ایندھن کا گٹھڑ اپنے سر پر اٹھا رکھا تھا حالانکہ آپ کے چار سو غلام تھے۔لوگوں نے کہا اے امیر المومنین یہ کیا حال ہے؟ فرمایا ''اُرِیْدُ اَنْ اُجَرِّبَ نَفْسِی'' (میں نے اپنے نفس کو آزمانا چاہا) میرے غلام ہیں اور وہ یہ کام بھی کر سکتے ہیں لیکن میں نے چاہا ہے کہ اپنے نفس کا تجربہ کروں تا کہ مخلوق کے درمیان میرا مرتبہ اس نفس کو کسی کام کے کرنے سے روک نہ لے اور ملامت کے اثبات میں یہ حکایت بالکل واضح ہے اور اسی معنی میں امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی بھی ایک حکایت بیان کرتے ہیں۔اس کتاب میں جہاں ان کا تذکرہ آئے گا وہاں اس حکایت کو تلاش کرنا...... نیز بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ سفر حجاز سے واپسی پر ایک شہر سے گزرے تو شور ہوا کہ بایزید تشریف لاتے ہیں۔شہر کے تمام لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آپ کو عزت وتکریم کے ساتھ شہر میں لائیں۔آپ نے جب دیکھا کہ شہر کے لوگ ان کے سامنے آ گئے ہیں تو آپ کا دل ان کی رعایت میں مشغول ہو گیا اور توجہ حق تعالیٰ سے ہٹ گئی اور آپ پریشان ہو گئے جب آپ بازار میں پہنچے تو اپنی آستین سے ایک روٹی نکالی اور کھانے لگے۔چونکہ یہ رمضان کا مہینہ تھا اس لئے یہ دیکھ کر لوگ آپ کے پاس سے ہٹ گئے اور آپ کو تنہا چھوڑ دیا حالانکہ آپ مسافر تھے جو مرید آپ کے ساتھ تھا۔آپ نے اس سے فرمایا ''تم نے دیکھا کہ میں نے شریعت کے ایک مسئلہ پر عمل نہیں کیا تو تمام مخلوق نے مجھے آزاد چھوڑ دیا ہے، اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں ملامت کے

لئے ایسا کام کرنا چاہئے جو بظاہر خلاف عادت ہو اور لوگ اس سے نفرت کریں چنانچہ اب اگر کوئی شخص چاہتا ہو کہ لوگ اسے ملامت کریں تو اسے کہو کہ وہ جائے اور دو رکعت نفل بہت طویل ادا کرے یا دین پر پوری طرح عمل کرے تمام لوگ یک لخت اسے منافق اور ریا کار کہیں گے لیکن جو شخص ملامت کے حصول کے لئے شریعت کو ترک کرنے کا راستہ اختیار کرے اور شریعت کے خلاف کوئی امر اختیار کر کے یوں کہے کہ یہ میں نے ملامت کا طریق اختیار کیا ہے تو اس کا یہ کام کھلی گمراہی بہت بڑی خرابی اور دنیا کی ہوس پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ اس دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا مقصد لوگوں کی سادگی اور بے توجہی کی وجہ سے ان میں مقبول ہونا ہے اس لئے کہ کوئی شخص لوگوں میں اس وقت تک مقبول نہیں ہوسکتا جب تک ان کے رد کا ارادہ نہ کرے اور ایسے فعل کا ارتکاب نہ کرے جس کو وہ رد کرتے ہوں۔ غیر مقبول آدمی کا رد کا تکلف کرنا درحقیقت اپنے مقبول بننے کے لئے ایک بہانہ ہے۔ مجھے (علی بن عثمان) ایک مرتبہ ان جھوٹے مدعیوں میں سے ایک کے ساتھ صحبت کا اتفاق ہوا ایک دن اس نے ایک غلط کام کا ارتکاب کیا اور ملامت کو اس کے لئے عذر کے طور پر پیش کیا۔ تو ایک شخص نے اس سے کہا کہ یہ تو کوئی چیز نہ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اس بات پر اس نے غصہ کیا" میں نے کہا" اے زاہد! اگر تو حصول ملامت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس دعویٰ میں سچا ہے تو اس جوان کا تیرے فعل کو قبول نہ کرنا تو تیرے مذہب کی تاکید ہی ہے اور جب وہ تمہارے دعویٰ کے مطابق تمہارے طریق میں تمہاری موافقت بھی کر رہا ہے تو یہ غصہ اور جھگڑا کیسا؟ تمہارا یہ معاملہ تو ملامت کے مقابلہ میں دعوت سے زیادہ مشابہ ہے اور جو شخص لوگوں کو شریعت کے کسی کام کی دعوت دے اس کے لئے قطعی دلیل کی ضرورت ہے اور سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام کی حفاظت ہی سب سے بڑی قطعی دلیل ہے اور میں جب دیکھتا ہوں تو علی الاعلان ایک فریضہ کو ترک کر رہا ہے اور لوگوں کو اس کی گویا دعوت بھی دے تو تمہارا یہ کام دائرہ اسلام سے باہر ہے۔

دوسری فصل

جان لو! کہ مذہب ملامت کو اپنے دور کے شیخ ابوحمدون قصار رحمۃ اللہ علیہ نے رواج دیا ہے اور ملامت کی حقیقت میں ان کے بہت سے لطائف ہیں انہی سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''اَلْمَلَامَةُ ترکُ السلامة'' (ملامت، سلامتی کو ترک کرنے کا نام ہے اور جب کوئی شخص سلامتی کو ترک کر کے مصائب کے لئے کمربستہ ہو جائے اور جلال خداوندی کے ظہور اور نیک انجام حاصل کرنے کی امید پر اپنی پسندیدہ چیزوں اور اپنی راحتوں سے بیزاری اختیار کرے یہاں تک کہ لوگوں کے ردوانکار کی وجہ سے مخلوق سے مایوس و ناامید ہو جائے تو اس کی طبیعت لوگوں سے الفت و محبت قطع کر لیتی ہے اور وہ جتنا لوگوں سے قطع تعلق کرتا ہے اتنا ہی حق تعالیٰ سے قریب ہو جاتا ہے۔ پس جس چیز کی طرف لوگوں کی توجہ ہوتی ہے اور اس میں ان کی سلامتی موجود ہوتی ہے اہل ملامت اس کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں وہ اس لئے اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں تاکہ اہل ملامت کا غم لوگوں کے غم سے مختلف اور ان کے مقاصد لوگوں کے مقاصد کے خلاف ہوں...... وہ اپنے اوصاف میں یکتا اور بے مثل ہوتے ہیں جیسا کہ احمد بن فاتک رحمۃ اللہ علیہ حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے ان سے پوچھا ''مَنِ الصُّوفِی قال وَحدانی الذاتُ'' (صوفی کون ہے؟ تو فرمایا جو اپنی ذات میں یکتا ہو)...... نیز ابوحمدون رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے ملامت کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا اگرچہ اس کی راہ لوگوں پر دشوار اور مشکل ہے تاہم اس کے متعلق کسی قدر ہم بیان کرتے ہیں ''رَجَاءُ المُرجِیَّةِ وَخَوفُ القدرِیَةِ'' (فرقہ مرجیہ کی امید اور فرقہ قدریہ کے خوف کا نام ملامت ہے) یعنی فرقہ مرجیہ کی طرح بعض امور میں شریعت کی خلاف ورزی کے باوجود مغفرت کی امید رکھنا اور فرقہ قدریہ کی طرح عمل میں کوتاہی کی وجہ سے مغفرت کے بارے میں ڈرتے رہنا، ملامت والوں کی

صفت ہے اور اس میں ایک رمز ہے اور وہ یہ کہ طبیعت انسانی لوگوں کے نزدیک مرتبہ حاصل ہونے کی وجہ سے جتنا درگاہ الٰہی سے نفرت کرنے لگتی ہے اتنا اور کسی وجہ سے نہیں کرتی۔ اور کسی آدمی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کر دے تو وہ اس کو دل و جان سے پسند کرنے لگے اور اسی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ سے دور ہو جائے پس خوف کرنے والا یہ کوشش کرتا ہے کہ خطرے کے مقام سے بھی دور رہے اور طالب کے لئے اس کوشش میں دو خطرے پیش آتے ہیں۔ ایک لوگوں کے حجاب کا خوف اور دوسرا اس فعل سے روکنا جس کی وجہ سے لوگوں نے اسے گنہگار سمجھا اور اس پر ملامت کی۔ یہ نہ تو ان کے نزدیک مرتبہ حاصل کر کے مطمئن ہوتا ہے اور نہ اس بات کا سامان ہے کہ ان کو اپنی ملامت سے گنہگار گردانے۔ پس ملامتی کو چاہئے کہ پہلے جس معاملہ میں لوگ اسے ملامت کرتے ہیں اس کے متعلق دنیا و آخرت کا جھگڑا ختم کرے اور دل کی نجات کے لئے ایسا فعل اختیار کرے جو شریعت میں نہ کبیرہ ہو نہ صغیرہ تا کہ لوگ اسے رد کریں حتی کہ اس شریعت کے معاملات میں اس کا خوف قدریوں کے خوف کی طرح اور ملامت کرنے والوں کے معاملہ میں اس کی مغفرت کی امید مرجیوں کی امید کی طرح ہو...... درحقیقت کسی چیز کی محبت ملامت کی محبت سے بہتر نہیں ہوتی کیونکہ دوست کی ملامت کا دوست کے دل پر اثر نہیں ہوتا اور دوست کا گزر کوچہ دوست کے سوا کہیں ہوتا اور دوست کے دل میں غیروں کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ ایک سچا عاشق۔ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہتا ہے ''اَجِدُ الْمَلَامَةَ فِی ھَوَاکَ لَذِیْذٌ لِاَنَّ الْمَلَامَةَ رَوْضُ الْعَاشِقِیْنَ وَنُزْھَةُ الْمُحِبِّیْنَ وَرَاحَةُ الْمُشْتَاقِیْنَ وَسُرُوْرُ الْمُرِیْدِیْنَ'' (میں تیری محبت میں ملامت کو لذیذ محسوس کرتا ہوں کیونکہ ملامت عاشقوں کا باغیچہ دوستان حق کی سیرگاہ مشتاقان خدا کی راحت اور مریدین حق کا سرور ہے) اور یہ گروہ دونوں عالم (جنوں اور انسانوں) میں دل کی سلامتی کے لئے اپنے بدن کی ملامت اختیار کرنے میں مخصوص ہے، اور مخلوق میں سے کسی مقرب، کسی کروبی اور کسی روحانی کو یہ درجہ حاصل نہیں

اوراس امت کے صوفیا اور دنیا سے قطع تعلق کے راستے پر چلنے والوں کے سوا پہلی امتوں کے عابد، زاہد اور طالبان و راغبان حق بھی اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکے...... لیکن میرے نزدیک ملامت کی طلب عین ریا ہے اور ریا عین منافقت کیونکہ ریا کار بتکلف ایسے راستے پر چلتا ہے کہ لوگ اسے قبول کرلیں اور ملامتی صوفی بتکلف ایسے راستے پر چلتا ہے کہ لوگ اس کورد کردیں اور دونوں گروہ لوگوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں اور اس سے باہر نہیں نکل سکے یہاں تک ان میں سے ریا کاروں کے گروہ نے یہ عمل اختیار کیا ہے تو سلامتی صوفیوں کے گروہ نے وہ عمل اختیار کرلیا ہے...... اور حقیقی درویش کے دل میں تو لوگوں کا خیال تک نہیں گزرتا اور جب اس کا دل مخلوق سے قطع تعلق کئے ہوئے ہوتا ہے تو وہ ان دونوں راستوں سے فارغ اور بے نیاز ہوتا ہے اور ان میں سے کسی چیز کا پابند نہیں ہوتا۔ مجھے (مصنف) ایک دفعہ ماوراالنہر کے ایک ملامتی صوفی کے ساتھ صحبت کا اتفاق ہوا اور جب میں خوش ہوا تو میں نے کہا اے بھائی! ان ناپسندیدہ افعال سے تمہاری مراد کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ''لوگوں کو اپنی ذات میں فنا کردینا''۔ میں نے کہا ''کہ یہ مخلوق تو بے شمار ہے اور اپنی تھوڑی سی عمر میں وہ زمانہ اور درجہ حاصل نہیں کر سکے گا کہ لوگوں کو اپنے حال میں فنا کر سکے لہذا تو اپنی ذات کو مخلوق میں فنا کردے تا کہ اس ہر وقت کی مشغولیت سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اور ایک گروہ وہ ہے جو مخلوق میں مشغول ہوتا ہے لیکن خیال کرتا ہے کہ خلقت ان میں مشغول ہے پس کوئی شخص تجھے نہیں دیکھتا تو بھی اپنے آپ کو نہ دیکھ، جب زمانہ کی خرابی خود تمہاری آنکھ سے ہے تو تجھے غیر سے کیا سروکار ہے؟ وہ شخص دانشمند نہیں جسے پرہیز سے شفا طلب کرنی ہو لیکن وہ دوا سے طلب کرتا رہے اور ایک گروہ ایسا ہے جو کسر نفسی کے لئے ملامت کو اختیار کرتا ہے تا کہ لوگوں کے سامنے ذلت کی وجہ سے اس کا نفس موذب ہو جائے اور وہ اپنے نفس سے اپنا انصاف طلب کرے کیونکہ ان کے نزدیک سب سے زیادہ اچھا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ اپنے نفس کو ذلت وخواری میں دیکھیں۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ

علیہ کے بارے میں حکایت نقل کرتے ہیں کہ کسی شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا کبھی آپ کو آپ کی مراد بھی حاصل ہوئی ہے؟ فرمایاہاں! دومرتبہ ایک مرتبہ تو میں کشتی میں سوار تھا اور وہاں کوئی بھی مجھے پہچانتا نہ تھا۔ ایک پھٹی ہوئی گدڑی میرا لباس تھا اور بال بڑھے ہوئے تھے کشتی والے سبھی مجھ پر ہنستے اور تمسخر اڑاتے تھے۔ اور کشتی میں ہمارے ساتھ ایک مسخرہ تھا وہ بار بار آتا اور میرے سر کے بال پکڑ کر کھینچتا اور تمسخر کے طور پر مجھے ذلیل کرتا تھا اور میں اس وقت اپنے آپ کو بامراد پاتا تھا اور اپنی اس حالت پر خوش ہوتا تھا حتی کہ میری یہ خوشی ایک انتہا تک پہنچ گئی اور وہ یوں کہ وہ مسخرا اٹھا اور اس نے مجھ پر پیشاب کر دیا...... دوسری مرتبہ سخت بارش کے دوران میں ایک گاؤں میں پہنچا اس طرح کہ میری گدڑی پانی سے تر ہو چکی تھی اور موسم سرما کی سردی مجھ پر غالب ہو چکی تھی۔ میں ایک مسجد میں چلا گیا لوگوں نے مجھے وہاں نہ رہنے دیا۔ میں دوسری مسجد میں گیا تو وہاں بھی لوگوں نے رہنے نہ دیا میں پھر تیسری مسجد میں چلا گیا وہاں بھی لوگوں نے نہ رہنے دیا اور میں عاجز ہو گیا اور میرے دل پر سردی نے شدت اختیار کر لی۔ تو میں ایک حمام کی بھٹی میں گھس گیا اور اپنا دامن اس کی آگ پر تان دیا۔ اس کا دھواں مجھ پر پڑتا رہا اور میرا منہ اور کپڑا اس کی وجہ سے سیاہ ہو گیا اس رات بھی میں اپنی مراد کو پہنچا تھا۔

اور خود مجھے (علی بن عثمان ہجویریؒ) بھی ایک مرتبہ ایک واقعہ پیش آیا تھا اور میں نے اس امید پر اس کے لئے بڑی جدوجہد کی کہ وہ حل ہو جائے لیکن وہ حل نہ ہوا۔ اور اس سے پہلے بھی مجھے اسی طرح کا ایک مشکل مسئلہ پیش آ چکا تھا جس کے لئے میں شیخ بایزید رحمتہ اللہ علیہ کی قبر پر جا کر مجاور ہوا تب وہ حل ہوا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں نے وہاں کا ہی ارادہ کیا اور تین مرتبہ ان کی تربت پر جا کر مجاور ہوا تاکہ وہ حل ہو جائے لیکن پھر بھی حل نہ ہوا جبکہ میں اس کو حل کرنے کی کوشش میں روزانہ تین مرتبہ غسل اور تیس مرتبہ وضو کرتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ حل نہ ہوا تو میں اٹھا اور خراسان کے سفر کا ارادہ کیا۔ سفر کے دوران ایک رات میں

برکش نام کے ایک گاؤں میں پہنچا وہاں ایک خانقاہ تھی جس میں صوفی نما لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی۔ اور میں ایک کھردری بوسیدہ گدڑی پہنے ہوئے تھا اور اہل رسم (صوفیوں) کے سامان میں سے ایک عصا اور ٹاٹ کے علاوہ میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ میں اس جماعت کی نگاہوں میں سخت حقیر معلوم ہوا کسی نے مجھے نہ پہچانا اور وہ آپس میں رسم کے انداز میں کہتے کہ یہ شخص ہماری جنس میں سے نہیں۔ ادر سچی بات بھی وہی تھی جو وہ کہہ رہے تھے۔ کہ میں ان میں سے نہ تھا۔ لیکن مجھے مجبوراً اس رات وہاں رہنا تھا۔ مجھے تو انہوں نے ایک بالا خانے پر بٹھایا اور خود اس سے اوپر والے بالا خانے پر چڑھ گئے گویا میں فرش پر بیٹھا تھا۔ مجھے تو انہوں نے ایسی سوکھی روٹی دی جو پرانی ہونے کی وجہ سے سبز ہو چکی تھی۔ اور وہ خود ایسا کھانا کھا رہے تھے کہ اس کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا اور بالا خانے سے میرے ساتھ طنز آمیز قسم کی باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہو گئے تو خربوزہ کھاتے ہوئے اپنی خوش طبعی میں اور میری حقارت کے لئے اس کے چھلکے مجھ پر پھینک رہے تھے..... اور میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ بار خدایا اگر انہوں نے تیرے دوستوں کا سا لباس نہ پہن رکھا ہوتا تو میں ان سے یہ ذلت کبھی برداشت نہ کرتا۔ اور وہ جس قدر ان کی طعن مجھ پر زیادہ ہوتی اسی قدر میں دل میں خوش ہوتا یہاں تک کہ اس ذلت کا بوجھ بخوشی برداشت کرنے کی وجہ سے وہ مشکل مسئلہ مجھ پر حل ہو گیا اور اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مشائخ طریقت نے جاہلوں کو اپنے اندر گھسنے کا موقع کیوں دیا اور ان کی ذلت کا بار کس لئے برداشت کرتے ہیں..... پس ملامت کے احکام یہی تھے جن کو میں نے اللہ تبارک تقدس کی توفیق سے پوری تحقیق کے ساتھ بیان کر دیا۔

سا تواں باب

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صوفیا کے ائمہ

اب ہم صوفیاء کے اماموں کے حالات بیان کرتے ہیں اور صحابہؓ میں سے بھی ان مہاجرین و انصار کے بعض احوال کا تذکرہ کرتے ہیں جنہوں نے ایمان قبول کرنے میں دوسروں پر سبقت اور اولیت حاصل کی کہ وہی انبیاء علیہم السلام کے بعد تصوف کے معاملات میں اہل تصوف کے پیشرو، انفاس میں ان کے پیشوا اور احوال میں ان کے قائد ہوئے ہیں اس تذکرہ سے تمہاری مراد ثابت ہو جائے گی انشاء اللہ عزوجل۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

ایک ان صحابہؓ میں سے اسلام کے شیخ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام مخلوق میں سے افضل۔ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ اول مسلمانوں کے امام اہل تجرید کے سردار، ارباب تفرید کے شہنشاہ اور آفات انسانی سے دور امیر المومنین حضرت ابوبکر عبداللہ بن عثمان الصدیق رضی اللہ عنہما ہیں۔ کہ ان کی کرامتیں مشہور ہیں اور حقائق و معاملات میں ان کے خوارق اور دلائل ظاہر ہیں اور تصوف کے باب میں آپ کے بہت سے بے مثال واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مشائخ طریقت آپ کی روایتوں اور حکایتوں کی قلت کی وجہ سے آپ کو ارباب مشاہدہ کا سردار اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی دین کے معاملات میں شدت اور پختگی کی بنا پر اہل مجاہدہ کا پیشوا مانتے ہیں۔ اور صحیح احادیث میں لکھا ہوا اور اہل علم میں مشہور ہے کہ حضرت صدیق اکبر رات کی نماز میں قرآن مجید آہستہ آواز میں تلاوت کرتے اور حضرت عمرؓ بلند آواز میں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تم نرم آواز میں کیوں پڑھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ ''اُسمِعُ مَنْ اُناجِیْهِ'' (میں اس کو سناتا ہوں جس سے میں راز میں بات کہہ سکتا ہوں) کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے غائب نہیں ہے اور اس کی

سماعت کے نزدیک تو آہستہ یا زور سے پڑھنا دونوں طرح برابر ہے۔ اور جب حضور علیہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا تو انہوں نے جواباً عرض کیا ''اُوْقِظُ الْوَسْنَا اَیْ النَّائِم وَاَطْرُدُ الشَّیْطَانَ'' (میں سونے والوں کو جگاتا اور شیطان کو ہٹاتا ہوں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حالت ان کے مجاہدے کا پتہ دیتی ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وہ بات ان کے مشاہدے کی علامت ہے، اور مقام مجاہدہ مقام مشاہدہ کے مقابل میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے جتنی ایک قطرہ کو سمندر کے مقابلے میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے تو پیغمبر علیہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ ''ھَلْ اَنْتَ حَسَنَةٌ مِنْ حَسَنَاتِ اَبِی بَکر'' (ابوبکرؓ کی نیکیوں کے مقابلہ میں تیری حیثیت ایک نیکی جتنی ہے) غور کرو کہ جب حضرت عمرؓ کو جو اسلام کی عزت ہیں کی حیثیت حضرت ابوبکرؓ کے نیکیوں کے مقابلہ میں ایک نیکی جتنی ہے تو باقی اہل جہاں کی آپ کے مقابلہ میں کیا حقیقت ہوگی۔ آپ کے بارے میں روایت ہے کہ فرمایا '' دَارُنَا فَانِیَةٌ'' وَاحْوَالُنَا عَارِیَةٌ'' وَ اَنفَاسُنَا مَعْدُودَةٌ'' وَکَسَلُنَا مَوْجُوْدَةٌ'' ''(ہمارا گھر فنا ہونے والا ہے، ہمارے سب احوال ناپائیدار ہیں۔ ہمارے سانس گنتی کے ہیں اور ہماری سستی موجود ہے) پس فانی گھر کو آباد کرنا جہالت ہے اور ناپائیدار حالت پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے اور گنتی کی چند سانسوں پر دل لگالینا غفلت ہے اور سستی کو دین کہنا خسارا ہے کیونکہ جو چیز مستعار ہے واپس ہو جائے گی جو چیز جانے والی ہے نہ رہے گی جو چیز شمار کی جا سکتی ہے ایک دن ختم ہو جائے گی اور کاہلی کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ حضرت رضی اللہ عنہ نے ہمیں خبر دی کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں اس قابل نہیں کہ دل کو ان میں مشغول کیا جائے۔ کیونکہ جب تو فانی میں مشغول ہو تو باقی سے حجاب میں ہو جائے گا۔ چونکہ نفس اور دنیا دونوں حق تعالیٰ سے حجاب کا سبب بنتی ہیں اس لئے دوستان حق نے ان دونوں سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اور جب انہوں نے جان لیا کہ یہ سب چیزیں مستعار ہیں اور مستعار چیز دوسروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ تو دوسروں کی ملک میں تصرف سے ہاتھ کھینچ لیا...... نیز آپؓ

ہی کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ اپنی مناجات میں آپ نے فرمایا ''اَللّٰھُمَّ ابْسُطْ فِی الدنیا وَزَھِّدْنی عنھا'' (اے اللہ! میرے لئے دنیا فراخ کر دے اور مجھے اس سے بے پرواہ بنا دے) پہلے تو آپ نے دعا کی کہ دنیا مجھ پر فراخ کر دے اور پھر فرمایا کہ مجھے اس کی آفت سے محفوظ رکھ۔ اس میں ایک خاص رمز ہے اور وہ یہ کہ پہلے دنیا عطا فرما تا کہ میں اس پر تیرا شکر ادا کروں۔ پھر مجھے اس بات کی توفیق مرحمت فرما کہ میں تیری رضا جوئی کے لئے اس سے دست بردار اور کنارہ کش ہو جاؤں تا کہ صبر کا مقام مجبوری اور اضطراری طور پر نہیں بلکہ اختیاری طور پر حاصل کرلوں، اور آپ کا یہ قول اس دنیادار پیر کا رد ہے جس نے کہا تھا کہ جس کا فقر مجبوری سے ہو وہ اس سے بہتر ہے جس کا فقر اپنے اختیار سے ہو۔ کیونکہ اگر فقر اضطراری ہو تو گویا فقیر اس کا معمول ہوا اور اگر اختیاری ہو تو گویا فقر اس فقیر کا معمول ہوا اور چونکہ پہلی صورت میں اس کے کسب اور فعل کو فقر کے حصول میں کوئی دخل نہیں اس لئے وہ اس شخص سے بہتر ہے جس نے بتکلف فقر کو اختیار کیا ہو...... اور ہم کہتے ہیں کہ فقر کا عمل تو اس وقت ظاہر ہوتا جب غنا کی حالت میں اس کے دل پر فقر کا ارادہ غالب ہو جائے اور اس شخص پر اس قدر اثر انداز ہو جائے کہ اس کو اولاد آدم علیہ السلام کی محبوب چیز دنیا سے الگ تھلگ کر دے۔ نہ اس طرح کہ فقر کی حالت میں دولت کی خواہش اس کے دل پر اس قدر غلبہ حاصل کئے ہوئے ہو کہ اس کو درہم و دینار کے لئے ظالموں اور بادشاہوں کے درباروں میں جانا پڑے اور درحقیقت فقر کا عمل یہ ہے کہ وہ غنا چھوڑ کر فقر کو اختیار کرے نہ یہ کہ فقر کی حالت میں سرداری اور دنیا کی دولت و ثروت کا طلبگار ہو۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد تمام مخلوق سے مقدم اور بلند مقام ہیں۔ لہذا کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ یہ کہہ کر ان کا مقابلہ کرے کہ وہ فقر اختیاری کو فقر اضطراری پر مقدم گردانتے تھے...... اور تمام مشائخ طریقت کا بھی وہی مسلک ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ کا ہے سوائے اس دنیادار پیر کے کہ جس کے قول کو ہم نے حضرت صدیق اکبرؓ کے قول

اورواضح حجت سے رد کر دیا ہے۔

اور امام زہری رحمۃ اللہ علیہ ان سے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے جب آپ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تو آپ نے برسرمنبر خطبہ ارشاد فرمایا اور دوران خطبہ فرمایا ''واللّٰہِ مَا کُنتُ حَرِیصًا عَلَی الاَمَارَۃِ یَوْمًا وَلَا لَیلَۃً قط وَلَا کُنتب فِیھا راغباً وَلَاسَا لُتھا اللّٰہَ قَطُ فِی سِروَعَلَانَیۃٍ وَمَالِی فی الاَمَارۃ رَاحۃً'' (اللہ کی قسم میں نے کسی دن میں اور کسی رات میں کبھی بھی امارت کی حرص نہیں کی اور نہ ہی مجھے اس کی خواہش تھی اور نہ میں نے کبھی پوشیدہ یا ظاہر اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کی اور نہ ہی مجھے اس میں کوئی راحت ہے) اور جب اللہ تعالیٰ بندے کو کمال صدق پر پہنچا دے اور عزت کے مقام پر معزز و متمکن کر دیتے ہیں تو وہ بندہ اللہ تعالیٰ کے امر کا منتظر رہتا ہے کہ وہ کس انداز میں آتا ہے تا کہ امر الٰہی کے مطابق وہ اسی طرح ہو جائے اگر حکم آتا ہے کہ فقیر ہو جا تو وہ فقیر ہو جاتا ہے اور اگر حکم آتا ہے کہ امیر ہو جا، تو وہ امیر ہو جاتا ہے، اس حکم میں اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کرتا۔ جیسا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے ابتدا سے انتہا تک تسلیم و رضا کے علاوہ کوئی راستہ اختیار نہیں کیا۔ پس تجرید تمکین فقر پر حرص اور سروری کے ترک پر صوفیا کرام آپ کی ہی اقتدا کرتے ہیں کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کے عموماً اور اہل طریقت کے خصوصاً دینی امام اور پیشوا ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ

اور انہی میں سے ایک اہل ایمان کے میر لشکر اہل احسان کے مقتدا اہل تحقیق کے امام اور محبت الٰہی کے سمندر کے شناور حضرت ابو حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں جن کی کرامات مشہور اور فراست ایمان کی باتیں لوگوں میں عام ہیں اور وہ دین کے معاملات میں فراست اور سخت پابندی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور طریقت و تصوف میں آپ کے بہت

سے لطائف اور قیمتی رموز ہیں اور پیغمبر علیہ السلام نے آپ کے متعلق ہی فرمایا کہ ''الحقُ یَنطقُ علَی لِسَانِ عمر ''(عمرؓ کی زبان پر حق بولتا ہے) اور نیز پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ''قَدْ کَانَ فِی الامَمِ مُحدّثُونَ فَاِنْ یَکُ مِنهُمْ فِی اُمّتِی فعُمَرُ ''(پہلی امتوں میں محدث ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہے) اور اس طریقت میں آپ کے بہت سے لطائف ہیں جن کو اس کتاب میں شمار کرنا ممکن نہیں۔ تاہم آپ کے بارے میں آتا ہے کہ فرمایا ''اَلْعُزلَۃُ رَاحَۃ'' مِنْ خُلَطَاءِ السوءِ ''(برے ہم نشینوں سے علیحدگی راحت ہے)...... اور عزلت دو طرح ہوتی ہے ایک لوگوں سے اعراض کرنا اور دوسری ان سے قطع تعلق کر لینا...... لوگوں سے اعراض کرنے کا مطلب ہے خالی جگہ اختیار کرنا ہم جنسوں کی صحبت سے کنارہ کش ہونا۔ اپنے برے اعمال کی خرابیوں کے دیکھنے سے آرام پانا۔ اپنے آپ کو لوگوں کے میل جول سے خلاصی طلب کرنا اور لوگوں کو اپنے ہاتھ کی برائی سے محفوظ رکھنا۔ اور لوگوں سے قطع تعلق دل سے ہوتا ہے اور دل کی صفت کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص دلی طور پر قطع تعلق کر لیتا ہے تو مخلوق کی کسی چیز سے اس کا کوئی واسطہ نہیں رہتا کہ مخلوقات کا خیال اس کے دل پر غلبہ حاصل کر سکے۔ اور اس وقت یہ شخص اگرچہ مخلوق کے اندر ہی موجود ہوتا ہے لیکن درحقیقت مخلوق سے بالکل الگ ہوتا ہے اور اس کا ارادہ ان سے بالکل منفرد ہوتا ہے اور یہ مقام بہت بلند اور دور ہے اور یہ صفت حضرت عمرؓ میں بوجہ اتم موجود تھی کہ انہوں نے تنہائی کو راحت قرار دیا۔ حالانکہ آپ بظاہر مخلوق کے درمیان امارت و خلافت کی ذمہ داریاں سرانجام دیتے تھے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اہل باطن اگرچہ بظاہر مخلوق کے ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں لیکن ان کا دل حق تعالیٰ سے وابستہ ہوتا ہے اور ہر حالت میں اسی کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور جتنا وقت ان کا لوگوں کے ساتھ گزرتا ہے اسے وہ حق تعالیٰ کی طرف سے اپنے لئے آزمائش سمجھتے ہیں اور مخلوق کی اس سے صحبت سے حق تعالیٰ کی طرف بھاگتے ہیں غرضیکہ دوستان حق کو یہ دنیا

کبھی بھی مصفا معلوم نہیں ہوتی اور نہ اس کے حالات کبھی ان کے ساتھ خوشگوار ہوتے ہیں۔
چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے ''دَارُ اُسِسَتْ عَلَی البلوٰی بِلاَبَلوٰی فعَال'' (جس گھر کی بنیاد ہی مصیبت پر رکھی گئی ہو اس کا مصیبت سے خالی ہونا محال ہے) اور حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے خاص صحابہؓ میں سے تھے اور حق تعالیٰ کی بارگاہ میں آپؓ کے تمام افعال یہاں تک مقبول تھے کہ اہل اسلام میں حضرت عمرؓ کی آمد کے موقع پر حضرت جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا ''قَدِاسْتَبْشَرَ یَامُحَمَّدُ اَهلَ اَسمَاءِ الیَومِ باِسلاَمِ عُمر'' (اے محمد ﷺ آج کے دن عمرؓ کے اسلام لانے پر آسمان والے خوشیوں کا اظہار کر رہے ہیں) پس صوفیاء کی جماعت گدڑی پہننے اور دین کے معاملات میں شدت اختیار کرنے میں آپ ہی کی پیروی کرتی ہے کیونکہ آپؓ دین و دنیا کے تمام معاملات میں پوری امت کے امام ہیں۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

اور ان میں سے ایک حیاء کا خزانہ اہل صفا میں سب سے زیادہ عبادت گزار رضائے الٰہی کی درگاہ سے تعلق رکھنے والے اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے طریق سے مزین حضرت ابو عمر عثمان بن عفانؓ ہیں کہ تمام معاملات میں ان کی فضیلتیں آشکار اور فضائل ظاہر ہیں۔ حضرت عبداللہ بن رباح اور ابو قتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ حرب الدار (حضرت عثمانؓ کے گھر کے چالیس روز کے محاصرہ کے بعد آپ کی شہادت کا واقعہ ہونے) کے دن ہم آپ کے پاس موجود تھے جب باغی آپ کے دروازہ تک پہنچ گئے تو آپ کے غلاموں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ''جو شخص ہتھیار نہ اٹھائے وہ اللہ کے راہ میں میری ملکیت سے آزاد ہے''...... اور ہم لوگ خوف کی حالت میں باہر نکلے تو حضرت حسن بن علیؓ ہمیں راستہ میں ملے۔ ہم بھی ان کے ساتھ حضرت عثمانؓ کے پاس لوٹ آئے تا کہ جان

سکیں کہ حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہ کس مقصد کے پیش نظر آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ حضرت حسنؓ اندر آپ کے پاس آئے تو آپ کو سلام کیا اور اس مصیبت پر اظہار افسوس و ہمدردی کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''اے امیر المومنین'' میں آپ کے فرمان کے بغیر مسلمانوں پر تلوار نہیں کھینچ سکتا اور آپ امام برحق ہیں مجھے حکم فرمایئے تا کہ اس قوم کی یہ مصیبت آپ سے دفع کر دوں'' تو حضرت عثمانؓ نے آپ کو جواباً فرمایا ''یَا ابنَ اَخِی اِرْجِع وَاجلِس فِی بَیتِکَ حَتی یَاتِیَ اللّٰہُ بِاَمرِہ فَلاَ حَاجَۃَ لَنَا فِی اِھْرَاقِ الدِمَاءِ'' (اے میرے بھتیجے! لوٹ جاؤ اور اپنے گھر میں بیٹھ جاؤ حتی کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے ہم خون بہانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے) اور یہ بات خلت کے درجہ میں مصیبت کے وارد ہونے کے وقت تسلیم و رضا کی علامت ہے، جیسا کہ نمرود لعین نے آگ بھڑکائی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینکنے کے لئے منجنیق کے پلڑے میں رکھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حاضر ہو کر پوچھا کہ ''ھَلْ لَکَ مِنْ حَاجَۃٍ'' (کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟) تو آپ نے جواب دیا ''اَمَّا اِلَیکَ فَلاَ'' (تیری طرف تو میری کوئی حاجت نہیں) حضرت جبرئیل نے عرض کیا تو پھر اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کیجئے تو آپ نے فرمایا ''حَسبِی مِن سوالی عِلمہ بِی لِی'' (میرے حال کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ میرے سوال کو بذات خود جانتا ہے) یعنی اللہ بڑی اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے اور وہ میرے حال کو مجھ سے بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔ اس لئے مجھے سوال کرنے کی ضرورت نہیں اسے معلوم ہے کہ میری بہتری کس چیز میں ہے؟ پس اس جگہ حضرت عثمانؓ کی بالکل وہی حالت ہے جو منجنیق میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی اور (سبائی) باغیوں کا اجتماع بمنزلہ آتش نمرود کے تھا اور حضرت حسنؓ یہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے قائم مقام تھے (فرق یہ ہے کہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مصیبت سے نجات پائی اور حضرت عثمانؓ اس مصیبت میں شہید ہو گئے اور ظاہر ہے کہ نجات کا تعلق بقا سے ہے اور

ہلاکت کا تعلق فنا سے ہے اور بقا وفنا کی تفصیل ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ پس گروہ صوفیاء مال و جان کو راہ خدا میں قربان کر دینے اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینے اور عبادت میں اخلاص کے طریقے میں حضرت عثمانؓ ہی کی اقتدا کرتے ہیں۔ آپ درحقیقت شریعت اور حقیقت میں امام برحق ہیں اور طریقت کی ترتیب میں آپ کی محبت بالکل ظاہر ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

اور انہی صحابہؓ میں سے حضرت مصطفےٰ ﷺ کے بھائی بحر ابتلاء کے غریق آتش ولایت کے سوختہ اور تمام اولیاء و اصفیاء کے مقتداء ابوالحسن علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ طریقت میں آپ کی شان بڑی عظیم اور درجہ بہت بلند ہے۔ اصول حقیقت کی باریک و دقیق عبارتوں کے بیان کرنے میں آپ کو پورا حصہ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''سیخُنَا فِی الاُصولِ وَالبَاء عَلَی المُرتَضیٰ'' (اصول حقیقت اور مصیبتیں برداشت کرنے میں ہمارے شیخ حضرت علیؓ ہیں) یعنی طریقت اور اس کے معاملات میں حضرت علیؓ ہمارے امام ہیں۔ اس لئے کہ اہل طریقت علم طریقت کو اصل اصول کہتے ہیں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا معاملات طریقت کہلاتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ''اے امیر المومنین! مجھے کوئی وصیت کیجئے آپ نے فرمایا ''لَا تَجعَلَنَّ اَکبَر شُغلِکَ بِاَھلِکَ وَوَلَدِکَ فَاِن یَکُ اَھلُکَ وَوَلَدُکَ مِن اَولِیاءِ اللّٰہِ تَعَالیٰ فَاِنَّ اللّٰہ لَایُضِیعُ اَولِیَاءَ فَاِن کَانُوا اَعداء اللّٰہِ فَمَا ھَمُّکَ وشُغلُکَ لِاَعداءِ اللّٰہِ'' (تم اپنی بیوی بچوں میں مشغول ہونے کو سب سے بڑا کام نہ بنانا کیونکہ اگر تیرے بیوی بچے اللہ تعالیٰ کے دوستوں میں سے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں میں سے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں میں مشغول ہونا اور ان کا فکر کرنا تیرے لئے

کسی طرح بھی درست نہیں) اور اس مسئلے کا تعلق غیر اللہ سے دل کے قطع تعلق کے ساتھ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جس طرح چاہتا ہے اسی طرح رکھتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی اپنی بیوی کو ایک وقت مشکل ترین حالت میں چھوڑ کر خداوند تعالیٰ کے سپرد کر گئے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اٹھایا اور بے آب و گیاہ زمین میں لے جا کر خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا تھا اور ان میں مصروف رہنے کو اپنا شغل نہ بنایا اور اپنے دل کو مکمل طور پر حق تعالیٰ سے وابستہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ عزوجل پر تمام معاملات میں بھروسہ کر لینے کی وجہ سے اس بظاہر نامرادی کی حالت میں بھی انہوں نے دونوں جہانوں کی مرادیں حاصل کر لیں اور یہ بات بالکل اس قول کے مشابہ ہے جو حضرت علیؓ نے اس سائل کے جواب میں فرمایا تھا کہ جس نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ پاکیزہ ترین کام کونسا ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا ''غِنَاءُ القَلْبِ بِاللّٰه'' (دل کو اللہ سے لگا کر غیر سے بے پرواہ ہو جانا) جو دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے مالا مال ہو دنیا کا نہ ہونا اس کو محتاج نہیں کرتا اور دنیا کا ہونا اس کیلئے خوشی کا باعث نہیں بنتا۔ اس معنی کی حقیقت سے فقر اور صفوت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جس کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ پس اہل طریقت کو چاہئے کہ وہ عبارات کی حقیقتوں اشارات کی باریکیوں، دنیا و آخرت سے بے پرواہی اور تقدیر الٰہی پر نظر رکھنے میں آپ ہی کی اقتدا کریں اور آپ کے کلام کے لطائف شمار میں آنے سے کہیں زیادہ ہیں اور اس کتاب میں میرا طریق اختصار کا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

آٹھواں باب

رسول اللہ ﷺ کے خاندان میں سے صوفیاء کے ائمہ

پیغمبر ﷺ کے اہل خاندان کے لوگ وہ ہیں جو ازلی و دائمی تقدس و پاکیزگی کے ساتھ مخصوص ہیں ان میں سے ہر ایک کو طریقت کے معاملات میں پوری دسترس حاصل تھی اور ان میں سے عام و خاص سب ہی اہل طریقت کے پیشوا ہوئے ہیں۔ میں انشاء اللہ ان میں سے ایک گروہ کے حالات بیان کروں گا۔

سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ

ان میں سے ایک جگر پارۂ رسول اللہ ﷺ حضرت علیؓ کے دل کے پھول اور حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی آنکھوں کی ٹھنڈک ابو محمد حسن بن علی کرم اللہ وجہہ ہیں جن کو طریقت میں نظر کامل اور تصوف کی باریکیوں کو بیان کرنے میں پورا حصہ حاصل تھا یہاں تک کہ آپ نے اپنی وصیت میں فرمایا تھا ''**عَلَیکم بحفظ اسَرایِر فاِنَّ اللّٰہ مَطَلِع عَلی الضمائر**'' (باطن کے اسرار کی حفاظت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے) حقیقت اس کی یہ ہے کہ بندہ کو باطن کے اسرار کی حفاظت کا حکم بھی اسی طرح دیا گیا ہے جس طرح کہ ظاہری احوال کی حفاظت کا پس اسرار باطن کی حفاظت یہ ہے کہ اغیار (ماسوی اللہ) کی طرف توجہ نہ کرے اور احوال ظاہر کی حفاظت یہ ہے کہ اپنی باگ اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے موڑ لے چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ جب گروہ قدریہ نے غلبہ حاصل کیا اور معتزلہ کا مذہب دنیا میں پھیل گیا تو حضرت حسن بصریؒ نے حضرت حسن بن علی کرم اللہ وجہہ کو ایک خط لکھا اور اس میں کہا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرحمٰن الرحیم

السلامُ عَلَیْکَ یَابْنَ رَسُوْل اللّٰہِ وَقرۃَ عَیْنِہٖ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکاتُہٗ

اَمَّا بعد!

فَاِنَّکُمْ مَعَاشِرُ بَنِی هَاشِمٍ کَالْفُلْکِ الجَارِیَۃِ فِی بَحْرٍ لُّجِیّ وَمَصَابِیحُ الدُّجی وَاَعْلَامُ الهُدیٰ وَالْائمۃُ القَادۃ الذِیْن مَنْ تبعَهُم" نَجی کَسَفِینَۃِ نُوْحٍ المَشْحُونَۃِ الَّتِیْ یَؤُلُ اِلَیْهَا المُؤمِنُونَ وَیبرُو افیها المتَمسکُوْنَ فِیمَا قَوْلُکَ یَابْنَ رَسُولِ اللّٰہِ صَلیَ اللّٰہ عَلیہِ وسَلَّمَ عِنْدَ حیرَتِنَا فِی القَدْرِ وَاختِلافِنَا فِی الاستِطَاعۃِ لِتُعَلِّمنَا بِمَا تَاکَدُ عَلَیہِ رایکَ فَاِنَّکُمْ ذریۃ" بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ بِعلْمِ اللّٰہِ عَلِتُم وَهُوَ الشَاهِدُ عَلَیْکُمْ وَاَنتُم شُهَداء اللّٰہِ عَلی الناسِ وَالسَّلامَ

ترجمہ:۔اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک آپ پر اللہ کی سلامتی اس کی رحمت اور برکت ہو۔اس کے بعد اے گروہ بنی ہاشم! آپ لوگ بحر پر امواج میں جاری کشتی کی طرح روشنی کے چراغ ہدایت کے جھنڈے اور وہ امام و رہنما ہیں کہ جو بھی ان کی اتباع کرے وہ نجات پا جائے اور آپ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہیں کہ اہل ایمان اس کی طرف رجوع کرتے اور اس میں بیٹھنے والے نجات پاتے ہیں۔پس اے رسول اللہ ﷺ کے فرزند ارجمند! تقدیر کے بارے میں ہماری حیرت اور استطاعت کے بارے میں ہمارے اختلاف میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تا کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپ کی رائے کس بات پر قائم ہے کیونکہ آپ نسل در نسل انبیاء کرام کی اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم سے آپ کو تعلیم دی گئی ہے وہ اللہ آپ کا محافظ و نگہبان ہے اور آپ لوگ اللہ کی طرف سے لوگوں پر گواہ ہیں۔والسلام

جب یہ خط حضرت حسنؓ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے یہ جواب لکھا

بسمِ اللّٰہِ الرحمٰن الرحیم

امابعد!

فَقَدِ انتھی اِلَیَّ کتابُکَ عِندِ خیرتکَ وحَیرۃِ مَنْ زَعَمْتَ مِنْ اُمَّتِنَا وَالذیْ طلب رَایٔ مَنْ لَمْ یُوْمِن بالقدرِ خیرہ وشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعالیٰ فَقَدْ کَفَرَ وَمَنْ حَمَلَ المَعَاصِیْ عَلیَ اللّٰہِ فقَد فَجَرَ انَّ اللّٰہِ لایُطَاعُ باکِراہٍ وَلا یُعْصیٰ بغلبۃ وَلاَیمھِلُ العباد فِی مُلِکہٖ وَلٰکِنَّ المالِکَ لِمَا مَلَّکَھُم وَالقَادِر عَلیٰ مَا عَلَیہ قَدْرَھُم فَاِن ایتحرُو بالطَاعَۃِ لَمْ یکُن لَھُم صَادًا وَلا لَھُم عنھا مَانِعًاوَاِنْ اَتَوْا بِالمَعصِیَّۃ وَشاءَ اَنْ یَمُنْ عَلَیھِم فیَحُولُ بَیْنَھم وَبَین مَا فَعَلَ وَ اِن لَمْ یَفْعَلُ فَلَیْسَ حَمْلُھُم عَلَیھَا اِجْبَاراً وَلاَ الزامُھُم اکراھًا اِیَّاھا حتبا جہ عَلَیھِم اَن عَرَفَھُم وَمَکّنَھُم وَجَعَل لَھُم السبِیلَ اِلیٰاخَذِمَا دَعَاھُم اِلَیہ وَترکِ مَانَھٰھُم عَند وَلِلّٰہِ الحجۃ البالغۃ. والسلام

ترجمہ: (شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے امابعد آپ کی اور ان لوگوں کی کہ جن کو آپ ہماری امت میں سمجھتے ہیں "حیرانی کے بارے میں آپ کا خط مجھے پہنچ گیا۔ اس مسئلہ کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ جو شخص اس بات پر ایمان نہیں رکھتا کہ ہر نیک اور برے کام کی تقدیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے وہ کافر ہے اور جس نے گناہوں کو اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگایا وہ فاجر و گمراہ ہے نہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت جبراً کی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی نافرمانی کسی مجبوری کے تحت کی جاتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی مملکت میں اپنے بندوں کو مہلت دیتا ہے۔ تاہم وہ ان تمام چیزوں کا مالک ہے جن کا اس نے اپنے بندوں کو مالک بنایا ہے اور ان سب چیزوں پر اس کی قدرت ہے جن پر اس نے اپنے بندے کو قادر بنایا ہے لہذا اگر وہ اطاعت کا ارادہ کریں تو وہ ان کو روکتا یا فرمانبرداری کرنے سے ہٹاتا نہیں اور اگر وہ نافرمانی کا ارتکاب کریں اور پھر وہ ان پر احسان فرمانا چاہے تو ان

کے اور معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس نے ان کو معصیت پر نہ تو مجبور کیا ہے اور نہ ہی نافرمانی کا ارتکاب ان پر جبراً لازم کیا ہے۔ اس نے تو ان پر یہ سب کچھ بتا کر اپنی حجت قائم کر دی ہے کہ انہیں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قوت بخش دی گئی ہے اور ان کے لئے اس امر کے اختیار کرنے کی جس کی اس نے انہیں دعوت دی ہے اور اس کام کے ترک کرنے کی جس سے اس نے انہیں منع کیا ہے آسانی پیدا کر دی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی حجت ہی غالب ہے۔ والسلام

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جو اپنی اور ان لوگوں کی جنہیں آپ حضور ﷺ کی امت میں سمجھتے ہیں تقدیر کے مسئلہ میں حیرت و استعجاب کے بارے میں ہماری رائے دریافت کی ہے تو اس مسئلہ میں ہماری رائے تو یہ ہے کہ جو شخص خیر اور شر کی تقدیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلیم نہیں کرتا وہ تو کافر ہے اور جو گناہ کو اس کے ذمہ لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نافرمانیوں پر مجبور کیا ہے تو وہ فاسق و فاجر ہے یعنی تقدیر کا انکار قدریہ کا مذہب ہے اور معاصی کو اللہ کے ذمے لگانا جبریہ کا مذہب ہے حالانکہ بندہ اللہ کی دی ہوئی طاقت کے مطابق اپنے اعمال میں خود مختار ہے اور ہمارا اہل سنت و جماعت کا مذہب قدریہ اور جبریہ کے درمیان ہے...... اور اس خط کو نقل کرنے سے میرا (حضرت علی ہجویری) مقصود صرف اسی قدر تھا لیکن پورا خط اس لئے درج کر دیا کہ وہ فصاحت و بلاغت کا ایک شاہکار ہے اور یہ سب باتیں اس لئے میں نے بیان کر دی ہیں تا کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ حضرت حسنؓ حقائق معرفت اور اصول طریقت کے کس بلند درجے پر فائز تھے کہ حضرت حسن بصریؒ جیسا بلند پایہ عالم بھی اس طرح کے دقیق مسائل اور اشارات میں آپؓ کی طرف رجوع کرتا تھا۔

اور ایک حکایت میں میں نے دیکھا ہے کہ حضرت امام حسنؓ کوفہ میں اپنے مکان کی دہلیز پر تشریف فرما تھے کہ ایک دیہاتی آپ کے پاس آیا اور آپ کو اور آپ کے ماں باپ کو گالیاں بکنے لگا۔ آپ اٹھے اور فرمایا اے اعرابی! تجھے بھوک لگی ہے یا پیاس یا کوئی

اور مصیبت تجھے لاحق ہے مجھے بتا تا کہ میں تیری امداد کروں حالانکہ وہ دیہاتی مسلسل آپ کو اور آپ کے والدین کو ایسا ویسا کہے جا رہا تھا۔ حضرت حسنؓ نے اپنے غلام کو حکم دیا کہ درہموں کی ایک تھیلی لا کر اس کو دے دو (غلام نے حکم کی تعمیل کی) تو حضرت حسنؓ نے فرمایا اے اعرابی! معاف کرنا! میرے گھر میں اس کے علاوہ کچھ موجود نہ تھا ورنہ میں تمہیں دینے سے دریغ نہ کرتا۔ جب اس دیہاتی نے آپ کی یہ بات سنی بے اختیار پکار اٹھا "اَشْهَدُ اَنَّکَ ابنَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلی اللّٰهِ عَلَیهِ وَسَلَّم "(میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے ہیں) اور میں تو آپ کے حلم اور بردباری کا تجربہ کرنے آیا تھا۔ اور حقیقت شناس اولیاء ومشائخ کی یہی صفت ہوتی ہے کہ لوگوں کی مدح اور مذمت ان کے نزدیک برابر ہوتی ہے اور وہ کسی کے برا کہنے سے خفا نہیں ہوتے......

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ

اور انہی آئمہ خاندان نبوت میں سے شمع آل محمد ﷺ، معاملات دنیا سے بے نیاز اور اپنے دور کے سردار حضرت ابو عبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالبؓ بھی ہیں۔ آپ بلند پایہ اولیاء میں سے ایک اہل مصیبت کے قبلہ اور کربلا کے شہید ہیں۔ اہل طریقت آپ کے حال وکردار کی درستی پر متفق ہیں کہ جب تک حق غالب وظاہر رہا آپ اس کے تابع رہے لیکن جب حق مفقود ہونے لگا تو آپ نے تلوار کھینچ لی اور جب تک آپ نے اپنی عزیز جان راہ خدا میں قربان نہ کردی آرام وچین سے نہ بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی بہت سی علامات آپ میں موجود تھیں جن کی وجہ سے آپ ممتاز تھے چنانچہ حضرت عمر بن خطابؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے حضرت حسینؓ کو اپنی پشت مبارک پر بٹھا رکھا ہے اور ایک رسی اپنے دھن مبارک میں ڈال کر اس کے سرے حضرت حسینؓ کے ہاتھ میں دیئے ہوئے ہیں اور وہ حضور ﷺ کو چلا رہے ہیں

اور خود حضور ﷺ گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو میں نے کہا "نِعمَ الجملُ جملُکَ یَا اَبَاعبدالله" (اے حسینؓ آپ کا اونٹ بہت ہی اچھا ہے) یہ سن کر پیغمبر ﷺ نے فرمایا "نِعمَ الراکِبُ ھو یَا عُمَر" (اے عمرؓ! یہ سوار بھی تو بہت اچھا ہے)

طریقت میں آپ کے بہت سے لطائف اور بے شمار رموز اور پر حکمت اقوال میں اور آپ کے بارے میں یہی روایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "اَشْفَقُ الاَخُوَانِ عَلَیْکَ دِینُکَ" (بھائیوں سے بھی زیادہ تجھ پر شفقت کرنے والا تیرا دین ہے) کیونکہ دین کی متابعت میں ہی انسان کی نجات اور دین کی مخالفت میں اس کی موت و ہلاکت ہے پس عقلمند آدمی وہ ہے جو اپنے مشفقوں کے فرمان کے مطابق عمل کرے اور اپنے اوپر ان کی شفقت کو قبول کرتے ہوئے ان کی مخالفت سے اجتناب کرے اور بھائی وہ ہے جو دوسرے بھائی کو نصیحت کرے اور اپنی شفقت کا دروازہ اس پر بند نہ کرے اور میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک دن ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے میں ایک درویش آدمی ہوں اور صاحب اولاد ہوں مجھے آج کی رات کے کھانے کے لئے اپنی طرف سے کچھ عنایت فرمایئے۔ حضرت حسینؓ نے اسے فرمایا بیٹھ جاؤ! ہمارا روزینہ ابھی راستے میں ہے ابھی آ جائے گا ابھی زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ لوگ آپ کے پاس حضرت امیر معاویہؓ کی طرف سے پانچ تھیلیاں لے کر آئے۔ ہر تھیلی میں ایک ہزار دینار تھے لوگوں نے عرض کی کہ حضرت امیر معاویہؓ آپ سے معذرت چاہتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ تھوڑی سی رقم خرچ کیجئے پھر اس کے بعد اس سے بہتر امداد کی جائے گی۔ حضرت حسینؓ نے اس درویش کی طرف اشارہ کیا اور وہ پانچ تھیلیاں اسے عطا فرما دیں اور اس سے معذرت کی کہ تھوڑی دیر ہوگئی اور یہ بے قدر سا عطیہ ہے جو تجھے ملا اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ رقم اتنی تھوڑی ہے تو میں تمہیں انتظار کے لئے نہ کہتا۔ ہمیں معذور سمجھنا کہ ہم اہل بلا میں ہم دنیا کی تمام راحتوں سے دست بردار ہو چکے ہیں اور اپنی خواہشات کو کم کر کے

دوسروں کی ضرورتوں کے لئے زندہ ہیں۔ اور آپ کے مناقب اس قدر مشہور ہیں کہ امت کے کسی فرد پر پوشیدہ نہیں۔ رضوان اللہ علیہ۔

حضرت زین العابدین رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے نبوت کے وارث امت کے چراغ سید مظلوم، امام مرحوم، عبادت کرنے والوں کی زینت اور اوتاد کی شمع حضرت ابوالحسن علی زین العابدین بن حسین بن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہیں۔ آپ اپنے دور میں سب سے زیادہ کریم اور عبادت گزار تھے اور معرفت کے حقائق کو کھولنے اور طریقت کے دقائق کو بیان کرنے میں مشہور تھے ایک دفعہ لوگوں نے آپ سے استفسار کیا کہ دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ سعادت مند کون ہے؟ تو ارشاد فرمایا "مَنْ اِذارَضِیَ لَمْ یَحملهُ رَضا عَلَی البَاطِل وَاِذَا سَخطَ لَمْ یخرجه' سَخطُه' مِنَ الحَقِ " (وہ شخص کہ جب خوشی ہو تو اس کی خوشی اس کو باطل پر آمادہ نہ کرے اور جب ناراض ہو تو اس کا غصہ اس کو حق سے باہر نہ نکال دے) مستقیم الحال لوگوں کے کامل اوصاف میں سے ہے اس لئے کہ باطل پر راضی ہونا باطل ہے اور غصہ کی حالت میں حق سے دست بردار ہو جانا بھی باطل ہے اور مومن باطن کا ارتکاب کرنے والا نہیں ہوتا...... اور روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ سبائیوں نے جب حضرت حسین بن علیؓ کو مع آپ کے عزیز و اقارب کے کربلا کے میدان میں شہید کر دیا اور حضرت زین العابدین کے علاوہ کوئی باقی نہ رہا جو عورتوں کی نگرانی کرتا اور آپ بیمار بھی تھے حضرت حسینؓ آپ کو علی اصغر کہتے تھے جب ان کو برہنہ پیٹھ (بے کجاوہ) اونٹوں پر سوار کر کے دمشق میں یزید بن معاویہؓ کے سامنے لایا گیا تو ایک شخص نے آپ سے کہا "کَیفَ اَصْبَحتُم یَا عَلیُّ وَیَا اَهَلَ بَیْتِ الرحمتِ " (اے علی اور اے اہل بیت رحمت! آپ نے صبح کیسے کی) تو آپ نے جواب دیا "اصبحنَا مِن قَوْمِنَا بِمَنْزِلَةِ قَوْمِ موسیٰ مِنْ الِ فرعوْن

يَـذْبَـحُـوْنَ اَبْـنَـاءَ هُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ هُمْ فلاَ نَدْرِى صَبَا حَسنَا مِن مَسَاءِ نَا وهٰـذا مِـن حَقِيْقَةِ بَلاءِ نَا "(ہم نے اپنی قوم سے بالکل ویسی ہی صبح کی جیسی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے آل فرعون سے کی تھی کہ وہ آل فرعون ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے پس ہم نہ صبح کو پہچانتے ہیں نہ شام کو بس یہی ہماری مصیبت کی حقیقت ہے) اور ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی آزمائش پر صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اور حکایات میں آتا ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان ایک سال حج کے لئے آیا خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے حجر اسود کا بوسہ لینا چاہا تو لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے کوئی راستہ نہ ملا تو منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا اسی دوران حضرت زین العابدین علی بن الحسین بن علی مسجد حرام میں تشریف لائے چاند سے چہرے، روشن رخساروں اور خوشبودار لباس کے ساتھ آپ نے بیت اللہ کا طواف شروع کیا۔ آپ جب حجر اسود کے قریب پہنچے تو آپ کی تعظیم کے لئے لوگوں نے حجر اسود کے آس پاس کی جگہ خالی کردی، ہشام نے کہا یہ نوجوان کون ہے؟ میں اس کو نہیں پہچانتا۔ اس سے مقصد اس کا یہ تھا کہ اہل شام اس کو نہ پہچانیں اور نہ ہی اس کی خلافت کی خواہش کریں۔ فرزوق شاعر وہاں کھڑا تھا اس نے کہا" میں اس کو خوب پہچانتا ہوں لوگوں نے پوچھا اے ابا فراس! ہمیں بتاؤ وہ کون ہے؟ کہ ہم نے اسے بڑا بارعب جوان دیکھا ہے، فرزوق نے کہا" اچھا خوب کان لگا کر سنو میں اس کی صفت اور اس کا نسب بیان کرتا ہوں۔ پس فرزوق نے یہ شعر پڑھے۔

قصیدہ

هٰذالذِی تَعْرِفُ البَطحاءُ وَطْئَتَهٗ وَالبَیْتُ یَعرِفُه والحلِ والحَرَمُ

یہ وہ ہستی ہے جس کے قدموں کو وادی بطحا پہچانتی ہے اور بیت اللہ وحل وحرم بھی اس سے خوب واقف ہیں۔

هَذابن فاطمه الزهرا ان کنت جاهله وَبِجَدِهِ انبیاء اللّٰه قَدْخُتِم

یہ فاطمۃ الزہرا کا صاحبزادہ ہے اگر تو اس سے ناواقف ہے اور اس کے نانا پر انبیاء کا سلسلہ ختم کیا گیا ہے۔

هَذا ابن خیر عباد اللهِ کُلهمِ هذا التِقی النقی الطاهرُ والعِلَمَ

یہ اللہ کے تمام بندوں میں سے بہتر بندے کی اولاد ہے۔ یہ متقی۔ پاک باطن اور پاکیزہ بدن ہے۔

یُبِیْنَ نورُالدُحی عَن نور طلعتِهِ کالشمس ینجابُ عَن اشراقها الظلمِ

اسکی پیشانی کی چمک سے تاریکی اس طرح ختم ہو جاتی ہے جس طرح طلوع آفتاب سے ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں۔

بعضُ حَیاءً وَیغضی مِنْ مهابتِهٖ فما یُکَلّمُ اِلاَّ حِسیْن یبنسم

وہ حیاء کے سبب نگاہیں جھکائے رہتا ہے اور لوگ اس کے رعب سے نگاہیں نیچی رکھتے ہیں اور اس وقت بولتے ہیں جب وہ مسکرا رہا ہو۔

یَنمِیْ اِلٰی ذُروَۃِ العِز الّتی قَصرت عَنْ نیلها عَربُ الاسلام العَجَمُ

وہ عزت کی اس بلندی پر پہنچا ہوا ہے جہاں تک عرب وعجم کے تمام مسلمان پہنچنے سے قاصر ہیں۔

اِذاراتهُ قریش" قال قائلُها الی مکارِمَ هٰذا ینتهِی الکرمُ

قبیلہ قریش اسے دیکھ کر اعتراف کرتا ہے کہ اس پر جود وکرم کی انتہا ہو چکی ہے۔

مَنْ جدّہٗ وان فضل الانبیاله وفضلُ امتِه وانت لهُ الامَم

اس کے نانا کا مقام تمام انبیاء سے افضل ہے اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

یکاد لمبسکہ' عرفانَ راحتِہٖ   رُکن الحطیم اِذا ما جاء یستلِمُ

قریب ہے کہ حطیم خود بڑھ کر اس کے ہاتھوں کی خوشبو کو چوم لے جب وہ اسے چومنے کیلئے بڑھتا ہے۔

فِی کفِہٖ خیزران ریحُھَا عبق"   مِنْ کف اروع فی ارنینہٖ شمتم

اس کے ہاتھ میں بڑی خوشگوار خوشبو والی بید مشک کی چھڑی ہے۔

سَھلُ الخلیقۃِ لَایخفیٰ بوادرہ   یزینہ اثنان حسن الخلق والشِیَم

وہ ایسا نرم مزاج ہے کہ اس کا غصہ بے خطر ہے حسن سیرت اور حسن صورت اس کی زینت ہیں۔

مشتقۃ" عن رسول اللّٰہِ بتعتِہٖ   لجابت عناصِرُہ' والخیم والشِیَم

اسکی صفات رسول اللہ ﷺ کی صفات سے مشتق ہیں اور اس کے عناصر انتہائی عمدہ اور پاکیزہ ہیں۔

فَلَیْسَ قُولکَ مَنْ ھذا؟ بضائرہٖ   الْعَرْب تصرف مَنْ الکرت والعجمُ

تیرا اس کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے "یہ کون ہے"؟ کہنا اسکی عزت میں کمی کا سبب نہیں کہ اس کو تو پورا عرب و عجم پہچانتا ہے۔

کِلتَا یَدیہِ غیاث" عَمَ نفعُھُا   تستَوکفانِ وَلایصر وھُمَا العَدَمْ

اس کے دونوں ہاتھ سخاوت میں گویا موسلا دھار بارش ہیں اور مال و دولت کا عدم ان کے ہاتھ خالی نہیں کرتا۔

عَمّ البریہ بالاحسان فالقشعَتْ   عن العنایۃِ والاملاق والظلم

مخلوق پر ان کا احسان عام ہے پس ان کی وجہ سے مخلوق میں غربت اور گمراہی رفع ہوگئی ہے۔

لاَیَسْتطیع جواد" بعد غایَتَھُمْ   لایُدا ینھم قوم" وَّان کرم'

کوئی جوانمرد سخاوت میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور کوئی قوم ان کے مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔

ھُمَ الغیوثُ اِذا مَاازِمَۃ ازمَتَ   وَالاُسد اسد الشریٰ والباس محتدم

جب قحط سالی ہوتو اس کے ہاتھ موسلا دھا بارش ہیں اور جب لوگ جنگ میں مبتلا ہوں تو وہ ایک شہر کی طرح ہیں۔

مِنْ معشرٍ حُبّھُم دین" وبُغضُھُم　　　کُفر" وقُربُھم منجا و مُعتصم

وہ اس گروہ کے فرد ہیں جس کی محبت دین، بغض کفر اور ان کا قرب باعث تحفظ ونجات ہے۔

اِنَّ عُدَّ اھل التقیٰ کانوا ائمتَّھُمْ　　　اَوْ قِیل مَن خیر اھل الارض قِیلَ ھِم

اگر دنیا کے تمام اہل تقوی کو شمار کیا جائے تو یہ ان کے مقتدا ہیں اور اگر پوچھا جائے کہ زمین والوں میں بہتر کون ہے تو انہی کا نام لیا جائے گا۔

سَیَّان ذالک اِن الروا واِن عَدَمُوا　　　لایَنْقُصُ العُسر بسطًا مِن اَکُفِھم

مال دار ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہے تنگی ان کے ہاتھوں کی کشادگی کو کم نہیں کرتی۔

اَللّٰہُ فَضَلہ، کَرمًا وَشَرفَۃ　　　جَریَ بِذٰلِک لَہ، فی اللوحِ والقلم

ان کو فضیلت اور بزرگی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے دی ہے اور لوح وقلم میں اس کے احکام جاری کر دئے ہیں۔

مُقَدم" بَعْدَ ذکر اللّٰہِ ذکرھم　　　فی کُل بدءٍ ومختوم" بِہ الکلَم

ہر چیز کی ابتداء وانتہا میں اللہ کے ذکر کے بعد ان کا ذکر ہی مقدم ہے۔

مَنْ یَعرفُ اللّٰہ، یَعرِفُ اَوّلِیتَہ،　　　والدین مِن بیت ھذا نالَہ، الاُمَم

جوشخص اللہ کو پہچانتا ہے وہ ان کی اولیت کو بھی پہچانتا ہے کہ پوری امت کو دین ان ہی کے گھرانے سے ملا ہے۔

ای القبائل لیست فی رقابھم　　　اِمّا الاَبَاءِ ھذا اَوْلَمہ، نِعَمْ

عرب کا کونسا قبیلہ ہے جس کی گردن اس کے یا اس کے بزرگوں کی دی ہوئی نعمتوں سے جھک نہ گئی ہو۔

اسی طرح فرزوق نے حضرت زین العابدین رحمتہ اللہ علیہ کی تعریف میں چند

اشعار پڑھے اور آپ کی اور پیغمبر علیہ السلام کے خاندان والوں کی خوب تعریف کی یہ سن کر ہشام اس پر سخت ناراض ہوا اور مکہ و مدینہ کے درمیان ایک مقام صفان میں اس کو قید کر دینے کا حکم دیا۔ یہ خبر جب لوگوں نے حضرت زین العابدینؒ کے سامنے عرض کی تو آپ نے بارہ ہزار درھم اس کے پاس لے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اسے کہہ دینا کہ اے ابا فراس ہمیں معذور سمجھنا کہ ہم اہل بلا ہیں۔ اس سے زیادہ رقم تمہارے پاس نہیں بھیج سکتے فرزوق نے وہ رقم واپس کر دی اور کہلا بھیجا کہ اے پیغمبر خدا کے بیٹے! میں نے حصول دولت کے لئے بادشاہوں اور امراء کے لئے بڑے اشعار کہے ہیں اور ان کی تعریف میں جھوٹ اور مبالغہ سے بھی کام لیا ہے لیکن یہ اشعار میں نے محض اللہ تعالیٰ اور فرزندان رسول علیہ السلام کی محبت میں ان جھوٹی مدائح کے کفارہ کے طور پر کہے ہیں۔

جب یہ پیغام حضرت زین العابدینؒ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے فرمایا "یہ درہم واپس لے جاؤ۔ اور اس سے کہو کہ اے ابوفراس! اگر تمہیں ہم سے محبت ہے تو پھر اس بات کو پسند نہ کرو۔ کہ ہم جو چیز دے چکے اور اپنی ملکیت سے نکال چکے ہیں اسے واپس لے لیں۔ حضرت کا یہ پیغام سن کر فرزوق نے وہ رقم قبول کر لی۔ آپ کے فضائل و مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ انہیں جمع کیا جا سکے۔

سیدنا حضرت محمد باقر رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی ائمہ اہل بیت میں سے اہل معاملہ کی حجت ارباب شاہد کی برھان اولاد نبی علیہ السلام کے امام اور حضرت علیؓ کی نسل میں برگزیدہ حضرت ابوجعفر محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابوطالب الباقر کرم اللہ وجہہ بھی ہیں۔

یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب باقر تھا۔ آپ کتاب الٰہی کے لطیف اشارات اور علوم دینیہ کے رموز بیان کرنے میں فاضل مقام کے حامل تھے۔ آپ کی

کرامات مشہور، دلائل معروف اور براهین روشن ہیں کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی خلیفہ نے آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آپ کے پاس آدمی بھیج کر آپ کو بلوایا۔ جب آپ تشریف لائے تو خلیفہ نے فوراً آپ سے معافی مانگ لی اور عزت واحترام سے ہدیہ پیش کر کے آپ کو رخصت کر دیا درباریوں نے سوال کیا اے بادشاہ! آپ تو ان کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ان کے ساتھ یہ اچھا سلوک دیکھ کر تو ہم حیران رہ گئے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے بادشاہ نے جواب دیا۔ جب آپ میرے سامنے تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دائیں بائیں دونوں طرف دو شیر موجود ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ اے بادشاہ اگر تم نے حضرت کے قتل کا قصد کیا تو ہم تمہیں ہلاک کر دیں گے..... اور آپ ہی کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے حق تعالیٰ کے ارشاد ''فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ '' (پس جو شخص شیطان کا کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ''كُلُّ مَنْ شَغَلَكَ عَنْ مطالعت الحق فَهُوَ طاغوتُكَ (جو چیز بھی تجھے مطالعہ حق سے باز رکھے وہ تیرا شیطان ہے) اب تم غور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ سے کس چیز کی وجہ سے لاتعلق اور حجاب میں ہو کہ اگر اس چیز اور حجاب کو ترک کر دو تو مکاشفہ الٰہی تک تمہیں رسائی حاصل ہو جائے اور تم حق سے ممنوع اور محجوب نہ رہو اور جو شخص مشاہدہ حق سے روک دیا گیا اسے قرب حق کا دعویٰ نہیں کرنا چاہئے۔

آپ کے خصوصی عقیدت مندوں میں سے ایک شخص بیان کرتے ہیں کہ جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا اور آپ اوراد و وظائف سے فارغ ہو جاتے تو اپنی مناجات میں اونچی آواز سے یوں عرض کرتے۔ اے میرے معبود! اے میرے آقا رات آ گئی اور بادشاہوں کے تصرف کی حکومت ختم ہوگئی اور آسمان پر ستارے نمودار ہو گئے اور سب لوگ نیند کی حالت میں معدوم ہو گئے اور لوگوں کی زبانیں خاموش ہوگئیں اور ان کی آنکھیں بند ہوگئیں اور لوگ مخلوق کے دروازوں سے بھاگ گئے اور خاندان بنو امیہ آرام پا گئے اور اپنی

خواہشات کو چھپالیا اور اپنے دروازے بند کر کے ان پر محافظ مقرر کر دیئے اور جو لوگ ان سے اپنی ضرورتیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی حاجتیں چھوڑ دیں لیکن بارِ خدایا! تو زندہ ہے اور ہمیشہ رہنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اونگھ اور نیند تیری ذات پر طاری نہیں ہوسکتی۔ جو شخص تجھے ان صفات کے ساتھ نہ پہچانے وہ کسی نعمت کا مستحق نہیں۔ اے وہ ذات کہ کسی کام کے کرنے سے تجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور ہر پکارنے والے پر تیری رحمت کے دروازے کھلے ہیں اور جو شخص تیری حمد و ثنا کرتا ہے اس پر تیرے خزانے فدا ہیں تو وہ داتا ہے کہ کسی سائل کو خالی لوٹا دینا تجھے زیبا نہیں مومنوں میں سے جو شخص تیری بارگاہ میں دُعا کرتا ہے زمین و آسمان کی مخلوق میں سے کوئی بھی اسے سوال کرنے سے روکنے والا نہیں۔ بار خدایا ہم دنیا کی کسی چیز سے آرام کیسے پا سکتے ہیں جب کہ موت، قبر اور حساب کو ہم یاد رکھتے ہیں۔ پس میں تجھ ہی سے مانگتا ہوں کیونکہ میں تجھے واحد جانتا ہوں اور تجھ ہی سے طلب کرتا ہوں کیونکہ صرف تجھے ہی پکارتا ہوں کہ موت کے وقت وہ راحت عطا کر جس میں عذاب نہ ہوں اور حساب کے وقت وہ خوشی عطا فرما جس میں تکلیف نہ ہو (راوی بیان کرتا ہے کہ) آپ یہ سب باتیں کہتے ہوئے روتے جاتے تھے یہاں تک کہ ایک رات میں نے آپ سے عرض کی کہ اے میرے اور میرے آباؤ اجداد کے آقا! آپ اس گریہ وزاری اور نالہ وشیون میں کب تک لگے رہیں گے؟ آپ نے فرمایا اے دوست! حضرت یعقوب علیہ السلام کا تو ایک یوسف گم ہوا تھا تو آپ اس قدر روئے کہ آپ کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور آپ نابینا ہو گئے تھے جب کہ میں نے اپنے باپ حضرت حسین کے ہمراہ اٹھارہ اشخاص اور دوسرے شہدا کربلا کو کھویا ہے لہذا میں اس سے کم تو نہیں رؤوں گا کہ ان کے فراق میں اپنی آنکھیں سفید کرلوں...... آپ کی یہ مناجات عربی میں فصاحت و بلاغت سے بھری ہوئی ہے لیکن طوالت کے خوف سے میں نے اس کے فارسی میں معانی بیان کر دیئے ہیں تاکہ تکرار نہ ہو البتہ کسی دوسرے مقام پر انشاء اللہ سے بیان کر دوں گا۔

سیدنا حضرت محمد جعفر رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے سنت نبوی ﷺ کے یوسف، طریقت کی زینت، معرفت کے ترجمان اور صفوت کے مزین حضرت ابو محمد جعفر بن محمد صادق بن علی بن حسین بن علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ آپ بڑے بلند حال۔ نیک سیرت اور ظاہر و باطن کے آراستہ و پیراستہ تھے تمام علوم میں آپ کے عمدہ اور لطیف اشارات موجود ہیں۔ آپ کلام الٰہی کی باریکیوں اور طریقت کے معانی سے واقفیت کی بنا پر مشائخ میں مشہور ہیں اور طریقت کے موضوع پر آپ کی بہت سی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ ''مَنْ عَرَفَ اللّٰہ اَعْرَضَ عن ماسواہ ''(جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا وہ غیر اللہ سے منہ پھیر لیتا ہے) یعنی عارف الٰہی وہ ہے جو غیر اللہ سے منہ پھیر لے اور اسباب دنیا سے رشتہ توڑ لے کیونکہ حق تعالیٰ کی معرفت بعینہ غیر اللہ کی عدم شناخت کا نام ہے اس لئے کہ غیر اللہ کی عدم معرفت اللہ تعالیٰ کی معرفت کی وجہ سے ہوتی ہے اور غیر اللہ کی معرفت حق تعالیٰ کی عدم معرفت کا سبب ہوتی ہے۔ پس عارف الٰہی مخلوق سے الگ اور حق سے پیوستہ ہوتا ہے غیر اللہ کی اس کے دل میں اتنی بھی قدر نہیں ہوتی کہ ان کی طرف دھیان دے۔ اور ان کے وجود سے اس کو اتنا اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ دل میں ان کی طرف دھیان دے اور ان کے وجود سے اس کو اتنا اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ دل میں ان کی یاد کو جگہ دے..... اور آپ سے ہی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ ''لاَ تَصِحُّ العِبَادَۃُ الا بالتوبَۃِ لاَنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ قَدَّمَ التوبَۃَ عَلیَ العبادۃ کما قَال اللہ تبارک و تعالیٰ التَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ ''(عبادت، توبہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد ''التائِبون العابدون میں توبہ کو عبادت پر مقدم ذکر فرمایا ہے) اس لئے کہ توبہ طریقت کے مقامات کی ابتدا ہے اور عبودیت ان مقامات کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جب

گنہگاروں کا ذکر فرمایا تو انہیں توبہ کا حکم دیا چنانچہ فرمایا "تُوْبُوْا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ" (اے ایمان والو! تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو) اور جب رسول اللہ ﷺ کو یاد کیا تو عبودیت کے ساتھ یاد کیا اور فرمایا "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی" (پس وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی) اور حکایت ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے ابن رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے کہ میرا دل سیاہ ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابوسلیمان! آپ تو خود اپنے زمانہ کے زاہد ہیں آپ کو میری نصیحت کی کیا ضرورت ہے، انہوں نے عرض کی اے فرزند پیغمبر ﷺ آپ کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے اور سب کو نصیحت کرنا آپ پر واجب ہے۔ آپ نے فرمایا اے ابوسلیمان میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے نانا پاک ؐ قیامت کے دن میرا دامن نہ پکڑ لیں کہ تم نے میری اطاعت کا حق کیوں نہیں ادا کیا اور یہ نصیحت کرنے کا کام کسی نسبی تعلق اور مضبوط نسبت پر منحصر نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور اچھے اعمال پر موقوف ہے۔ یہ سن کر حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ رونے لگے اور کہنے لگے۔ اے خداوند! جب نبوت کے پانی سے گوندھی ہوئی طبیعت اور برھان و دلائل کے اصولوں سے ترکیب پانے والی طبیعت والا اور رسول اللہ ﷺ کا نواسہ اور حضرت بتول بی بی فاطمہ ؓ کا صاحبزادہ اتنی حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہے تو پھر داؤد کون ہے جو اپنے عمل پر مغرور ہو...... اور آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک روز اپنے غلاموں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آؤ آپس میں عہد اور بیعت کریں کہ ہم میں سے جو بھی نجات پا جائے قیامت کے دن سب کی شفاعت کرے گا۔ یہ سن کر غلاموں نے عرض کیا "اے رسول اللہ ﷺ کے بیٹے آپ کو ہماری شفاعت کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ آپ کے جد بزرگوار پوری مخلوق کے شفیع ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے اپنے ان افعال کی وجہ سے قیامت کے دن اپنے جدِ امجد کا رخِ انور دیکھنے سے شرم آتی ہے...... یہ باتیں اپنے نفس کے عیوب کی طرف نگاہ کرنے سے

پیدا ہوتی ہیں اور اوصاف کمال میں سے یہ بھی ایک صفت ہے اور انبیاء اولیا میں سے تمام مقربان الٰہی اس صفت سے متصف رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اِذَا اراد اللّٰہ بِعَبْدٍ خیراً بَصَّرہ بعیوب نفسِہٖ" (اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں تو اسے اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتے ہیں) اور جو شخص تواضع سے اپنا سر جھکا لیتا ہے اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں اس کے تمام کام سنوار دیتا ہے...... اور اگر میں تمام اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یاد کروں اور ان کے مناقب علیحدہ علیحدہ شمار کروں تو یہ کتاب اس کی متحمل نہیں ہو سکتی طریقت کے ارادت مندوں اور منکروں میں سے جن کی عقل کو ادراک کا لباس حاصل ہے ان کی ہدایت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

اب ہم اس کتاب میں ایجاز و اختصار کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب صفہ کا ذکر لاتے ہیں اور اس سے پہلے ہم نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "منہاج الدین" رکھا ہے اس میں ہم نے اصحاب صفہ میں سے ہر ایک کے مناقب تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں صرف ان کے نام اور کنیتیں الگ الگ بیان کریں گے تا کہ تمہارا مقصد حاصل ہو۔ اللہ تمہیں عزت سے نوازے۔ واللہ اعلم و باللہ التوفیق۔

نواں باب

اصحاب صفہ کے ذکر میں

جان لے کہ پوری امت اس بات پر متفق ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ میں سے ایک جماعت ایسی تھی جو ہر وقت عبادت کے لئے مسجدی نبویؐ میں رہتی تھی۔ یہ حضرات دنیا سے دست بردار اور روزی کمانے سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے لئے اپنے پیغمبر ﷺ کو عتاب[1] کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''وَلاَ تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ '' (ان لوگوں کو اپنے پاس سے نہ ہٹایئے جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے رات دن اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کے فضائل پر ناطق ہے اور پیغمبر ﷺ کی ان کے فضائل میں بہت سی احادیث ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں اور ہم نے کتاب کے مقدمہ میں ان کا کچھ ذکر کر دیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ پیغمبر ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ''وَقَفَ رسولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عَلٰی اصحاب الصفۃِ فَرأی فَقْرَھُمْ وجھْدَھُمْ وَطِیْبَ قُلُوبِھم فقالَ البشِرُوایا اَصْحَابَ اصفۃِ فَمَنْ بَقِیَ مِنْ اُمَّتِی عَلَی النَّعْتِ الذی اَنْتُمْ عَلَیہِ راضیاً بِمَا فیہِ فَاِنَّھُم مِنْ رُفَقَائی فلی الجنۃِ '' (رسول اللہ ﷺ اصحاب صفہ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور ان کی تنگدستی اور مجاہدے اور پھر اس حالت میں ان کے دلوں کے اطمینان اور خوشی کو دیکھا تو فرمایا ''اے صفہ والو! تمہیں بشارت ہو کہ میری امت کا جو شخص بھی اس صفت پر رہے گا جس پر تم ہو پھر اس پر راضی بھی رہے گا تو وہ جنت میں میرے رفیقوں میں سے ہوگا۔

ان اصحاب صفہ میں سے ایک اللہ جبار کی درگاہ کے منادیٔ اعلان کرنے والے موذن) اور حضرت محمد مختار ﷺ کے برگزیدہ حضرت بلال بن رباحؓ...... دوسرے خداوند واحد کے دوست اور واقف احوال پیغمبر ﷺ حضرت ابو عبداللہ سلمان فارسیؓ...... تیسرے

---

[1] عتاب کا معنی ہے ''پیار بھرا شکوہ۔''

مہاجرین وانصارؓ کے سالار اور خداوند جبار کی خوشنودی کی طرف متوجہ، حضرت ابوعبید اللہ عامر بن عبداللہ بن الجراحؓ...... چوتھے برگزیدہ اصحاب صفہ اور زینت اہل تصوف حضرت ابوالیقطان عمار بن یاسرؓ...... پانچویں علم کا خزانہ اور حلم کا مخزن حضرت ابومسعود عبداللہ ابن مسعود الہذلیؓ...... چھٹے اللہ رب العزت کی درگاہ کا تمسک کرنے والے اور گناہوں سے پاک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بھائی حضرت عتبہ بن مسعودؓ...... ساتویں راہ عزلت کے سالک اور عیوب دولت کی باتوں سے کنارہ کش حضرت مقداد بن الاسودؓ...... آٹھویں مقام تقویٰ کے داعی اور مصیبت وابتلا پر راضی حضرت جناب بن الارتؓ...... نویں رضا الٰہی کی درگاہ کا ارادہ کرنے اور مقام فنا میں بارگاہ بقا کے تلاش کرنے والے حضرت صہیب بن سنانؓ...... دسویں سعادت کے سیپ کے موتی اور قناعت کے سمندر حضرت عتبہ بن گزوانؓ...... گیارہویں حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی مخلوق اور دونوں جہاں سے بے نیاز حضرت زید بن الخطابؓ...... بارہویں مشاہدات کی طلب میں مجاہدوں کے مالک، پیغمبر ﷺ کے غلام حضرت ابولبشرؓ...... تیرہویں صاحب عزت وتوبہ اور ساری دنیا کو چھوڑ کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے حضرت ابوالمرشد کنانہ الحصین العدویؓ...... چودہویں تواضع اور انکساری کے عبور کرنے والے دنیا سے قطع تعلق کرنے والے حذیفہ الیمانیؓ کے غلام حضرت سالمؓ...... پندرہویں عذاب آخرت سے ڈرنے والے اور مخالفت شریعت سے بھاگنے والے حضرت عکاشہ بن الحصنؓ...... سولہویں مہاجرین وانصار کی زینت اور بنی قار کے سردار حضرت مسعود بن ربیع القاریؓ...... سترھویں زہد میں مانند عیسیٰ علیہ السلام اور شوق میں مانند موسیٰ علیہ السلام حضرت ابوذر جناب ابن الجناوۃ الغفاریؓ...... اٹھارہویں انفاس پیغمبر ﷺ کے محافظ اور خیرات شایان حضرت عبداللہ بن عمرؓ...... انیسویں استقامت دین میں قائم اور اتباع شریعت میں راست رو حضرت صفوان بن بیضاؓ...... اکیسویں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ امید سے تعلق رکھنے والے اور دربار مصطفوی ﷺ کے برگزیدہ حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذرؓ...... اور بائیسویں سمندر شرف

کے کیمیا اور صدف توکل کے موتی حضرت عبداللہ بن بدر الجہنیؓ عنہ و عنہم اجمعین ہیں۔

اگر ہم ان تمام اصحاب صفہؓ کا تذکرہ کریں تو کتاب طویل ہو جائے گی شیخ ابو عبدالرحمٰن بن الحسین السلمی رحمتہ اللہ تعالیٰ جو طریقت اور مشائخ کے کلام کو نقل کرنے والے ہیں انہوں نے اہل صفہؓ کے حالات پر ایک تاریخ مرتبہ کی ہے جس میں ان کے فضائل ومناقب اسما اور کنیتیں بیان کی ہیں...... لیکن انہوں نے مسطح بن ثابت بن عباد کو بھی اصحاب صفہ میں شمار کیا ہے جب کہ میں اس کو دل سے پسند نہیں کرتا کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر تہمت کی ابتدا اسی نے کی تھی۔ البتہ حضرات ابو ہریرہؓ چوبان، معاذ بن الحارث، تائب بن خلاب، ثابت بن ابوعیٰنی عویم بن ساعد، سالم بن عمر، بن ثابت، ابو اللیث کعب بن عمر، وھب بن معقل، عبداللہ بن انیس اور حجاج بن عمر الاسلمی رضی اللہ عنہم اجمعین سب انہی اصحاب صفہ میں سے تھے، کبھی کبھی کسی خاص مقصد کے پیش نظر دنیا کی کسی دوسری خدمت میں شامل ہو جاتے تھے تاہم تمام کے تمام ایک ہی درجہ میں تھے۔ اور درحقیقت صحابہ کا دور خیر القرون (بہترین زمانہ) تھا لہذا وہ جس درجہ میں بھی تھے بعد کے ہر زمانہ کے لوگوں سے بہترین اور افضل ترین مخلوق تھے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنے پیغمبر ﷺ کی صحبت کی سعادت سے نوازا تھا اور ان کے قلوب کو ہر قسم کے عیوب سے محفوظ رکھا تھا جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''خیر القرون قرنی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الذین یلُوْنَھُمْ'' الحدیث (سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آنے والے ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آنے والے ہیں) اور خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ'' (اور ایمان میں سبقت حاصل کرنے والے پہلے مہاجرین اور انصار اور وہ لوگ جنہوں نے خلوص کے ساتھ ان کی متابعت کی اللہ ان سے راضی ہو چکا اور وہ اللہ سے راضی ہو چکے)

اب ہم اس کتاب میں بعض تابعین رحمہم اللہ اجمعین کا تذکرہ کریں گے تا کہ پورا پورا فائدہ بھی حاصل ہو اور زمانے بھی ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو جائیں۔

دسواں باب

تابعین میں تصوف کے امام

حضرت اویس قرنی رحمتہ اللہ علیہ

تابعین میں تصوف کے آئمہ میں سے امت کے آفتاب اور دین وملت کی شمع حضرت اویس قرنیؓ اہل تصوف کے بڑے مشائخ میں سے تھے۔ آپ رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک میں موجود تھے لیکن دو وجہ سے پیغمبر ﷺ کی زیارت سے محروم رہے ایک غلبہ حال اور دوسرے اپنی والدہ کے حقوق کے پیش نظر اور پیغمبر ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا تھا کہ قبیلہ قرن کا ایک اویس نامی آدمی ہے جو قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کی مقدار میری امت میں شفاعت کرے گا۔ اور آپؐ نے چہرہ انور حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کی طرف کر کے فرمایا کہ تم دونوں اسے دیکھو گے وہ چھوٹے اور درمیانے قد کا لمبے بالوں والا آدمی ہے اور اس کے دائیں پہلو پر ایک درہم کی مقدار سفید نشان ہے جو چنبل کے علاوہ کسی اور چیز کا نہیں اور اس کے ہاتھ کی ہتھیلی پر بھی اسی طرح کا سفید داغ ہے اور اس کو میری امت میں قبیلہ ربیعہ ومضر کی بھیڑوں کی مقدار شفاعت کا حق ملے گا۔ جب تم اسے دیکھو تو اسے میرا اسلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میری امت کے لئے دُعا کرے، چنانچہ حضورؐ کی وصال باکمال کے بعد جب حضرت عمرؓ مکہ مکرمہ تشریف لائے اور امیر المومنین حضرت علیؓ بھی آپ کے ہمراہ تھے تو آپ نے خطبہ کے دوران فرمایا "یا اھل نجد قوموا" (اے نجد کے رہنے والو کھڑے ہو جاؤ) اہل نجد کھڑے ہوئے تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم میں قبیلہ قرن کا کوئی آدمی ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں چنانچہ قرن کے رہنے والے کچھ لوگوں کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے ان سے اویس

قرنیؒ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاں اویس نام کا ایک دیوانہ آدمی ہے جو نہ تو آبادی میں آتا ہے اور نہ کسی شخص کے ساتھ بیٹھتا ہے اور نہ ہی وہ چیز کھاتا ہے جو لوگ کھاتے ہیں اور غم و خوشی میں شریک نہیں ہوتا۔ جب لوگ ہنستے ہیں تو وہ روتا ہے اور جب لوگ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں انہوں نے عرض کی کہ وہ تو تمہارے اونٹوں کے ساتھ جنگل میں ہے۔ دونوں بڑے بزرگ (حضرت عمر و علیؓ) اٹھے اور اس کے پاس پہنچ گئے حضرت اویس اس وقت نماز میں مشغول تھے۔ جب وہ فارغ ہوئے تھے تو انہیں سلام کیا اور اپنے پہلو اور ہتھیلی کا نشان دکھایا تا کہ ان کو معلوم ہو جائے پھر ان سے انہوں نے دُعا کی وصیت کی۔ یہ حضرات تھوڑی دیر ان کے پاس ٹھہرے تب حضرت اویس نے عرض کی کہ آپ حضرات نے تکلیف گوارا فرمائی اب آپ واپس تشریف لے جائیے کہ قیامت نزدیک ہے ہمیں وہاں ایسی ملاقات نصیب ہو گی کہ اس سے کبھی محروم نہ ہوں گے کیونکہ اس وقت میں سفر قیامت کا سامان تیار کرنے میں مصروف ہوں...... جب اہل قرن ان دونوں امرأ سے واپس لوٹے تو انہیں حضرت اویسؒ کے مرتبے اور مقام کا اندازہ اور علم ہو چکا تھا لہٰذا آپ وہاں سے کوفہ چلے گئے...... بس ایک دن ھرم بن حیان رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھا اس کے بعد کسی نے نہیں دیکھا حتیٰ کہ جب حضرت علیؓ کے ہمراہ آپ کے مخالفین کے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ جنگ صفین کے روز شہادت پائی ''عَاشَ حَمِیدَ او مَاتَ شھیدا '' (زندہ رہتے تو تعریف کے لائق اور وفات پائی تو شہادت کی، اللہ ان سے راضی ہو) آپ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ فرمایا ''السلامة فی الوحدة'' (سلامتی تنہائی میں ہے) اس لئے جس کا دل تنہا ہو وہ غیر کے خیال سے الگ ہوتا ہے اور اپنے تمام حالات میں مخلوق سے بے تعلق ہوتا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہتا ہے اور تمام لوگوں سے منہ پھیر لیتا ہے لیکن اگر کوئی یہ خیال کرے کہ تنہا جینا وحدت ہے تو یہ ایک محال امر ہے کیونکہ جب تک شیطان سے کسی کے دل

کومحبت ہوتی اور نفس امارہ کواس کے سینہ میں غلبہ حاصل ہوتا ہے اور جب تک دنیا وآخرت کا فکر دامن گیر ہو اور مخلوق کا خیال موجود ہو اس وقت تک وحدت نہیں ہوتی کیونکہ کسی چیز کی موجودگی میں یا صرف اس کے خیال سے آرام ہو دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ پس جو شخص وحید ہو اگر چہ اسے لوگوں کے ساتھ محبت حاصل ہو اس کی صحبت وحدت کے ساتھ مزاحم نہیں ہوتی اور جو شخص لوگوں میں مشغول ہوتا ہے اس کی خلوت نشینی بھی اس کے دل کی فراغت کا سبب نہیں بنتی لہذا اللہ تعالیٰ کی محبت کے بغیر لوگوں سے قطع تعلق نہیں ہوسکتا جس شخص کو حقیقتاً اللہ تعالیٰ سے محبت ہو اس کا ظاہری طور پر لوگوں سے ملنا جلنا اسے کچھ نقصان نہیں دیتا اور جس کو لوگوں کے ساتھ محبت ہو اس کے دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا نہ تو گزر ہوتا ہے اور نہ ہی محبت حق کی اسے خبر ہوتی ہے "لِاَنَّ الوحدَۃ صفۃَ عِبدِصافِ سَمِعَ قولہَ تعالٰی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہ' "(اس لئے کہ حقیقی تنہائی ایسے صاف باطن بندے کی صفت ہے جس نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول سن رکھا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے)

حضرت ھرم بن حیان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور انہی ائمہ تابعین میں سے صفائی باطن کا سرچشمہ اور اخلاص وفا کی کان حضرت ھرم بن حیانؒ ہیں آپ طریقت کے بزرگوں میں سے تھے اور طریقت کے معاملات میں حصہ وافر رکھتے تھے اور صحابہ کرامؓ کی صحبت سے مشرف ہوئے تھے۔ آپ نے حضرت اویس قرنیؓ کی زیارت کا ارادہ کیا لیکن جب قبیلہ قرن کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے چلے گئے ہیں آپ مایوس ہو کر مکہ کی طرف آئے تو معلوم ہوا کہ وہ کوفہ میں رہتے ہین چنانچہ آپ شوق زیارت میں کوفہ آئے تو یہاں بھی ملاقات نہ ہوئی کچھ روز وہاں ٹھہر کر آپ بصرہ کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں دریائے فرات کے کنارے پر ان سے ملاقات ہوگئی کہ وہ وضو فرما رہے تھے انہوں نے گدڑی زیب تن کر رکھی تھی اس لئے ان کو پہچان لیا، حضرت

اویسؒ نے وضو سے فارغ ہو کر دریا کے کنارے سے ذرا ہٹ کر بالوں کو کنگھی کی تو حضرت ھرم بن حیانؒ نے سامنے آ کر سلام کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا اے ھرم بن حیانؒ تم پر بھی سلام ہو! آپ نے سوال کیا کہ آپ نے کس طرح مجھے پہچان لیا کہ میں ھرم ہوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ''عَرَفَتْ روحي روحکَ '' (میری روح نے تمہاری روح کو پہچان لیا ہے) تھوڑی دیر یہ اکٹھے بیٹھے پھر آپ کو رخصت کر دیا ''ھرمؒ فرماتے ہیں کہ میرے ساتھ زیادہ تر باتیں ہر دو امیر (عمر و علی رضی اللہ عنہما) کے بارے میں کرتے رہے اور میرے لئے انہوں نے حضرت عمرؓ سے روایت بیان کی کہ حضرت عمرؓ نے پیغمبر ﷺ سے روایت بیان کی کہ آپ نے فرمایا ''اِنَّمَا الاعمال بالنیات وَلِکلِ امرءٍ مانوی فَمَن کانت ھجرتہ' اِلی اللہ وَرسولہٖ فھجرتہ' اِلی اللہِ ورسولہٖ وَمَن کانت ھجرتہ اِلَی الدُنیا بصیبھا او انی امراۃٍ تیزوجھا فجھرتہ' اِی مَا ھاجَرَ الیہِ '' (بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لئے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف ہی شمار ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہے کہ اس کو حاصل کرے یا کسی عورت کی طرف ہے کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے سمجھی جائے گی جس کی طرف اس نے ہجرت کی) پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ''عَلَیْکَ بقلبکَ '' (تجھ پر اپنے دل کی حفاظت لازم ہے) یعنی غیر اللہ کے خیال سے اپنے دل کو محفوظ رکھ اور اس کے دو معنی ہیں...... ایک یہ کہ مجاہدہ کی حالت میں اپنے دل کو حق کے تابع کر دے...... اور دوسرا یہ کہ اپنے آپ کو اپنے دل کے تابع کر دے اور یہ دونوں اصل قوی ہیں حق تعالیٰ کے ارادتمندوں کا کام یہ ہے کہ دل کو نفسانی شہوات کی کثرت اور خواہشات کی محبت سے خالی کر دیں دل سے ناموافق حالات کو آہستہ آہستہ دور کریں اور عمل کی درستگی اور امور طریقت کی نگہداشت کی تدبیر میں اپنی نگاہ کو آیات خداوندی میں لگا دیں تا کہ حق تعالیٰ کی محبت کا محل ہو

جائیں اور اپنے آپ کو دل کے تابع بنالینا کامل لوگوں کا کام ہے حق تعالیٰ نے جن کے دلوں کو اپنے جمال کے نور سے منور فرمایا اور تمام ظاہری اسباب وعلل سے ان کونجات عطا فرمائی اور بلند مقام پر پہنچا کر خلعت قرب سے سرفراز فرمایا اور اپنے لطف وکرم سے ان پر تجلی فرما کر اپنے مشاہدہ اور قرب سے محبت کی نظر ڈالی ہے ان کے جسم کو دل کے موافق کر دیا ہے...... پس پہلا گروہ وہ ارباب قلوب ہوتے ہیں اور دوسرا طبقہ مغلوب القلوب لوگوں کا ہوتا ہے اور صاحب قلوب دلوں کے مالک اور باقی الصفتہ ہوتے ہیں اور مغلوب القلوب فانی الصفتہ اور اس مسئلہ کی حقیقت حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے واضح ہوتی ہے کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ''اِلَّا عِبَادَکَ مِنهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ '' (مگر تیرے وہ بندے جو اخلاص والے ہیں) اس میں دو قرآنی آیتیں ہیں۔ مخلسین بکسر الام اور مخلصین بفتح الام۔ مخلص بکسر الام فاعل اور باقی الصفتہ ہوتا ہے اور مخلص بفتح الام مفعول اور فانی الصفتہ بمعنی خالص کیا گیا ہوتا ہے اور انشاء اللہ یہ مسئلہ کسی دوسرے مقام پر شرح وتفصیل کے ساتھ بیان کروں گا...... اور درحقیقت فانی الصفت لوگ زیادہ فضیلت کے حامی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے اجسام کو دل کے موافق کر لیتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کے دل حق کی تحویل میں ہوتے ہیں اور اسی کے مشاہدہ میں قائم رہتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جو باقی الصفتہ ہوتے ہیں اور دل کو بہ تکلف امر الٰہی کے موافق کرتے ہیں...... اور اس مسئلہ کی بنیاد صحو اور شکر (ہوشیاری و بے ہوشی) اور مشاہدہ اور مجاہدہ پر قائم ہے...... واللہ اعلم۔

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

اور انہی میں سے امام العصر اور یکتائے زمانہ حضرت ابو علی الحسن بصریؒ بھی ہیں ایک گروہ آپ کی کنیت ابو محمد بتلاتا ہے اور دوسرا گروہ ابو سعید۔ اہل طریقت کے نزدیک آپ کی بڑی قدر ومنزلت ہے اور علم معاملات میں آپ کے بڑے لطیف اشارے ہیں اور

میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک اعرابی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر صبر کی حقیقت دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ صبر دو طرح کا ہوتا ہے...... اول مصیبتوں اور آزمائشوں میں صبر کرنا اور دوسرا ان کاموں سے باز رہنے پر صبر کرنا جن سے اللہ تعالیٰ نے اجتناب کرنے کا حکم دیا اور ان کی متابعت سے منع فرمایا ہے اعرابی نے کہا ''اَنْتَ زَاھِد مارایتُ اَزْھَدَمِنکَ '' (آپ یقیناً زاہد ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر کوئی زاہد نہیں دیکھا)

امام حسن بصریؒ نے فرمایا اے اعرابی! میرا زہد تمام تر رغبت ہے اور میرا صبر بے قراری!

اعرابی نے کہا ''اس کلام کی تفسیر بیان فرمایئے کیونکہ اس سے تو میرا اعتقاد پریشان ہو گیا ہے'' آپ نے فرمایا ''مصیبت یا اطاعت و فرمانبرداری میں میرا صبر دوزخ سے میرے خوف کو ظاہر کرتا ہے اور یہ عین جزع اور بیقراری ہے اور دنیا سے میرا بے تعلق ہونا آخرت کی خواہش ہے اور یہ عین رغبت ہے وہ شخص بڑا خوش نصیب جو ان دونوں کے درمیان سے اپنا حصہ اٹھا لے تا کہ اس کا صبر عذاب دوزخ سے بچنے کے لئے نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہو اور اسی طرح اس کی رغبت بہشت میں پہنچنے کے لئے نہ ہو بلکہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو اور یہی اخلاص کی علامت ہے...... اور انہی سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''صحبة الاشرار تورث سوءَ الظن بالاخیار '' (شریر لوگوں کے ساتھ صحبت نیک لوگوں کے ساتھ بدظنی پیدا کر دیتی ہے) جو شخص اس طائفہ کے برے لوگوں کا ہمنشین ہوتا ہے اس گروہ کے اچھے اور بزرگ حضرات سے بدگمان ہو جاتا ہے اور یہ بات متفق علیہ اور اس زمانہ کے لوگوں کے حال سے بالکل موافق ہے جو بارگاہ حق تعالیٰ کے عزیزوں کا انکار کرتے ہیں اور ایسا اس لئے ہوا ہے کہ جب لوگ نام نہاد صوفیوں کے ساتھ صحبت اختیار کرتے ہیں اور ان کے افعال کو خیانت پر، زبان کو جھوٹ اور غیبت پر کانوں کو بیہودہ اور فضول باتوں کے سننے پر، آنکھ کو لہو اور شہوت پر اور ان کے ارادوں کو حرام اور مشتبہ چیزوں کے جمع کرنے پر مصروف دیکھتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں،

کہ تمام صوفیا کا یہی حال اور یہی مذہب ہے۔ان کا دل محبت الٰہی کا مسکن ہے اور ان کا کان درحقیقت سماع حق کا، آنکھ مشاہدہ تجلیات کا اور ان کی ہمیت رویئت حق کا مرکز و محل ہے۔ یہ سب اسرار الٰہی ہیں...... اور کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو صوفیا کی جماعت اور ان کے کردار و سیرت میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن ان خیانت کرنے والوں کی ضیافت کا تعلق محض خود ان کی ذات کے ساتھ ہے جہاں کے شرفا اور زمانہ کے سادات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں...... پس جو شخص کسی طبقہ کے شریر لوگوں کے ساتھ محبت کرتا ہے تو وہ درحقیقت اس کی اپنی برائی اور شرارت کا نتیجہ ہے کیونکہ اگر اس کے وجود میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرتا پس ہر شخص کو اپنے آپ پر ملامت کرنی چاہئے کہ وہ ایک نالائق اور نامناسب شخص سے صحبت اختیار کرتا ہے اور صوفیا کرام کے اقوال سن کر بھی سب سے زیادہ ایسے شریر اور رذیل ہی ہیں کہ رذیلوں اور شیریروں سے ان کی صحبت ہوتی ہے لہذا جب سچے صوفیا کرام سے اپنی خواہشات نفس نہیں پاتے تو ان کے منکر ہو جاتے ہیں اور ان شریر اور رذیل نام نہاد صوفیوں کی اقتدا کر کے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بخلاف ان نیک اور بارگاہ خداوندی کے عزیزوں کے جنہوں نے اپنی چشم رضا کے ساتھ ان صوفیاء میں سے نیک لوگوں کو دیکھا۔ ان کی صحبت کو دل و جان سے خرید لیا۔ پوری دنیا میں سے اس برگزیدہ گروہ کے طریق کو اختیار کر کے ان کی برکات سے دونوں جہانوں کا مقصود حاصل کر لیا اور باقی سب سے تعلق منقطع کر دیا اور اسی مفہوم کو ایک بزرگ نے یوں ادا کیا ہے۔

فَلاَ تحِقوَنّی نفسِی دانت حبیبُها　　فکُلِ امرءٍ یصیبُ اِلیٰ مَنَ بجانِسْ

ترجمہ:۔ پس میرے نفس کو حقیر نہ سمجھ جب کہ تو اس کا محبوب ہے کیونکہ ہر شخص اپنے ہم جنس کا مشتاق ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے علماء کے سردار اور فقہا کے مقتدا حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ آپ کی شان بہت بڑی اور قدر بہت بلند ہے اور آپ کا فرمان قابل عزت اور سینہ قابل تعریف تھا اور علم فقہ، توحید، حقائق طریقت، تفسیر، شعر اور دوسرے تمام فنون کے علوم میں آپ کے بے شمار مناقب ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بظاہر ہوشیار اور طبعاً پارسا تھے اور تمام مشائخ طریقت کے نزدیک یہی طرز عمل نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے اور آپ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا ”بالیسیر مِنَ الدنیا مع ملامۃِ دینکَ کمارَضی قوم“ بکثیر ھا مَع ذَھابِ دینھم ”(تو اپنے دین کی سلامتی کے ساتھ دنیا کے تھوڑے سے مال پر راضی ہو جا جس طرح کچھ لوگ دین کے چلے جانے کے بدلے میں بہت سی دنیا پر راضی ہوئے بیٹھے ہیں) یعنی دین کی سلامتی کے ساتھ فقر و افلاس اس دولت مندی اور غنا سے بدرجہا بہتر ہے جو دین سے غفلت کا سبب بن جائے۔ کیونکہ فقیر جب دل کی طرف دھیان دیتا ہے تو وہاں زیادتی دنیا کی خواہش نہیں پاتا اور جب ہاتھ دیکھتا ہے تو ناپاک دنیا دیکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے دوستوں کا اللہ تعالیٰ کی خداوندی پر بغیر غفلت کے راضی رہنا۔ خدا تعالیٰ سے غافل لوگوں کے دھوکا دینے والی دنیا پر راضی رہنے سے بہتر ہے اور مصیبت پر حسرت و ندامت کے بغیر صبر کرنا اس نعمت سے بدرجہا بہتر ہے جس کے ساتھ ذلت اور معصیت ہو۔ پس جب مصیبت آتی ہے تو غافل لوگ کہتے ہیں۔ الحمد للہ کہ یہ مصیبت جسم پر نہیں آئی۔ اور دوستان حق تعالیٰ کہتے ہیں کہ الحمد للہ کہ بدن مصیبت میں مبتلا ہوا ہے یہ مصیبت ہمارے دین پر واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ اگر مصیبت جسم پر واقع ہو لیکن دل میں بقا موجود ہو تو یہ مصیبت جسم کے لئے خوشی کا موجب ہوتی ہے اور اگر دل میں غفلت شعاری ہو تو جسم اگرچہ نعمت میں ہی کیوں نہ ہو وہ نعمت عذاب بن جاتی ہے اور درحقیقت تھوڑی سی دنیا

پرراضی ہونا دنیائے کثیر پر راضی ہونے کے برابر ہے اور زیادہ دنیا پر راضی ہونا قلیل دنیا کے مترادف ہے اس لئے کہ دنیا کی قلت بھی دنیا کی کثرت کی طرح ہی ہے...... اور آپ ہی کے متعلق آتا ہے کہ آپ ایک روز مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی نے حاضر ہوکر سوال کیا کہ مجھے وہ حلال چیز بتائیے جس میں کوئی حرام نہ ہو اور وہ حرام چیز کہ جس میں کوئی حلال نہ ہو؟ آپ نے جواباً فرمایا "ذِکرُ اللّٰہِ حلال" لَیسَ فِیہِ حرام" وَذکر غیرہٖ حرام" لَیسَ فِیہِ حلال" "(اللہ تعالیٰ کا ذکر ایسا حلال ہے کہ اس میں کچھ بھی حرام نہیں اور غیر اللہ کا ذکر ایسا حرام ہے جس میں کچھ بھی حلال نہیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں نجات ہے اور غیر اللہ کے ذکر میں ہلاکت! اور توفیق اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

گیارھواں باب

تبع تابعین میں سے ائمہ تصوف

حضرت حبیب عجمی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

تبع تابعین میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ طریقت کے بہادر اور شریعت میں بڑے مضبوط تھے آپ کا نام حضرت حبیب عجمیؒ ہے آپ بڑے بلند حوصلہ اور قیمتی انسان تھے اور مردان خدا کے درجات میں بہت بڑے مرتبہ کے حامل تھے آپ کو شروع میں حضرت حسن بصریؒ رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر توبہ نصیب ہوئی تھی کہ آپ ابتداءعمر میں لوگوں کو سود پر رقم دیا کرتے تھے اور ہر قسم کا غلط کام کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ سے آپ کو سچی توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اور آپ نے رب العزت کی طرف رجوع فرمایا اور طریقت کا عمل اور اس کا بنیادی علم حضرت حسن بصریؒ سے سیکھا۔ آپ کی زبان عجمی تھی اور عربی پر جاری نہ ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سی کرامات سے مخصوص فرمایا تھا اور آپ اس درجے تک پہنچ گئے تھے کہ ایک شام حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ آپ کے عبادت خانہ کے دروازے پر سے گزر رہے تھے کہ آپ تکبیر کہہ کر شام کی نماز میں کھڑے ہو چکے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ آئے لیکن نماز میں آپ کی اقتدا نہ کی۔ کیونکہ آپ کی زبان عربی اور قرآن مجید کی تلاوت پر جاری نہ ہوتی تھی...... جب رات کو سوئے تو خواب میں حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوئی۔ پوچھا بار خدایا! تیری خوشنودی کس چیز میں ہے؟ حق تعالیٰ نے فرمایا اے حسن! میری رضا تو نے پا تو لی تھی لیکن تو نے اس کی قدر نہ کی۔ آپ نے عرض کی بار خدایا! یہ کیسے؟ فرمایا! اگر گزشتہ رات تو حبیب کی اقتداء میں نماز ادا کر لیتا اور اس کی صحت نیت تجھ کو اس کی عبادت کے انکار سے باز نہ رکھتی تو میں تجھ سے راضی ہو جاتا...... طائفہ صوفیاء میں یہ

بات مشہور ہے کہ جب حضرت حسن بصریؒ حجاج بن یوسف کے کارندوں سے بھاگ کر آپ کی عبادت گاہ میں آ گئے تو وہ سپاہی آئے اور حضرت حبیبؒ سے دریافت کیا اے حبیب! حسن بصریؒ کو آپ نے کسی جگہ دیکھا ہے؟ فرمایا ہاں انہوں نے پوچھا تو وہ کہاں ہیں؟ فرمایا میری عبادت گاہ میں موجود ہیں! چنانچہ وہ عبادت خانہ میں داخل ہو گئے لیکن وہاں انہوں نے کسی کو نہ دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ حبیبؒ نے ان سے استہزاء کیا ہے آپ کے ساتھ سخت کلامی کی کہ آپ نے ہم سے غلط بیانی کی کہ حسنؒ یہاں ہیں۔ آپ نے قسم کھا کر کہا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اس طرح سپاہی دوبارہ اور پھر سہ بارہ اندر گئے لیکن حضرت حسنؒ کو نہ پایا اور واپس چلے گئے تو حضرت حسنؒ باہر تشریف لے آئے اور فرمایا اے حبیب! میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تیری برکت سے مجھے ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ لیکن آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ حسنؒ اندر ہی موجود ہے؟ آپ نے جواب دیا اے استاد محترم! وہ جو آپ کو دیکھ نہ سکے تھے یہ میری برکت نہ تھی بلکہ میرے سچ بولنے کی برکت سے وہ آپ کو دیکھ نہ سکے تھے اور اگر میں دروغ بیانی سے کام لیتا تو وہ مجھے اور آپ دونوں کو رسوا کرتے۔ اور آپ کی اس طرح کی کرامات بہت ہیں۔ آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کس چیز میں ہے؟ تو آپ نے فرمایا "لَیْسَ فیهِ غبارُ النفاق " (اللہ کی رضا اس دل میں ہے جس میں منافقت کا غبار نہ ہو) اس لئے کہ نفاق وفاق کی ضد ہے اور رضا عین وفاق ہے اور محبت کو نفاق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور اس کا محل رضا ہے۔ پس قضا الٰہی پر راضی رہنا حق تعالیٰ کے دوستوں کی صفت ہے اور نفاق دشمنوں کی صفت ہے...... اور یہ مسئلہ بڑا اہم ہے ہم اسے انشاءاللہ کسی دوسرے مقام پر بیان کریں گے اور توفیق اور مدد اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی آئمہ تابعین میں سے اہل محبت کے نقیب اور جملہ جن وانس کی زینت حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ہیں وہ حضرت حسن بصریؒ کے دوست اور

طریقت کے بزرگوں میں سے تھے ان کی کرامات مشہور ہیں اور ریاضیات میں ان کے خصائل مذکور ہیں آپ کے والد دینار غلام تھے اور حضرت مالکؒ کی ولادت والد کی غلامی کے دور میں ہی ہوئی تھی اور آپ کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک رات آپ ایک گروہ کے ساتھ عیش وطرب میں مشغول تھے جب سب لوگ سو گئے تو جو باجہ آپ بجا رہے تھے اس میں سے آواز آئی "یَا مَالِکَ مَالَکَ اَنْ لاتتوبَ "(اے مالک تجھے کیا ہوا کہ تم توبہ نہیں کرتے) چنانچہ آپ نے ان سب چیزوں سے ہاتھ اٹھالیا اور حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کی اور اپنا معاملہ درست کر لیا پھر اس مقام تک پہنچے کہ ایک دفعہ کشتی میں سوار تھے کہ ایک دوسرے سوار کا ایک قیمتی موتی غائب ہو گیا۔ آپ چونکہ سب کے لئے اجنبی تھے اس لئے انہوں نے موتی چرانے کی تہمت آپ پر لگا دی۔ آپ نے اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھایا تو فوراً دریا کی تمام مچھلیوں نے اپنے سر سطح پانی پر نکال لئے اور ہر مچھلی نے اپنے منہ میں ایک قیمتی پتھر لے رکھا تھا۔ آپ نے ان میں سے ایک موتی لے کر اس شخص کو دے دیا اور خود سطح پانی پر قدم رکھا اور دریا کے پانی پر چلتے ہوئے ساحل پر پہنچ گئے۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "حَبُّ الاعمالِ اِلَی الاخلاص فِی الاعمالِ "(میرے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل اعمال میں اخلاص ہے) کیونکہ کوئی عمل اخلاص سے ہی عمل بنتا ہے گویا عمل کے لئے اخلاص کی وہی حیثیت ہے جو جسم کے لئے روح کی ہوتی ہے جس طرح روح کے بغیر جسم ایک پتھر ہوتا ہے اسی طرح اخلاص کے بغیر عمل بھی ایک بیکار چیز ہوتا ہے لیکن اخلاص کا تعلق باطن کے معاملات سے ہے اور عبادت ظاہری اعمال میں سے ہے اور ظاہری اعمال باطنی اعمال کے ساتھ مل کر ہی مکمل ہوتے ہیں اور باطنی اعمال ظاہری اعمال کے ساتھ ہی قیمتی بنتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہزار سال تک دل میں مخلص ہو لیکن جب تک اس کا عمل اخلاص کے ساتھ موافق نہیں ہوگا۔ اخلاص کی کوئی حیثیت نہیں اور اگر ایک شخص ہزار سال تک ظاہری طور پر عمل کرتا رہے لیکن جب تک خلوص نیت

اس کے عمل کے ساتھ نہیں ملے گا وہ عمل عبادت نہیں قرار پائے گا۔

حضرت حبیب بن اسلم الراعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

اورانہی تبع تابعین رحمہم اللہ اجمعین میں سے بہت بڑے فقیر اور تمام اولیاء پر امیر حضرت ابوحلیم حبیب بن اسلم الراعیؒ ہیں آپ مشائخ طریقت میں بہت بڑے مرتبہ کے حامل تھے تمام احوال میں آپ کے بہت سے براہین اور دلائل موجود ہیں۔ آپ حضرت سلمان فارسیؓ کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔ آپ پیغمبر ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "فیةُ الْمُومِنِ خیر" مِنْ عَمِلِهٖ" (مومن کی صحیح نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) حضرت حبیبؒ نے بھیڑ بکریاں رکھی ہوئی تھیں اور فرات کے کنارے پر قیام فرماتھے اور عزلت وتنہا نشینی اختیار کر رکھی تھی ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آپ کے پاس سے گزرا تو میں نے آپ کو نماز میں مشغول پایا اور دیکھا کہ بھیڑیئے آپ کی بکریوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں اس پیر کی ضرور زیارت کروں گا کہ مجھے اس میں بزرگی کی علامات نظر آتی ہیں۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے فرمایا! بیٹے کس کام کے لئے آئے ہو؟ میں نے عرض کی کہ آپ کی زیارت کے لئے فرمایا "اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزادے میں نے کہا "یا شیخ! بھیڑیئے کو بکری کے موافق دیکھ رہا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا "اس کی وجہ یہ ہے کہ بکریوں کے چرواہے نے حق تعالیٰ کے ساتھ موافقت اختیار کر رکھی ہے" یہ کہہ کر آپ نے لکڑی کا ایک پیالہ ایک پتھر کے نیچے رکھا تو اس پتھر سے دو چشمے پھوٹ پڑے ایک دودھ کا اور دوسرا شہد کا...... آپ نے فرمایا۔ لو پی لو میں نے عرض کی "اے شیخ! آپ نے کس عمل کی وجہ سے یہ مقام حاصل کیا؟ فرمایا "حضرت محمد ﷺ کی متابعت سے۔ پھر فرمایا "اے لڑکے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم باوجود کہ اپنے نبی کی

مخالفت تھی پھر بھی پتھر نے ان کے لئے پانی دے دیا تھا اور جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی حضرت محمد ﷺ کے درجہ کے برابر نہ تھے۔ تو جب میں حضرت محمد ﷺ کا اطاعت گزار ہوں تو یہ پتھر مجھے دودھ اور شہد کیوں نہ دے گا جب کہ حضرت محمد ﷺ مرتبہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں بہتر تھے...... میں نے عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے آپ نے فرمایا "لاَ تَجعَل قَلْبکَ صَندوقَ الحَرصِ وبطْنکَ وعالحرام" (اپنے دل کو دنیوی لالچ کا صندوق اور اپنے پیٹ کو حرام مال کا برتن نہ بنا) کیونکہ مخلوق کی تباہی انہی دو چیزوں کی وجہ سے ہے اور اس کی نجات انہی دو چیزوں سے حفاظت میں ہے[1]......

اور میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں مجھ سے بہت سی روایات بیان کی ہیں لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کہ میری کتابیں غزنی میں رہ گئی ہیں اللہ انہیں محفوظ رکھے) اور میں خود ہندوستان کے شہر بہنور (لاہور) میں ہوں جو ملتان کے مضافات میں سے ہے اور بیگانہ لوگوں میں گھرا ہوا ہوں اور خوشحالی و تنگ حالی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے......

حضرت ابوحازم مدنی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے بڑے نیک بزرگ اور مشائخ طریقت میں سے بعض کے پیشوا حضرت ابوحازم المدنیؒ بھی ہیں۔ طریقت کے معاملات میں آپ حصہ وافر اور مقام بلند کے مالک تھے اور فقر میں سچی استقامت اور مجاہدات میں کامل دسترس رکھتے تھے اور حضرت عمر بن عثمان مکیؒ آپ کے احکام پر سختی سے پابند تھے اور آپ کے کلام کو دل و جان سے پسند کرتے تھے بہت سی کتابوں میں مذکور ہے اور یہی عمر بن عثمانؒ آپ سے روایت کرتے ہیں

[1] صاحب کشف المحجوب نے آپ کا ذکر تبع تابعین میں کیا ہے لیکن حضرت سلمان فارسیؓ معروف صحابی رسول اللہؐ ہیں اس اعتبار سے حضرت حبیبؒ کا ذکر تابعین میں ہونا چاہئے تھا کہ کسی صحابی کی صحبت سے مشرف ہونے والا بزرگ اصطلاحاً تابعی کہلاتا ہے۔ (مترجم)

کہ لوگوں نے حضرت ابو حازمؒ سے دریافت کیا کہ "ما مالک" (آپ کا مال کیا ہے؟) تو آپ نے جواب دیا۔ "الرضاء عن الله و الغنی عنِ الناس" (ہر حال میں اللہ سے راضی رہنا اور لوگوں سے بے نیاز رہنا) اور لامحالہ جو شخص حق تعالیٰ سے راضی ہو وہ مخلوق سے بے پرواہ ہوتا ہے اور کسی مرد بزرگ کے لئے سب سے بڑا خزانہ یہی رضا الٰہی ہے اور اس میں خدائے عزوجل کے ساتھ غنی ہونے کی طرف اشارہ ہے پس جو شخص ذات حق تعالیٰ کے ذریعہ غنی ہوتا ہے وہ غیر اللہ سے بے نیاز ہی ہوتا ہے اور اس کی درگاہ کے علاوہ کسی کے دروازے کا راستہ نہیں جانتا اور ظاہر و باطن میں اس کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتا...... مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت ابو حازمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ سو رہے تھے میں تھوڑی دیر ٹھہرا کہ آپ بیدار ہوئے اور مجھ سے فرمایا "کہ ابھی میں نے پیغمبر علیہ السلام کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپؐ نے مجھے تمہارے لئے پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ ماں کے حقوق کی حفاظت کرنا حج ادا کرنے سے بہتر ہے اس لئے لوٹ جا اور ماں کی دلجوئی کر" میں وہیں سے واپس لوٹ آیا اور مکہ مکرمہ کی طرف نہ گیا...... اس سے زیادہ کوئی کلام میں نے آپ سے متعلق نہیں سنا۔

حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل مجاہدہ کے داعی اور مشاہدات میں ہمیشہ قائم رہنے والے حضرت محمد بن واسعؒ بھی ہیں۔ آپ کے دور میں آپ کا ہم مرتبہ بزرگ نہ تھا۔ آپ نے تابعینؒ میں سے بہت سے حضرات کی صحبت کا شرف پایا تھا اور مشائخ متقدمین میں سے ایک گروہ کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ آپ طریقت میں کامل حصہ رکھتے تھے طریقت کے حقائق میں بہت اعلیٰ خیالات اور کامل اشارات آپ سے ثابت ہیں..... اور آپ سے ہی آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "ما رایتُ شیاً الا ورایت الله فیہِ" (میں نے کوئی چیز

کہ لوگوں نے حضرت ابوحازمؒ سے دریافت کیا کہ "ما مالک" (آپ کا مال کیا ہے؟) تو آپ نے جواب دیا۔ "الرضاء عن الله و الغنی عَنِ الناس" (ہر حال میں اللہ سے راضی رہنا اور لوگوں سے بے نیاز رہنا) اور لامحالہ جو شخص حق تعالیٰ سے راضی ہو وہ مخلوق سے بے پرواہ ہوتا ہے اور کسی مرد بزرگ کے لئے سب سے بڑا خزانہ یہی رضا الٰہی ہے اور اس میں خدائے عزوجل کے ساتھ غنی ہونے کی طرف اشارہ ہے پس جو شخص ذات حق تعالیٰ کے ذریعہ غنی ہوتا ہے وہ غیر اللہ سے بے نیاز ہی ہوتا ہے اور اس کی درگاہ کے علاوہ کسی کے دروازے کا راستہ نہیں جانتا اور ظاہر و باطن میں اس کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتا...... مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت ابوحازمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ سو رہے تھے میں تھوڑی دیر ٹھہرا کہ آپ بیدار ہوئے اور مجھ سے فرمایا "کہ ابھی میں نے پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے کہ آپؐ نے مجھے تمہارے لئے پیغام دیتے ہوئے فرمایا کہ ماں کے حقوق کی حفاظت کرنا حج ادا کرنے سے بہتر ہے اس لئے لوٹ جاؤ اور ماں کی دلجوئی کر" میں وہیں سے واپس لوٹ آیا اور مکہ مکرمہ کی طرف نہ گیا...... اس سے زیادہ کوئی کلام میں نے آپ سے متعلق نہیں سنا۔

حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل مجاہدہ کے داعی اور مشاہدات میں ہمیشہ قائم رہنے والے حضرت محمد بن واسعؒ بھی ہیں۔ آپ کے دور میں آپ کا ہم مرتبہ بزرگ نہ تھا۔ آپ نے تابعینؒ میں سے بہت سے حضرات کی صحبت کا شرف پایا تھا اور مشائخ متقدمین میں سے ایک گروہ کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ آپ طریقت میں کامل حصہ رکھتے تھے طریقت کے حقائق میں بہت اعلیٰ خیالات اور کامل اشارات آپ سے ثابت ہیں...... اور آپ سے ہی آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "ما رایتُ شیاً الاورایت الله فیهِ" (میں نے کوئی چیز

ایسی نہیں دیکھی جس میں اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھا ہو) یہ مقام مقام مشاہدہ ہے کہ بندہ فاعل حقیقی کی محبت میں اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ جب اس کے کسی بھی فعل پر نظر کرتا ہے تو فعل کو نہیں دیکھتا بلکہ صرف فاعل کو دیکھتا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی تصویر کو دیکھتے ہوئے مصور کو دیکھتا ہے اور اس کلمہ کی حقیقت پیغمبر خدا حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے قول کی طرف لوٹتی ہے کہ انہوں نے چاند سورج اور ستارے کے بارے میں کہا کہ 'ھٰذا ربی '' (یہ میرا رب ہے) اور یہ چیز محبت کے غلبہ کی وجہ سے تھی کہ جس چیز کو بھی دیکھتے اس کو اپنے محبوب کی صفت پر دیکھتے تھے کیونکہ جب دوستان الٰہی نگاہ کرتے ہیں تو تمام جہان کو اللہ تعالیٰ کے قہر سے مغلوب اور اس کی حاکمیت کے تابع دیکھتے ہیں اور تمام موجودات میں ان کے فاعل حقیقی کی قدرت کے متلاشی ہوتے ہیں اور ممکن کی تکوین کو معدوم سمجھتے ہیں جب نگاہ شوق سے اس میں دیکھتے ہیں تو مغلوب کو نہیں بلکہ غالب کو دیکھتے ہیں اور مفعول کو نہیں بلکہ فاعل کو دیکھتے ہیں اور مخلوق کو نہیں خالق کو دیکھتے ہیں، اور ہم اس مسئلہ کو باب مشاہدہ میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔

اور اس مقام پر ایک گروہ مغالط میں مبتلا ہوا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد بن واسعؒ نے جو کہا ہے کہ ''رَائیتُ اللّٰہ فیہِ '' (میں نے اس چیز میں حق تعالیٰ کو دیکھا) یہ مکان حق تعالیٰ کے لئے تجزیہ اور حلول کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ بات صریح کفر ہے اس لئے کہ مکان متمکن کی جنس ہوتا ہے اگر کوئی شخص اس قول کو اس تقدیر پر مانے کہ مکان مخلوق ہے تو مکین بھی مخلوق ہونا چاہئے اور اگر اس تقدیر پر مانے کہ متمکن قدیم ہے تو مکان کو بھی قدیم ماننا پڑے گا اس طرح اس قول سے دو فساد لازم آئیں گے یا تو مخلوق کو قدیم ماننا پڑتا ہے یا خالق کو حادث اور یہ دونوں باتیں کفر ہیں۔ لیکن حقیقت اس طرح نہیں بلکہ آپ کا اشیاء کو اس طرح دیکھنا اس معنی میں ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی آیات اور براہین دیکھنا مراد ہے...... اور اس میں بڑے لطیف رموز ہیں جنہیں ہم

اپنی جگہ پر بیان کریں گے انشاء اللہ۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ[1] رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے اماموں کے امام اہل سنت و جماعت کے مقتداء فقہا کے باعث شرف اور علماء کے لئے نشان عزت حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الخراز بھی ہیں مجاہدات اور عبادات میں آپ بڑے صاحب استقامت تھے اور اس طریقت کے اصولوں میں بڑی بلند شان کے مالک تھے۔ آپ نے ابتدائی زندگی میں خلوت نشینی کا ارادہ فرمایا تھا اور لوگوں سے الگ ہو کر بالکل تنہا رہنا چاہا تھا کیونکہ آپ نے اپنے دل کو دنیاوی ریاست اور طلب جاہ سے بالکل پاک کر لیا اور اپنے دل کو حق کے لئے اچھی طرح سنوار لیا تھا حتیٰ کہ ایک رات آپ نے خواب دیکھا کہ آپ کی مبارک ہڈیوں کو آپ کی قبر منور میں اکٹھا کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض کو بعض سے چن رہے ہیں۔ آپ اس خواب کی ہیبت سے بیدار ہوئے اور امام محمد بن سیرینؒ کے اصحاب میں سے ایک کے پاس جا کر اس خواب کی تعبیر دریافت کی۔ انہوں نے تعبیر بیان کی کہ آپ کے علوم نبوت اور آپ کی سنت کی حفاظت میں بڑے بلند مرتبہ و مقام پر پہنچیں گے اور اس میں پوری مہارت حاصل کر کے صحیح احادیث کو ضعیف روایات سے جدا کریں گے...... آپؒ نے پھر دوبارہ خواب میں پیغمبر علیہ السلام کی زیارت کی کہ آپ فرما رہے ہیں "اے ابو حنیفہ! اللہ تعالیٰ نے تمہاری زندگی کو میری سنت کے زندہ کرنے کے لئے بنایا ہے" "گوشہ نشینی کا ارادہ نہ کرو"......

آپ ابراہیم بن ادھم، فضیل بن عیاض داؤد طائی، بشر حافی رحمہم اللہ اجمعین اور اسی طرح کے مشائخ طریقت کے بڑوں بزرگوں میں سے بہت سے حضرات کے استاد تھے

---

[1] صاحب کشف المحجوب نے امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ کا شمار تبع تابعینؒ میں کیا ہے لیکن یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ صحابی رسول اللہ ﷺ حضرت انسؓ کی ملاقات اور زیارت کا شرف آپ کو حاصل ہے اس اعتبار سے آپ کا شمار حضرات تابعینؒ میں ہوتا ہے لہذا آپ کا تذکرہ اس سے قبل باب میں ہونا چاہئے تھا۔ (مترجم)

علماء میں یہ بات مشہور ہے کہ خلیفہ ابوجعفر منصور نے یہ تدبیر کی کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام سفیان ثوری، حضرت امام صلہ بن اشیم اور حضرت امام شریک رحمہم اللہ اجمعین میں سے کسی ایک کو قاضی مقرر کیا جائے کیونکہ یہ چاروں حضرات اپنے دور کے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ خلیفہ نے آدمی بھیج کر ان چاروں حضرات کو دربار میں بلوایا۔ جب یہ دربار کی طرف جارہے تھے تو راستے میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا میں ہر ایک کے لئے دربار جانے کے بارے میں فراست سے ایک بات کہتا ہوں ''انہوں نے کہا ٹھیک ہے فرمائیے! تب آپ نے فرمایا میں تو ایک حیلہ کے ذریعہ اس عہدہ قضا کو اپنے سے ہٹا لوں گا اور صلہ اپنے آپ کو دیوانہ بنا لے، اور سفیان بھاگ جائے گا اور شریک قاضی بن جائے گا چنانچہ حضرت سفیان ثوریؒ تو موقع پا کر راستہ سے ہی بھاگ گئے اور ایک کشتی میں داخل ہو کر کشتی والوں سے کہا کہ مجھے چھپا لو میرا سر کاٹنا چاہتے ہیں۔ اور آپ نے یہ پیغمبر ﷺ کی اس حدیث کی تاویل کے طور پر کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''مَنْ جُعِلَ قاضیاً فقد ذُبِح بغیــر سکین ''(جو شخص قاضی بنایا گیا تو گویا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا) چنانچہ ملاح نے آپ کو کشتی میں چھپا لیا۔ باقی ان تینوں آئمہ کرام کو خلیفہ کے دربار میں لے گئے۔ خلیفہ نے سب سے پہلے حضرت اما ابوحنیفہؒ سے کہا کہ آپ کو قاضی ہونا چاہئے۔ آپ نے جواب دیا ''اے امیر! میں ایک عجمی نسل کا آدمی ہوں عربی نہیں بلکہ ان کے غلاموں میں سے ہوں لہذا سرداران عرب میرے احکام پر راضی نہ ہوں گے'' خلیفہ نے کہا اس عہدے کا نسب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق علم سے ہے اور علم کے اعتبار سے آپ اس دور کے تمام علما پر مقدم ہیں'' آپ نے فرمایا میں اس کام کے لائق نہیں ہوں اور اس قول میں اگر میں سچا ہوں تو واقعی قضا کے لائق نہیں اگر جھوٹا ہوں تو جھوٹے آدمی کو مسلمانوں کی قضا کے لئے نہیں ہونا چاہئے'' اور آپ کو جو خلیفہ وقت میں کسی جھوٹے آدمی کو اپنا قاضی نہیں بنانا چاہئے اور نہ ہی مسلمانوں کے مال، خون اور شرمگاہوں سے متعلق اس پر بھروسہ کرنا چاہئے

''آپ نے یہ کہا اور عہدہ قضا سے نجات حاصل کر لی بعدازیں حضرت صلہ ؒ منصور کے سامنے آئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے ''آپ کیسے ہیں؟ اور آپ کے فرزندوں اور جانوروں کا کیا حال ہے؟ منصور نے کہا'' یہ تو دیوانہ ہے اسے باہر نکال دو۔ پھر شریک سے کہا آپ کو قضا کی خدمت سرانجام دینی چاہئے آپ نے جواباً فرمایا کہ میں سودائی مزاج کا آدمی ہوں اور میرا دماغ کمزور ہے اس لئے میں اس عہدہ کی ذمہ داریاں پوری نہ کرسکوں گا۔ خلیفہ منصورؔ نے کہا ''مقوی اور موافق غذاؤں اور خوشبودار پھلوں کے جوس سے علاج کیجئے تاکہ آپ کی عقل تیز اور مضبوط ہو جائے۔ پھر عہدہ قضا ان کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد حضرت ابوحنیفہؒ نے آپ کو چھوڑ دیا اور پھر کبھی آپ سے بات نہ کی۔ اور یہ سب کچھ آپ کے ہر شخص کے بارے میں سچی فراست۔ خود صحت و سلامتی کی راہ پر چلنے مخلوق کو اپنے سے دور کرنے لوگوں کے نزدیک مرتبہ والی چیز پر مغرور نہ ہونے دیں اور کامل الحال ہونے کی واضح علامت ہے اور آپ کی یہ حکایت اس بات کی قوی دلیل ہے کہ لوگوں سے کنارہ کش رہنا ہی صحت و سلامتی کا موجب ہے کہ ان تینوں بزرگوں نے کسی نہ کسی حیلہ کے ذریعہ مخلوق کو اپنے آپ سے دور کر دیا۔ لیکن آج کے عام علماء اس معاملہ کے منکر ہیں کیونکہ وہ خواہشات نفس سے آرام پاتے ہیں اور حق کے راستے سے بھاگ گئے ہیں اور امراء کے دروازوں کو اپنے لئے قبلہ اور ظالموں کے درباروں کو اپنے لئے بیت المعمور اور جابر لوگوں کے دستر خوان کو اپنے لئے مقام قاب قوسین کی طرح قابل تعظیم بنالیا ہے اور جو کوئی بھی ان کی خواہشات کی مخالفت کرے وہ ان سے انکار کر دیتے ہیں...... ایک دفعہ میرے قیام غزنی (اللہ اس کی حفاظت کرے) کے دوران امانت اور علم کے مدعی ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ گدڑی پہننا بدعت ہے۔ میں نے کہا ''حشیش اور دیبقی جو بالکل ریشمی کپڑے ہیں جن کا استعمال کرنا مردوں کے لئے حرام محض ہے اور پھر ظالموں کے مطلق حرام مال سے منت اور زاری کر کے حلال کرنا اور بھی زیادہ موجب حرمت بن جاتا ہے لیکن تم اس طرح حرام مال

سے حرام طریقہ سے لیا ہوا کپڑا تو بے تکلف پہن لیتے ہو اور یہ نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے تو پھر حلال رقم سے خریدے ہوئے حلال کپڑے کو کیوں کہتے ہو کہ یہ بدعت ہے اگر رعونت طبع اور نفس کی گمراہی تم پر مسلط نہ ہوتی تو اس طرح کی کمزور بات نہ کرتے لیکن ریشمی کپڑا عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام اور دیوانوں پر مباح ہے اگر تم ان دونوں میں سے کسی ایک کا اقرار کرو پھر تو تم معذور ہو پس ہم ناانصافی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب حضرت نوفل بن حیانؒ نے وفات پائی تو میں نے خواب دیکھا کہ قیامت بپا ہے اور تمام لوگ حساب گاہ میں کھڑے ہیں۔ میں نے پیغمبر ﷺ کو دیکھا کہ حوض کوثر کے کنارے کھڑے ہیں اور آپ کے دائیں بائیں بہت سے مشائخ کھڑے ہیں اور ایک نیک صورت بوڑھے شخص کو دیکھا جس نے اپنے سر کے سفید بال چھوڑ رکھے تھے وہ اپنے رخسار کو پیغمبر ﷺ کے رخسار مبارک پر رکھے ہوئے تھا اور ان کے برابر میں حضرت نوفلؒ کو دیکھا۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو میری طرف آئے اور مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا مجھے پانی دیجئے! انہوں نے فرمایا "میں آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگتا ہوں۔ حضور ﷺ نے اپنی انگلی مبارک سے اشارہ فرمایا کہ پانی دے دو۔ تو انہوں نے مجھے پانی دیا۔ میں نے اس میں سے خود بھی پیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی پلایا لیکن اس پیالہ میں سے کچھ بھی کم نہ ہوا۔ میں نے پوچھا اے نوفل! پیغمبر ﷺ کی داہنی جانب بوڑھے بزرگ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ حضرت ابراہیم خلیل صلوات اللہ علی نبینا وعلیہ السلام ہیں اور آپ کی بائیں جانب حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں اسی طرح میں پوچھتا جاتا تھا یہاں تک کہ سترہ آدمیوں کے متعلق میں نے دریافت کیا۔ جب میں بیدار ہوا۔ تو میرے ہاتھ پر سترہ کا عدد گرہ کیا ہوا تھا...... اور حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے پیغمبر ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ کی خدمت میں عرض کیا "یا رسول اللہ اَیْنَ اَطْلُبُکَ" (یارسول اللہ ﷺ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟) تو آپ نے فرمایا "عِند

عِلمِ ابی حنیفہ "(ابوحنیفہؒ کے علم کے پاس مجھے تلاش کرو) اور پرہیزگاری وتقویٰ میں آپ کے بہت سے طریق اور بے شمار مناقب مشہور ہیں۔ یہ کتاب ان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

اور میں علی بن عثمان الجلابیؒ ملک شام میں موذن رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ کے روضہ مبارک پر سو رہا تھا کہ خواب کی حالت میں اپنے آپ کو مکہ مکرمہ میں موجود پایا اور دیکھا کہ پیغمبر ﷺ باب بنی شیبہ سے اندر تشریف لائے اور ایک بوڑھے شخص کو اس طرح اپنی بغل میں لے رکھا ہے جس طرح شفقت سے بچوں کو بغل میں لیتے ہیں میں دوڑ کر آپؐ کے سامنے گیا اور آپ کے پاؤں مبارک کی پشت پر بوسہ دیا اور میں اس تعجب میں تھا کہ یہ بوڑھے بزرگ کون ہیں؟ کہ حضور ﷺ معجزہ کے طور پر میرے باطن اور میری سوچ پر مطلع ہو گئے اور مجھے کہا کہ یہ تمہارے ملک کے مسلمانوں کے امام ابوحنیفہؒ ہیں مجھے اور میرے ہم وطنوں کو اس خواب میں اپنے امام کو حضور ﷺ کے پہلو میں دیکھ کر بڑی امید ہوئی اور اس خواب سے مجھ پر یہ بھی واضح ہوا کہ ہمارے امام ان بلند مرتبہ لوگوں میں سے ہیں جو اوصاف طبع سے فانی اور احکام شریعت سے باقی اور شریعت کے ساتھ قائم ہیں اس لئے کہ اوصاف طبع سے آپ کو نکال کر لے جانے والے خود پیغمبر ﷺ ہی ہیں اور اگر وہ خود جانے والے ہوتے تو باقی الصفتہ ہوتے اور باقی الصفت مخطی ہوتا ہے یا مصیب ۔لیکن جب کہ ان کو لے جانے والے خود پیغمبر ﷺ ہیں اس لئے وہ فانی الصفت ہیں اور پیغمبر ﷺ کی صفت بقا کے ساتھ باقی ہیں اور جب پیغمبر ﷺ سے خطا کا صدور نا ممکن ہے تو جو شخص آپ کے ساتھ قائم ہو گا اس سے بھی خطا سرزد نہ ہو سکے گی اور یہ ایک لطیف رمز ہے (یعنی جب پیغمبر ﷺ کے ساتھ آپ کا تعلق اتنا گہرا ہے تو آپ کے اجتہاد میں بھی خطا نہ ہو گی چنانچہ دوسرے مجتہدین مخطی بھی ہو سکتے ہیں اور مصیب بھی لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنے اجتہاد میں مصیب ہی ہوں گے۔

اور بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت داؤد طائیؒ نے علم حاصل کیا اور اپنے دور کے مقتدا اور علما کے سردار بن گئے تو حضرت ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا

کہ میں اب کیا کروں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ''عَلَیْکَ بالعَمَلِ فانِ العِلْمَ بلا عَمَلٍ کالجَسَدِ بلا روحٍ '' (تجھ پر لازم ہے کہ علم کے مطابق عمل کرو کیونکہ بغیر عمل کے علم اس طرح بیکار ہے جیسے جسم بغیر روح کے اور اے داؤد طائیؒ میں تجھ پر قربان ہو جاؤں جب تک عمل کے ساتھ علم ملا ہوا نہ ہو نہ عمل صاف ہوتا ہے اور نہ ہی زندگی میں خلوص پیدا ہوتا ہے اور جو شخص صرف علم پر قناعت کر لیتا ہے وہ حقیقت میں عالم ہی نہیں ہوتا کیونکہ عالم کے لئے مجرد علم پر قناعت نہیں ہوتی اس لئے کہ علم خود عمل کا متقاضی ہوتا ہے اور جیسا کہ ہدایت خود بخود مجاہدے کا تقاضہ کرتی ہے اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے نہیں ہو سکتا اسی طرح علم بغیر عمل کے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ علم عمل کی جڑ ہے اور علم کی کشائش اور اس کا تمام تر نفع عمل کی برکت سے ہی ہوتا ہے اور کسی طرح بھی علم کو عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ آفتاب سے اس کی روشنی کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اور کتاب کی ابتداء میں علم کے باب میں مختصر طور پر اس کا بیان ہم کر چکے ہیں اور توفیق اللہ سے ہی ہے......

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمتہ اللہ علیہ

زاہدوں کے سردار اور اوتاد کے قائد حضرت عبداللہ بن مبارک المروزیؒ بھی تبع تابعین میں تصوف کے ائمہ میں سے تھے۔ آپ اس قوم کے ذی حشمت شریعت و طریقت کے احوال و اقوال و اسباب کے عالم اور اپنے دور کے بہت بڑے امام تھے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کا زمانہ پایا اور ان سے ہم نشینی کا شرف حاصل کیا تھا۔ علوم کے ہر شعبے میں آپ کی تصنیفات موجود ہیں اور آپ کی کرامات مشہور ہیں۔ آپ کی توبہ کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ آپ ایک کنیزک (باندی چھوٹی لڑکی) کے فتنہ محبت میں مبتلا تھے ایک رات اپنے ساتھیوں میں سے اٹھے اور ایک ساتھی کو ساتھ لے کر اپنی معشوقہ کی دیوار کے نیچے جا کر

کھڑے ہو گئے وہ منڈیر پر آئی اور دونوں ایک دوسرے کے مشاہدے میں محو کھڑے رہے یہاں تک کہ جب نماز فجر کی اذان سنی تو یہ سمجھے کہ یہ نماز عشاء کی اذان ہے لیکن جب دن روشن ہوا تو معلوم ہوا کہ محبوبہ کے دیدار اور مشاہدہ میں پوری رات مستغرق رہے ہیں اس بات سے آپ کو تنبیہ ہوئی اور اپنے آپ سے کہنے لگے کہ اے مبارک کے بیٹے! تمہیں شرم آنی چاہئے کہ آج کی پوری رات تو نفسانی خواہش کے لئے پاؤں پر کھڑا رہا ہے اور پھر بھی تو عزت چاہتا ہے لیکن اگر امام نماز کے دوران ذرا لمبی سورۃ پڑھ لے تو دیوانہ ہو جاتا ہے اس نفسانی خواہش کے دعویٰ کے ہوتے ہوئے تو ایمان کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟ چنانچہ اسی وقت توبہ کی اور علم اور طلب علم میں مشغول ہو گئے اور زہد و دیانت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ ایسے بلند مقام پر پہنچے کہ ایک دفعہ آپ کی والدہ نے باغ میں آپ کو دیکھا کہ آپ سو رہے ہیں اور ایک بہت بڑا سانپ ریحان کی ٹہنی منہ میں لئے ہوئے آپ پر سے مکھیاں ہٹا رہا ہے۔اس کے بعد آپ نے مرو سے کوچ کیا اور بغداد آ کر ایک مدت تک مشائخ کی صحبت میں رہے پھر کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں رہنے کے بعد واپس مرو تشریف لے آئے۔شہر کے تمام باشندوں نے آپ کے ساتھ عہد کیا اور آپ کے لئے درس اور مجلس کی مسند مقرر کی۔ان دنوں شہر کے آدھے لوگ تو حدیث کے ظاہری معانی کی متابعت کرتے تھے اور آدھے رائے اور قیاس سے بھی کام لیتے تھے۔لیکن آپ وہاں اس طرح رہے کہ لوگ آپ کو آج تک ''رضی الفریقین'' (فریقین میں مقبول) کہتے ہیں کیونکہ آپ کا طرز عمل دونوں فریقوں کے موافق تھا اور ہر مشرب کے لوگ آپ کے بارے میں اپنا ہم مشرب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔آپ نے وہاں دو رباط (مسند علم) بنائے تھے ایک خاص اہل حدیث کے لئے اور دوسرا خاص اہل رائے کے لئے یہ دونوں مکان اپنے قاعدہ کے مطابق آج تک قائم ہیں۔لیکن کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد آپ دوبارہ حجاز واپس تشریف لے گئے اور وہاں قیام اختیار کیا ایک مرتبہ آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ عجائبات میں سے آپ نے کیا

کیا دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے ایک پادری کو دیکھا کہ مجاہدات کی کثرت کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا اور خوف الٰہی سے اس کی پشت میں خم آ گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''یَا رَاهِبُ کیف الطریق الی الله '' (اے راہب اللہ تعالیٰ کی طرف راستہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟) تو اس نے جواب دیا کہ ''لَوْ عَرَفْتَ اللّٰه لَعَرَفْتَ الطریق اِلَیه فقال اَعْبُدُ من لااَعْرِفُه' و تصصی مَنْ تعرفُه' '' (اگر تو اللہ تعالیٰ کو پہچان چکا ہے تو اس کی طرف کا راستہ بھی پہچان لیا۔ پھر کہا کہ میں اس کی پرستش کرتا ہوں جسے نہ میں جانتا ہوں اور نہ پہچانتا ہوں اور تو اس کی نافرمانی کرتا ہے جسے تو پہچانتا ہے) یعنی معرفت خداوندی تو اس سے خوف کا تقاضہ کرتی ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تو اس سے بے خوف ہے اور اس کی ذات سے انکار جہالت کا مقتضٰی ہے اور میں اپنے آپ کو اس سے خائف پاتا ہوں...... آپ نے فرمایا یہ بات میرے لئے نصیحت ہو گئی اور اس نے مجھے بہت سے نامناسب امور سے باز رکھا...... اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''السکونُ حرام' علی قلبِ اولیائه '' (اللہ تعالیٰ کے دوستوں کے دل پر آرام و سکون حرام ہے) کیونکہ دنیا میں وہ حالت طلب میں مضطرب اور آخرت میں حالت خوشی کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ اس لئے دنیا میں تو انہیں حق تعالیٰ سے دوری کے خیال کی وجہ سے آرام نصیب نہیں ہوتا اور آخرت میں حق تعالیٰ کے دربار کی حاضری اور اس کے دیدار کی تجلیات کی وجہ سے ان کے لئے آرام جائز نہیں پس ان کے لئے دنیا تو آخرت کی طرح ہے کیونکہ دلی اطمنان دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے مقصد میں کامیابی یا مقصد سے غفلت...... اور مقصد کا حصول اور اس میں کامیابی تو دنیا و عقبٰی میں روا نہیں تاکہ محبت کی خلش سے آرام حاصل ہو اور غفلت اس کے دوستوں پر حرام ہے کہ دل طلب کی حرکات سے ساکن ہو جائے اور یہ قول اہل تحقیق کے ہاں ایک بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور انہی میں سے اہل حق کے بادشاہ اور بارگاہ وصل الٰہی کے شہنشاہ حضرت ابو علی فضیل بن عیاضؒ بھی ہیں۔ آپ کا شمار صوفیاء کے بزرگوں اور حقیقی درویشوں میں ہوتا ہے آپ طریقت کے معاملات اور حقائق میں بہت بڑے حصہ اور بلند مقام کے حامل تھے۔ آپ طریقت کے ان مشہور بزرگوں میں سے ایک تھے جن کی تمام فریق تعریف کرتے ہیں اور آپ کے احوال صدق اور اخلاص سے معمور تھے۔ آپ عمر کے ابتدائی حصہ میں مرو اور ماورد کے درمیان راہزنی اور ٹھگی کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی طبیعت نیکی کی طرف ہر وقت مائل اور راغب رہتی تھی اور آپ طبعاً بڑے صاحب ہمت اور جوانمرد تھے چنانچہ جس قافلہ میں کوئی عورت موجود ہوتی ہو آپ اس کے قریب میں بھی نہ جاتے اور جس کے پاس سرمایہ کم ہوتا اس کا سامان بھی نہ چھینتے بلکہ ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ سرمایہ باقی رہنے دیتے یہاں تک کہ خسرو سے ایک سوداگر سفر کے لئے چلنے لگا تو لوگوں نے اس کہا کہ فضیل راستہ میں ہے اس لئے کوئی حفاظتی دستہ ساتھ لے لو اس نے کہا میں نے سنا ہے کہ وہ ایک خدا ترس آدمی ہے چنانچہ اس نے قرآن کے ایک قاری کو اجرت پر لے لیا اور اسے اونٹ پر بٹھا لیا جو راستہ میں رات دن قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہا یہاں تک کہ جب قافلہ فضیل کی کمین گاہ کے مقام تک پہنچا تو اتفاقاً اس وقت قاری یہ آیت پڑھ رہا تھا ''اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ'' (کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وہ وقت قریب نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے گڑ گڑا اٹھیں) یہ سنتے ہی آپ کے دل پر رقت طاری ہو گئی اور آپ کے جسم و جان پر اللہ تعالیٰ نے اپنے غلبہ کو ظاہر کر دیا اور آپ نے اس شغل سے توبہ کر لی اور جن لوگوں کا مال آپ لوٹ چکے تھے ان سب کا سامان لوٹا دیا اور انہیں ہر طرح سے راضی کر کے آپ مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لے گئے اور ایک عرصہ تک وہاں قیام کیا اور اس دوران بعض اولیاء اللہ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا

اس کے بعد آپ کوفہ واپس آ گئے اور ایک طویل مدت تک حضرت امام ابوحنیفہؒ کی صحبت اختیار کی فن حدیث کے جاننے والوں میں آپ کی روایات بڑی قابل قدر اور بیحد مقبول ہیں اور تصوف و معرفت میں بھی آپ کا کلام بہت بلند ہے آپ ہی کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''مَنْ عَـرف اللّٰہَ حقَ معرفتہ عَبدہ بکل طاقۃٍ ''(جس نے اللہ تعالیٰ کو اس طرح پہچان لیا جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے تو وہ پوری طاقت کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ہے) کیونکہ جو بھی اس کو پہچانتا ہے اس کے انعام و احسان اور اس کی رحمت و مہربانی سے پہچانتا ہے اور جب اس طرح پہچان لیتا ہے تو اس کو دوست بنالیتا ہے اور جب اس کے ساتھ دوستی اختیار کرتا ہے تو اپنی پوری طاقت اس کی اطاعت میں صرف کر دیتا ہے۔ کیونکہ دوستوں کے فرمان پر عمل کرنا دشوار نہیں ہوتا۔ پس جس شخص کی دوستی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنی ہی اس کی اطاعت پر حرص زیادہ ہوتی ہے اور دوستی میں اضافہ معرفت کی حقیقت کی وجہ سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر ﷺ ایک رات اٹھے اور میرے حجرے سے کہیں باہر تشریف لے گئے مجھے گمان گزرا کہ شاید کسی دوسری زوجہ محترمہ کے حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں چنانچہ میں اٹھی اور آپ کے محسوس اثرات پر چلتی رہی یہاں تک کہ میں مسجد میں پہنچ گئی اور وہاں میں نے آپ کو نماز میں کھڑے پایا کہ آپ مسلسل رو رہے ہیں یہاں تک کہ حضرت بلالؓ آئے اور انہوں نے نماز فجر کے لئے اذان دی اور جب آپ نماز فجر ادا کر کے حجرہ میں تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ آپ کے دونوں پاؤں مبارک پر ورم آیا ہوا ہے اور انگلیوں کے سرے پھٹے ہوئے ہیں اور ان سے زرد رنگ کا پانی بہہ رہا ہے، میں رو پڑی اور عرض کیا'' یا رسول اللہ ﷺ آپ کے تو اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آپ اتنی تکلیف کیوں برداشت کرتے ہیں۔ چھوڑیئے یہ کام تو وہ شخص کرتا ہے جو اپنی عاقبت کے بارے میں امن میں نہ ہو۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! سب اللہ عزوجل کا لطف و فضل ہے تو ''

اَفَلاَاَکُوْنَ عَبداً شکوراً "(کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بن جاؤں" جب اس نے اپنا کرم مجھ پر فرمایا اور مجھے بخشش کا مژدہ سنا دیا ہے تو تمہارا کیا خیال کہ مجھے اس کی بندگی نہیں کرنی چاہئے اور اپنی طاقت کے مطابق اس کی نعمتوں کا استقبال نہیں کرنا چاہئے......اور نیز آنحضرت ﷺ نے تو معراج کی رات پچاس نمازیں قبول کر لیں اور انہیں گراں نہیں سمجھا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے پر لوٹ کر بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے اور پانچ وقت کی نمازوں کا حکم لے کر واپس تشریف لائے۔ اس لئے کہ آپ کی طبیعت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی کسی درجہ میں بھی مخالفت موجود نہ تھی۔"لِاَنَّ المحبة هِیَ الموافقة " (کیونکہ محبت نام ہے دوست سے موافقت کا)...... نیز حضرت فضیلؒ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "الدنیَا دار المرضی وَالناسُ فیها مجانینِ وللمجانین فِی دار المُرضی الغُلُّ والقید "(دنیا بیماروں کا گھر ہے اور لوگ اس میں دیوانوں کی طرح ہیں اور دیوانوں کے لئے بیماری کے گھر میں طوق اور بیڑیاں ہوئی ہیں) اور ہماری نفسانی خواہشات ہمارے طوق ہیں اور ہماری نافرمانیاں ہماری بیڑیاں ہیں۔ فضیل بن ربیع روایت کرتے ہیں میں خلیفہ ہارون الرشید کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں تھا۔ جب ہم حج ادا کر چکے تو خلیفہ نے مجھ سے پوچھا! کیا یہاں اولیاء اللہ میں سے کوئی موجود ہیں تاکہ میں ان کی زیارت کروں؟ میں نے کہاں ہاں حضرت عبدالرزاق صفانیؒ یہاں موجود ہیں خلیفہ نے کہا مجھے ان کے ہاں لے چلو! چنانچہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ دیر ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہے جب واپسی کا ارادہ کیا تو ہارون الرشید نے مجھے اشارہ کیا کہ ان سے پوچھو کہ کیا ان کے ذمہ کوئی قرضہ ہے! میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ہاں میں مقروض ہوں۔ خلیفہ نے وہ قرض ادا کرنے کا فرمان جاری کیا۔ جب وہاں سے نکلے تو خلیفہ نے کہا اے فضل! میرا دل اب بھی چاہتا ہے کہ میں ان سے بھی زیادہ بزرگ آدمی کی زیارت کروں۔ میں نے عرض کی کہ حضرت سفیان بن عینیہؒ یہاں موجود ہیں۔ خلیفہ نے کہا

کہ وہاں چلتے ہیں'' ہم وہاں حاضر ہوئے کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد جب واپسی کا ارادہ کیا تو خلیفہ نے پھر مجھے اشارہ کیا تا کہ ان کے قرضہ کے متعلق سوال کروں۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں میرے ذمہ قرضہ ہے خلیفہ نے وہ بھی ادا کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔ جب یہاں سے باہر آئے تو خلیفہ نے کہا اے فضل! ابھی تک میرا مقصد مجھے حاصل نہیں ہوا'' میں نے عرض کی کہ مجھے یاد آیا کہ حضرت فضیل بن عیاض بھی یہاں موجود ہیں۔ چنانچہ میں خلیفہ کو حضرت فضیلؒ کے پاس لے گیا وہ جھرونکے میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی انہوں نے پوچھا کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ امیر المومنین ہیں۔ انہوں نے فرمایا ''وَلاَ میر المومنین'' (ہمیں امیر المومنین سے کیا سروکار ہے) میں نے کہا سبحان اللہ! رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ '' لَيْسَ لِلْعَبْدِاَن يذِلَّ نَفْسَه' فلى طاعةِ اللّٰه '' (بندے کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس کو ذلیل کرے) یہ سن کر آپ نے فرمایا ''بَلٰی امّا الرضاء عِز'' دائِم'' عنداهله '' (یہ ٹھیک ہے لیکن اہل رضا کے لئے رضا ہی ہمیشہ کی عزت ہے) تم اس کو میری ذلت سمجھتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی رہنے کی وجہ سے اسی میں اپنی عزت سمجھتا ہوں اس کے بعد نیچے تشریف لائے دروازہ کھولا اور چراغ بجھا دیا اور ایک کونے میں ہو کر کھڑے ہو گئے تو آپ نے فرمایا آہ اس ہاتھ سے کہ جس سے زیادہ نرم ہاتھ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ عذاب الٰہی سے بچ جائے یہ سن کر خلیفہ ہارون الرشید پر گریہ طاری ہو گیا حتیٰ کہ روتے روتے بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو کہا اے فضیلؒ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے آپ نے فرمایا اے امیر المومنین آپ کے دادا حضرت عباسؓ۔ رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے انہوں نے حضرت پیغمبر ﷺ سے درخواست کی تھی کہ مجھے ایک قوم پر امیر مقرر فرما دیجئے! حضور ﷺ نے فرمایا میں نے آپ کے ایک نفس کو آپ کے جسم پر امیر مقرر کر دیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزرنے والا آپ کا ایک سانس

اس سے بہتر ہے کہ لوگ ہزار سال تک آپ کی اطاعت کریں ''لِاَنَّ الامارة یومُ القیمة الندامةُ'' (کیونکہ امارت قیامت کے دن ندامت کا باعث ہوگی) خلیفہ ہارون الرشید نے عرض کی کہ کچھ اور نصیحت فرمائیے۔ آپ نے فرمایا ''لوگوں نے جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو خلافت پر مقرر کیا تو آپ نے حضرت سالم بن عبداللہ، حضرت رجاء بن حیات اور محمد بن نصب القرضیؒ کو بلا کر فرمایا کہ میں خلافت کی آزمائشوں میں مبتلا ہو گیا ہوں میرے لئے کیا تدبیر ہے کیونکہ میں تو اس کو اپنے لئے بڑی آزمائش سمجھتا ہوں حالانکہ دوسرے لوگ اسے نعمت سمجھتے ہیں؟ ان میں سے ایک نے کہا اگر آپ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں تو تمام بوڑھے مسلمانوں کو اپنے باپ کی طرح۔ ان کے جوانوں کو اپنے بھائیوں کی طرح اور ان کے لڑکوں کو اپنے بیٹوں کی طرح جانئے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیجئے جیسا گھر میں باپ بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سارا اسلامی ملک آپ کے گھر کی طرح ہے اور اس میں رہنے والے آپ کے اہل و عیال ہیں '' زُرْ اَبَاکَ وَاکْرِم اَهْلَکَ وَاحْسِن عَلَی وَلَدِکَ '' (اپنے والد کی زیارت کر اپنے بھائی کی عزت کر اور اپنے بیٹے کے ساتھ حسن سلوک کر) اس کے بعد حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا اے امیر المومنین میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کا یہ خوبصورت چہرہ دوزخ کی آگ میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اس لئے خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہئے اور اس کا حق بہتر طور پر ادا کیجئے۔ اس کے بعد ہارون الرشید نے کہا کہ '' کیا آپ کے ذمہ کوئی قرضہ ہے؟'' فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ کا قرض میری گردن پر موجود ہے اور وہ اس کی اطاعت ہے اگر وہ مجھے اس سے متعلق پکڑ لے تو مجھ پر افسوس ہے۔ خلیفہ نے کہا '' اے فضیل '' میں لوگوں کے قرض سے متعلق بات کر رہا ہوں تو آپ نے فرمایا کہ '' حمد اور سپاس ہے خدائے عزوجل کے لئے کہ مجھے اس کی طرف سے بہت سی نعمتیں میسر ہیں۔ مجھے اس سے کوئی گلہ نہیں کہ بندوں کے سامنے اس کا شکوہ کروں۔ ہارون الرشید نے ایک ہزار دینار کی ایک تھیلی نکال کر آپ کے

سامنے رکھی اور کہا کہ اسے اپنے مصارف میں سے کسی مصرف میں استعمال کیجئے! حضرت فضیلؒ نے فرمایا اے امیر المومنین! میری نصیحتیں آپ پر کچھ بھی سودمند ثابت نہیں ہوئیں کہ آپ نے یہیں پر ظلم اور ناانصافی کا طرز عمل شروع کر دیا ہے خلیفہ نے پوچھا! میں نے کون سی بے انصافی کی ہے؟ آپ نے فرمایا ''میں تو آپ کو نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور آپ مجھ کو مصیبت میں ڈال رہے ہیں۔ یہ ناانصافی نہیں تو کیا؟..... یہ سن کر ہارون الرشید اور فضیل دونوں روتے ہوئے باہر نکلے۔ ہارون نے مجھ سے کہا اے فضل بن ربیع بادشاہ تو درحقیقت فضیل ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے دنیا اور اہل دنیا سے منہ موڑ رکھا ہے۔ اور دنیا کی زیب و زینت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہل دنیا کے سامنے دنیا کے لئے کوئی تواضع نہیں کرتے۔ اور آپ کے مناقب اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ان کو احاطہ تحریر میں لایا جاسکے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

اور تحقیق و کرامت کے سفینہ اور شرف ولایت کے خزانہ حضرت ابوالفیض ذوالنون بن ابراہیم المصریؒ بھی آئمہ تبع تابعینؒ میں سے تھے۔ آپ کا تعلق ثوبی نسل کے ساتھ تھا اور آپ کا نام ثوبان تھا۔ آپ اپنی قوم کے منتخب لوگوں اور طریقت کے ان باخبر بزرگوں میں سے تھے جو مصیبت پسندی اور ملامت کی راہ پر چلتے تھے۔ تمام اہل مصر آپ کی شان کے بارے میں حیران اور آپ کے احوال کو سمجھنے سے عاجز اور آپ کر مرتبے سے ناواقف تھے حتیٰ کہ آپ کی وفات تک آپ کے حال اور جمال کو کسی نے شناخت نہیں کیا اور جس رات آپ دنیا سے رخصت ہوئے۔ ستر افراد نے پیغمبر علیہ ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرما رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے دوست ذوالنون آ رہے ہیں میں ان کے استقبال کے لئے آیا ہوں..... اور جب آپ فوت ہوئے لوگوں نے آپ کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا پایا کہ

''هذا حبیبُ اللّٰہِ مَان فِی حُبِّ اللّٰہ قتیل اللّٰہِ ''(یہ اللہ کا پسندیدہ بندہ ہے جو اللہ کی محبت میں شہید مرا ہے) اور جب آپ کا جنازہ لوگوں نے اٹھایا تو پرندے آپ کے جنازے کے اوپر مجتمع ہو گئے اور ایک دوسرے کے پروں سے پر ملا کر جنازے پر سایہ کر دیا۔ جب اہل مصر نے یہ دیکھا تو نادم ہوئے اور جو ظلم آپ پر ڈھائے تھے ان سے توبہ کی......

علوم کے حقائق میں آپ کے بہت سے انداز اور خوبصورت کلمات ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ ''العارِفُ کُلَّ یومٍ اَخْشَعُ لِاَنَّہ‘ فی کُلِّ ساعۃٍ مِنَ الرب اَقْرَبُ ''(عارف ہر روز زیادہ سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے کیونکہ وہ ہر ساعت اپنے رب سے قریب ہوتا ہے) اور جو شخص زیادہ نزدیک ہوتا ہے لامحالہ اس کی حیرت اور خشوع میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کی حکمرانی کی ہیبت سے وہ آگاہ ہوتا ہے اور اس کے دل پر حق تعالیٰ کا جلال غالب ہو جاتا ہے وہ اپنے آپ کو اس سے دور دیکھتا ہے اور اس کے وصل کی کوئی صورت نہ پا کر خشوع و خضوع میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی ہمکلامی کے دوران یوں کہا ''یَا رَبِّ اَیْنَ اَطْلُبُکَ؟ ''(اے اللہ میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟) تو حق تعالیٰ نے جواب دیا ''عندالمنکَسِرَۃِ قلوبھم ''(ٹوٹے ہوئے دلوں میں) جو اپنے اخلاص میں ناامید ہو چکے ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی بار خدایا! کوئی بھی دل میرے دل سے زیادہ شکستہ اور ناامید نہیں، تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ''پس میں بھی تیرے ٹوٹے ہوئے دل میں ہوں'' پس خشوع و خضوع کے بغیر حق تعالیٰ کی معرفت کا دعویٰ کرنے والا جاہل ہے نہ کہ عارف! اور حقیقت معرفت کی علامت سچی ارادت ہے اور سچی محبت بندہ کے لئے تمام اسباب اور اللہ کے سوا تمام تعلقات کو توڑنے والی ہوتی ہے جیسا کہ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ''الصِدْقُ سیفُ اللّٰہِ فِی ارضِہٖ مَا وَضَعَ عَلیٰ شئٍ اِلَّا قَطَعَہ‘ ''(سچائی اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی تلوار ہے کہ جس چیز پر رکھ دی جائے اس کو کاٹ کر رکھ

دیتی ہے) اور سچائی یہ ہے کہ مسبب الاسباب (حق تعالیٰ) پر نظر رکھی جائے نہ کہ اسباب پر۔ اور جب بندہ اسباب کی طرف دیکھتا ہے تو سچائی کا حکم ساقط ہو جاتا ہے...... اور آپ سے متعلق حکایات میں میں نے دیکھا ہے کہ ایک روز اپنے رفقاء کے ہمراہ کشتی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے ایک اور کشتی آ رہی تھی جس میں مصر کے کھیل کود کرنے والوں کی ایک جماعت (ثقافتی طائفہ) بیٹھی ہوئی تھی اور دریائے نیل میں اپنی عادت کے مطابق کھیل تماشے اور شور و غوغا میں مشغول تھے۔ آپ کے شاگردوں کو ان سے بڑی نفرت ہوئی اور عرض کرنے لگے "یا شیخ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو غرق کر دیں تا کہ ان کی نحوست لوگوں سے دور ہو جائے" حضرت ذوالنونؒ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھ دُعا کے لئے اٹھائے اور کہا بار خدایا! جس طرح اس گروہ کو اس دنیا میں آپ نے اچھی زندگی عطا فرمائی ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کو اچھی زندگی عطا فرما۔ آپ کی اس دُعا سے تمام مرید حیران ہوئے تاہم جب وہ کشتی ذرا اور قریب آئی اور انہوں نے حضرت ذوالنونؒ کو دیکھا تو سب پر گریہ طاری ہو گیا اور آپ سے معذرت کرنے لگے اپنے ساز اور موسیقی کے آلات توڑ ڈالے اور توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیا۔ آپ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا "آخرت کی اچھی زندگی اس جہان سے توبہ میں ہے تم نے دیکھا کہ سب کا مقصد پورا ہو گیا تم نے اور انہوں نے اپنی اپنی مراد کو پا لیا اسی طرح کہ کسی کو کوئی رنج بھی نہیں پہنچا۔ اس سچے مرشد کا یہ قول مسلمانوں پر اس کی کمال شفقت کا آئینہ دار ہے اور اس میں انہوں نے پیغمبر ﷺ کی اقتدا کی ہے کہ باوجود یکہ کفار کی طرف سے آپ کے ساتھ بڑی جفا اور ظلم کیا گیا لیکن آپ اس پر رنجیدہ خاطر نہ ہوئے اور یہی کہتے رہے کہ "اللھم اھد قومی فانھم لایعلمون" (اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما کہ وہ مجھے جانتے نہیں) نیز حضرت ذوالنونؒ سے روایت ہے کہ فرمایا میں مصر جانے کا ارادہ لئے بیت المقدس سے آ رہا تھا کہ راستہ میں دور سے آتے ہوئے ایک شخص کو میں نے دیکھا میں نے دل میں سوچ لیا

کہ جب یہ میرے قریب پہنچ جائے گا تو میں اس سے ایک سوال کروں گا جب وہ نزدیک آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بڑھیا ہے جس کے ہاتھ میں نوکدار لاٹھی ہے اور اس نے اونی جبہ پہن رکھا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "مِنْ اَیْنَ" (کہاں سے آ رہی ہو) "قالت مِنَ اللّٰہ" (اس نے کہا اللہ کی طرف سے) میں نے پھر سوال کیا کہ "اِلٰی اَیْنَ" (کہاں جا رہی ہو؟) اس نے جواب دیا "اِلَی اللّٰہ" (اللہ کی طرف جا رہی ہوں) میرے پاس کچھ دینار تھے میں نے اسے دینے کے لئے وہ نکالے لیکن اس نے ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے کہا "اے ذوالنون! تو نے جو میرے متعلق یہ صورت اختیار کی ہے یہ تمہاری عقل کی کمزوری کی وجہ سے ہے میں تو اللہ تعالیٰ کے لئے ہی کام کرتی ہوں اور اس کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں لیتی۔ جس طرح کہ میں اس کے سوا کسی کی پرستش نہیں کرتی اسی طرح اس کے سوا کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ یہ بات کہہ کر وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔ اس حکایت میں ایک لطیف رمز ہے کہ اس بڑھیا نے جو یہ کہا کہ میں اس کے لئے کام کرتی ہوں تو یہ اس کی سچائی اور حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی محبت کی دلیل ہے کیونکہ لوگوں میں سے عمل کرنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں..... ایک وہ جو کوئی عمل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے لئے کر رہے ہیں حالانکہ وہ اپنی ذات کے لئے کر رہے ہیں کہ اگر چہ ان کی نفسانی خواہش تو اس سے منقطع ہوتی ہے لیکن آخرت میں انہیں ثواب کے حصول کی ہوس ضرور ہوتی ہے..... اور دوسرے وہ کہ انہیں عالم آخرت کے ثواب و عقاب اور عالم دنیا کے دکھاوے اور ریاکاری سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں حق تعالیٰ کے فرمان کی تعظیم کے لئے کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کی محبت کے تقاضے کے پیش نظر اپنی غرض اور خواہش کو چھوڑ دیتے ہیں اور ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں سامان آخرت کے لئے کرتے ہیں اور یہ درست ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت میں اطاعت کرنے والے کو وہ وافر حصہ ملتا ہے جو اس سے زیادہ ہوتا ہے جو کسی معصیت کرنے والے کو دنیا میں ملتا ہے

کیونکہ گناہوں کی لذت اور راحت ایک ساعت کے لئے ہوتی ہے اور اطاعت گزاری کی راحت ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے...... اور لوگوں کے مجاہدات اور محنتوں سے حق تعالیٰ کو کیا فائدہ ہے اور ان کے ترک سے کیا نقصان ہے؟ اگر تمام اہل عالم حق تعالیٰ کی تصدیق میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح ہو جائیں تو اس کا نفع خود انہی کو حاصل ہوگا اور اگر حق تعالیٰ کی تکذیب میں سب کے سب فرعون کی طرح ہو جائیں تو اس کا نقصان بھی انہی کو ہو گا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے "اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا" (اگر تم اچھائی کرو گے تو اپنے لئے کرو گے اور اگر کوئی برائی کرو گے تو وہ بھی تمہارے لئے ہی ہوگی نیز یہ بھی ارشاد ہے کہ "وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ" اور جو شخص دین میں جدوجہد کرتا ہے تو وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے کیونکہ بے شک اللہ تعالیٰ تو بے پرواہ ہے جہان والوں سے) لوگ تو اپنے نیک اعمال کے ذریعہ اپنے لئے ابدی ملک یعنی جنت کی خواہش کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے کر رہے ہیں لیکن اپنے آپ کو دوستی کے راستے پر چلانا ایک الگ چیز ہے کیونکہ اس راہ کو اختیار کرنے والے حق تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل میں دوستی کے معاملات کو ہی پیش نظر رکھتے ہیں اور ان کی نگاہیں اس کے علاوہ کسی دوسری چیز پر نہیں ہوتیں۔ اور اس کتاب میں اس طرح کی اور باتیں ہم انشاءاللہ باب الاخلاص میں بیان کریں گے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ

سرداروں کے سردار اور لقاالٰہی کی راہ کے سالک حضرت ابواسحٰق ابراہیم بن ادھم منصورؒ بھی انہی تبع تابعین میں سے ایک ہیں۔ آپ اپنے دور میں طریقت کے یکتا اور اپنے ہمعصروں کے سردار تھے اور حضرت خضر علیہ السلام کے مرید تھے۔ بہت سے متقدمین مشائخ سے ملاقات کی تھی اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کی صحبت میں رہ کر علم حاصل کیا تھا۔ آپ

ابتدا میں بلخ کے بادشاہ تھے ایک روز شکار کرتے ہوئے اپنے لشکر سے جدا ہو گئے اور ایک ہرن کے تعاقب میں دور تک نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہرن کو آپ کے ساتھ بات کرنے کی قدرت عطا فرمائی اور ہرن نے بڑی فصیح زبان میں آپ سے مخاطب ہو کر کہا "اَلِھٰذ خُلِقْتَ اَمْ بھذا اُمِرْتَ" (کیا تو اس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے یا اس کام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے؟) آپ اس کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور امور مملکت سے ہاتھ کھینچ لئے اور زہد اور پرہیزگاری کی زندگی اختیار کر لی۔ آپ نے حضرت فضیل بن عیاضؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ سے شرف ملاقات حاصل کیا اور ان کی صحبت اختیار کی۔ پھر توبہ کر لینے کے بعد اپنے ہاتھ کی حلال کمائی کے علاوہ کچھ نہیں کھایا۔ آپ کے معاملات واضح اور کرامات مشہور ہیں اور تصوف کے حقائق میں آپ کے عجیب کلمات اور نفیس لطائف موجود ہیں۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "مفاتیح العلوم ابراہیم" (حضرت ابراہیم تمام علوم طریقت کی کنجی ہیں) اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا" "اتخذ اللّٰہ صاحبًا وَذرِ النّاس جانباً" (اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بنا اور لوگوں کو ایک طرف چھوڑ دے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ کی توجہ حق تعالیٰ کی طرف درست ہو اور حق تعالیٰ کی محبت میں وہ مخلص ہو تو یہ چیز مخلوق سے اعراض کرنے کا خود بخود تقاضہ کرتی ہے کیونکہ مخلوق کی صحبت کا حق تعالیٰ کی باتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اور محبت حق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے فرمان کی بجا آوری میں اخلاص ہو اور اطاعت میں اخلاص درحقیقت محبت حق سے ہی پیدا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی محبت کا اخلاص اپنے نفس کی خواہشات کے ساتھ دشمنی کا نام ہے جو کوئی بھی اپنی خواہشات سے آشنا ہو وہ حق تعالیٰ سے جدا ہوتا ہے اور جو شخص خواہشات سے رشتہ توڑ دے وہ حق تعالیٰ کی محبت سے آرام پاتا ہے پس اپنے حق میں تو خود ہی تمام مخلوق ہے لہذا جب تو نے اپنے آپ سے ہی اعراض کر لیا تو گویا تمام مخلوق سے تو نے اعراض کر لیا اور اگر تمام مخلوق سے تعلقات منقطع کرنے کے باوجود تو اپنی ذات کی

طرف متوجہ رہا تو یہ تو ظلم ہے کیونکہ تمام لوگ جس جس کام میں لگے ہوئے ہیں حکم خداوندی اور تقدیر کے سبب ہیں تیرا معاملہ تیری ذات کے ساتھ متعلق ہے اور طالب حق کے ظاہر و باطن کی استقامت دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک کا تعلق پہچاننے سے ہے اور دوسری کا کرنے سے جو چیز پہچاننے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ تمام اچھائیوں اور برائیوں میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو حق جانے کہ پوری دنیا میں حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی حرکت کے بغیر کوئی ساکن متحرک نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی متحرک ساکن ہوسکتا ہے..... اور جو چیز کرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو بجالائے، معاملات کو درست رکھے اور حلال و حرام کی تمیز کرے کیونکہ اس کی تقدیر کسی حالت میں بھی اس کے فرمان کو ترک کرنے کے لئے حجت نہیں بن سکتی پس مخلوق سے اعراض اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اپنی ذات سے بھی اعراض نہ کرے اور جب تو اپنی ذات سے اعراض کرلے گا تو پوری مخلوق حق تعالیٰ کی مراد کے حصول کے لئے تیار ہو جائے گی اور جب تو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو خود حق تعالیٰ کے احکام کو قائم کرنے کے لئے تیار ہوجائے گا پس مخلوق کے ذریعہ آرام پانے کی تو کوئی صورت نہیں اور اگر حق کے سوا کسی اور چیز سے تو خلاصی پانا چاہے تو غیر سے خلاصی حاصل کر کیونکہ غیر سے چھٹکارا حاصل کرنا توحید حق کو دیکھنا ہے اور اپنی ذات کے ساتھ آرام تعطل کو ثابت کرنا ہے اسی لئے حضرت شیخ ابوالحسن سالبہؒ نے فرمایا کہ مرید کو کسی بلی کے حکم میں رہنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اپنے نفس کے تابع رہے کیونکہ کسی غیر کی صحبت خدا تعالیٰ کے لئے ہوتی ہے اور اپنی صحبت اپنے نفس کی خواہشات کو پالنے کے لئے ہوتی ہے اور اس معنی سے متعلق انشاء اللہ اس کتاب میں اپنی جگہ پر مزید کلام کیا جائے گا۔

اور حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کی حکایات میں آتا ہے انہوں نے بیان کیا کہ جب میں جنگل میں پہنچا تو ایک بوڑھا شخص میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ اے ابراہیم! تم جانتے ہو کہ یہ کونسی جگہ ہے جس میں بغیر سامان سفر اور سواری کے چلے جارہے ہو؟ آپ

فرماتے ہیں کہ میں جان گیا کہ یہ شیطان ہے لہذا چاندی کے چار دانگ جو میں نے کوفہ میں ایک زنبیل بیچ کر حاصل کئے تھے اور میری جیب میں موجود تھے انہیں بھی جیب سے نکالا اور پھینک دیا اور میں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ہر میل پر چار سو رکعت نماز ادا کروں گا چنانچہ میں چار سال تک اس جنگل میں رہا اور اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ وقت پر بے تکلف مجھے روزی پہنچاتے رہتے اور اسی دوران حضرت خضر علیہ السلام نے میرے ساتھ صحبت اختیار کی اور مجھے حق تعالیٰ کا اسم اعظم سکھایا اس وقت سے میرا دل مخلوق سے بلکل ہی بے نیاز ہو گیا۔۔۔۔ آپ کے مناقب بے شمار ہیں وباللہ التوفیق۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ

معرفت کے تخت اور اہل معاملہ کے تاج حضرت بشر الحافیؒ بھی انہی تبع تابعین میں سے تھے مجاہدات میں آپ بڑی شان اور بلند برھان اور طریقت کے معاملات میں کامل نصیب کے مالک تھے۔ آپ کو حضرت فضیل بن عیاض کی صحبت حاصل رہی اور اپنے ماموں حضرت بوعلی بن حشرمؒ کے مرید تھے اور آپ علم اصول وفروغ کے زبردست عالم تھے آپ کی توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ آپ مستی کی کیفیت میں کہیں جارہے تھے کہ راستہ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا پایا جس پر ''بِسمِ اللّٰہِ الرحمن الرحیم'' لکھا تھا آپ نے بڑی تعظیم کے ساتھ اسے اٹھایا اور عطر لگا کر ایک پاک جگہ پر رکھ دیا۔ اسی رات خواب میں حق تعالیٰ کی زیارت ہوئی کہ وہ فرمارہے ہیں ''یا بِشر طیبتَ اِسمِی فبعزتی لاطیبن اِسمک فی الدنیا والاخرۃ'' اے بشر! تو نے میرے نام کو خوشبو لگائی۔ مجھے اپنی عزت کی قسم میں تیرے نام کو دنیا اور آخرت میں خوشبودار کروں گا) یہاں تک کہ جب بھی کوئی تیرا نام سنے گا اپنے دل میں راحت محسوس کرے گا آپ نے اسی وقت توبہ کرلی اور زہد وعبادت کا راستہ اختیار کر لیا اور مشاہدہ حق کے غلبہ کی یہاں تک شدت تھی کہ اپنے پاؤں میں کوئی چیز نہ پہنتے تھے لوگوں

نے آپ سے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا ''کہ زمین اللہ تعالیٰ کا بچھایا ہوا بستر ہے اور میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کے فرش اور میرے پاؤں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو...... اور یہ بات آپ کے معاملات کے عجائب میں سے ہے کہ اپنی ہمت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مجتمع کرنے میں جوتا بھی آپ کو حجاب نظر آیا آپ سے ہی روایت ہے کہ فرمایا ''مَنْ اَرَادَاَنْ یکُونَ عَظِیماً فی الدنیا وشریفاً فی الاخرۃ فلیجتنب ثلاثاً لایَسال احداً حاجۃً وَلایَذکُرُ احداً بسوءٍ وَلا یُجیبُ اَحداً الی طَعَامِہٖ ''(جو شخص دنیا میں صاحب عزت اور آخرت صاحب شرف بننے کا ارادہ رکھتا ہو اسے چاہئے کہ تین باتوں سے اجتناب کرے۔

ا۔ کسی سے بھی اپنی حاجت کے بارے میں سوال نہ کرے، ۲۔ کسی کو برائی کے ساتھ یاد نہ کرے اور ۳۔ کھانے کی طرف کسی کا بلاوا قبول نہ کرے) کیونکہ جو شخص راہ خدا سے واقف ہے مخلوق سے کسی حاجت کی طلب نہیں کرتا اس لئے کہ مخلوق سے حاجت طلب کرنا معرفت نہ ہونے کی دلیل ہے کہ اگر وہ قاضی الحاجات (حاجت روا) سے وابستہ ہوتا تو اپنی طرح کی مخلوق سے حاجت نہ مانگتا ''لِاَن استعانۃ المخلوق اِلی المخلوق کا ستعانۃِ المسجونِ اِلَی المسجون ''(کیونکہ مخلوق کا مخلوق سے مدد مانگنا ایسا ہے جیسے کہ ایک قیدی کا دوسرے قیدی سے مدد مانگنا) اور جو کوئی کسی کو برا کہتا ہے تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم میں تصرف ہے کیونکہ وہ شخص اور اس کا فعل دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو رد کرتا ہے گویا وہ حق تعالیٰ کو رد کرتا ہے کیونکہ جو کسی فعل کو عیب دار کہے گا تو گویا اس نے فاعل کو عیب دار کیا۔ البتہ سوائے اس کے جو خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میری موافقت میں کفار کی مذمت کرو۔ باقی یہ جو فرمایا ہے کہ لوگوں کی دعوت طعام قبول کرنے سے پرہیز کرو تو یہ اس لئے کہ اصل رزق دینے والا تو خدا ہے اگر اس نے مخلوق کو تیری روزی کا سبب بنا دیا ہے تو تو اس سبب کو نہ دیکھ بلکہ جان لے کہ وہ تیری ہی روزی تھی جو خدا نے تجھے پہنچائی ہے نہ کہ اس سبب کی اور اگر وہ شخص یہ سمجھتا ہو کہ وہ اس کی ملکیت ہے اور اس

طرح وہ تجھ پر احسان کرتا ہے تو اس کی دعوت قبول نہ کر کیونکہ روزی کے معاملہ میں کسی کا کسی پر ہرگز کوئی احسان نہیں۔ اس لئے کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک روزی غذا ہے اور معتزلہ کے نزدیک ملکیت ہے اور خدا تعالیٰ غذاؤں کے ذریعہ مخلوق کی پرورش فرماتے ہیں اور اس قول کے جواز کے لئے ایک اور وجہ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ

معرفت کے آسمان اور محبت خداوندی کی کشتی حضرت بایزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی رحمتہ اللہ علیہ بھی بزرگ ترین تبع تابعین اور بڑے مشائخ میں شمار ہوتے ہیں آپ کا حال سب سے بڑا اور شان سب سے عظیم تھی یہاں تک کہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ ''بایزیدمِنا بمنزله جبریل من الملئکةِ '' (ہم میں بایزید اسی طرح بلند مرتبہ ہیں جس طرح حضرت جبرئیل فرشتوں میں) آپ کے دادا مجوسی تھے اور والد بسطام کے بزرگوں میں سے تھے اور انہوں نے پیغمبر علیہ السلام کی احادیث میں سے بہت روایتیں بیان کی ہیں اور آپ کا شمار تصوف کے دس بڑے اماموں میں ہوتا ہے۔ آپ سے قبل علم تصوف کے حقائق سے استنباط کی اتنی مہارت کسی کو حاصل نہ تھی جتنی کہ آپ کو حاصل ہوئی'' درحقیقت آپ تمام حالات میں علم دوست اور شریعت کی تعظیم کرنے والے تھے بخلاف اس گروہ کے جو الحاد کی وجہ سے مردود تھا اور مصنوعی طور پر آپ کے ساتھ وابستگی کا دعویٰ کرتا تھا'' آپ کا ابتدائی دور مجاہدات اور معاملات طریقت میں ریاضت پر مشتمل تھا...... اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''عَمِلْتُ فی المجاهَدَةِ ثلثين سَنةً فَمَا وَجدتُ شيًا اَشَد عَلَىَّ مِنَ العِلمِ وَمتابعتِهِ وَلَوْلاَ اختلافُ العُلَماءِ لَبَقِيتُ واختلاف العلماء رحمةٌ اِلاَ تجريد التوحيد'' (میں نے تیس سال کا عرصہ مجاہدہ میں گزارا پس میں نے علم اور اس کی متابعت سے زیادہ سخت کوئی چیز نہیں دیکھی اور اگر علماء کے درمیان اختلاف نہ

ہوتا تو دین کے تمام امور پر عمل کرنے سے میں قاصر رہتا اور مسئلہ توحید کے علاوہ دوسرے امور میں علماء کا اختلاف رحمت ہے) اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ انسانی طبیعت علم کی بجائے جہالت کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے کیونکہ جہالت میں بہت سے کام بغیر رنج کے کئے جاسکتے ہیں۔لیکن علم میں بغیر تکلیف کے ایک قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔اور شریعت کی راہ اس جہان کی پل صراط سے بھی بہت زیادہ باریک اور بہت زیادہ پرخطر ہے پس تمہیں چاہئے کہ تمام احوال میں اس طرح رہے کہ اگر بلند احوال اور عظیم مقامات سے تو رک بھی جائے تو شریعت کے میدان کی طرف تو تیری توجہ برقرار رہے تا کہ اگر تمام معاملات تجھ سے جاتے بھی رہیں تو بھی عمل تو تیرے ساتھ رہ جائے اس لئے کہ مرید کے لئے سب سے بڑی آفت عمل کا ترک کرنا ہے اور جھوٹے دعویداروں کے تمام دعوے شریعت پر عمل کرنے کے مقابلے میں ہیچ ہیں اور تمام اہل زبان اس کی برابری سے عاری ہیں...... نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''**الجنه لاحظر لها عنداهلِ المحبةَ محجُوبُونَ بمحبّتهم**'' (اہل محبت کے نزدیک جنت کی کوئی وقعت نہیں اور اہل محبت اپنی محبت کی وجہ سے حجاب میں ہیں) اور حق تعالیٰ کی محبت کے سوا کوئی چیز ان کے نزدیک نہیں آسکتی یعنی بہشت اگرچہ اعلیٰ درجہ کی مخلوق ہے لیکن محبت الٰہی اس کی صفت قدیم ہے مخلوق نہیں اور جو شخص غیر مخلوق کو چھوڑ کر مخلوق میں الجھ جاتا ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔پس دوستان حق کے لئے مخلوق کی کوئی وقعت نہیں اور دوستان حق اس کی محبت میں محجوب ہیں کیونکہ غیر کی محبت کا وجود دوئی کا تقاضہ کرتا ہے اور اصل توحید میں دوئی کا تصور غلط ہے اور دوستان حق کا راستہ واحدانیت کی طرف ہوتا ہے اور راہ محبت میں یہ بات دوستی کے لئے نقصان دہ ہے کہ دوستی میں ایک مرید ہو اور دوسرا مراد۔خواہ حق تعالیٰ مرید ہو اور بندہ مراد یا بندہ مرید ہو اور حق تعالیٰ مراد۔اگر مرید حق تعالیٰ ہو اور مراد بندہ تو حق تعالیٰ کی مراد میں بندہ کی ہستی ثابت ہوگئی اور اگر مرید بندہ ہو اور مراد حق تعالیٰ تو مخلوق کی طلب وارادت کو اس میں کوئی راہ نہیں

ہوتا۔ اب اس مقام پر وجود کی آفت دونوں حالتوں میں باقی رہے گی پس محبّ کا محبت کی بقا میں فنا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ بقائے محبت کے سبب اس کو فنا حاصل ہو......اور نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ ایک دفعہ میں مکہ میں تھا صرف خانہ کعبہ کو دیکھا تو میں نے کہا کہ حج تو قبول نہیں کیونکہ اس طرح کے پتھر تو میں نے بارہا دیکھے ہیں دوبارہ جب مکہ مکرمہ گیا تو خانہ کعبہ بھی دیکھا اور خداوند خانہ کعبہ کی زیارت بھی کی تو میں نے کہا کہ اب بھی حقیقت توحید حاصل نہیں ہوئی۔ جب تیسری دفعہ گیا تو صرف خداوند خانہ کعبہ کو دیکھا اور خانہ کعبہ کو نہ دیکھا تو میرے دل سے آواز آئی کہ اے بایزید! اگر تو اپنے آپ کو نہ دیکھے اور باقی تمام مخلوق کو دیکھ لے تو مشرک نہ ہوگا۔ لیکن اگر تو نے تمام جہان کو تو نہ دیکھا اور اپنے آپ کو دیکھا تو تو مشرک ہوگا۔ اسی وقت میں نے توبہ کی اور نیز توبہ سے بھی توبہ کی۔ اور اپنی ہستی کو دیکھنے سے بھی توبہ کی۔ اور آپ کے حال کے صحیح ہونے میں یہ حکایت نہایت لطیف ہے اور اہل حال کے لئے عمدہ علامت ہے۔

حضرت حارث بن اسد رحمتہ اللہ علیہ

تمام فنون کے امام اور تمام شبہات کا پتہ لگا لینے والے حضرت ابو عبداللہ حارث بن اسد المحاسبیؒ بھی تبع تابعین میں سے اصول اور فروع کے بہت بڑے عالم اور اپنے دور میں تمام اہل علم کے لئے مرجع تھے۔ آپ نے اصول تصوف میں رغائب نام کی ایک کتاب تصنیف کی اور اس کے علاوہ بھی تمام فنون میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں آپ بڑے بلند حال اور بزرگ ہمت اور اپنے دور میں بغداد کے شیخ المشائخ تھے آپ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ فرمایا **"العلم بحرکات القلوب فی مطالعة القلوب اشرف مِن العمل بحرکات الجوارح"** (اپنے دل کی حرکات سے جہان کے پوشیدہ علوم حاصل کرنا اعضا کی حرکات سے عمل کرنے سے زیادہ شریف ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ علم محل

کمال ہے اور جہالت محل طلب! اور بارگاہ خداوندی میں علم جہالت سے بہتر ہے۔ کیونکہ علم انسان کو درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے اور بارگاہ الٰہی میں جہالت کا گزر بھی نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت علم عمل سے زیادہ بزرگ ہے کیونکہ علم سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاسکتا ہے اور عمل سے اسے حاصل نہیں کیا جاسکتا اگر عمل کو علم کے بغیر اس کی بارگاہ میں رسائی ہوسکتی تو نصاریٰ اور ان کے پادری اپنے سخت مجاہدوں کے سبب مشاہدہ الٰہی کی منزل میں داخل ہو جاتے اور گنہگار مومن راہ حق سے دور رہتے۔ پس عمل بندے کی صفت ہے اور علم حق تعالیٰ کی...... اس قول کے بعض راویوں کو غلطی واقع ہوئی اور انہوں نے دونوں جگہ لفظ عمل کو بیان کر دیا اور یوں کہا کہ "العمل بحرکاتِ القلوب اشرف مِنَ العَمَلِ بحرکاتِ الجوارح" (دل کی حرکات سے عمل کرنا۔ اعضا کی حرکات سے عمل کرنے سے زیادہ بہتر ہے) حالانکہ یہ محال ہے بندہ کا عمل صرف دل کی حرکات سے ہی متعلق نہیں ہوتا البتہ اگر اس سے تفکر اور احوال باطن کا مراقبہ مراد لیتے ہوں تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ "تَفَکُّرُ ساعَةٍ خیر" مِن عبادةِ ستین سَنَةٍ" (دل میں ایک ساعت کے لئے غور وفکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے) اور درحقیقت اسی اعتبار سے دل کے اعمال کو اعضا کے اعمال سے زیادہ فضیلت حاصل ہے اور باطن کے احوال وافعال کی تاثیر ظاہری اعمال سے زیادہ کامل ہوتی ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ "نومُ العَالِم عبادة وسِهر الجاهل معصية" (عالم کی نیند بھی عبادت ہے اور جاہل کی بیداری بھی معصیت ہے) کیونکہ عالم کا دل خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں مغلوب ہوتا ہے اور جب دل مغلوب ہو تو جسم بھی مغلوب اور تابعدار ہوتا ہے پس دل کا غلبہ حق سے مغلوب ہونا مجاہدہ کی وجہ سے نفس کے ظاہری حرکات پر غلبے سے بہتر ہے...... نیز آپ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک روز ایک درویش سے فرمایا "کُن للّٰهِ وَ اِلاَّ فَلا تکُن" (خداوند تعالیٰ کے لئے ہو جاؤ ورنہ پھر کچھ بھی نہ رہو) یعنی باقی رہنا ہے تو حق تعالیٰ کے ساتھ باقی رہو یا پھر اپنے وجود سے فانی ہو

جاؤ۔ یعنی یا تو صفائی قلب سے اپنی خاطر مجتمع رکھ اور یا فقر سے اپنے آپ کو پریشان۔ یا تو اس صفت کے ساتھ متصف رہ کہ جو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ'' (آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو) یا پھر اس صفت کے ساتھ متصف رہو کہ ''هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ'' مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا '' (انسان پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ وہ عالم ہستی میں قابل ذکر چیز نہ تھا) اگر تو اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے گا تو تیرا وجود بذات خود قائم رہے گا اور اگر تو اپنے اختیار سے نہ ہوگا تو تیرا قیام حق تعالیٰ کے ساتھ ہو گا اور یہ معنی بہت لطیف ہیں۔ واللہ اعلم۔

حضرت داؤد ابن طائی رحمۃ اللہ علیہ

مخلوق سے قطع تعلق کرنے والے اور طلب جاہ سے بچنے والے امام ابو سلیمان حضرت داؤد ابن طائیؒ بھی تبع تابعین میں سے تھے آپ اپنے دور کے مشائخ کبار اور اہل تصوف کے سرداروں میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے زمانہ کے بے نظیر انسان تھے۔ آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور حضرت فضیل و حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہما اللہ وغیرہ کے ہمعصر اور طریقت میں حضرت حبیب راعیؒ کے مرید تھے۔ تمام علوم میں کافی دسترس اور بلند درجہ کے مالک تھے خصوصاً فقہ میں تمام فقہا زمانہ کے امام مانے جاتے تھے آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی اور ریاست چھوڑ کر زہد و تقویٰ کا راستہ اپنا لیا تھا۔ آپ کے مناقب بہت ہیں اور فضائل کا بہت چرچا ہے کیونکہ آپ طریقت کے معاملات کے عالم اور حقائق کے بیان کرنے میں کامل مہارت رکھتے تھے روایت ہے کہ آپ نے ایک مرید سے فرمایا ''اِنْ اَرَدْتَ السَّلَامَةَ سَلِّمْ عَلَی الدُّنیا وَاِن اَرَدْتَ الکرامة کبرِ علی الاخرةِ '' (اگر تو سلامتی کا خواہاں ہے تو دنیا کو سلام کہہ دے اور اگر بزرگی چاہتے ہو تو آخرت پر تکبیر موت پڑھ دو) یعنی دنیا و آخرت دونوں ہی محل حجاب ہیں اور ہر قسم کی فراغت ان دو چیزوں سے ہی

وابستہ ہے لہٰذا جو شخص بدن سے فراغت چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے اور جو شخص دل سے فارغ ہونا چاہتا ہو تو اسے کہہ دو کہ وہ آخرت کی محبت اپنے دل سے نکال باہر کرے...... حکایات میں آپ کے متعلق آتا ہے کہ آپ امام محمد بن حسن شیبانیؒ سے اکثر میل ملاقات کا سلسلہ رکھتے لیکن امام قاضی ابو یوسفؒ سے بہت کم تعلق رکھتے تھے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ دونوں بزرگ علم میں بڑے درجہ کے حضرات ہیں آپ ان میں سے ایک کو کیوں عزیز رکھتے ہیں اور دوسرے کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے؟ جواب میں فرمایا اس لئے کہ محمد بن حسنؒ دنیا اور اس کی تمام نعمتوں کو چھوڑ کر علم میں داخل ہوئے ہیں چنانچہ آپ کا علم دین کی عزت اور دنیا کی ذلت کا سبب ہے اور قاضی ابو یوسفؒ درویشی اور ذلت کو چھوڑ کر علم میں داخل ہوئے ہیں اور علم کو اپنی عزت اور عہدہ کے لئے سبب بنایا ہے۔ اس لئے محمد بن حسن خلوص میں امام ابو یوسف سے بلند مرتبہ ہیں...... اور حضرت معروف کرخیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ اس کی نگاہوں میں دنیا اس قدر حقیر ہو جتنی کہ حضرت داؤد طائیؒ کی نظر میں۔ کہ دنیا اور دنیا دار کی آپ کے نزدیک کچھ بھی قدر نہ تھی لیکن فقرا کو آپ بڑی ہی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی مصیبت زدہ کیوں نہ ہوں اور آپ کے مناقب بے شمار ہیں...... واللہ اعلم

حضرت سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل حقائق کے شیخ اور جملہ علائق دنیا سے بے نیاز حضرت ابو الحسن سری بن مفلس السقطیؒ بھی ہیں۔ آپ حضرت جنید بغدادیؒ کے ماموں تھے۔ اور تصوف میں آپ عظیم شان کے مالک تھے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مقامات کی ترتیب اور احوال کی وضاحت میں غور فرمایا۔ عراق کے مشائخ میں سے بہت سے بزرگ آپ کے مرید ہیں۔ آپ کو حضرت حبیب راعیؒ کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور آپ

سے صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ آپ حضرت معروف کرخیؒ کے مرید تھے۔ آپ بغداد کے بازار میں کباڑی کی دکان کرتے تھے جب بغداد کا بازار جل کر خاکستر ہو گیا تو لوگوں نے آپ کو اطلاع دی کہ آپ کی دکان جل گئی فرمایا "چلو اس کی فکر سے تو فارغ ہوئے" لیکن جب لوگوں نے وہاں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اردگرد کی تمام دکانیں جل چکی ہیں لیکن آپ کی دکان محفوظ ہے، آپ نے خود تشریف لا کر جب یہ حالت دیکھی تو اپنا تمام سامان درویشوں میں تقسیم کر دیا اور خود تصوف کا راستہ اختیار کر لیا۔ آپ سے ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ شروع میں آپ کی حالت کیا تھی؟ فرمایا کہ ایک دن حضرت حبیبؒ میری دکان پر سے گزرے میں نے روٹی کے ٹکڑے انہیں دیئے کہ وہ درویشوں میں تقسیم کر دیں تو انہوں نے مجھے کہا "خیرک اللہ" (اللہ تجھے بھلائی دے) بس جس دن سے میرے ان کانوں نے ان کی یہ دُعا سنی ہے احوال دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں اور دنیا سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہے......

آپ سے ہی روایت ہے کہ فرمایا "الھم فھما عذبتنی به بشئ فلا تعذبنی بذل الحجاب" (اے اللہ! اگر مجھے کسی چیز سے آپ عذاب دیں تو حجاب کی ذلت سے عذاب نہ دیں) کیونکہ جب میں حجاب میں نہ ہوں گا تو تیرے ذکر اور مشاہدہ کی وجہ سے ہر قسم کی سختی مجھ پر آسان ہو جائے گی اور جب میں تجھ سے حجاب میں ہوں گا تو تجھ سے حجاب کی وجہ سے دنیا کی نعمتیں بھی میرے لئے ہلاکت کا باعث ہوں گی پس جو مصیبت، مشاہدہ محبوب کے اندر ہو وہ مصیبت نہیں ہوتی۔ بلکہ مصیبت تو وہ نعمت ہوتی ہے جو محبوب سے حجاب میں ہو اور دوزخ میں کوئی مشقت حجاب سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ نہ ہوگی کیونکہ اگر اہل دوزخ کو دوزخ میں حق تعالیٰ کے دیدار کی سعادت نصیب ہوئی تو گنہگار مومنین کو کبھی بھی جنت یاد نہ آتی کیونکہ دوزخ میں بھی دیدار الٰہی سے ان کی جان کو اس قدر خوشی نصیب ہوتی کہ بدن کی مصیبت اور جسم کے عذاب کی ان کو خبر تک نہ ہوتی اور جنت میں بھی کوئی نعمت دیدار خداوندی سے زیادہ کامل نہیں کیونکہ اگر جنت کی تمام نعمتیں بلکہ سو گنا زیادہ بھی

حاصل ہوں لیکن وہ خداوند تعالیٰ سے حجاب میں ہوں تو وہ ہلاک ہو جائیں اور ان کے دل سے زندگی ختم ہو جائے پس اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ دل کے تمام احوال میں اپنے دوستوں کو اپنی ذات کے بارے میں بیدار رکھتے ہیں تا کہ تمام مشقتیں ریاضتیں اور بشریت کی تمام آزمائشیں وہ آسانی سے برداشت کرسکیں تو لامحالہ اس حال میں ان کی دُعائیں یہی ہوتی ہیں کہ اے باری تعالیٰ تیرے تمام عذاب ہمیں تیرے حجاب کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہیں۔ کیونکہ جب تیرا جمال ہمارے دلوں میں جلوہ نما ہو تو ہمیں مصیبتوں کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا..... واللہ اعلم

حضرت شفیق بن ابراہیم الازدی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے اہل بلاو مصیبت کے سالار اور زہد و تقویٰ کے سرمایہ حضرت ابوعلی شفیق بن ابراہیم الازدی رحمتہ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ اپنی قوم کے معززان کے مقتدا اور شریعت طریقت اور حقیقت کے جملہ علوم کے عالم تھے۔ علم تصوف میں آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ آپ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے ہم صحبت تھے اور بہت سے مشائخ کی زیارت اور ان کی صحبت کا شرف حاصل تھا۔ آپ سے روایت آئی ہے کہ فرمایا ''**جعل اللہ اہل طاعۃٍ احیاء فی مماتھم واھل المعاصی امواتا فی حیرتھم**'' (اللہ تعالیٰ اہل اطاعت کو ان کی موت کے بعد بھی زندہ کر دیتے ہیں اور اہل معصیت کو ان کی زندگی میں ہی مردہ بنا دیتے ہیں) یعنی خدا تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا اگرچہ مر جائے۔ زندہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی فرمانبرداری پر فرشتے اسے ہمیشہ آفرین کہتے ہیں اور اس کو ہمیشہ ثواب ملتا رہتا ہے پس وہ اپنی موت کے بعد بھی ہمیشہ ملنے والی جزا کی وجہ سے باقی رہتا ہے۔ آپ کے متعلق ہی روایت کرتے ہیں کہ آپ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا اور کہنے لگا۔ اے شیخ میں بہت گنہگار ہوں اور چاہتا ہوں کہ گناہوں سے توبہ کرلوں آپ نے فرمایا

وہ کیسے؟ اس نے کہا" جو کوئی اپنی موت سے پہلے توبہ کیلئے آ جائے اگر چہ دیر بعد آئے وہ جلدی ہی آنے والا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ کی توبہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک سال بلخ شہر میں قحط پڑا اور لوگ ایک دوسرے کو کھانے پر آمادہ ہو گئے تمام مسلمان بڑے غمگین تھے آپ نے ایک غلام کو دیکھا کہ وہ بازار میں ہنس رہا ہے اور خوشی کا اظہار کر رہا ہے۔ لوگوں نے اسے کہا کہ تمام مسلمان غم و اندوہ میں مبتلا ہیں لیکن تو خوشی کا اظہار کر رہا ہے تجھے شرم نہیں آتی؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے کسی طرح کا کوئی غم نہیں کیونکہ میں ایسے شخص کا غلام ہوں جو ایک پورے گاؤں کا مالک ہے اور اس نے میرے دل سے تمام اندیشوں کو اٹھا دیا ہے حضرت شفیقؒ نے کہا اے میرے خدا! یہ غلام اپنے اس مالک پر اتنا خوش ہو رہا ہے جو صرف ایک گاؤں کا مالک ہے اور آپ تو تمام جہان کے مالک ہیں اور ہمیں روزی پہنچانے کا آپ نے ذمہ لے رکھا ہے پھر بھی ہم نے اپنے دلوں میں اس قدر غموں کو کیوں جگہ دے رکھی ہے؟ یہ کہہ کر آپ نے دنیا کے تمام معاملات کو چھوڑ کر طریقت کا راستہ اختیار کر لیا اور اس کے بعد کبھی بھی روزی کا غم اپنے دل میں پیدا نہیں ہونے دیا۔ آپ فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ میں تو ایک غلام کا شاگرد ہوں اور میں نے جو کچھ پایا ہے اسی سے حاصل کیا ہے اور آپ یہ انکساری کے طور پر کہتے تھے، اور آپ کے مناقب بہت ہیں اور توفیق تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن الدارانی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے اپنے وقت کے شیخ اور راہ حق کے مرد یکتا حضرت ابو سلیمان عبدالرحمٰن بن عطیہ الدارانی ؒ بھی ایک ہیں۔ آپ اپنی قوم کے معزز اور ان کے دلوں کی راحت تھے۔ آپ اپنے مجاہدات اور ریاضات کی وجہ سے اپنے گروہ میں مخصوص تھے۔ آپ عصری علوم کے عالم اور آفات نفس کے عارف اور نفس کی کمین گاہوں سے اچھی طرح خبردار تھے۔ معاملات تصوف، دلوں کی حفاظت اور اعضا کی نگہداشت میں آپ کا کلام بڑا

لطیف ہے۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "اذا غلب الرجاء علی الخوف فسد الوقت" (جب امید خوف پر غالب ہو جائے تو عارف کا وقت خراب ہو جاتا ہے) کیونکہ حال کی رعایت کا نام وقت ہے۔ پس بندہ جس وقت تک اپنے حال کی نگہداشت کرتا رہتا ہے اس کے دل پر خوف طاری رہتا ہے اور جب اٹھ جاتا ہے تو وہ احوال کی نگرانی کو ترک کر دیتا ہے اور اس کا وقت فاسد ہو جاتا ہے اور اگر خوف اس کی امید پر غالب ہو جائے تو اس کی توحید باطل ہو جاتی ہے اس لئے کہ خوف کا غلبہ نا امیدی کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ سے نا امیدی شرک ہے۔ پس توحید کی حفاظت بندہ کی امید کے صحیح ہونے پر منحصر ہے اور وقت کی حفاظت اس کے خوف کی صحت پر موقوف لہذا جب خوف اور امید دونوں برابر ہوں تو توحید اور وقت دونوں محفوظ رہتے ہیں اور بندہ توحید کی حفاظت کی بنا پر صاحب ایمان ہوتا ہے اور وقت کی حفاظت کے سبب مطیع و فرمانبردار رہتا ہے اور امید کا تعلق صرف مشاہدہ حق سے ہے کہ اس میں مکمل اتحاد ہے اور خوف کا تعلق صرف مجاہدہ سے کہ اس میں مکمل اضطراب ہے اور مشاہدہ مجاہدہ کی میراث ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ تمام امیدیں، نا امیدی سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور جو شخص اپنے کردار کی وجہ سے اپنی کامیابی سے نا امید ہو جائے تو یہ نا امیدی ہی اس کو نجات فلاح اور حق تعالیٰ کے کرم کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور اس کے چہرے پر خوشی کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اس کے دل کو طبیعت کی تمام خرابیوں سے صاف کر دیتی ہے اور اس پر اسرار الٰہی کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں حضرت احمد بن لابی الحواریؒ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں خلوت میں نماز پڑھ کر رہا تھا کہ مجھے اس نماز میں بڑی ہی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ جب میں نے دوسرے روز حضرت ابوسلیمانؒ کے سامنے اپنی اس کیفیت کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم کمزور آدمی ہو ابھی تک مخلوق تیرے پیش نظر ہے اس لئے خلوت اور جلوت میں تمہاری حالتیں مختلف ہیں حالانکہ دونوں جہان میں کسی چیز کی یہ طاقت نہیں کہ بندہ کو حق تعالیٰ سے روک رکھے جس طرح دلہن کو لوگوں کے سامنے اس لئے

دکھاتے ہیں کہ تمام لوگ اس کو دیکھ لیں گے اور اس طرح اس کی عزت میں اضافہ ہو۔ لیکن اسے خود ایسا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر وہ اپنے مقصود کے علاوہ کسی اور کو دیکھے گی تو ملبس کا دیدار اس کو ذلیل کر دے گا۔ اسی طرح اگر تمام مخلوق فرمانبردار کی اطاعت کو عزت کی نگاہ سے دیکھے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن اگر وہ خود اپنی اطاعت کو غرور کی نگاہ سے دیکھے تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور اس حالت سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

حضرت معروف بن فیروز الکرخی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے رضائے خداوندی کی درگاہ سے تعلق رکھنے والے اور حضرت علی بن موسیٰ الرضاؒ کے تربیت یافتہ حضرت ابوالمحفوظ معروف بن فیروز الکرخیؒ بھی ہیں۔ آپ متقدمین اور مشائخ کے سرداروں میں سے ہیں۔ آپ پرہیزگاری میں مشہور اور تقویٰ ورجوع الی اللہ میں معروف ہیں۔ آپ کا ذکر ترتیب کے اعتبار سے مقدم ہونا چاہئے تھا لیکن میں نے پہلے دو بزرگوں کی موافقت میں اس جگہ پر آپ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک تو صاحب نقل حضرت شیخ مبارک ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ ہیں کہ ان کی کتاب اسی ترتیب پر ہے اور دوسرے صاحب تصرف حضرت استاد امام ابوالقاسم القشیریؒ ہیں کہ ان کی کتاب کے شروع میں بھی آپ کا ذکر اسی ترتیب پر ہے۔ میں نے اس مقام پر آپ کا تذکرہ اس لئے لکھ دیا ہے کہ آپ حضرت سری سقطیؒ کے استاد اور حضرت داؤد طائیؒ کے مرید تھے۔ زندگی کے ابتدائی دور میں آپ دین سے بیگانہ تھے پھر حضرت علی بن موسیٰ الرضاؒ کے ہاتھ پر آپ نے اسلام قبول کیا اور ان کے نزدیک آپ بڑے عزیز اور پسندیدہ تھے۔ آپ کے فضائل ومناقب بہت ہیں اور آپ علم کے تمام فنون میں صوفیا کے مقتدا شمار ہوئے ہیں۔ اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "**للفتیان ثلاث علامات وفا بلاخلاف ومدح بلاجود وعطاء بلاسوال**" (جوانمردوں کی تین نشانیاں ہیں۔

ا۔خلاف ورزی کے بغیر وعدہ پورا کرنا،۲۔کسی لالچ اور طمع کے بغیر مستحق کی تعریف کرنا اور،۳۔مانگے بغیر محتاج کی امداد کرنا۔وفا بلا خلاف یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کے عہد میں مخالفت اور مصیبت کو اپنے اوپر حرام کرے اور مدح بلا جود یہ ہے کہ کسی سے بھلائی پائے بغیر اس کی تعریف کرے اور......عطا بلا سوال یہ ہے کہ جب دولت موجود ہو تو سخاوت کرنے میں اپنے پرائے کی تمیز نہ کرے اور جب کسی کی حالت کا علم ہو تو اسے سوال کی ذلت سے دوچار ہونے سے پہلے دے دے۔اور یہ تمام صفات اگرچہ بظاہر مخلوق کے درمیان وقوع پذیر ہوئی ہیں لیکن تمام لوگ اپنی صفات سے مجازی طور پر متصف ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ تینوں صفات درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہیں اور اپنے بندوں پر اس فعل کا اظہار فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کی یہ حقیقی صفات ہیں کیونکہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وفا کرنے میں خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ہر چند کہ بندے اپنے عہد و پیماں میں خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں لیکن وہ پھر بھی ان پر اپنی مہربانیوں میں اضافہ کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کے وفا کی دلیل یہ ہے کہ اس نے ازل میں بندہ کے کسی نیک عمل کے بغیر اسے پیدا فرما کر اسے اپنا مخاطب بنایا اور آج دنیا میں اس کے برے افعال کے باوجود اس کو اپنی درگاہ سے نہیں ہٹاتا......اور مدح بلا جود بھی اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ بندے کے کسی فعل کا محتاج نہیں پھر بھی بندے کے معمولی سے عمل پر بھی اس کی تعریف کرتا ہے......اور عطاء بلا سوال بھی اس کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ وہ کریم ہے اور ہر ایک کی حالت سے بخوبی واقف ہے اور بن مانگے ہر ایک کا مقصود اسے دیئے دیتا ہے۔پس جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر کرم فرماتے اور اس بزرگ کو اپنے قرب کے ساتھ مخصوص فرماتے ہیں تو اس کے یہ تینوں معاملات درست فرما دیتے ہیں پھر وہ بندہ اپنی کوشش سے حتی الامکان مخلوق کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے تو بزرگ اس کا نام جوانمرد رکھ دیتے ہیں اور جوانمردوں کی فہرست میں اس کا نام لکھ دیتے ہیں......اور یہ تینوں صفات حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بدرجہ کمال موجود

تھیں۔ میں انشاءاللہ اپنے مقام پر اس کو بیان کروں گا۔

حضرت حاتم اصم رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک بندوں کی زینت اور اوتاد کا جمال حضرت ابو عبدالرحمٰن حاتم بن عنوان الاصمؒ بھی ہیں۔ آپ کا شمار بلخ کے صاحب حشمت بزرگوں اور خراسان کے قدیم مشائخ میں ہوتا ہے آپ حضرت شقیق رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت احمد خضرویہؒ کے استاد ہیں۔ آپ نے ابتداء سے انتہا تک تمام حالات میں ایک قدم بھی سچائی کے خلاف نہیں رکھا۔ حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ "صدیق زماننا حاتم الاصم" (حاتم اصمؒ ہمارے دور کے صدیق ہیں) نفس کی خرابیوں اور طبیعت کی رعونت میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے اور علم طریقت میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "الشھو ة ثلاثة شھو ة فی الاکل وشھوة فی الکلام وشھوة فی النظر" (شہوت تین طرح کی ہوتی ہے۔ ۱۔ کھانے میں شہوت، ۲۔ کلام کرنے میں شہوت، ۳۔ نظر میں خواہش "فاحفظ الاکل بالثقة واللسان بالصدق والنظر بالعبرة" (پس اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے کھانے کو حرام سے محفوظ رکھ۔ سچائی کے ساتھ اپنی زبان کی حفاظت کر اور عبرت کے ذریعہ نظر کا تحفظ کر) پس جو شخص کھانے کے معاملہ میں حق تعالیٰ پر توکل کرتا ہے وہ طعام کی خواہش سے چھوٹ جاتا ہے اور جو شخص سچ بولے وہ زبان کی خواہش سے بچ جاتا ہے اور جو شخص آنکھ سے امر حق کو دیکھے وہ نظر کی خواہش سے بچ جاتا ہے اور یہ یاد رکھ کہ حقیقت توکل امر حق کے جاننے سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو شخص حق تعالیٰ کو صحیح طور پر جان لیتا ہے وہ اس کے روزی پہنچانے پر بھی یقین کر لیتا ہے پھر اپنے سچے علم کی بدولت اس کی عبادت کرتا اور اپنی صحیح معرفت کی بنا پر اس کی ذات وصفات میں تدبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا کھانا پینا بھی محبت الٰہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اس کی عبادت

وجد کے علاوہ اوراس کی نظر مشاہدہ حق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ پس جس وقت وہ حق تعالیٰ کو صحیح طور پر جان لیتا ہے تو حلال روزی کھاتا ہے اور جب سچ بولتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور جب امر حق کا مشاہدہ کرتا ہے تو خود اسی کو دیکھتا ہے کیونکہ اس کے دیئے ہوئے رزق اور اس کی اجازت کے بغیر کھانا حلال نہیں اور اس کے ذکر کے بغیر اور کسی کا ذکر کرنا درست نہیں اور اس کے جمال وجلال کے علاوہ اس کی پیدا کردہ دوسری موجودات کو دیکھنا صحیح نہیں اور جب تو اس ذات حق تعالیٰ سے رزق حاصل کرے اور اسی کی اجازت سے کھائے تو نفس کی خواہش پیدا نہ ہوگی اور جب تو اسی کی طرف سے اور اسی کے حکم سے کچھ کہے گا تو بھی خواہش پیدا نہ ہوگی اسی طرح جب اس کے فعل یعنی مخلوقات کو دیکھے اور اسی کے حکم سے دیکھے تو بھی خواہش نفس نہ ہوگی۔ لیکن اگر تو اپنے نفس کی چاہت پر کھانا کھائے تو اگرچہ وہ حلال ہی ہو خواہش نفس ہوگی اور اگر تو اپنے نفس کی خواہش کے مطابق کچھ کہے گا تو اگرچہ وہ حق تعالیٰ کا ذکر ہی ہو، جھوٹ اور خواہش نفس ہوگی اور اگر تو اپنے نفس کی خواہش سے دیکھے گا تو اگرچہ اس سے حق پر استدلال ہی کرے، وبال اور نفس کی خواہش ہوگی۔ (والا لہ اعلم)

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک امام مطلبی اور نبی ﷺ کے چچا کے بیٹے ابو عبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن شافع بن اسائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبدمناف القرشی الشافعیؒ بھی ہیں اپنے وقت کے بزرگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ جملہ علوم میں اپنے دور کے امام اور جوانمردی و پرہیزگاری میں معروف تھے۔ آپ اوصاف حمیدہ اور بلند پایہ کلام کے مالک تھے۔ آپ جب تک مدینہ منورہ میں رہے حضرت امام مالک بن انسؒ کی شاگردی اختیار کئے رکھی اور جب عراق میں تشریف لے آئے تو حضرت امام محمد بن الحسن شیبانیؒ کی صحبت اختیار کی۔ اور آپ کی طبیعت ہمیشہ گوشہ

نشینی کے ارادے پر مائل رہی اورطریق تصوف کی تحقیق کی جستجو میں مصروف رہے یہاں تک کہ ایک جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی اور آپ کی اقتدا کرنے لگی اورحضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی انہی میں سے تھے اس کے بعد طلب جاہ اورامامت کی کوشش میں مشغول ہوگئے لیکن کچھ مدت کے بعداس سے بھی رک گئے آپ جملہ احوال میں قابل تعریف عادات کے مالک تھے۔شروع میں اہل تصوف کیلئے آپ کے دل میں کچھ سختی موجود تھی لیکن جب حضرت سلیمان راعیؒ سے آپ کی ملاقات ہوئی اوران کے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تو پھر آپ جہاں کہیں بھی تشریف لے جاتے حقیقت تصوف کے متلاشی رہتے آپ سے روایت ہے کہ فرمایا''اذا رایت العالم یشتخل بالرخص فلن یجی منه شی ''(جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ وہ دین کے احکام میں آسانیاں تلاش کرنے میں مشغول ہے تو جان لو کہ اس سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا) یعنی علما ہرقسم کے لوگوں کے پیشوا ہوتے ہیں ان کیلئے جائز نہیں کہ کوئی شخص ان سے آگے قدم رکھ سکے۔لہذا وہ اس وقت تک حق کا راستہ نہیں پا سکتے جب تک وہ اپنے تمام افعال واقوال میں کامل احتیاط اورخوب محنت اختیار نہ کریں اورعلم میں رخصت اورآسانیوں کوتلاش کرنا اسی آدمی کا کام ہوسکتا ہے جو دین میں مجاہدہ سے راہ فرار کرے اوراپنے لئے تخفیف وآسانی پیدا کرے پس دین کے معاملات میں رخصتوں کی طلب کرنا یہ عوام کا درجہ ہے تا کہ دائرہ شریعت سے باہر نہ نکل جائیں اورمجاہدہ اورمحنت کے ساتھ دین کے احکام کو پورا کرنا خواص کا مقام ہے تا کہ اپنے دل میں اس مجاہدہ کا ثمرہ حاصل کرلیں اورعلما تو خواص میں شمار ہوتے ہیں لہذا جب یہی عام لوگوں کے درجہ پر راضی ہو جائیں تو ان سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہئے دوسری بات یہ بھی ہے کہ رخصت طلب کرنا تو احکام الٰہی کو ہلکا سمجھنا ہے۔حالانکہ علماء اللہ تعالیٰ کے دوست ہوتے ہیں اورکوئی دوست اپنے دوست کے حکم کو حقیر نہیں سمجھا کرتا اوراس کے فرمان کوادنیٰ سمجھنے کی بجائے اس کے بجا لانے میں پوری احتیاط کرتے ہیں.... مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان

فرماتے ہیں کہ ایک رات میں نے پیغمبر ﷺ کی خواب میں زیارت کی اور عرض کی کہ ''یا رسول اللہ ﷺ مجھے آپ کی طرف سے ایک روایت پہنچی ہے کہ زمین میں اللہ کے اولیا اوتاد اور ابرار ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ راوی نے میری طرف سے میرے سامنے درست روایت بیان کی ہے'' میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں ان میں سے ایک ولی کی زیارت کرنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا کہ محمد بن ادریس الشافعی ان اولیا میں سے ایک ہیں'' اس کے علاوہ بھی آپ کے مناقب بہت زیادہ ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ

اور ان میں سے ایک سنت رسول کو زندہ کرنے والے اور اہل بدعت کو مٹانے والے حضرت ابو محمد احمد بن حنبلؒ بھی ہیں۔ آپ تقویٰ و پرہیز گاری میں مخصوص اور پیغمبر ﷺ کی احادیث کے حافظ تھے۔ آپ کا شمار علما و صوفیا، دونوں میں ہوتا ہے اور ہر طبقہ کے لوگ آپ کی ذات کو اپنے لئے باعث برکت سمجھتے تھے آپ کو حضرت ذوالنون مصریؒ، حضرت بشر حافیؒ، حضرت سری سقطیؒ اور حضرت معروف کرخیؒ جیسے بڑے بڑے مشائخ کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا...... آپ کی کرامتیں بڑی واضح اور فراست بے حد درست تھی اور بعض مشبہین آج کل جو کچھ آپ کی طرف منسوب کر رہے ہیں یہ آپ پر افتراء اور بہتان ہے آپ ان باتوں سے بالکل بری تھے۔ اصول دین میں آپ صحیح اعتقاد اور آپ کا مذہب تمام علما کو پسند ہے اور جب بغداد میں معتزلہ کا غلبہ ہوا تو انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ آپ کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ آپ قرآن مجید کو مخلوق کہیں۔ آپ بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے اس حالت میں آپ کے ہاتھ شکنجہ میں کس کر آپ کو ہزار کوڑے لگائے گئے تاکہ آپ قرآن کو مخلوق کہہ دیں لیکن آپ نے پھر بھی ایسا کہنے سے انکار کر دیا کہتے ہیں کہ اسی دوران آپ کا ازار بند کھل گیا جب کہ آپ کا ہاتھ بندھا ہوا تھا اتنے میں غیب سے

ایک ہاتھ نمودار ہوا جس نے آپ کا ازار بند باندھ دیا۔ لوگوں نے جب آپ کی یہ کرامت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو آپ کو چھوڑ دیا لیکن آپ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چند روز کے بعد وفات پا گئے۔ زندگی کے آخری وقت میں کچھ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جنہوں نے آپ کو کوڑے لگائے؟ آپ نے فرمایا میں کیا کہوں کہ ان لوگوں نے تو بزعم خویش مجھے حق تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے مارا ہے کہ گویا میں باطل پر ہوں اور وہ حق پر ہیں میں صرف ان زخموں کی بنیاد پر روز قیامت ان کے ساتھ جھگڑا نہ کروں گا...... دین کے مسائل میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے جب کوئی شخص آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو اگر وہ اعمال سے متعلق ہوتا تو جواب ارشاد فرما دیتے لیکن اگر طریقت کے حقائق سے متعلق ہوتا تو حضرت بشر حافیؒ کے پاس جا کر ان سے دریافت کرنے کی تاکید فرما دیتے۔ چنانچہ ایک روز ایک شخص نے سوال کیا کہ ''ماالاخلاص'' (اخلاص کسے کہتے ہیں؟) آپ نے فرمایا ''الاخلاص ھو الخلاص من آفات الاعمال'' (اخلاص یہ ہے کہ انسان اعمال کی خرابیوں سے نجات پا جائے) یعنی تیرا عمل ریا کاری اور نقصان سے خالی ہو۔ اس نے سوال کیا ''ماالتوکل'' (توکل کیا ہے؟) آپ نے جواب دیا ''الثقة باللّٰه'' (اللہ پر پوری طرح بھروسہ کرنا) اس نے دریافت کیا ''ماالرضاء'' (رضا کیا ہے؟) آپ نے ارشاد فرمایا ''تسلیم الامور الی الله'' (اپنے تمام معاملات کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا) اس نے پوچھا ''ما المحبة'' (محبت کیا ہے؟) تو آپ نے فرمایا ''یہ بات جا کر حضرت بشر حافی سے پوچھو کیونکہ جب تک وہ زندہ ہیں میں اس کا جواب نہیں دے سکتا...... حضرت امام احمد بن حنبلؒ تمام احوال میں آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ زندگی میں معتزلہ نے آپ کو اذیتیں دیں اور وفات کے بعد بعض لوگوں نے آپ پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں۔ حالانکہ آپ ان تمام الزامات سے بالکل پاک ہیں حتیٰ کہ اہل سنت و جماعت نے بھی آپ کے حالات سے ناواقفی کی بنا پر بعض باتیں آپ کی

طرف غلط منسوب کردی ہیں حالانکہ وہ ان سے بری ہیں۔ (واللہ اعلم)

حضرت احمد بن الحواری رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے وقت کے چراغ اور عذاب الٰہی کی آفتوں سے واقف حضرت ابوالحسن احمد بن الحواریؒ بھی ایک ہیں۔ آپ شام کے بڑے جلیل القدر مشائخ میں شمار ہوتے تھے اور تمام صوفیا کے ممدوح تھے۔ یہاں تک حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ''احمد ابن الحواری ریحانۃ الشام'' (احمد بن الحواریؒ شام کی خوشبو ہے) علم طریقت کے شعبوں میں آپ کا کلام بہت بلند پایہ اور اشارات بہت لطیف ہیں اور پیغمبر ﷺ کی احادیث میں آپ کی روایت کردہ احادیث سب کی سب صحیح ہیں اور طریقت میں آپ کا مقام اتنا بلند تھا کہ وقت کے تمام صوفیاء اس سلسلے میں آپ سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ آپ حضرت ابوسلیمان دارانیؒ کے مرید تھے اور سفیان بن عینیہ مروان بن معاویہ القاری جیسے بزرگوں کی صحبت سے تربیت حاصل کی اور سیاحت کے دوران ہر ایک بزرگ سے ادب اور فائدہ حاصل کیا تھا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''الدنیا بلۃ ومجمع الکلاب واقل من الکلاب من عکف علیھا فان الکلب یاخذ فیھا حاجتہ وتنصرف والمحب لھا لا یزول عنھا ولا یترکھا بحال'' (دنیا کوڑے کرکٹ کا مقام اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے اور وہ آدمی تو کتوں سے بھی کم درجہ ہے جو ہر وقت اس پر گرار رہتا ہے اس لئے کہ کتا تو اس جگہ سے اپنی ضرورت پوری کر کے واپس لوٹ جاتا ہے لیکن دنیا سے محبت کرنے والا ہر وقت اس سے چمٹا رہتا ہے اور کسی حال میں بھی اس کو چھوڑتا نہیں) یعنی آپ کے نزدیک دنیا اس قدر حقیر تھی کہ آپ نے اس کو کوڑے کرکٹ سے تشبیہ دی اور اہل دنیا کو کتوں سے بھی کم مرتبہ شمار کیا اور وجہ یہ بتائی کہ کتے تو کوڑے سے اپنی ضرورت پوری کر کے الگ ہو جاتے ہیں لیکن اہل دنیا اس کو جمع کرنے

کیلئے ہمیشہ اس پر بیٹھے رہتے ہیں، اس لئے کتا حرص میں اہل دنیا سے کم تر اور اہل دنیا درجہ میں کتے سے کم تر ہوئے اور یہ بات آپ کے اہل دنیا سے قطع تعلق کی بڑی واضح دلیل ہے۔ درحقیقت ارباب طریقت کا دنیا و مافیہا سے لاتعلق ہونا ایک شاندار محل اور ترو تازہ باغیچہ کی مانند ہے..... آپ ابتدائے عمر سے ہی حصول علم میں مصروف ہو گئے تھے اور اس کیلئے اتنی محنت کی کہ آپ ائمہ کے درجہ تک پہنچ گئے۔ بالاخر آپ نے تمام کتابیں دریا برد کر دیں اور فرمانے لگے "**نعم الدليل انت واما الاشتغال بالدليل بعد الوصول الى المدلول محال** "(تم بہترین دلیل اور رہنما ہولیکن مدلول ومقصود تک پہنچ جانے کے بعد دلیل کے ساتھ مشغول رہنا محال ہے) کیونکہ رہنما کی ضرورت تو اس وقت تک ہوتی ہے جب تک مرید راستہ میں ہولیکن جب منزل مقصود تک رسائی ہو جائے تو پھر رہنما کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور بعض مشائخ نے آپ کے اس کلام کو حالت سکر پر محمول کیا ہے کہ "**مَنْ قال وصلت فقد وصل** "(جس آدمی نے کہا کہ میں پہنچ گیا تو وہ واقعی پہنچ گیا) کیونکہ منزل پر پہنچ جانا کام سے رک جانا ہے، پس شغل مشغل ہوتا ہے اور فراغت فراغت اور حق تک وصول کا راستہ مشغل اور فراغت دونوں میں نہیں کیونکہ یہ دونوں بندہ کی صفات ہیں اور فصل و وصل حق تعالیٰ کی عنایت اور اس کے ازلی ارادہ سے حاصل ہوتے ہیں نہ کہ بندہ کی مشغولیت و فراغت سے پس حق تعالیٰ تک پہنچنے کا کوئی اصول نہیں اور حق تعالیٰ کیلئے قربت اور نزدیکی کی نسبت درست نہیں۔ اس کا وصل تو بندہ کو صرف بزرگی عطا کرتا ہے اور اس کا ہجر بندہ کو ذلیل کرتا ہے کیونکہ اس کی صفات حقیقہ میں تغیر درست نہیں...... اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ اس معنی کا احتمال موجود ہے کہ اس بزرگ احمد بن الحواریؒ کی لفظ وصول سے مراد راہ حق تک وصول ہو نہ کہ ذات حق تعالیٰ تک وصول۔ کیونکہ کتابوں میں وصول سے مراد راہ حق ہی ہے اس لئے کہ جب راستہ واضح ہو جائے تو پھر رہنما کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ مقصود واضح ہو تو بیان کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ مقصود کے

غائب ہونے کی صورت میں ہوتی ہے۔غرضیکہ جب راہ حق مل گئی تو اس کا دکھانا لا حاصل ہو گیا اور جب صحیح طور پر معرفت حق کے بیان کرنے میں زبانیں عاجز ہیں تو کتابیں بدرجہ اول اس سلسلہ میں بیکار ہوں گی۔آپ کے علاوہ دیگر مشائخ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔جیسا کہ شیخ المشائخ ابوسعید فضل اللہ بن محمد المہینی وغیرہ نے اپنی کتابیں پانی میں پھینک دی تھیں اور بعض نام نہاد صوفیوں نے بھی سستی، ناکامی اور اپنی جہالت کی وجہ سے ان مردان حریت کی تقلید کی...... تاہم ان بزرگوں کی اس سے مراد ماسوی اللہ سے اپنے دل کو فارغ کرنے۔ دنیا سے لاتعلق ہونے اور اس سے اپنی توجہ ہٹانے کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔تاہم حالت سکر اور غلبہ جذب کے علاوہ یہ بات درست نہیں کیونکہ جو شخص مقام مشاہدہ میں قیام پذیر ہو دونوں جہان کی کوئی چیز اس کے مشاہدہ میں حائل نہیں ہوسکتی چنانچہ جب دل دنیا کے تعلقات سے منقطع ہو گیا تو کاغذ کے چند اوراق کی کیا وقعت باقی رہ گئی۔لیکن جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ شاید کتاب کو دھونے سے مراد یہ ہو کہ مقصودی معنی کے حصول کے بعد الفاظ و عبارت کی نفی کر دی تو جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ عبارت زبان سے بھی دور ہو جائے کیونکہ کتاب میں عبارت لکھی ہوتی ہے اور زبان پر جاری ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی صورت بھی دوسری سے بہتر نہیں......اور مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ احمد بن الحواری کو غلبہ حال میں ایسا کوئی شخص نہ ملا جس کو وہ اپنا کلام سنا دیتے اس لئے انہوں نے اپنی حالت کی تفصیل کاغذوں پر تحریر کر دی اور جب کاغذ زیادہ جمع ہو گئے اور ان کو عام طور پر شائع کرنے کے قابل کوئی آدمی میسر نہ آیا تو انہوں نے ان کاغذوں کو پانی میں ڈال دیا اور کہا کہ تم بہت اچھی دلیل ہو لیکن چونکہ تم سے میری مراد مجھے حاصل ہو چکی ہے اس لئے اب تم میں مشغول رہنا بے فائدہ ہے۔نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے پاس کتابیں زیادہ جمع ہو گئی ہوں جو آپ کو اوراد اور معاملات کے ادا کرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہو۔ اس لئے آپ نے اس شغل اور رکاوٹ کو اپنے سامنے سے اٹھا دیا ہو اور معانی کے حصول

کیلئے دل کی فراغت چاہی ہو اور عبارات کو ترک کر دیا ہو۔ (واللہ اعلم)

حضرت احمد بن خضرویہ البلخی رحمتہ اللہ علیہ

اور ان تبع تابعین میں سے جوانمردوں کے سالار لشکر اور آفتاب خراسان حضرت ابو حامد احمد خضرویہ البلخیؒ بھی ہیں۔ آپ اپنے دور کے بلند حال و بلند شرف صوفیاء کے مقتدا اور خواص و عوام کے انتہائی پسندیدہ تھے۔ آپ ملامت کے طریق پر چلتے اور سپاہیانہ لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے، آپ کی اہلیہ فاطمہ بھی طریقت میں بڑی شان کی مالک تھیں۔ وہ حاکم بلخ کی صاحبزادی تھیں جب ہجی توبہ کا ارادہ کرلیا تو کسی شخص کے ذریعہ حضرت احمد کے پاس پیغام بھجوایا کہ اپنے ساتھ نکاح کیلئے مجھے میرے والد سے مانگ لیجئے! آپ نے قبول نہ کیا تو انہوں نے دوبارہ پیغام بھجوایا کہ اے احمد! میں تو آپ کو اس سے بھی بہادر سمجھتی تھی کہ آپ راہ حق میں رہبر ثابت ہوں گے نہ کہ رہزن یہ سن کر آپ نے ان کے والد کے پاس ایک آدمی بھیج کر فاطمہ کے ساتھ نکاح کی درخواست کی۔ حاکم بلخ نے تبرک کے طور پر ان کا نکاح حضرت احمد بن خضرویہ کے ساتھ کر دیا۔ حضرت فاطمہ نے بھی دنیا کے شغل اور دھندے چھوڑ دیئے اور حضرت احمد بن خضرویہ کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر کے دائمی سکون حاصل کرلیا ایک دفعہ حضرت احمد کے دل میں حضرت بایزیدؒ کی زیارت کا ارادہ پیدا ہوا تو حضرت فاطمہ نے بھی آپ کے ساتھ موافقت کی۔ چنانچہ جب حضرت بایزیدؒ کے سامنے پہنچے تو حضرت فاطمہؓ نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا اور حضرت بایزیدؒ کے ساتھ گستاخانہ گفتگو شروع کر دی۔ حضرت احمد کو انتہائی تعجب ہوا اور ان کے دل پر غیرت پیدا ہوئی اور کہا ''اے فاطمہ! حضرت بایزید کے سامنے تم نے یہ گستاخانہ انداز کیوں اختیار کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ میری طبیعت کے محرم ہیں اور حضرت بایزید میری طریقت کے محرم ہیں۔ آپ کے ذریعہ میں اپنی خواہش کی تسکین کرتی ہوں اور ان کے

ذریعہ روح کی طمانیت اور تعلق باللہ حاصل کرتی ہوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت بایزیدؒ تو میری صحبت سے بے نیاز ہیں اور آپ میری صحبت کے محتاج ہیں۔ چنانچہ آپ ہمیشہ حضرت بایزیدؒ کے ساتھ اسی طرح شوخی کے انداز میں باتیں کیا کرتی تھیں یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت بایزید کی نگاہ آپ کے ہاتھ پر پڑھ گئی جس پر مہندی لگی ہوئی تھی آپ نے فرمایا ''اے فاطمہ! تم نے ہاتھ پر مہندی کیوں لگائی ہے؟ حضرت فاطمہ نے جواباً کہا ''اے بایزید جب تک آپ نے میری ہاتھ اور مہندی کو نہ دیکھا تھا مجھے یہاں خوشی و راحت محسوس ہوتی تھی لیکن اب چونکہ آپ کی نظر میرے جسم کے ایک حصے پر پڑ گئی ہے۔ لہذا میرے لئے آپ کی صحبت میں رہنا حرام ہو گیا ہے اور وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے اور نیشاپور میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں کے جملہ مشائخ حضرت احمد سے بہت خوش رہتے تھے جب حضرت یحییٰ بن معاذ الرازیؒ نیشاپور تشریف لائے اور پھر وہاں سے بلخ جانے کا ارادہ فرمایا تو حضرت احمد نے ان کی دعوت کرنا چاہی اور حضرت فاطمہ سے مشورہ کیا کہ حضرت یحییٰ کی دعوت کیلئے کیا انتظام کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ اتنی گائیں، اتنی بھیڑیں اور اتنی دیگر ضروری اشیاء اور اتنی موم بتیاں اور عطر درکار ہے اور ان تمام چیزوں کے علاوہ بیس گدھے ذبح کرنے چاہئیں یہ سن کر حضرت احمد نے پوچھا کہ گدھوں کو ذبح کرنے کا کیا مقصد! انہوں نے جواب دیا کہ جب کوئی کریم کسی کریم کے گھر مہمان آئے تو محلّہ کے کتوں کیلئے بھی کوئی حصہ ہونا چاہئے اور حضرت ابو یزیدؒ نے فرمایا ''مَن اراد ان ینظر الی رسل من الرجال محتو تحت لباس النسوانی فلینظر الی فاطمة رحمة الله علیها '' (جو شخص کسی مرد کو عورتوں کے لباس میں پوشیدہ دیکھنا چاہے تو وہ فاطمہؒ کو دیکھ لے) اور ابو حفص حدادؒ نے فرمایا ہے کہ ''لولا احمد بن خضرویه ماظهرت الفتو '' (اگر احمد بن خضرویہ نہ ہوتے تو جوانمردی ظاہر ہی نہ ہوتی) غرضیکہ آپ کے ملفوظات بڑے بلند اور انفاس بڑے مہذب ہیں۔ علم طریقت کے ہر شعبے میں آپ کی مشہور تصانیف ہیں اور حقائق

کے بیان میں آپ کے اداب اور نکات بڑے واضح ہیں اور آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''الطریق واضیح والحق لائخ والراعی قدا سمع فما التجبر بعدھا الامن العمی ''(راستہ بڑا واضح ہے اور حق روشن ہے اور نگہبان خوب سننے والا پس اس کے بعد حیرانی دل کے اندھے پن کی وجہ سے ہی ہو سکتی ہے) یعنی راستہ کی تلاش بالکل خطا ہے کیونکہ راہ حق تو آفتاب کی طرح روشن ہے۔ تو اپنے آپ کو تلاش کر کہ تو کہاں ہے۔ تو جب اپنے آپ کو پالے گا تو خود بخود راستہ پر آ جائے گا۔ کیونکہ حق تو اس سے بہت زیادہ روشن ہے کہ طالب اس کی طلب کرے..... نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا کہ '' استر عزفقرک عن الخلق ''(اپنی درویشی کی عزت کو مخلوق سے پوشیدہ رکھ) یعنی مخلوق کے سامنے یہ مت کہو کہ میں درویش ہوں تاکہ تیرا راز آشکار نہ ہو۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بڑی عظیم کرامت ہے۔ نیز آپ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رمضان کے مہینہ میں ایک درویش نے ایک مالدار کی دعوت کی جبکہ اس کے گھر میں خشک روٹی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ دولت مند جب واپس ہوا تو سونے کی ایک تھیلی درویش کے پاس بھیجی۔ اس نے یہ کہہ کر وہ واپس کر دی کہ یہ اس شخص کے لائق ہے جو اپنی درویشی کو تجھ جیسے شخص پر ظاہر کرے یا دولت مندوں کو فقیری کی عزت کے قابل سمجھے۔ اور یہ بات اس فقیر کے صحبت فقر کی علامت ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت عسکر بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک توکل کرنے والوں کے امام اور اہل زمان کے برگزیدہ حضرت ابوتراب عسکر بن الحسین النسفیؒ بھی ہیں۔ آپ خراسان کے بڑے مشائخ اور ان کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ جوانمردی، زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے۔ لوگوں میں آپ کی بہت سی کرامات اور عجیب باتیں مشہور ہیں جو آپ سے جنگل میں ظاہر ہوئیں۔

آپ بڑے صوفی سیاحوں میں سے تھے اور جنگلوں میں تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔آپ کی وفات بھی بصرہ کے ایک جنگل میں ہوئی تھی۔کئی سال کے بعد ایک جماعت کا آپ پر گزر ہوا تو اس نے آپ کو قبلہ رو پاؤں پر کھڑے پایا کہ آپ خشک ہو چکے تھے۔مشکیزہ آپ کے سامنے پڑا تھا اور ہاتھ میں عصا تھام رکھا تھا۔درندوں میں سے کوئی آپ کے پاس نہیں پھٹکا اور نہ ہی آپ نیچے گرے۔آپ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''الفقیر قوته ماوجد ولباسه ماستر وسکنه حیث نزل ''(فقیر کی روزی وہ ہے جو اسے مل جائے اور لباس وہ ہے جس سے وہ بدن ڈھانپ لے اور اس کی قیام گاہ وہی ہے جہاں وہ اترے) کیونکہ تینوں چیزوں میں تصرف کرنا غفلت ہے اور تمام اہل جہاں انہی تین چیزوں کی بلا میں مبتلا ہیں۔کیونکہ وہ ان تینوں میں تکلف برتتے ہیں اور یہ بات تو دنیاوی اور مادی معاملات کے لحاظ سے تھی لیکن تحقیق کے مطابق حالت وجد درویش کی غذا تقویٰ اس کا لباس اور غیب اس کا مسکن ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّاءً غَدَقًا ''(اور یہ کہ اگر وہ لوگ راہ حق پر ثابت قدم ہو جائیں تو ہم انہیں کثیر پانی سے سیراب کرتے) نیز ارشاد فرمایا ''وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ'' (اور ہم نے انہیں لباس عطاء کیا اور تقویٰ کا لباس بہت بہتر ہے) نیز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''الفقر وطن الغیب''(فقر،غیب کا وطن ہے)پس جب اس کا کھانا پینا قرب کی شراب سے ہو اور مجاہدہ و تقویٰ اس کا لباس ہو اور وطن،غیب ہو اور انتظار اس کا وصل ہو تو پھر فقر کی راہ بالکل واضح اور اس کے معاملات بڑے روشن ہیں اور یہ درجہ کمال ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ الرازی رحمۃ اللہ علیہ

اور تبع تابعین میں سے محبت و وفا کی زبان اور ولائت وطریقت کی زینت حضرت ابوزکریا یحییٰ بن معاذ الرازیؒ بھی ایک ہیں۔آپ بڑے بلند حال اور نیک کردار

بزرگ تھے۔ حق تعالیٰ سے امید میں بڑے ثابت قدم تھے یہاں تک کہ حضرت خضریؒ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو یحییٰ ہیں ایک گروہ انبیاء علیہم السلام میں اور دوسرے گروہ اولیاء رحمہم اللہ میں سے...... حضرت یحییٰ بن زکریا علیٰ نبینا وعلیہما السلام نے تو اس طرح خشیت الٰہی کی راہ طے فرمائی کہ خوف الٰہی کے تمام دعویدار آپ کے مقابلہ میں اپنی کامیابی سے ناامید ہو گئے اور حضرت یحییٰ بن معاذ الرازیؒ نے اللہ تعالیٰ سے امید کی راہ اس انداز سے طے کی کہ آپ کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی امید کے تمام دعویداروں نے ہاتھ باندھ دیئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا حال تو سب کو معلوم ہے حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا حال کیسا تھا؟ حضرت خضریؒ نے جواباً فرمایا ''مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ انہوں نے کبھی جہالت کا کوئی کام نہیں کیا۔ کبھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اور آپ مجاہدہ وعمل میں اس قدر کوشاں رہتے تھے کہ دوسرا کوئی اس کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ آپ کے دوستوں میں سے ایک نے کہا کہ اے شیخ! آپ کا مقام تو مقام امید ہے لیکن آپ کا عمل اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا سا عمل ہے؟ آپ نے فرمایا اے بیٹے جان لو کہ عبادت کا ترک کرنا گمراہی ہے اور خوف ورجا دونوں ایمان کے دوست ہیں اور کوئی شخص ارکان ایمان میں کسی رکن پر عمل کرتا ہو تو اس کا گمراہ ہو جانا محال ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا شخص تو اللہ تعالیٰ سے علیحدگی کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے والا اللہ تعالیٰ کے وصل کی امید پر اس کی عبادت کرتا ہے، جب تک عبادت موجود نہ ہو اس وقت تک نہ خوف الٰہی درست ہو سکتا ہے اور نہ امید لیکن جب عبادت کا درجہ حاصل ہو تو خوف ورجا سب عبادت بن جاتا ہے اور جس جگہ عبادت کی ضرورت ہے وہاں محض عبارت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

آپ کی تصانیف، نکات اور بدیع اشارات بہت ہیں اور خلفاء راشدینؓ کے بعد مشائخ صوفیا میں سے پہلا وہ شخص جو مسائل طریقت بیان کرنے کیلئے منبر پر چڑھا وہ آپ ہی تھے اور مجھے ان کا کلام انتہائی محبوب ہے کیونکہ اس کے سننے سے طبیعت کو تازگی اور کانوں کو سرور

حاصل ہوتا ہے اور اس کا مفہوم بڑا لطیف اور عبارت بڑی شگفتہ ہے اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''الدنیا دار الاشتفال والاخرہ دار الاھوال ولایزال العبدبین الاشتفال والاھوال حتی تستقربه القرار ما الی الجنة وا ما الی النار ''(دنیا مقام عمل ہے اور آخرت خوف وخطرہ کا گھر ہے اور بندہ اس وقت تک شغل اور خوف کے درمیان رہتا ہے جب تک یا تو جنت میں یا پھر دوزخ میں قرار نہ پکڑے) وہ دل بڑا خوش نصیب ہے جو دنیا کے دھندوں سے چھوٹ جائے اور آخرت کے خطرات سے بے خوف ہو جائے اور دونوں جہان سے اپنا ارادہ منقطع کر کے اپنا رشتہ حق تعالیٰ سے جوڑ لے اور آپ کا مذہب یہ تھا کہ غنا فقر سے افضل ہے۔ کہتے ہیں کہ جب رے میں آپ پر قرضہ بہت ہو گیا تو خراسان کا ارادہ فرمایا اور وہاں کے لوگوں کو ایک عرصہ تک وعظ و نصیحت کی۔ پھر جب واپس لوٹنے لگے تو لوگوں نے آپ کی خدمت میں ایک لاکھ درہم پیش کیے۔ یہ رقم لے کر جب آپ رے کی طرف روانہ ہوئے تو راستہ میں چوروں نے آپ کو لوٹ لیا اور تمام رقم چھین لی اور آپ بالکل خالی ہاتھ نیشاپور میں آ گئے اور وہیں آپ کی وفات ہوئی۔ اور آپ تمام احوال میں لوگوں کے درمیان معزز اور وجیہہ تھے۔ (واللہ اعلم)

حضرت عمر بن السالم نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے ایک خراسان کے شیخ المشائخ اور اپنے دور میں زمین کے بے مثل بزرگ حضرت ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری الحدادیؒ بھی ہیں۔ آپ کا شمار بڑے بزرگ اور بلند پایہ صوفیاء میں ہوتا ہے اور تمام بزرگوں کے ممدوح تھے۔ حضرت ابو عبداللہ لاہوریؒ کے صحبت یافتہ اور حضرت احمد خضرویہؒ کے دوست تھے اور شاہ شجاع جیسا انسان کرمان سے چل کر آپ کی زیارت کیلئے تشریف لایا تھا۔ ایک مرتبہ آپ بغداد کے مشائخ کی زیارت کیلئے روانہ ہوئے لیکن آپ عربی نہ بول سکتے تھے۔ جب بغداد پہنچے تو

آپ کے مریدوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ یہ بڑی نامناسب بات ہے کہ خراسان کے شیخ المشائخ کو گفتگو کیلئے ترجمان کی ضرورت پڑے۔ لیکن جب مسجد شونیزیہ میں آئے اور بغداد کے تمام مشائخ بھی وہاں آ گئے تو آپ نے ان کے ساتھ ایسی فصیح عربی میں گفتگو کی کہ تمام مشائخ دنگ اور عاجز رہ گئے۔ آپ سے مشائخ نے سوال کیا کہ "ما انفنوه" (جوانمردی کیا ہے؟) آپ نے فرمایا "آپ میں کوئی صاحب ابتداء کر کے اس کے متعلق پہلے کوئی قول بیان کریں۔ چنانچہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا "الفتوه عندی ترک الروية واسقاط النسه" (میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ تو جوانمردی کو نہ دیکھے اور اپنے کسی عمل کی نسبت اپنی طرف نہ کرے کہ یہ میں نے کیا ہے) حضرت ابو حفص نے کہا "مَا احسن مَا قال الشیخ ولکن الفتوه عندی اداء الانصاف وترک مطالبة الانصافِ" (شیخ نے بہت خوب فرمایا ہے لیکن میرے نزدیک جواں مردی یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ انصاف کرے لیکن دوسروں سے انصاف کا تقاضہ نہ کرے) یہ سن کر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا "قوموا یا اصحابنا فقدزادالو حفص علی آدم و ذریته" (اے دوستو! اٹھو کہ حضرت ابو حفص جوانمردی میں آدم اور تمام آ دلا دآ دم[1] پر بڑھ گئے ہیں)

اور کہتے ہیں کہ آپ کی توجہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ آپ ایک کنیز پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ لوگوں نے آپ سے کہا کہ نیشاپور کے قریبی ایک گاؤں میں ایک یہودی جادوگر رہتا ہے آپ کے اس کام کا علاج اس کے پاس موجود ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور اپنا حال اس کے سامنے بیان کیا۔ یہودی نے کہا کہ چالیس روز تک تم نہ تو نماز پڑھو۔ نہ کوئی اچھا عمل کرو اور نہ ہی نیک نیتی کا کوئی کام دل وزبان پر لاؤ پھر میں عمل کروں گا جس سے تمہاری

[1] کشف المحجوب کے فارسی نسخوں میں یوں ہی لکھا ہے لیکن یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ کسی بزرگ یا ولی کا کسی نبی سے کسی بھی درجہ میں بڑھ جانا ناممکن ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ کتابت کی غلطی سے عبارت اس طرح بن گئی ہو ورنہ اصل عبارت یوں ہو کہ "زادابو حفص علی ذرية آدم" (کہ ابو حفص اولا دآدم سے بڑھ گئے ہیں) واللہ اعلم۔ مترجم

مراد پوری ہو جائے گی۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور جب چالیس روز ہو گئے تو اس یہودی نے جادو کا عمل کیا لیکن آپ کی مراد پوری نہ ہوئی۔ یہودی نے کہا کہ اے ابوحفص اس عرصہ میں تو نے ضرور کوئی نیک کام کیا ہے خوب سوچ لو! ابوحفص نے کہا اس عرصے میں کسی اچھے عمل کو میں نہیں جانتا جو میرے ظاہر و باطن سے سرزد ہوا ہو سوائے اس کے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا کہ راہ میں ایک پتھر پڑا تھا جسے میں نے اس ارادہ سے راستہ سے ہٹا دیا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے۔ تو یہودی نے کہا کہ پھر تو اس خدا کو آزردہ نہ کر کہ جس کا فرمان تو نے چالیس دن تک ضائع کیا ہے لیکن اس نے تیری اتنی سی تکلیف کو ضائع نہیں کیا۔ آپ نے یہ سن کر اسی وقت توبہ کر لی اور وہ یہودی بھی مسلمان ہو گیا۔ آپ وہی لوہار کا کام کرتے رہے یہاں تک کہ باورہ جا کر حضرت ابوعبداللہ ماوردیؒ کی زیارت کی اور ان سے ارادتمندی کا عہد باندھ لیا اور کچھ دن کے بعد نیشاپور واپس تشریف لے آئے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز آپ اپنی دکان پر بیٹھے کام کر رہے تھے کہ بازار میں ایک نابینا قرآن کی تلاوت کر رہا تھا اس کی قرات آپ پر اس قدر غالب ہوئی کہ آپ پر وجد طاری ہو گیا اور آپ بے خود ہو گئے اور ہاتھ آگ میں ڈال کر بغیر آہن گیر کے بھٹی سے تپا ہوا لوہا باہر نکال لیا۔ جب اس حالت میں شاگرد نے آپ کو دیکھا تو وہ بے ہوش ہو گیا'' حضرت ابوحفص کو جب ہوش آیا تو آپ نے لوہا کا پیشہ چھوڑ دیا اور پھر کبھی بھی اس کی طرف دھیان نہ دیا...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''**ترکت العمل ثم رجعت الیه ثم ترکنی العمل فلم ارجع الیه**'' (پہلے میں نے کام کو چھوڑا پھر اس کی طرف رجوع کیا تو پھر عمل نے خود ہی مجھے چھوڑ دیا پس میں نے کبھی اس کی طرف رجوع نہ کیا) کیونکہ جس کام کو بندہ تکلف اور اپنے کسب کے ساتھ چھوڑے اس کا چھوڑنا اس کے کرنے سے بہتر نہیں ہوتا۔ اس قول کی صحبت کی دلیل کہ تمام اکتساب محل آفات ہوتے ہیں'' یہ ہے کہ قدر و قیمت تو صرف اس بات کی ہوتی ہے؟ تکلف کے بغیر غیب سے حاصل ہو اور جس محل میں بھی ہو بندے کا اختیار اس کے ساتھ

متصل نہ ہو اور حقیقت کا بھید اس سے زائل ہو جائے پس کسی کام کے ترک کرنے یا اختیار کرنے کی نسبت بندہ کی طرف درست نہیں کیونکہ عطا و زوال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اسی کی تقدیر سے ہے جب عطا اس کی طرف سے نہ ہوگی تو اس کا اختیار بھی اسی جانب سے حاصل ہوگا اور جب زوال آئے گا تو حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا ترک کرنا بھی حاصل ہو جائے گا جب معاملہ یوں ہے تو پھر قدر و قیمت بھی اسی چیز کی ہوگی جس کے ساتھ اخذ و ترک کا قیام ہے نہ اس چیز کی بندہ اپنے اجتہاد سے اس کو کرنے یا نہ کرنے والا ہو پس اگر کوئی مرید ہزار سال تک بارگاہ خداوندی میں مقبول بننے کیلئے کوشاں رہے تو بھی وہ ایسا نہ ہو سکے گا۔ جیسا کہ اگر حق تعالیٰ ایک لمحہ اس کے قبول کرنے لئے فرما دیں کیونکہ دائمی اقبال ازلی قبولیت سے وابستہ ہے اور سرور سرمدی ہمیشہ کی سعادت کے ساتھ پیوستہ ہے اور عنایت الٰہی کے علاوہ بندہ کو اپنی نجات کیلئے کوئی راستہ نہیں مل سکتا۔ پس صاحب عزت وہ بندہ ہے کہ مسبب الاسباب جس کو اسباب کا ضرور مند محتاج نہ رکھیں۔

حضرت حمدون بن احمد رحمتہ اللہ علیہ

اہل ملامت کے پیشوا اور ہر آزمائش میں راضی رہنے والے حضرت ابو صالح حمدون بن احمد بن عمارۃ القصارؒ بھی تبع تابعین میں سے ایک ہیں آپ متقدمین مشائخ میں سے تھے اور ان میں سے انتہائی پرہیز گار تھے۔ فقہ اور شریعت کے باقی علوم میں آپ اعلیٰ درجہ پر فائز تھے اور حضرت امام ثوریؒ کا مذہب رکھتے تھے۔ طریقت میں حضرت ابو تراب بخشیؒ کے مرید تھے اور علی نصر آبادیؒ جیسے بزرگ آپ کے ارادتمندوں میں شامل تھے۔ جملہ معاملات طریقت میں آپ کے باریک رموز اور تمام طرح کے مجاہدات میں آپ کا کلام دقیق موجود ہے روایت ہے کہ جب علم میں آپ کا درجہ و مقام بہت بڑھ گیا تو نیشاپور کے آئمہ اور بزرگ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ آپ کو بر سر منبر لوگوں کو وعظ

ونصیحت کرنی چاہیئے تاکہ لوگوں کو آپ کے کلام سے فائدہ ہو۔ آپ نے فرمایا ''ابھی میرے لئے وعظ کہنا جائز نہیں'' لوگوں نے پوچھا آخر کیوں؟ آپ نے فرمایا اس لئے کہ میرا دل ابھی دنیا اور مرتبہ و جاہ میں وابستہ ہے اس لئے میری کلام کا نہ فائدہ ہوگا اور نہ دلوں پر کوئی اثر ہوگا اور جو کلام دلوں پر اثر انداز نہ ہو وہ علم کی توہین اور شریعت پر استہزا کے مترادف ہے۔ وعظ کہنا تو اس شخص کیلئے ضروری ہے جس کی خاموشی سے دین میں خلل کا اندیشہ ہو اور جب وہ کلام کرے تو وہ اندیشہ اور نقصان رفع ہو جائے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ سلف صالحین کا کلام دلوں کو متاثر کرتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو فرمایا ''لانھم تکلمو العز الاسلام و نجات النفوس ورضا الرحمن ونحن نتکلم لعز النفس و طلب الدنیا وقبول الخلق'' (اس لئے کہ سلف صالحین اسلام کی عزت، لوگوں کی نجات اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے کلام کرتے تھے اور ہم اپنے نفس کی عزت دنیا کی طلب اور مخلوق میں مقبول ہونے کیلئے کلام کرتے ہیں) پس جو کوئی حق کی مراد کے موافق کلام کرے اور حق بیان کرے تو اس کے کلام میں رعب اور اثر ہوتا ہے کہ وہ شریروں پر اثر کرتا ہے اور جو کوئی اپنی مراد کے موافق کلام کرتا ہے اس کے کلام میں ذلت اور رسوائی ہوتی ہے اور مخلوق کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور اس کا کچھ نہ کہنا کچھ کہنے سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ اس کی اپنی عبارت سے مقصود بیگانہ اور فارغ ہوتا ہے۔

حضرت منصور بن عمار رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے شیخ باوقار و دلوں کے اسرار سے واقف حضرت ابوالسری منصور بن عمار بھی ایک ہیں جو درجہ کے اعتبار سے بزرگ ترین مشائخ اور مقام کے اعتبار سے صوفیا میں بلند مقام شمار ہوتے ہیں۔ آپ کا تعلق صوفیا عراق سے تھا تاہم اہل خراسان میں بھی مقبول تھے۔ وعظ و نصیحت میں آپ کا کلام بڑا اچھا اور بیان بہت لطیف ہوتا تھا آپ لوگوں

کو وعظ کہا کرتے تھے۔ آپ علم کے فنون روایات و درایات اور احکام و معاملات کے بہت بڑے عالم تھے۔ بعض صوفی آپ کے بارے میں حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہیں...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "**سبحان من جعل قلوب العارفین راعیة الذکر وَقلوب الزاھدین اوعیة التوکل وَقلوب المتوکلین اوعیة الرضاء و کلوب الفقرا اوعیة القناعة و کلوب اھل الدنیا اوعیة الطمع** "(پاک ہے وہ ذات جس نے عارفین کے دلوں کو اپنے ذکر کا محل، زاہدوں کے دلوں کو توکل کا محل متوکلین کے قلوب کو رضا کی جگہ فقراء کے قلوب کو قناعت کا مقام اور اہل دنیا کے دلوں کو طمع و لالچ کا ٹھکانا بنا دیا ہے) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کے جسم میں جو بھی عضو اور قوت حاسہ پیدا فرمائی ہے اس میں اس عضو اور قوت سے مناسب ایک خاص بات رکھ دی ہے چنانچہ ہاتھوں کو گرفت کا محل پاؤں کو چلنے کا آنکھوں کو دیکھنے کا کانوں کو سننے کا اور زبان کو بولنے کا محل پیدا کیا اور ان امور کے وجود پذیر ہونے کے مقاصد میں کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوتا، پھر دلوں کو پیدا فرمایا تو ان میں سے ہر دل میں مختلف مقصد و خاصہ رکھا اور ہر ایک میں ارادہ اور خواہش دوسرے سے مختلف رکھے۔ چنانچہ کسی دل کو تو معرفت الٰہی کا محل بنا دیا اور کسی کو گمراہی کا مقام اور کسی دل کو قناعت کا ٹھکانا بنا دیا تو کسی کو لالچ کا مرکز اور اسی طرح دوسرے دلوں میں بھی مختلف خواص پیدا کر دیئے اور دلوں کے علاوہ کسی دوسرے عضو میں حق تعالیٰ کی اتنی عجیب و غریب کاریگری ظاہر نہیں ہوئی...... اور نیز روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "**الناس رجلان عارف بنفه فشغله فی المجاھدات والریاضات وعارف بربه و نشغله بخدمته وعبادته و مرضاته** "(لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک اپنے نفس کا عارف! سو اس کا مشغلہ مجاہدے و ریاضت میں ہوتا ہے اور دوسرا اپنے رب کا عارف سو اس کی مشغولیت اللہ کی خدمت اس کی عبادت اور اس کی رضا جوئی ہوتی ہے) پس اپنے نفس کے عارف کی عبادت تو ریاضت ہوتی ہے لیکن عارفان حق کی عبادت روایت حق

ہوتی ہے عارف نفس تو کسی درجہ کے حصول کیلئے عبادت کرتا ہے لیکن عارف باللہ کسی لالچ کے بغیر عبادت کرتا ہے کیونکہ درجہ تو اسے پہلے سے حاصل ہوتا ہے۔ پس دونوں الگ الگ مقامات میں ہوتے ہیں کہ ایک مقام مجاہدہ پر قائم ہوتا ہے اور دوسرا مقام مشاہدہ پر...... نیز روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''الناس رجلان مفتقر الی اللہ فھو فی اعلی الدرجات علی لسان الشریفة والاخر لایری الافتقار لما علم من فراغ اللہ من الخلق والرزق والاجل والحیوۃ والسعادۃ والشقاوۃ فھو فی افتقار الیه واستغنائه به عن غیرہ '' (لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک گروہ وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہوتا ہے سو یہ شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے درجات کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اپنی احتیاج کو اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان میں نہیں لاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل سے اس کی پیدائش، رزق، موت، زندگی، سعادت اور بدبختی وغیرہ کو مقرر کر رکھا ہے لہذا وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں شیوہ تسلیم ورضا اختیار کرتے ہیں پس پہلا گروہ حق تعالیٰ کی طرف محتاج ہونے کی وجہ سے تقدیر الٰہی کی روایت سے حجاب ہوتا ہے اور دوسرا گروہ حق تعالیٰ کی طرف اپنی احتیاج کو پیش نہ کرنے کی وجہ سے حق تعالیٰ کی تجلیات کا مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ماسوی اللہ سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ پس ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی نعمت حاصل کرتا ہے اور دوسرا خود منعم حقیقی کو پاتا ہے جو نعمت حاصل کرتا ہے وہ نعمت پالینے پر غنی ہونے کے باوجود فقیر ہوتا ہے اور جو منعم حقیقی کو حاصل کرتا ہے وہ بظاہر فقیر ہونے کے باوجود غنی ہوتا ہے۔

حضرت احمد بن عاصم انطا کی رحمتہ اللہ علیہ

ممدوح اولیاء اور اہل رضا کے مقتداء حضرت ابو عبداللہ احمد بن عاصم انطا کیؒ بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ آپ قوم صوفیاء کے بزرگ اور سردار تھے آپ شرعی علوم کے اصول

وفروغ اور طریقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے بڑی طویل عمر پائی اور قدیم مشائخ کی صحبت اور تبع تابعین کی ملاقات کا اتفاق ہوا۔ آپ حضرت بشر حافی اور حضرت سری سقطیؒ کے ہمعصر تھے۔ حضرت حارث محاسبیؒ کے مرید تھے اور حضرت فضیلؒ کی زیارت کی تھی اور ان سے فیض صحبت بھی حاصل تھا سب لوگ آپ کی تعریف کرتے تھے اور صوفیائے کرام میں رائج علوم میں آپ کا کلام بڑا بلند اور اشارات بڑے لطیف اور نفع بخش ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''انفع الفقر ما کنت به متجملا و به راضیا'' (سب سے انفع مند فقر وہ ہے جس سے تو اپنے آپ کو آراستہ کرے اور اس پر راضی ہو) یعنی ساری مخلوق کا جمال تو اسباب کے ثابت کرنے سے ہوتا ہے لیکن فقر کا جمال اسباب کی نفی اور مسبب کے ثابت کرنے۔ اس کی طرف دھیان دینے اور اس کے احکام پر راضی ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ فقر اسباب کے کھو دینے کا نام ہے اور غنا اسباب کے وجود کا نام ہے۔ بغیر اسباب کے فقر حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور اسباب کے ہمراہ فقر اپنی ذات کے ساتھ ہوتا ہے پس اسباب مشاہدہ حق سے حجاب کا محل ہیں اور اسباب کو چھوڑنا حق تعالیٰ کے مشاہدہ اور کشف کا محل ہے اور دونوں جہان کی خوبصورتی حق تعالیٰ کے مشاہدہ اور اس کی خوشنودی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور تمام دنیا حق تعالیٰ سے حجاب کی صورت میں ہیں اور فقر کی تفصیل میں وضاحت کے ساتھ یہ بیان آئے گا۔

حضرت عبداللہ بن خفیف رحمتہ اللہ علیہ

اور تبع تابعین میں سے ایک پرہیز گاری وتقویٰ کی راہ کے سالک اور زہد میں اس امت کے یحییٰ حضرت ابو محمد عبداللہ خفیفؒ بھی ہیں۔ آپ جملہ احوال میں اپنی قوم کے زاہدوں اور پرہیز گاروں میں شمار ہوتے تھے۔ احادیث کے بارے میں آپ کی روایات بہت بلند ہیں اور آپ فقہ میں حضرت امام ثوریؒ کا مذہب رکھتے تھے۔ اسی طرح معرفت و

حقیقت میں بھی آپ انہی کے مذہب پر قائم تھے اور آپ کے شاگردوں اور اصحاب کو دیکھا اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ طریقت کے مقالات و معاملات میں آپ کا کلام لطیف ہے آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "من ارادان یکون حیاتی حیواتہ فلاسکین الطمع فی قلبہ " (جو شخص اپنی زندگی میں واقعی زندہ رہنا چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ اپنے دل میں لالچ کو ٹھکانہ نہ دے) تاکہ وہ سختی اور وبال سے آزاد ہو جائے کیونکہ دل میں طمع رکھنے والے کے جذبات لالچ کی وجہ سے مردہ ہو جاتے ہیں۔ پس دل میں لالچ ہونے کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ جیسے دل پر مہر لگی ہوئی ہو اور جس دل پر مہر لگ چکی ہو لامحالہ وہ مردہ ہوتا ہے۔ وہ دل بڑا ہی خوش نصیب ہے کہ جو غیر اللہ سے مردہ اور حق تعالیٰ کے ساتھ زندہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر دل کیلئے ایک عزت اور ایک ذلت پیدا فرمائی ہے۔ اپنے ذکر کو دل کیلئے عزت اور لالچ کو اس کیلئے ذلت قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ "خلق اللہ القلوب مساکین الذکر فصارت مساکن الشھوات ولا یمحوا الشھوات من القلوب الاخرف مزعج اوشرق مقلق " (حق تعالیٰ نے دلوں کو اپنے ذکر کی قیام گاہ بنایا ہے لیکن وہ نفس کی مصیبت کی وجہ سے خواہشات کا مسکن بن گئے اور شہوات کو دلوں سے یا تو بے قرار کرنے والا خوف دور کر سکتا ہے اور یا بے آرام کر دینے والا شوق۔ پس شوق اور خوف ایمان کے دوستوں میں سے ہیں جب کوئی دل ایمان کا محل ہوتا ہے تو اس کے ساتھ قناعت اور ذکر الٰہی ہوتا ہے نہ کہ طمع اور غفلت پس مومن کا دل لالچی اور خواہشات کا تابع نہیں ہوتا۔ کیونکہ خواہش نفس اور لالچ وحشت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور وحشت زدہ دل ایمان سے واقف نہیں ہوتا کیونکہ ایمان کو تو حق تعالیٰ سے انس اور غیر حق سے وحشت ہوتی ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا قول ہے کہ "الطماع حش منہ کل واحد" (لالچی آدمی سے ہر کوئی وحشت زدہ اور متنفر ہوتا ہے)

حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

انہی تبع تابعین میں سے ایک طریقت میں شیخ المشائخ اور شریعت میں امام الائمہ حضرت ابو القاسم جنید بن محمد بن جنید البغدادیؒ بھی ہیں۔ آپ اہل ظاہر اور ارباب قلوب کے یکساں مقبول تھے اور علم کے جملہ فنون میں کامل اور معاملات شریعت اور اصول وفروع میں مفتی اور امام کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ثوریؒ کے اصحاب میں سے تھے۔ آپ کا کلام اتنا عالی اور احوال اس قدر کامل تھے کہ تمام اہل طریقت آپ کی امامت پر متفق ہیں اور کسی بھی مدعی اور متصرف کو آپ پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ حضرت سری سقطیؒ کے خواہرزادہ اور مرید تھے۔ ایک مرتبہ حضرت سری سقطیؒ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ''کیا کسی مرید کا درجہ اپنے مرشد سے بڑھ سکتا ہے؟'' آپ نے فرمایا ہاں اور اس کی واضح سی دلیل ہے کہ جنیدؒ کا درجہ میرے درجہ سے بلند ہے'' لیکن آپ کا یہ قول تواضع کی وجہ سے تھا اور آپ نے جو کچھ کہا وہ بصیرت کی بنا پر کہا ورنہ کوئی شخص اپنے سے اوپر نہیں دیکھا کرتا۔ کہ دیدار کا تعلق نیچے سے ہوتا ہے اور آپ کا یہ قول اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ نے حضرت جنیدؒ کو اپنے سے اوپر دیکھا۔ تاہم اگرچہ آپ نے اپنے سے اوپر دیکھا لیکن درحقیقت وہ نیچے ہے...... اور یہ بات بڑی مشہور ہے کہ حضرت سری سقطیؒ کی زندگی میں مریدوں نے حضرت جنیدؒ سے درخواست کی کہ ''اے شیخ! آپ ہمیں کوئی نصیحت فرمایئے تاکہ ہمارے دلوں کو راحت نصیب ہو'' آپ نے ان کی درخواست قبول نہ کی اور فرمایا کہ جب تک میرے شیخ بقید حیات ہیں میں کوئی نصیحت نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ رات کو سو رہے تھے کہ خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے جنید! لوگوں کو نصیحت کی باتیں کہا کرو کہ حق تعالیٰ نے تمہارے کلام کو ایک جہان کی نجات کا سبب بنا دیا ہے'' آپ جب بیدار ہوئے تو دل میں خیال پیدا ہوا کہ شاید میرا درجہ حضرت سری سقطیؒ سے بڑھ گیا ہے۔ اسی

لئے تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے وعظ کہنے کا حکم دیا ہے'' صبح ہوئی تو حضرت سری سقطیؒ نے اپنے ایک مرید کو بھیجا کہ جب جنید نماز سے فارغ ہو تو اسے کہنا کہ تم نے مریدوں کی درخواست پر تو انہیں وعظ نہیں کیا۔ پھر مشائخ بغداد کی سفارش کو بھی رد کر دیا اور میرے پیغام بھیجنے پر بھی تم نے وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری نہیں کیا۔ لیکن اب جب کہ پیغمبر ﷺ نے تجھے حکم فرمایا ہے تو آپ کے فرمان پر ضرور عمل کرنا'' حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ یہ سن کر وہ خیال میرے دل سے نکل گیا اور میں نے جان لیا کہ حضرت سری سقطیؒ میرے ظاہری اور باطنی تمام احوال سے واقف ہیں اور آپ کا درجہ بہر حال میرے درجہ سے بہت بلند ہے کہ وہ تو میرے اسرار سے مطلع ہیں اور میں ان کے حالات سے بے خبر ہوں چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے خیال پر معافی مانگی اور پھر آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ علم کس طرح ہوا کہ میں نے خواب میں پیغمبر ﷺ کی زیارت کی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ''میں نے خواب میں اللہ عزوجل کو دیکھا کہ وہ مجھے فرما رہے ہیں کہ میں نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو بھیجا ہے تا کہ وہ جنید سے فرمائیں کہ وہ مخلوق کو وعظ کہا کرے تا کہ اس سے اہل بغداد کی مراد حاصل ہو...... اس حکایت میں اس بات پر بڑی واضح دلیل موجود ہے کہ مرشد جس حالت میں بھی ہوں مریدوں کے باطنی احوال سے آگاہ ہوتے ہیں...... آپ کا کلام بڑا بلند اور رموز بڑے لطیف ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا'' **کلام الانبیاء نبا عَنِ الحضور و کلام الصدیقین اشارات عن المشاهده** ''(انبیاء علیہم السلام کا کلام رب العزت کے حضور کی خبر دیتا ہے اور صدیقین کا کلام مقام مشاہدہ کی طرف اشارہ اور رہنمائی کرتا ہے) خبر کی صحت دیکھنے سے ہوتی ہے اور اشارہ کی صحت تفکر اور سوچ سے۔ اور خبر عین ذات کے علاوہ نہیں دی جا سکتی اور اشارہ غیر کے سوا نہیں ہو سکتا۔ پس صدیقین کے کمال کی انتہا سے انبیاء کے احوال کی ابتدا ہوتی ہے اور اس بیان سے نبی اور ولی کے درمیان فرق اور انبیاء کی اولیاء پر فضیلت واضح ہے بخلاف ملحدین کے دو گروہوں کے کہ جو انبیاء کرام کو فضیلت میں

موخر اور اولیاء کرام کو مقدم سمجھتے ہیں نیز آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''ایک دفعہ میں نے خواہش کی کہ میں ابلیس کو دیکھوں چنانچہ میں ایک دن مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا کہ ایک بوڑھا شخص دور سے میری طرف آتا دکھائی دیا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وحشت نے میرے دل میں اثر پیدا کیا جب وہ میرے نزدیک آیا تو میں نے پوچھا کہ اے بوڑھے! تو کون ہے کہ وحشت کی وجہ سے میری آنکھ تجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتی اور ہیبت سے میرے دل میں تیرا خیال لانے کی ہمت نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ ''میں وہی ہوں جسے دیکھنے کی آپ کو آرزو تھی'' میں نے کہا ''اے ملعون! آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روک لیا تھا؟ اس نے کہا ''اے جنید! تمہارے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرتا؟ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس کا یہ جواب سن کر میں بڑا حیران ہوا اور مجھے کوئی جواب سمجھ نہ آیا کہ یکا یک میرے دل سے آواز آئی کہ ''قل له کذبت لو کنت عبداً ماموراً لماخرجت من امرا الی نهیه فسمع التدا من قلبی فصاح وقال احرقتنی بالله وغابَ ''(اے جنید! اس سے کہو کہ تو جھوٹ کہتا ہے کہ اگر تو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ ہوتا تو اس کے حکم سے نکل کر اس کی منع کردہ چیز کی طرف نہ جاتا'' پس اس نے میرے دل سے یہ آواز سنی تو چلایا اور کہنے لگا خدا کی قسم تو نے مجھے جلا دیا ہے اور پھر وہ غائب ہو گیا) یہ حکایت آپ کی ابلیس سے حفاظت اور عصمت کی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو تمام احوال میں شیطان کی مکاریوں سے محفوظ رکھتے ہیں...... آپ کی طرف سے ایک دفعہ ایک مرید کے دل میں ناراضگی پیدا ہو گئی اور اس نے سمجھا کہ شاید میں کسی درجہ پر پہنچ گیا ہوں اس لئے آپ سے روگردانی کر لی۔ پھر ایک روز آپ کی آزمائش کرنے کیلئے آپ کے پاس آیا لیکن آپ اس کے حالات سے مطلع ہونے کی وجہ سے اس کے آنے کا مقصد سمجھ گئے'' چنانچہ اس نے کوئی سوال کیا تو حضرت جنیدؒ نے پوچھا کہ اس سوال کا جواب تم الفاظ میں چاہتے ہو یا معانی میں؟ اس نے

کہا ''دونوں صورتوں میں جواب چاہتا ہوں'' آپ نے فرمایا'' اگر عبارت میں جواب چاہتے ہو تو یہ ہے کہ اگر تو نے اپنے آپ کو آزمایا ہوتا تو میرا تجربہ کرنے کی ضرورت تمہیں محسوس نہ ہوتی اور یہاں مجھے آزمانے کیلئے نہ آتے'' اور اگر معنوی جواب چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ میں نے تجھے ولایت سے معزول کر دیا ہے'' چنانچہ اسی وقت اس مرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا اور چلانے لگا کہ یقین کی راحت میرے دل سے اٹھ گئی ہے'' پھر توبہ و استغفار میں مشغول ہو گیا اور اس فضول خیال کو چھوڑ دیا'' تب حضرت جنیدؒ نے اس سے فرمایا'' کیا تو جانتا نہ تھا کہ اولیاءاللہ مخفی رازوں سے واقف ہو جاتے ہیں اور تم ان کا زخم برداشت نہیں کر سکتے پھر آپ نے اس پر پھونک ماری تو وہ اپنی پہلی حالت کے مطابق اچھا ہو گیا اور مشائخ کے معاملات میں تصرف کرنے سے توبہ کر لی۔

حضرت احمد بن محمد نوری رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے طریقت میں شیخ المشائخ شریعت میں امام الائمہ اہل تصوف کے بادشاہ اور تکلف کی آفت سے بری حضرت ابوالحسن احمد بن محمد الخراسانی نوریؒ بھی ہیں۔ آپ اچھے معاملات واضح کلمات اور روشن مجاہدات کے مالک تھے اور تصوف میں آپ کا مذہب مخصوص تھا۔ صوفیا میں سے ایک گروہ ہے جس کو نوری کہا جاتا ہے وہ آپ کی اقتدا کرتا اور آپ سے عقیدت رکھتا تھا اور جان لو کہ تمام صوفیا کے بارہ گروہ ہیں۔ ان میں سے دو گروہ مردود اور دس گروہ مقبول ہیں جو گروہ مقبول ہیں وہ یہ ہیں (۱) محاسبی (۲) قصاری (۳) طیفوری (۴) جنیدی (۵) نوری (٦) سہیلی (۷) حکیمی (۸) خرازی (۹) خفیفی (۱۰) مستاری۔

اور یہ سب کے سب اہل تحقیق اور اہل سنت و جماعت کے گروہ ہیں باقی جو دو گروہ مردود ہیں ان میں سے ایک تو حلولی ہیں جو حلول اور امتزاج کی طرف منسوب ہے سالمی اور مشتبہ انہی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں...... اور دوسرے حلاجی ہیں جنہوں نے شریعت

کوترک کر کے الحاد اختیار کرلیا اور مردود ہو گئے اباحتی اور فاری فرقے انہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اس کتاب میں اپنے مقام پر ایک مستقل باب ان گروہوں کے فرق میں تحریر کروں گا جس میں ان دو فرقوں کے درمیان اختلاف اور ان دو گروہوں کی مخالفت کو بیان کروں گا۔ تاکہ انشاء اللہ مکمل فائدہ حاصل ہو۔ تاہم حضرت احمد نوریؒ کا طرزِ عمل دین کے معاملات میں سستی و چشم پوشی ترک کرنے اور ہمیشہ مجاہدہ کرنے میں قابل تعریف طریقہ ہے اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''میں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں آیا تو آپ کو مسند ارشاد پر تشریف فرما پایا میں نے کہا ''یا ابا القاسم غشتھم فصدروک ونصحتھم فرمونی بالحجارۃ ''(اے ابوالقاسم! آپ نے ان سے حق چھپایا تو انہوں نے آپ کو مسند وعظ پر بٹھا دیا اور میں نے ان کو نصیحت کی تو انہوں نے مجھ پر پتھر برسائے) اس لئے کہ دین میں مداہنت کو نفسانی خواہشات سے موافقت ہے اور نصیحت کو اس سے مخالفت اور انسان اس چیز کا دشمن ہوتا ہے جو اس کی خواہشات کے برعکس ہو اور جو چیز اس کی خواہش نفس کے موافق ہو اس کا دوست ہوتا ہے..... اور حضرت ابوالحسن نوریؒ، حضرت جنیدؒ کے رفیق اور حضرت سری سقطیؒ کے مرید تھے۔ آپ کو بہت سے مشائخ کی زیارت اور ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تھا اور حضرت احمد بن ابی الحواریؒ کو بھی پایا تھا..... تصوف و طریقت میں آپ کے اشارات بڑے لطیف اور اقوال بڑے خوبصورت ہیں اور علم کے تمام شعبوں میں آپ کے نکات بہت بلند ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''الجمع بالحق تفرقۃ عن غیرہ والتفرقۃ من غیرہ جمع بہ ''(حق تعالیٰ سے وابستہ ہونا اس کے غیر سے علیحدگی ہے اور غیر اللہ سے علیحدہ ہونا حق تعالیٰ سے وابستگی ہے) یعنی جس کسی کا ارادہ حق تعالیٰ کے ساتھ مجتمع اور وابستہ ہے وہ اس کے غیر سے جدا ہے اور جو کوئی اس کے غیر سے منقطع ہے وہ حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق اور مجتمع ہے۔ پس ہمت و ارادہ کا حق تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کرنا مخلوقات کے خیال سے جدا ہونا ہے۔ چنانچہ جب موجودات سے روگردانی صحیح ہو

گئی تو حق تعالٰی کی طرف توجہ درست ہوگئی اور مخلوق سے اعراض درست ہوگیا کیونکہ ''الضدان لاتعیمعان '' (دوضدیں جمع نہیں ہوسکتیں) میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت نوریؒ تین دن رات تک مکان میں ایک ہی جگہ کھڑے ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔لوگوں نے حضرت جنیدؒ کے سامنے یہ حالت بیان کی تو آپ اٹھے اوران کے پاس تشریف لائے اور کہا اے ابوالحسن !اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کے سامنے شور وغوغا کچھ مفید ہے تو مجھے بھی بتاؤ تا کہ میں بھی اسی طرح بلند آواز سے ذکر کروں اور اگر جانتے ہو کہ اس کے یہاں شور وغوغا قطعاً سودمند نہیں تو پھر دل کو تسلیم و رضا میں لگا دو تا کہ تمہارے دل کو راحت نصیب ہو۔حضرت نوریؒ نے شور کرنا چھوڑ دیا اور کہا کہ اے ابوالقاسم آپ ہمارے بہتر معلم ہیں......اورآپ سے ہی روایت میں آتا ہے کہ فرمایا ''اَعَزَّ الاشیاء فی زمانناشبان عالم یعمل بعلمه وعارف نیطق عَنِ الحقیقةِ'' (ہمارے زمانے میں دو چیزیں سب سے عزت والی ہیں۔ایک وہ عالم جو اپنے علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے اور دوسرا وہ عارف جو اپنی حقیقت حال کے مطابق گفتگو کرتا ہے) یعنی ہمارے زمانے میں علم اور معرفت دونوں ہی عزیز ہیں۔ اس لئے کہ علم، عمل کے بغیر علم ہی نہیں ہوتا اور معرفت، حقیقت کے بغیر معرفت ہی نہیں ہوتی......اس پیر حضرت نوریؒ نے تو یہ اپنے دور کا پتہ بتایا ہے۔لیکن ہر دور میں ہی یہ دو چیزیں عزیز رہی ہیں اور آج بھی عزیز ہیں اور جو کوئی علم اور معرفت کی تلاش میں مشغول ہو اس کی حالت پراگندہ ہو جاتی ہے لیکن وہ مقصد حاصل نہیں کرسکتا لہذا اسے اپنے آپ میں مشغول ہو جانا چاہئے تا کہ وہ تمام جہان کو عالم اور عارف دیکھے اور اپنی طرف سے حق تعالٰی کی طرف رجوع کرے تا کہ تمام اہل عالم کو عارف دیکھے۔ اس لئے کہ عالم و عارف عزیز ہوتے ہیں اور عزیز مشکل سے ملا کرتے ہیں اور جس چیز کا حصول دشوار ہو اس کی تلاش کرنا وقت کا ضیاع ہے۔اس لئے علم معرفت اور عمل و حقیقت اپنی ذات میں ہی تلاش کرنے چاہئیں......آپ سے ہی آتا ہے کہ فرمایا ''مَن علم الاشیاء

بـاللهِ فرجوعه فِي كل شئٍ الى الله ''(جو شخص تمام اشیاء کو اللہ تعالیٰ کی وجہ سے جانتا اور پہچانتا ہے وہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرتا ہے) اس لئے کہ ملکیت اور حکومت کا قیام مالک کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔اس لئے راحت خالق کو دیکھنے سے ہوتی ہے نہ کہ مخلوق کی رویت سے۔ کیونکہ اگر چیزوں کو افعال کے اسباب جانے گا تو ہمیشہ رنج زدہ رہے گا اور ہر چیز کی طرف رجوع کرنا اس کیلئے شرک ہوگا۔ جب اشیاء کو افعال کا سبب جانے گا تو جان لے گا کہ سبب خود بخود تو قائم نہیں ہوتا بلکہ مسبب کے ساتھ قائم ہوتا ہے لہذا جب وہ مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرے گا تو تعلقات دنیا سے رجوع پا جائے گا۔

حضرت سعید بن اسماعیل الحیری رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تبع تابعین میں سے سلف صالحین کے امام اور اپنے اسلاف کے سچے جانشین حضرت ابوعثمان سعید بن اسماعیل الحیریؒ بھی ایک ہیں۔ آپ قدیم اور بزرگ صوفیا میں سے تھے۔ اپنے دور کے مرد یکتا تھے اور تمام صوفیا کے دلوں میں آپ کی بڑی قدر تھی۔ اولاً آپ حضرت یحییٰ بن معاذؒ کی صحبت میں رہے اور اس کے بعد حضرت شاہ شجاع کرمانیؒ کی صحبت میں رہے اور انہی کے ہمراہ نیشاپور میں حضرت ابوحفصؒ کی زیارت کیلئے آئے اور باقی تمام زندگی انہی کی صحبت میں گزار دی۔ بڑے ثقہ لوگ آپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''بچپن کی عمر میں میرا دل ہمیشہ ایک حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اور اہل ظاہر سے نفرت کرتا تھا اور میں جانتا تھا کہ لامحالہ لوگ جس ظاہر پر عمل پیرا ہیں اس کے علاوہ شریعت کا ایک باطن بھی ہے۔حتی کہ میں نے اپنا مقصود پالیا ایک روز میں حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ کی مجلس میں پہنچ گیا اور وہ راز میں نے پالیا اور اپنا مقصد حاصل کر لیا تو میں نے انہی کی صحبت اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ شجاع کرمانیؒ کے ہاں سے ایک جماعت یہاں آئی اور ان کی صفات بیان کیں تو میں نے اپنے دل کو ان کی زیارت کی

طرف مائل پایا اور میں نے رے سے کرمان جانے کا ارادہ کرلیا اور حضرت شاہ شجاعؒ سے ان کی صحبت کا طریق حاصل کرنے کی درخواست کی مگر انہوں نے اجازت مرحمت نہ فرمائی کہ تمہاری طبیعت رجا پر ورده ہے اور تم نے حضرت یحییٰؒ کی صحبت حاصل کی ہے اور ان کا مقام رجا ہے اور جس کسی نے رجاء کا شرب پایا ہوا سے طریقت اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ رجاء کی تقلید کرنے والے میں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے آپ کہتے ہیں کہ میں نے بڑی تفرع اور زاری کی اور بیس روز تک ان کی درگاہ پر پڑا رہا تب کہیں انہوں نے مجھے اجازت دی اور اپنی صحبت کیلئے قبول فرمایا اور میں ایک عرصہ تک ان کی صحبت میں رہا وہ بڑے ہی غیور بزرگ تھے۔ حتیٰ کہ آپ نے نیشاپور جا کر حضرت ابو حفصؒ کی زیارت کرنے کا ارادہ کیا تو میں بھی آپ کے ساتھ ہولیا جس روز ہم حضرت ابو حفصؒ کے یہاں پہنچے حضرت شاہ شجاعؒ نے قبا پہن رکھی تھی۔ جب حضرت ابو حفصؒ نے آپ کو دیکھا تو احتراماً کھڑے ہو گئے اور استقبال کیلئے آگے بڑھ کر کہا ''وجدت في القباء ما وجدت في العباء '' (میں جو چیز گدڑی میں تلاش کر رہا تھا وہ میں نے قبا میں پالی ہے) حضرت شاہؒ ایک عرصہ تک وہاں رہے اور اس دوران حضرت ابو حفصؒ نے میری ساری توجہ کو اپنی گرفت میں لے لیا تاہم حضرت شاہؒ کا رعب مجھے ان کی صحبت میں ہمیشہ رہنے سے باز رکھتا۔ لیکن حضرت ابو حفصؒ میر دل کی اس ارادت کو دیکھ رہے تھے اور میں اللہ تعالیٰ سے بڑی عاجزی کے ساتھ یہ مانگتا رہتا تھا کہ کسی طرح حضرت ابو حفصؒ کی صحبت مجھے میسر آ جائے اور حضرت شاہؒ بھی آزردہ نہ ہوں یہاں تک کہ جس روز حضرت شاہؒ نے واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے بھی ان کی موافقت میں تیاری کی اور سفر کا لباس پہن لیا اور اپنا دل حضرت ابو حفصؒ کے پاس چھوڑ دیا۔ حضرت ابو حفصؒ نے حضرت شاہؒ سے کہا کہ صحبت کی انبساط کا خیال رکھتے ہوئے اس لڑکے کو اسی جگہ چھوڑ جایئے کہ مجھے اس سے بڑی خوشی نصیب ہوتی ہے، حضرت شاہؒ نے اپنا چہرہ میری طرف کیا اور فرمایا ''اجب الشیخ! (شیخ کی بات مان لو) چنانچہ حضرت تو تشریف لے گئے اور

میں یہیں رہ گیا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوحفصؒ کی صحبت میں بڑے ہی عجائب دغرائب دیکھے اور آپ کا مقام شفقت کا مقام تھا۔ اس طرح اللہ عزوجل نے تین رہنماؤں کے ذریعہ مجھے تین مقامات سے گزار دیا۔ یہ تینوں مقام جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے خود آپ کو حاصل تھے۔ مقام رجاء حضرت یحییٰؒ بن معاذ کی صحبت سے، مقام غیرت حضرت شاہ شجاعؒ کی صحبت سے اور مقام شفقت حضرت ابوحفصؒ کی صحبت سے حاصل ہوا اور یہ بات درست ہے کہ کوئی مرید پانچ چھ یا اس سے بھی زیادہ رہنماؤں کی صحبت سے منزل تک پہنچ جائے اور پیر اور اس کی صحبت نے اس کو کشف میں ایک مقام حاصل ہو۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ نہ تو پیروں کو اپنے مقام سے آلودہ کرے اور نہ ہی ان کی نہایت کو اپنے مقام میں محدود سمجھے اور کہے کہ مجھے ان کی صحبت سے یہ حصہ ملا ہے اور کا درجہ اس سے بلند ہے ان کے پاس میرے لئے اس سے زیادہ حصہ موجود نہ تھا۔ یہ بات ادب سے زیادہ نزدیک ہے کیونکہ راہ حق کے کاملین کو مقام و زوال سے سروکار نہیں ہوتا...... نیشا پور اور خراسان میں تصوف کے اظہار کا آپ ہی ذریعہ تھے۔ آپ نے حضرت جنیدؒ، حضرت رویمؒ، حضرت یوسف بن الحسینؒ اور حضرت محمد بن فضل بلخیؒ کی صحبت سے بھی استفادہ کیا تھا اور مشائخ میں سے کسی شیخ نے اپنے شیوخ سے وہ فائدہ حاصل نہیں کیا جو آپ نے اپنے پیروں سے حاصل کیا تھا۔ نیشا پور کے رہنے والوں نے آپ کیلئے ایک منبر رکھ دیا تھا تا کہ آپ تصوف کی زبان میں ان کے سامنے وعظ کہا کریں گے۔ طریقت کے علم کے تمام فنون میں آپ کی کتابیں بلند پایہ اور روایات بڑی پختہ ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "حق لِمن اعزہ اللہ بالعرفۃ ان لایذلہ بالمعصیۃ" (جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت سے عزت بخشی ہو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو معصیت کے ساتھ ذلیل نہ کرے) اور اس چیز کا تعلق بندہ کے اپنے کسب کے ساتھ ہے اور اس کا مجاہدہ ہمیشہ امور حق کی رعایت کرتا ہے اور اگر تم اس کا راز جاننا چاہو تو وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی معرفت سے عزیز بنا دیں تو اسے چاہئے کہ وہ معصیت سے اپنے آپ کو

ذلیل نہ کرے۔ کیونکہ معرفت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور معصیت انسان کا اپنا فعل ہے اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کی عطا سے صاحب عزت ہو اس کیلئے نامناسب ہے کہ وہ اپنے فعل سے ذلیل ہو جائے۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت سے عزت بخشی تو پھر ان کی لغزش کی وجہ سے انہیں عزت سے گرایا نہیں۔

حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ رحمتہ اللہ علیہ

اوج معرفت کے سہیل اور محبت الٰہی کے قطب حضرت ابوعبداللہ احمد بن یحییٰ بن جلائیؒ بھی تبع تابعین میں سے اپنی قوم کے بزرگوں اور اپنے وقت کے سرداروں میں سے ہیں۔ آپ کے طریقے بہت اچھے اور سیرت بڑی قابل تعریف تھی۔ آپ کو حضرت جنیدؒ حضرت ابوالحسن نوریؒ اور بڑے بزرگوں کی ایک جماعت کا رفیق ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حقائق طریقت میں آپ کا کلام بڑا بلند اور اشارات انتہائی لطیف ہیں۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "**ھمة العارف الی مولا ولم یعطف علی شیئ سواہ**" (عارف کی توجہ اپنے مولا کی طرف ہوتی ہے اور وہ ان کے سوا کسی چیز پر ہرگز دھیان نہیں دیتا) اس لئے کہ عارف کو معرفت کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ جب اس کے دل کا سرمایہ ہی معرفت ہوتا ہے تو پھر اس کے ارادوں کا مرکز بھی دیدار حق ہوتا ہے کیونکہ ارادوں کا پراگندہ ہونا غم کا باعث بنتا ہے اور غم اس کو بارگاہ حق سے روک دیتے ہیں۔ اور آپ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ فرمایا "میں نے ایک روز ایک بڑے ہی خوبصورت کافر نوجوان کو دیکھا اور اس کے حسن و جمال میں متحیر ہو کر رہ گیا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا کہ حضرت جنیدؒ کا میرے پاس سے گزر ہوا تو میں نے ان سے کہا "اے استاد! اللہ تعالیٰ اس جیسے چہرے کو دوزخ کی آگ میں جلائے گا؟ حضرت جنیدؒ نے کہا "بیٹے یہ نفس کا بازار ہے جو تجھے اپنی طرف بلا رہا ہے یہ عبرت کا نظارہ نہیں کیونکہ اگر تو عبرت کی نگاہ سے دیکھے تو

جہان کے ہر ذرے میں اسی طرح کا تعجب انگیز حسن موجود ہے لیکن صنعت الٰہی کی اس بے حرمتی کی وجہ سے بہت جلد تو کسی گرفت میں مبتلا ہو جائے گا" آپ کہتے ہیں کہ جب جنیدؒ نے میری طرف سے منہ پھیرا اسی وقت مجھے قرآن مجید بھول گیا اور پھر کئی سال تک میں اللہ تعالیٰ سے استعانت چاہتا اور توبہ کرتا رہا تب جا کر کہیں مجھے قرآن یاد ہوا اور اب میں اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ موجودات کی کسی بھی چیز کی طرف توجہ کر کے ان چیزوں کو دیکھنے میں اپنا وقت ضائع کروں۔

حضرت ابو محمد رویم بن احمد رحمۃ اللہ علیہ

اپنے دور کے یکتا اور زمانہ کے امام حضرت ابو محمد رویم بن احمدؒ بھی تبع تابعین میں سے بڑے بلند پایہ بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ حضرت جنیدؒ کے محرم راز اور قریبی ساتھی تھے۔ حضرت داؤدؒ کے فقہی مسلک پر چلنے والے فقہا کے سردار اور علم تفسیر و علم قرات میں پوری مہارت رکھتے تھے اور اس دور میں فنون علم میں آپ جیسا بلند حال اور اعلیٰ مقام کوئی نہ تھا آپ نے تجدید میں بڑے اچھے سفر اور تفرید میں بڑی سخت ریاضتیں برداشت کی تھیں۔ آپ نے آخری عمر میں اپنے آپ کو دنیا داروں میں چھپا لیا اور عہدہ قضا کا معاہدہ کر لیا تھا حالانکہ دنیا کے حجاب میں آ جانے سے آپ کا درجہ کہیں زیادہ بلند تھا۔ یہاں تک کہ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ ہم دنیا سے فارغ رہتے ہوئے بھی ان میں مشغول ہیں اور رویمؒ اس میں مشغول ہوتے ہوئے بھی اس سے فارغ ہے علم طریقت میں آپ کی بہت سی کتابیں ہیں خصوصاً وہ کتاب کہ جس کا نام "غلط الواجدین" رکھا ہے اور وہ مجھے بڑی پسند ہے۔ روایات میں ہے کہ ایک دن کسی نے آپ کے پاس آ کر پوچھا کہ "کیف حالک" (آپ کا حال کیا ہے؟) آپ نے فرمایا "کیفَ حال من دینه هوا وهمته دنیا لیس هوَ بصالح تقی ولا بعارف نقی" (اس شخص کا حال کیا ہوگا جس کا دین اس کی خواہش

ہواور جس کا مقصود اپنی دنیا ہو۔ وہ نہ تو متقی صالح ہے اور نہ ہی پاکیزہ عارف ہے) اور آپ نے اس طرح نفس کے عیوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس لئے کہ نفس کے نزدیک دین خواہش نفس ہے اور نفس کا اتباع کرنے والے اپنی خواہشات کو دین کا نام دے دیتے ہیں اور اس کی متابعت کو شریعت کا درجہ دے دیتے ہیں چنانچہ جو کوئی اس کی منشا کے مطابق چلے وہ اگرچہ بدعتی ہی ہو اس کے نزدیک دین دار ہوتا ہے اور جو کوئی اس کی منشا کے خلاف چلے اگرچہ متقی ہی ہو ان کے نزدیک بے دین قرار پاتا ہے اور یہ برائی ہمارے زمانہ میں بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئی اور شائع ہو رہی ہے۔ پس ہم ایسے آدمی کی صحبت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں...... باقی ہو سکتا ہے کہ حضرت نے اس طرح سائل کے حال کی حقیقت بیان کی ہو۔ نیز یہ بھی درست ہے کہ آپ نے سائل کو تو اس کی حالت پر چھوڑ دیا ہو اور نصیحت وتادیب کیلئے ان باتوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہو کیونکہ تبلیغ کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حضرت یوسف بن حسین رازی رحمۃ اللہ علیہ

اپنے زمانہ کے بے مثال اور بلند مرتبہ حضرت ابو یعقوب یوسف بن حسین رازیؒ بھی تبع تابعین میں سے اپنے وقت کے بڑے ائمہ اور قدیم مشائخ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے طویل عمر پائی اور حضرت ذوالنون مصریؒ کے مرید تھے۔ بہت سے مشائخ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا اور سب کی خدمت کا کام سرانجام دیا۔ آپ سے روایت ہے کہ "**اذل الناس الفقیر الطماع واعزھم اعجبُ المحبوبه الصدیق**" (لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل وہ فقیر ہے جو لالچی ہو اور تمام لوگوں میں صاحب عزت وہ ہے جس نے اپنی تمام صحبت کو محبوب کے لئے خالص کر دیا) اور طمع درویش کو دونوں جہان کی رسوائی میں ڈال دیتی ہے کیونکہ درویش تو ویسے بھی اہل دنیا کی نگاہوں میں حقیر ہوتے ہیں لہٰذا جب وہ طمع کریں تو اور بھی ذلیل ہو جاتے ہیں پس عزت والے غنی اس فقیر سے بہتر ہیں جو

ذلت سے دوچار ہوں اور طمع درویش کو جھوٹ کا ارتکاب کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ محب اپنے محبوب کی نگاہوں میں ساری مخلوق سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے کیونکہ محب خود بھی اپنے آپ کو اپنے محبوب کے مقابلہ میں سخت حقیر سمجھتا ہے اور اس کے سامنے تواضع کرتا ہے اور یہ سب طمع کے نتائج میں سے ہے لیکن جب یہ لالچ ختم ہو جائے تو پھر ذلت تمام تر عزت میں بدل جاتی ہے۔ جیسا کہ جب تک زلیخا کو حضرت یوسف علیہ السلام کی حرص تھی ہر قدم پر ذلت سے دوچار رہی لیکن جب اس نے لالچ چھوڑ دیا اور اپنے دل سے ان کی حرص نکال دی تو خدا تعالیٰ نے اسے حسن اور جوانی دوبارہ لوٹا دی اور اسی طرح ہوتا آیا ہے کہ محب کی رغبت پر محبوب اعراض اور روگردانی کرتا ہے اور بے اعتنائی سے پیش آتا ہے لیکن جب محب اپنی رغبت کو چھوڑ دیتا اور صرف دلی ربط و تعلق پر ہی اکتفا کر لیتا ہے تو محبوب بے چین ہو کر خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محب کو وصل کی طمع نہ ہو اس کیلئے عزت ہے لیکن جب اس کو وصال کا لالچ لاحق ہو جاتا ہے تو پھر ساری عزت، ذلت بن جاتی ہے اور محبت وہ خالص ہوتی ہے جس میں محبوب کے فراق و وصال کی گنجائش نہ ہو۔

حضرت سمنون بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ

اہل محبت کے آفتاب اور پیشوا حضرت ابوالحسن سمنون بن عبداللہ الخواص بھی بزرگان تبع تابعین میں سے ایک ہیں آپ اپنے دور میں بے نظیر اور محبت خداوندی میں بڑی بلند شان کے مالک تھے تمام مشائخ آپ کو بزرگ جانتے اور آپ کو سمنون المحب کے نام سے پکارتے تھے لیکن آپ خود اپنے آپ کو سمنون الکذاب کے نام سے متعارف کراتے تھے..... آپ نے غلام الخلیل نامی ایک شخص سے بڑے رنج برداشت کئے تھے اس نے ایک مرتبہ خلیفہ وقت کے سامنے ایسی باتوں کی آپ کے متعلق گواہی دی جن کا آپ سے صادر

ہونا محال تھا۔اس سے تمام مشائخ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ دراصل یہ غلام الخلیل ایک ریاکار آدمی تھا جس نے تصوف اور پارسائی کا دعویٰ کر رکھا تھا اور دین کو دنیوی دولت وعزت کے بدلہ میں بیچ کر خلیفہ وقت کے دربار میں اپنی پارسائی کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ جیسا کہ اس دور میں بھی ہو رہا ہے اور پھر بادشاہ اور اس کے درباریوں کے سامنے مشائخ اور درویشوں پر نکتہ چینیاں کرتا تھا تاکہ لوگ ان بزرگوں سے دور رہیں اور ان سے کوئی فیض حاصل نہ کر سکیں، اس طرح خود اس کا مرتبہ قائم رہے۔ حضرت سمنون اور اس دور کے مشائخ بڑے خوش نصیب تھے کہ ان کیلئے اس طرح کا دشمن صرف ایک تھا ورنہ اس دور میں تو ہر محقق صوفی کیلئے سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں غلام الخلیل موجود ہیں...... لیکن کوئی پراہ نہیں کیونکہ مردار، کرگسوں (گدھوں) کے ہی قابل ہوتا ہے...... اور جب بغداد میں حضرت سمنونؒ کا مرتبہ بڑھ گیا اور ہر کوئی آپ کا قرب تلاش کرنے لگا تو غلام الخلیل کو بڑی تکلیف ہوئی اور اس نے آپ پر بہتان لگانے اور رنجیدہ کرنے کے ہتھکنڈے شروع کر دیئے یہاں تک کہ ایک عورت کو آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت سمنونؒ کی نگاہ اس کے جمال پر پڑی اور اس عورت نے اپنے آپ کو حضرت سمنونؒ پر پیش کیا تو آپ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ حضرت جنیدؒ کے پاس گئی اور کہا کہ آپ سمنونؒ سے کہیں کہ وہ مجھے اپنی زوجیت میں قبول کر لیں۔ جنیدؒ اس پر سخت ناراض ہوئے اور بڑی سختی سے ڈانٹ دیا۔ چنانچہ وہ عورت غلام الخلیل کے پاس آئی اور جس طرح ایسی عورتیں تہمت لگایا کرتی ہیں اس طرح حضرت سمنونؒ پر ایک تہمت لگا دی۔ غلام الخلیل نے دشمنوں کی طرح اس عورت کی تہمت کو سنا اور حضرت سمنون کو برا بھلا کہنے لگا اور خلیفہ وقت کو آپ کے خلاف بھڑکا دیا حتیٰ کہ خلیفہ نے آپ کے قتل کر دینے کا فرمان جاری کر دیا۔ جب جلاد کو لایا گیا اور آپ کو قتل کرنے کی خلیفہ سے اجازت طلب کی گئی اور خلیفہ نے قتل کا حکم دینے کا ارادہ کیا تو اس کی زبان بند ہوگئی۔ جب اس رات وہ سویا تو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ تمہارے ملک کا زوال حضرت سمنونؒ کی زندگی کے

ساتھ وابستہ ہے...... دوسرے روز اس نے معافی مانگی اور عزت کے ساتھ آپ کو رخصت کیا...... محبت الٰہی کی حقیقت کے بیان میں آپ کا کلام بلند پایہ اور اشارات بڑے باریک ہیں۔ اور آپ وہی عظیم بزرگ ہیں کہ آپ جب حجاز سے واپس آ رہے تھے تو اہل فید نے آپ سے وعظ و نصیحت کرنے کی درخواست کی آپ برسر منبر لوگوں کو نصیحتیں کرنے لگے لیکن توجہ سے کوئی بھی سن نہ رہا تھا چنانچہ آپ نے مسجد کی قندیلوں کی طرف رخ کر کے فرمایا ''میں تم سے کہتا ہو'' یہ سنتے ہی تمام قندیلیں نیچے گر پڑیں اور ٹوٹ کر چور ہو گئیں...... اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا'' **لایعبرو عن شئ الابماھوارق منه ولا شئ ارق عن المحبة فلم یعبر عنھا** '' (کسی چیز کی تعبیر اس چیز سے کی جاتی ہے جو اس سے زیادہ نازک ہو اور جب کہ محبت سے زیادہ نازک چیز کوئی نہیں تو پھر محبت کی تعبیر کس چیز سے کی جائے گی) مطلب اس کا یہ ہے کہ محبت کو ان الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عبارت تعبیر کرنے والے کی صفت ہے جب کہ محبت، محبوب کی صفت ہے پس اس کی حقیقت کا ادراک عبارت کے ذریعہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوالفوارس شاہ شجاع کرمانی رحمۃ اللہ علیہ

اور ان تبع تابعین میں سے مشائخ کے بادشاہ اور زمانہ کے تغیرات سے بے نیاز حضرت ابوالفوارس شاہ شجاع الکرمانی '' بھی ایک ہیں۔ آپ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے اور اپنے زمانہ میں بے نظیر سے تھے۔ حضرت ابوتراب بخشیؒ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا اور بہت سے مشائخ کا زمانہ پایا تھا۔ حضرت ابوعثمان حیریؒ کے تذکرہ میں آپ کا کچھ ذکر گزر چکا ہے۔ تصوف میں آپ کے رسائل بڑے مشہور ہیں اور ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے جس کا نام مراۃ الحکما رکھا۔ آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے روایات میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا'' **لاھل الفضل فضل ٥ مالم یروہ فاذ اراوہ فلا فضل لھم ولاھل**

الولایة ولایة مَالَم یروھا فاذارائوھا فلا ولایة لھم ''(اہل فضیلت کیلئے اس وقت تک فضیلت ہے جب تک وہ اسے نہ دیکھیں اور جب اسے دیکھ لیں تو پھران کیلئے کوئی فضیلت نہیں اور اہل ولایت کیلئے ولایت ہے جب تک وہ اسے نہ دیکھیں اور جب اسے دیکھ لیں تو پھران کیلئے کوئی ولایت نہیں) معنی اس کا یہ ہے کہ جس جگہ فضیلت اور ولایت موجود ہو اس کی رویت ساقط ہوتی ہے اور جب اس کی روایت حاصل ہو جائے اس کی حقیقت ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ فضیلت ایک ایسی صنعت ہے جس میں فضیلت کا دیکھنا درست نہیں اور ولایت ایسی صفت ہے جس میں ولایت کو دیکھنا جائز نہیں......اور جب کوئی کہے کہ میں صاحب فضیلت ہوں یا ولی ہوں تو نہ وہ صاحب فضیلت رہتا ہے اور نہ ولی!......اور آپ کے آثار میں یہ لکھا ہے کہ آپ چالیس سال تک نہ سوئے اور جب سوئے تو حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا تو عرض کی ''بارخدایا! میں آپ کو حالت بیداری میں تلاش کرتا رہا ہوں لیکن آپ کو نیند کی حالت میں حاصل کیا ہے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا'' اے شاہ! ان شب بیداریوں کی وجہ سے ہی تو نے خواب میں مجھے پایا ہے اگر تم ان راتوں میں سو جاتے تو آج اس طرح مجھے حاصل نہ کر پاتے......(واللہ اعلم)

حضرت عمرو بن عثمان المکی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے دلوں کے سرور اور سینوں کے نور حضرت عمرو بن عثمان المکیؒ بھی ہیں۔ آپ اہل طریقت کے بزرگوں اور سرداروں میں سے ہیں۔ علم تصوف کے حقائق میں آپ کی تصانیف مشہور ہیں۔ آپ اپنی ارادت کی نسبت حضرت جنیدؒ کی طرف کرتے تھے، حضرت ابوسعید خرازؒ کی زیارت اور حضرت نباجیؒ کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ اصول طریقت میں آپ اپنے وقت کے امام تھے۔ آپ سے روایت ہے فرمایا'' لایقع علیٰ کیفیة الواجد عبارة لانه سر الله عندالمومنین ''(وجد کی کیفیت، عبارت میں

بیان نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ اہل ایمان کے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے)اور جو چیز عبارت میں بیان کی جاسکے وہ اللہ تعالیٰ کا راز نہیں ہوتی کیونکہ بندہ کا تصرف اور تکلیف اسرار ربانی سے منقطع ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عثمانؒ، اصفہان میں تشریف لائے تو ایک نو جوان آپ کی صحبت میں داخل ہوا جب کہ اس کا باپ آپ کی صحبت سے اس کو منع کرتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ نوجوان بیمار ہو گیا اور کچھ عرصہ بستر علالت پر پڑا رہا۔ شیخ ایک دن ایک جماعت کے ہمراہ اٹھے اور اس کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے۔ اس نوجوان نے حضرت کی طرف اشارہ کیا کہ آپ قوال سے چند اشعار پڑھنے کیلئے فرمائیں۔ حضرت نے قوال کو حکم دیا تو اس نے پڑھا۔ شعر

مالی مرخدت فلم یعدنی عائد

منکم ولمیرض عبد کم فاعود

(کیا وجہ ہے کہ میں بیمار ہوا تو تمہاری طرف سے کوئی بھی عیادت کیلئے نہ آیا۔ حالانکہ آپ کا کوئی غلام بھی بیمار ہو جائے تو میں اس کی بھی بیمار پرسی کرتا ہوں)

اس بیمار نوجوان نے یہ شعر سنا تو اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کی تکلیف اور بیماری کی شدت کم ہوگئی اور کہا ''زدنی'' (میرے لئے کچھ اور پڑھو!) قوال نے دوسرا شعر پڑھا۔

واشد من مرضی علی صدود کم

وصدودعند کم علی شدید

(اور تمہارا میرے پاس آنے سے رکا رہنا میرے نزدیک میری بیماری سے بھی سخت اور میرا آپ کے پاس آنے سے رکا رہنا بھی مجھ پر بڑا سخت ہے) یہ سن کر بیمار اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے بیماری جاتی رہی۔ چنانچہ اس کے باپ نے بخوشی اسے حضرت عمرو بن عثمانؒ کی صحبت میں دے دیا اور اپنے دل میں موجود اندیشے سے توبہ کی...... اور وہ دونوں آپ کی صحبت کی برکت سے طریقت کے بزرگوں میں سے ہوئے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت سہل تستری رحمتہ اللہ علیہ

دلوں کے مالک اور برائیوں کو مٹانے والے حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستریؒ بھی تبع تابعین میں اپنے وقت میں پیر تھے اور تمام لوگ آپ کے عقیدتمند اور مداح تھے آپ نے بہت سی ریاضتیں کیں اور آپ کے معاملات بہت اچھے تھے اخلاص اور افعال کے عیوب میں آپ کا کلام بڑا لطیف ہے۔علما ظاہر کا کہنا ہے کہ'' **هو جمع بين الشريعة والحقيقة** ''(آپ نے شریعت اور حقیقت کو باہم جمع کر دیا ہے) لیکن ان کا یہ قول خطا پر مبنی ہے کیونکہ کسی نے بھی شریعت وحقیقت میں فرق نہیں کیا کیونکہ شریعت بغیر حقیقت کے کچھ نہیں اور حقیقت بغیر شریعت کے کچھ نہیں! اور اس وجہ سے کہ اس پیر کی باتوں کا ادراک بڑا آسان ہے اور طبیعتیں اس کو بہتر طور پر پالیتی ہیں اس لئے لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں ورنہ حق تعالیٰ نے جب شریعت وحقیقت کو آپس میں جمع کر دیا ہے تو پھر یہ بات محال ہے کہ اولیاء اللہ اس میں فرق کریں۔لامحالہ اگر دونوں میں کوئی فرق موجود ہو تو ایک کو قبول اور دوسری کو رد کرنا پڑے گا جبکہ شریعت کا رد الحاد اور حقیقت کا رد کفر اور شرک ہے اور صوفیاء جو فرق کرتے ہیں وہ معنی کا فرق نہیں بلکہ شریعت کے ذریعہ حقیقت کو ثابت کرنا ہے۔چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ'' **لا اله الا الله حقيقة و محمد رسول الله شريعة** '' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں یہ تو حقیقت ہے اور محمد ﷺ یہ جملہ شریعت ہے) اگر کوئی شخص ایمان کی صحت کی حالت میں ان میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا چاہئے تو ہرگز نہیں کر سکتا اور اس کی یہ خواہش باطل ہوگی۔غرضیکہ شریعت اصل ہے۔حقیقت کیلئے اور حقیقت، شریعت کیلئے اصل الاصول ہے جیسا کہ توحید کی معرفت حقیقت ہے جو شریعت کیلئے اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہے اور تمام احکام ونواہی کا اتباع شریعت ہے۔پس اہل ظاہر کی طبیعت جس چیز میں نہ لگے وہ اس سے منکر ہو جاتے ہیں۔حالانکہ راہ حق کے اصولوں میں

سے کسی ایک اصل کا انکار بھی بڑا خطرناک امر ہے اور ایمان کی نعمت پر حق تعالیٰ کا شکر گزار ہی ہونا چاہئے...... اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا" **ما طلعتِ الشمس ولا غربت علی اهل وجه الارض الاوهم جهال بالله الامن یوثر الله علی نفسه و روحه ودنیا و آخرته** "(سورج نہ طلوع ہوا اور نہ ہی غروب ہوا زمین پر رہنے والوں پر مگر ایسی حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جاہل تھے۔ سوائے اس شخص کے جس نے اپنے جسم وروح اور اپنی دنیا و آخرت پر حق تعالیٰ کو ترجیح دی ہو) یعنی جو شخص دنیا میں اپنے حصے کی تلاش میں کوشاں رہتا ہے اس کا یہ فعل اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے متعلق بالکل جاہل ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کی معرفت تو دنیا کی تدبیروں کو چھوڑ دینے کا تقاضہ کرتی ہے اور دنیا کی تدابیر کو ترک کر دینا یہ ہے کہ اپنے تمام امور کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے اور دنیا کے معاملات میں تدبیر کو جاری رکھنا تقدیر الٰہی سے جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے...... (واللہ اعلم)

حضرت محمد بن فضل البلخی رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے برگزیدہ اہل حرمین شریفین اور جملہ مشائخ کی آنکھوں کی ٹھنڈک حضرت ابوعبداللہ محمد بن فضل البلخیؒ بھی ہیں، آپ بڑے مشائخ میں سے تھے۔ عراق وخراسان کے رہنے والوں کے پسندیدہ اور حضرت احمد بن خضرویہ کے مرید تھے۔ حضرت ابوعثمان حیریؒ آپ سے بڑی محبت کرتے تھے...... مذہب کے ساتھ آپ کے والہانہ عشق کی وجہ سے متعصب لوگوں نے آپ کو بلخ سے باہر نکال دیا تھا۔ چنانچہ آپ سمرقند تشریف لے گئے اور تمام زندگی وہیں گزار دی۔ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا" **اعرف الناس بالله اشدهم مجاهدة فی اوامره واتبعهم بسنه** "(لوگوں میں سب سے زیادہ عارف باللہ وہ ہے جو اس کے احکام بجالانے اور اس کے نبی ﷺ کی سنت کی پیروی میں سب سے زیادہ محنت کرنے والا ہو) ظاہر ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ کے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی

اس کے نبی ﷺ کے اتباع سے روگرداں ہوتا ہے...... روایت ہے کہ آپ نے فرمایا'' عجبت لمن یقطع البوادی والقفار ولمفاوز حتی یصل الی بیته وحرامه لان فیه آثار الانبیا کیف لایقطع نفسیه وھواہ حتی یصل الی قلبه لان فیه آثار مولاہ'' (میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو دشت وصحرا اور جنگل قطع کر کے اللہ تعالیٰ کے گھر اور اس کے حرم میں پہنچتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے انبیا کے آثار ہیں۔لیکن وہ اپنی خواہشات اور اپنے نفس کو قطع کر کے اپنے دل میں کیوں نہیں پہنچتا کہ جس میں اس کے مولیٰ تعالیٰ کے آثار موجود ہیں)...... یعنی دل جو معرفت الٰہی کا محل ہے کعبہ سے جو عبادت الٰہی کی جہت ہے سے زیادہ بزرگ ہے، کیونکہ کعبہ تو وہ ہے کہ عبادت میں اس کی طرف بندہ کی نظر پیوست رہتی ہے اور دل وہ مقام ہے جس پر ہر وقت حق اللہ تعالیٰ کی نظر پڑتی رہتی ہے۔ جہاں دوست کا دل ہے وہاں میں ہوں اور جس جگہ اس کا حکم ہے وہاں میری مراد ہے اور جس جگہ میرے انبیاء علیہم السلام کے آثار ہیں وہاں میرے دوستوں کا قبلہ ہے۔

حضرت محمد بن علی الترمذی رحمتہ اللہ علیہ

انہی میں سے شیخ بزرگ اور صفات بشریت سے فانی حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی الترمذیؒ بھی ایک ہیں۔آپ جملہ علوم میں کامل اور پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں اور مشائخ محققین میں سے طریقت کے معاملات میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں'' ختم الولایة کتاب الحج نوادر الاصول ''اور ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابوں میں آپ کی کرامات ظاہر ہیں۔ میرے نزدیک آپ بڑے باعظمت بزرگ ہیں اور میرا دل پوری طرح آپ کی محبت کا شکار ہو چکا ہے۔میرے شیخؒ نے فرمایا کہ محمد ترمذی ایک ایسا درِ یتیم ہے جس کی مثال نہیں ملتی...... علم ظاہر میں آپ کی بہت سی کتب ہیں اور احادیث میں آپ کی اسانید بڑی عالی اور معتبر ہیں، آپ نے قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھنی شروع کی تھی لیکن

عمر نے اس کو مکمل کرنے تک وفا نہ کی تاہم جس قدر لکھی گئی وہ بھی اہل علم کے درمیان استفادہ کے قابل سمجھی جاتی ہے، آپ نے فقہ کا علم حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے ایک خاص شاگرد سے حاصل کیا تھا..... آپ کو ترمذ میں محمد حکیم کے نام سے پکارا جاتا تھا اور ملک کے صوفیاء کرام آپ کی اقتداء کرتے تھے۔ آپ کے مناقب وفضائل بے شمار ہیں منجملہ ان میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا اور آپ کے مرید حضرت ابوبکر وراق آپ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر یک شنبہ کو حضرت خضر علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے باطنی ومخفی حقائق اور واقعات کے بارے میں گفتگو کیا کرتے تھے..... نیز آپ نے فرمایا کہ **''من جهل باوصاف العبوديه يكون اجهل باوصاف الربوبية ومن لم يعرف طريق معرفة النفس لم يعرف طريق معرفة الرب بان الظاهر متعلق بالباطن والتعلق بالظاهر بلا باطن محال ودعوى الباطن بلا ظاهر محال فمعرفة اوصاف الربوبية في تصحيح اركان العبودية ولا يصح ذالک الا بالادب''** (جو شخص اوصاف عبودیت یعنی علم شریعت سے جاہل ہو وہ اوصاف ربوبیت کے بارے میں زیادہ جاہل ہوتا ہے اور جو شخص معرفت نفس کا طریق نہیں جانتا وہ حق تعالیٰ کی معرفت کے طریق سے بھی ناواقف ہے کیونکہ ظاہر کا باطن کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور باطن کے بغیر ظاہر کے ساتھ تعلق محال ہے اور ظاہر کے بغیر باطن کا دعویٰ محال ہے، پس اوصاف ربوبیت کی معرفت عبودیت کے ارکان واحکام کو صحیح طور پر بجالانے میں ہے اور یہ چیز ادب کے بغیر صحیح نہیں ہو سکتی..... اور یہ کلمہ ایک بنیادی اور بڑا ہی مفید طلب ہے جس کا تفصیلی بیان انشاءاللہ اپنے مقام پر ہوگا۔

حضرت محمد بن عمر الوراق رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ابوبکر محمد بن عمر الوراق ؒ بھی انہی تبع تابعین میں سے ایک تھے جو امت کے زاہدوں کے شرف اور اہل فقر وصفا کے پاکباز کی حیثیت کے حامل تھے، کبار مشائخ اور بلند پایہ زاہدوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے آپ کو حضرت احمد بن حضرویہ کی زیارت اور حضرت محمد بن علی ترمذیؒ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ آداب اور معاملات میں کے بیان میں آپ کی تصنیفات بہت سی ہیں اور مشائخ آپ کو مودب الاولیاء کہا کرتے تھے..... آپ حکایت کرتے ہیں کہ حضرت محمد بن علی ترمذیؒ نے ایک مرتبہ مجھے ایک کتاب کے چند اجزاء دیئے اور فرمایا کہ انہیں دریائے جیحوں میں ڈال دو۔ میرے دل نے مجھے اس کی اجازت نہ دی چنانچہ میں نے ان کو گھر میں رکھ دیا اور واپس آ کر حضرت سے کہہ دیا کہ میں ڈال آیا ہوں حضرت نے سوال کیا کہ پھر تم نے کیا دیکھا؟ میں نے عرض کی کچھ بھی نہیں دیکھا آپ نے فرمایا تو پھر تم نے وہ اجزاء دریا میں نہیں ڈالے جاؤ اور انہیں دریا میں ڈال کر آؤ میں واپس آیا اور میرا دل وسوسوں میں مبتلا تھا پھر بھی جب میں نے انہیں دریا میں پھینک دیا تو دریا کا پانی دو حصوں میں بٹ گیا اور اس میں سے ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا کھلا تھا جب وہ اجزاء صندوق میں جا پڑے تو اس کا منہ بند ہو گیا اور پھر پانی بھی آپس میں مل گیا..... میں نے واپس آ کر یہ ساری کیفیت بیان کی تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں اب تم نے واقعی وہ اجزاء دریا میں ڈال دیئے ہیں۔ میں نے عرض کی "اے شیخ! اس معاملہ کے بعد مجھے ضرور بتلائیے آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اصول طریقت اور اس کے اسرار و رموز کی تشریح میں تصنیف کی تھی مگر لوگوں کیلئے اس کا سمجھنا دشوار تھا۔ چنانچہ یہ کتاب مجھ سے میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے مانگ لی اور اللہ تعالیٰ نے اس دریا کو حکم دیا کہ وہ کتاب ان تک پہنچا دے..... اور حضرت ابوبکر وارق سے یہ حکائت بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا

''الناس ثلاثة العلماء والا مرا والفقرا فازا فسد العلماء فسد الطاعة والشریعة واذفسدالا مرا فسد المعاش واذا فسد الفقرا فسد الاخلاق''

(لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں (۱) علماء (۲) امراء (۳) فقراء پس جب علما برباد ہو جاتے ہیں تو لوگوں پر شریعت اور اس کی اطاعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے، جب امرا بگڑتے ہیں تو لوگوں کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے اور جب فقراء میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو اخلاق برباد ہو جاتے ہیں) پس امراء اور بادشاہوں کی تباہی تو ظلم وستم سے ہوتی ہے اور علما کی تباہی طمع اور لالچ سے اور فقراء کی بربادی جاہ طلبی سے ہوتی ہے۔ جب تک بادشاہ علما سے روگردان نہیں ہوتے تباہ نہیں ہوتے اور جب تک علماء بادشاہوں کی صحبت سے کنارہ کش رہتے ہیں تباہی سے محفوظ رہتے ہیں اور جب تک فقراء دنیوی جاہ طلبی کے دلدادہ نہیں ہوتے تباہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ بادشاہوں کا ظلم وستم جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے علماء کی طمع ان کی بددیانتی کی وجہ سے اور فقراء کی ریا کاری اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس بے علم بادشاہ بے پرہیز عالم اور بے توکل فقیر سلطان کا ہم نشین ہوتا ہے اور پوری مخلوق کا بگاڑ انہیں تین طبقوں کے بگاڑ کے ساتھ وابستہ ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخراز رحمتہ اللہ علیہ

توکل ورضاء کا سفینہ اور راہ فنا کے سالک حضرت ابوسعید احمد بن عیسیٰ الخرازؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک ہیں۔ آپ ارادتمندوں کے احوال کے بیان کرنے والے اور طالبان حق کے اوقات کی دلیل تھے۔ فنا و بقا کے طریقہ کی وضاحت کرنے والے آپ پہلی شخصیت ہیں۔ آپ ہی نے اس کے اصول وضوابط مرتب فرمائے۔ آپ کے مناقب مشہور، ریاضت بڑی خوب، نکات بصیرت افروز، تصانیف گرانقدر اور کلام ورموز بلند پایہ ہے، حضرت ذوالنون مصریؒ سے ملاقات اور حضرت بشرؒ اور حضرت سری سقطیؒ کی

صحبت کا شرف حاصل تھا...... مروی ہے کہ پیغمبر علیہ ﷺ کے ارشاد مبارک " جبلت القلوب علی حب من احسن الیھا " (دل فطرتاً اس سے محبت کرتے ہیں جو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے) کے متعلق آپ نے فرمایا " واعجبا لمن لم یرٗ محسناً غیر اللہ کیف لایمیل بکلیتہ الی اللہ " (اس شخص پر بڑا تعجب ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا محسن نہیں پایا پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوتا) اس لئے کہ درحقیقت احسان وہی ہوتا ہے جو مالک الملک کی طرف سے ہو کیونکہ بغیر کسی بدلہ کے احتیاج کسی کے ساتھ نیکی کرنے کا نام احسان ہے اور جو کوئی خود کسی دوسرے سے کسی احسان کا محتاج ہو وہ کسی کے ساتھ نیکی اور احسان کیسے کرسکتا ہے پس تمام جہان کی ملکیت خداوند عز و جل کیلئے اور وہ ایسی ذات ہے جو غیر سے بے نیاز ہے لہذا جب حق تعالیٰ کے دوستوں نے اس معنیٰ کو جان لیا تو انہوں نے احسان اور انعام میں محسن و منعم حقیقی کا مشاہدہ کرلیا اور ان کے دل اس کی دوستی اور عشق میں پوری طرح اسیر ہو گئے اور غیر اللہ سے انہوں نے منہ موڑ لیا۔

حضرت علی بن محمد الاصفہانی رحمتہ اللہ علیہ

محققین کے بادشاہ اور مریدین کی دلیل حضرت ابوالحسن علی بن محمد الاصفہانیؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ بعض نے آپ کا اسم گرامی حضرت علی بن سہیل بیان کیا ہے، آپ کبار مشائخ میں سے تھے۔ حضرت جنیدؒ کے ساتھ آپ کی بڑی لطیف خط و کتابت رہتی...... آپ اس پایہ کے بزرگ تھے کہ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ نے آپ کی زیارت کیلئے اصفہان کا سفر کیا تھا...... آپ حضرت ابوترابؒ کے مصاحب اور حضرت جنیدؒ کے رفیق تھے، آپ قابل تعریف طریقہ کے ساتھ مخصوص رضا اور ریاضت میں آراستہ آفات وفتن سے محفوظ معاملات تصوف اور حقائق کے بیان میں اچھی زبان اور رموز و اشارات کے انکشاف میں بڑے لطیف بیان کے مالک ہیں...... مروی ہے کہ آپ نے فرمایا

"الحضور افضل من الیقین لان الحضور وطنات والیقین خطرات "(حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ہر وقت کی حاضری اس کی ذات کے یقین سے افضل ہے کیونکہ بارگاہ خداوندی میں حاضر رہنا اس کو اپنا وطن بنا لینے کی طرح ہے جب کہ یقین تو صرف دل میں پیدا ہونے والے خطرات وخیالات کا نام ہے) چنانچہ وطن بنا لینے میں غفلت کا گذر نہیں ہوتا اور صرف یقین کی کیفیت صرف دل میں گزرنے والی ایک چیز ہے جو کبھی آ جاتی ہے کبھی نہیں آتی۔ پس حاضران بارگاہ قدس کے اندر قیام پذیر ہوتے ہیں اور صرف یقین رکھنے والے اس بارگاہ کے دروازے پر کھڑے ہوتے ہیں...... میں غیبت اور حضور کے بیان میں انشاءاللہ ایک باب لا رہا ہوں......اور نیز آپ نے فرمایا کہ "من وقت آدم الی قیام الساعة الناس یقون القلب القلب وانا احب ان اری رجلا یصف القلب ویقول الیش القلب او کیف القلب فلا اری "(حضرت آدم علیہ السلام سے آج تک لوگ میرا دل میرا دل کہتے چلے آتے ہیں جب کہ میں چاہتا ہوں کہ ایسے ایک آدمی کو دیکھ لوں جو دل کی صفات بیان کرے اور بتائے کہ دل کیا چیز ہے یا اس کی کیفیت کیا ہے لیکن مجھے آج تک ایسا آدمی نہیں مل سکا) اور عوام تو اس گوشت کے ٹکڑے کو دل کہتے ہیں جب کہ وہ تو دیوانوں، مفلوک الحال اور بچوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ اس گوشت کے ٹکڑے کے باوجود بغیر دل کے ہی ہوتے ہیں۔ پس دل کیا چیز ہے؟ کہ جس کے بارے میں الفاظ کے علاوہ میں کچھ نہیں سنتا۔ یعنی اگر میں عقل کو دل کہوں تو یہ غلط ہے کیونکہ وہ تو دل نہیں اور اگر روح کو دل کہوں تو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ وہ بھی دل نہیں اور اگر اس علم کو دل کہوں تو یہ بھی نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام مشاہدات کا تعلق دل سے ہے اور اس کیفیت کے سمجھنے کا الفاظ وعبارت کے سوا کوئی ذریعہ نہیں۔

حضرت محمد بن اسماعیل خیر النساج رحمتہ اللہ علیہ

اور انہی میں سے اہل تسلیم کے مرشد اور محبت خداوندی کے طریق میں صاحب استقامت حضرت ابوالحسن محمد بن اسماعیل خیر النساجؒ بھی ہیں۔ آپ بزرگ مشائخ میں سے ہیں اور معاملات و نصائح بیانی اور مہذب عبارات میں اپنے دور میں اچھی شہرت کے حامل تھے۔ آپ کو طویل زندگی نصیب ہوئی تھی، حضرت شبلیؒ اور حضرت ابراہیمؒ خواص دونوں نے آپ کی مجلس میں ہی توبہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے حضرت جنیدؒ کی حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے حضرت شبلیؒ کو اس کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ آپ حضرت سری سقطیؒ کے مرید اور حضرت جنیدؒ و حضرت ابوالحسن نوریؒ کے ہمعصر تھے، حضرت جنیدؒ کے نزدیک آپ قابل احترام تھے اور حضرت ابوحمزہؒ بھی آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ کو خیر النساج کہنے کا سبب یہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ اپنے پیدائشی وطن سے جب سامرہ تشریف لے گئے تو حج کے ارادہ سے آپ کا گزر کوفہ سے ہوا۔ ایک ریشم باف نے کوفہ کے دروازے پر آپ کو پکڑ لیا کہ تم تو میرے غلام ہو اور تمہارا نام خیر ہے آپ نے اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے خیال کیا اور اس آدمی کی مخالفت نہ کی اور کئی سال تک اس کا کام کرتے رہے، وہ شخص آپ کو جب بھی خیر کہہ کر پکارتا تو آپ اس کی آواز پر لبیک کہتے یہاں تک کہ وہ اپنی اسی حرکت پر پشیمان ہوا اور کہا کہ آپ تشریف لے جائیے کیونکہ میں نے غلطی کی تھی، آپ میرے غلام نہیں'' آپ چلے گئے اور مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور اتنا مقام حاصل کیا کہ حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''خیر خیرنا'' (خیر ہم سے بہتر ہے) آپ اسی بات کو پسند کرتے تھے کہ لوگ آپ کو خیر کے نام سے پکاریں اور فرمایا کرتے تھے کہ جب ایک مسلمان نے میرا نام خیر رکھ دیا ہے تو اس کو تبدیل کرنا مناسب نہیں...... کہتے ہیں کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو شام کی نماز کا وقت ہو رہا تھا، نزع کی بیہوشی سے ذرا افاقہ ہوا تو آنکھیں کھول کر ملک

الموت کی طرف دیکھا اور فرمایا "قف عافاک اللہ فانما انت عبد مامرو وانا عبد مامور وما امرت بہ لا یفوتک وما امرت بہ فھو شی یفوتنی فدعنی امضی فیما امرت بہ ثم امض بما امرت بہ" (اللہ تجھے معاف کر دے ذرا ٹھہر جا! تو بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ہے جو ایک کام پر مامور ہے اور میں بھی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں جو ایک کام پر مامور ہوں۔ تاہم جس کام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ تم سے فوت نہیں ہو رہی البتہ مجھے جس کام کا حکم دیا گیا ہے وہ مجھ سے فوت ہو رہا ہے پھر آپ نے پانی منگوا کر وضو کیا اور شام کی نماز ادا کی اور پھر جان دے دی۔ لوگوں نے اسی رات آپ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ آپ نے جواب دیا "لاتسلنی عن ھذا ولکن استرحت من دینا کم" (مجھ سے اس معاملے میں کچھ نہ پوچھو البتہ تمہاری دنیا سے چھٹکارا پا کر مجھے آرام مل گیا ہے) آپ سے روایت ہے کہ اپنی مجلس میں آپ نے فرمایا "شرح اللہ صدور المتقین بنور الیقین و کشف بصایر الموقنین بنور الایمان" (اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کے سینوں کو یقین کے نور کے ساتھ کھول دیا ہے اور اہل یقین کے دلوں کی آنکھوں کو ایمان کے نور سے بینائی عطا فرمائی) کیونکہ متقی انسان کو یقین کے سوا چارہ نہیں کہ اس کا دل یقین کے نور سے روشنی پاتا ہے اور اہل یقین کو ایمان کے حقائق کے سوا چارہ نہیں کیونکہ ان کی عقل کی آنکھیں نور ایمان سے ہی روشن ہوتی ہیں پس جہاں ایمان ہوتا ہے وہاں یقین بھی ہوتا ہے اور جہاں یقین ہوتا ہے وہاں تقویٰ بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک دوسرے کا ذریعہ اور ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابوحمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ

انہی تبع تابعین میں سے زمانے کو حق کی طرف دعوت دینے والے اور اپنے عہد کے یکتا حضرت ابوحمزہ خراسانیؒ بھی ایک ہیں، خراسان کے قدیم مشائخ میں سے تھے اور

حضرت ابوتراب کی صحبت سے مشرف ہوئے اور حضرت خراز کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ خدا تعالیٰ پر بھروسے میں کامل درجہ کے مالک تھے آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کہیں جارہے تھے کہ کنویں میں گر پڑے اور تین روز تک اسی میں پڑے رہے، سیاحوں کا ایک گروہ وہاں پہنچا تو آپ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان کو آواز دوں کہ وہ مجھے یہاں سے باہر نکال لیں مگر ساتھ ہی یہ خیال آ گیا کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا مناسب نہیں اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی شکایت ہو جائے گی کہ میں ان سے کہوں کہ میرے اللہ نے مجھے کنویں میں ڈال دیا ہے تم سب مل کر مجھے باہر نکال لو! چنانچہ میں چپ ہو رہا، جب وہ لوگ قریب آئے اور دیکھا کہ راستے میں کنویں کا منہ کھلا ہے تو انہوں نے ثواب کی نیت سے اس کا منہ بند کر دینے کا مشورہ کیا تا کہ کوئی مسافر اس میں گر نہ جائے ان کی اس طرح کی باتیں سن کر مجھے پریشانی ہوئی اور میں اپنی زندگی سے ناامید ہو گیا وہ لوگ جب کنویں کا منہ ڈھانپ کر واپس چلے گئے تو میں موت کیلئے تیار ہو گیا اور خدا کے حضور بڑی عاجزی سے دُعا کی اور سب مخلوق سے مایوس ہو گیا...... جب رات خوب پھیل گئی تو کنویں کے اوپر سے مجھے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی میں نے غور سے دیکھا تو نظر آیا کہ کنویں کا منہ کسی نے کھول دیا ہے اور ایک بڑے اژدھا کی طرح کے ایک جانور نے اپنی دم نیچے لٹکا دی ہے میں نے سوچا کہ غالباً اللہ تعالیٰ نے میری نجات کیلئے اسے بھیجا ہے چنانچہ میں نے اس کی دم کو زور سے پکڑ لیا اور اس نے مجھے اوپر کھینچ لیا اتنے میں کسی ھاتف نے آواز دی کہ اے اباحمزہ تیری نجات بڑی خوب ہے کہ ہم نے ایک ہلاک کرنے والے جانور کے ذریعہ تجھے موت کے منہ سے نجات دی!

آپ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ "غریب کون ہے؟" تو آپ نے فرمایا " **المستوحشر من الالئف** "(جو شخص الفت سے وحشت زدہ ہوا) یعنی وہ آدمی جس کو دنیا و مافیہا بلکہ اپنی ذات کی محبت سے بھی وحشت ہو۔ کیونکہ دنیا اور عقبیٰ میں درویش کا وطن نہیں ہوتا اور وطن کے علاوہ کسی بھی چیز سے الفت، وحشت ہی ہوتی ہے جب تمام جہان سے اس

کی الفت منقطع ہو جاتی ہے تو وہ سب چیزوں سے وحشت زدہ ہی ہو جاتا ہے پھر وہ غریب ہوتا ہے......اور یہ مقام بہت ہی بلند ہے۔(واللہ اعلم)

حضرت ابوالعباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ

ان تبع تابعین میں سے فرمان خداوندی کے مطابق مریدوں کو دعوت حق دینے والے حضرت ابوالعباس احمد بن مسروقؒ بھی ایک ہیں۔خراسان کے بزرگوں اور بڑے صوفیا میں آپ کا شمار ہوتا ہے اولیاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ آپ زمین کے اوتار میں سے تھے قطب المدار علیہ کے ساتھ آپ کو صحبت حاصل رہی......لوگوں نے ایک دفعہ آپ سے دریافت کیا کہ اس دور کے قطب کون ہیں؟ آپ نے وضاحت کے ساتھ اظہار تو نہ کیا لیکن اشارتاً کہا کہ حضرت جنیدؒ اس وقت کے قطب ہیں۔آپ کو چالیس کے لگ بھگ بلند مرتبہ اولیاء کرام کی خدمت اور ان سے استفادے کا شرف حاصل ہوا تھا اور ظاہری و باطنی علوم میں آپ شاہسوار تھے......روایت ہے کہ آپ نے فرمایا"**من کان مسرورہ بغیر الحق فسرورہ بورث الھموم ومن لم یکن انسہ فی خدمۃ ربہ فانسہ بورث الوحشۃ** "(جس شخص کو اپنے رب کی خدمت سے لگاؤ نہ ہو تو اس کی محبت،وحشت کا پیش خیمہ ہوتی ہے)یعنی اللہ کے سوا جو کچھ ہے فانی ہے لہذا جو شخص فنا ہونے والی چیز سے خوش ہوتا ہے تو جب وہ چیز فنا ہو جاتی ہے تو یہ غمگین ہو جاتا ہے اور حق کی خدمت کے علاوہ سب کچھ بیکار ہے لہذا جب بندہ پر مخلوق کا حقیر و بیکار ہونا ظاہر ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہر طرح کی محبت تمام تر وحشت ہو جاتی ہے۔پس تمام جہان کے غم اور حشت غیر اللہ کے دیکھنے میں ہیں......(واللہ اعلم)

حضرت ابوعبداللہ بن احمد اسماعیل المغربی رحمتہ اللہ علیہ

تبع تابعین میں سے ایک متوکلین کے استاد اور محققین کے شیخ حضرت ابوعبداللہ احمد بن اسماعیل المغربیؒ بھی ہیں، آپ اپنے وقت کے بزرگوں اور مشائخ میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے دور کے اساتذہ میں مقبول اور مریدوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والے بزرگ تھے۔ حضرت ابراہیم خواصؒ اور حضرت ابراہیم رشیبائیؒ دونوں آپ کے مرید تھے آپ کا کلام بلند پایہ اور دلائل بڑے واضح ہیں اور آپ دنیا سے قطع تعلقی پر بڑے استقامت سے قائم رہے۔ آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "مارایت انصف من الدنیا أن خدمتھا خدمتک وان ترکتھا ترکتک" (میں نے دنیا سے زیادہ انصاف کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا کہ اگر تو اس کی خدمت کرے گا تو وہ بھی تیری خدمت کرے گا لیکن اگر تو اس کو چھوڑ دے تو وہ بھی تجھے چھوڑ دے گی) یعنی جب تک تمہیں اس کی جستجو ہے وہ بھی تمہاری طالب ہے لیکن جب تم اس کو نظر انداز کر کے حق تعالیٰ کی طلب کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے وہ بھی تم سے بھاگ جائے گی اور اس کے خیالات تمہارے دل سے نکل جاتے ہیں۔ پس جو شخص صدقِ دل کے ساتھ دنیا سے اعراض کرے وہ اس کے شر سے محفوظ اور اس کی مصیبت سے نجات پا جاتا ہے۔

حضرت ابوعلی بن الحسن بن علی الجوز جانی رحمتہ اللہ علیہ

زمانہ کے پیر اور اپنے دور کے مرد یکتا حضرت ابوعلی بن الحسن بن علی الجوز جانیؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ اپنے زمانہ کے بے مثل بزرگ تھے معاملات طریقت اور نفس کی خرابیوں پر لکھی جانے والی آپ کی تصانیف بہت سی ہیں، حضرت محمد بن علی ترمذیؒ کے ہمعصر تھے اور حضرت ابراہیم سمرقندیؒ جیسے بزرگ آپ کے ہی

مرید تھے ...... روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "الخلق کلهم فی میادین الفضلة یرکفون وعلی الظنون یعتمدون وعندهم انهم فی الحقیقة یقلبون وعن الكاشفة ينطقون "(سب لوگ غفلت کے میدانوں میں گھوڑے دوڑا دیتے ہیں اور شکوک واوہام پر اعتماد کئے ہوئے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ درحقیقت ہم سے ہی دنیا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف آ جا رہی ہے اور ہماری ہی گفتگو اسرار کو کھولنے والی ہے) اس مرشد نے اس طرح غرور طبیعت اور نفس کی سرکشی کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ ایک جاہل آدمی اپنی جہالت کا ہی معتقد ہوتا ہے اسی طرح جاہل صوفی اور بھی زیادہ اپنی جہالت کا عقید تمند ہوتا ہے۔ چنانچہ صوفیا میں سے وہ صوفی زیادہ صاحب عزت واحترام ہوتا ہے جو صاحب علم بھی ہو اور جاہل صوفی سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے کیونکہ صاحب علم صوفیوں کو حقیقت کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور غروران کے نزدیک بھی نہیں آتا لیکن جاہل صوفی محض غرور میں مبتلا ہوتے ہیں انہیں حقیقت حاصل نہیں ہوتی۔ وہ غفلت کے میدان میں چرتے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ولایت کا میدان ہے اپنے وہم وگمان پر اعتماد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی یقین ہے، رسم ورواج کے پابند ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہی حقیقت ہے اپنی نفسانی خواہش کے مطابق بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی مکاشفہ ہے کیونکہ غرور انسان کے سر سے اس وقت ہی نکل سکتا ہے جب اسے جلال یا جمال حق کا مشاہدہ حاصل ہو۔ اس لئے کہ جب اس کا جمال ظاہر ہوتا ہے تو سب لوگ اسے ہی دیکھتے ہیں تو ان کا غرور فنا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا جلال ظاہر ہونے کی صورت میں وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھتا اور اس کا غرور سر ہی نہیں اٹھاتا۔

حضرت ابو محمد احمد بن الحسین الحریری رحمۃ اللہ علیہ

علوم طریقت کو پھیلانے اور رسوم طریقت کو مقرر کرنے والے حضرت ابو محمد احمد

بن الحسین الحریریؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ حضرت جنیدؒ کے رازداروں میں سے تھے اور حضرت سہیل بن عبداللہؒ کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ظاہری اور باطنی تمام علوم سے باخبر علم فقہ میں اپنے دور کے امام۔ اصول فقہ کے کامل ماہر اور طریق تصوف میں اس بلند مقام پر فائز تھے کہ حضرت جنیدؒ جیسے بلند پایہ بزرگ نے آپ سے کہا تھا کہ ''میرے مریدوں کو ادب سکھایئے اور انہیں ریاضت کی تاکید کیجئے آپ حضرت جنیدؒ کے ولیعہد مقرر ہوئے کہ ان کے بعد ان کی مسند پر تشریف فرما ہوئے...... آپ کے بارے میں روایت ہے کہ فرمایا ''دوام الایمان وقوام الادیان وصلاح الابدان فی ثلاثۃ خصال الاکتفا والاتقا والاحتماء فمن اکتفلی باللہ صلحت سریرتہ ومن اتقی مانھی اللہ عنہ استقامت سیرتہ ومن احتماء مالم لوافقہ ارتاضت طبیعتہ فثمرہ الاکتفاء صفو المعرفۃ وعاقبۃ الاتقاء حسن الخلیقۃ وغایۃ الاحتماء اعتدال الطیقۃ'' (ایمان کی ہمیشگی، دین کی پختگی اور بدن کی اصلاح تین خصلتوں (۱) اکتفا کرنے (۲) پرہیز کرنے اور (۳) غذا کی نگہداشت پر منحصر ہے پس جس کسی نے حق تعالیٰ کی ذات کو اپنے لئے کافی سمجھ لیا اس کا باطن درست ہو گیا اور جس کسی نے اللہ کے منع کردہ امور سے پرہیز کیا اس کی سیرت نیک ہو گئی اور جس کسی نے خوراک کی حفاظت (یعنی حلال وحرام اور مناسب و نامناسب میں تمیز کی) اور اپنے نفس کو ریاضت کا خوگر بنایا اس کی طبیعت اعتدال پر آ گئی۔ پس اللہ تعالیٰ پر اکتفا کرنے کا ثمرہ معرفت خداوندی کی صفائی، تقویٰ و پرہیزگاری کا انجام خوش خلقی اور غذا کی نگہداشت کا نتیجہ طبیعت کی تندرستی اور اعتدال ہے) یعنی جو شخص اپنے تمام معاملات میں حق تعالیٰ کو کافی سمجھتا اور اس پر توکل کرتا ہے اس کی معرفت بالکل صاف ستھری ہوتی ہے اور جو معاملات میں تقویٰ کو اختیار کرتا ہے اس کا اخلاق دنیا اور آخرت میں نیک ہو جاتا ہے جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''من کثر صلاتہ باللیل حسن وجھہ بالنھار'' (جو کوئی رات کو زیادہ نماز

پڑھتا ہے اس کا چہرہ دن کے وقت زیادہ باجمال ہو جاتا ہے) ایک روایت میں ہے کہ قیامت کے دن متقی لوگ اس شان کے ساتھ آئیں گے کہ "وجوھھم نور علی منابر من نور " (ان کے چہرے منور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے) اور جو شخص غیر مناسب غذاؤں سے اجتناب کی راہ اختیار کرے گا اس کا جسم بیماریوں سے اور نفس شہوت و سرکشی سے محفوظ رہے گا اور یہ بات بڑی جامع اور عمدہ ہے جو سننے کے قابل ہے...... واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد بن سہل الآملی رحمتہ اللہ علیہ

ان تبع تابعین میں سے اہل ظرافت کے شیخ اور اہل صفا کے پیشوا حضرت ابو العباس احمد بن محمد بن سہل الاملیؒ بھی ایک تھے۔ بزرگ مشائخ اور ارباب حشمت میں آپ کا شمار ہوتا ہے اپنے ہمعصر لوگوں میں آپ کا بے حد احترام تھا۔ علم تفسیر اور قرات کے جید عالم تھے اور قرآن کے لطائف بیان کرنے میں آپ کو خاص درک حاصل تھا حضرت جنیدؒ کے عظیم مریدوں میں سے تھے، حضرت ابراہیمؒ بارستانی کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے اور حضرت ابوسعید خرازؒ آپ کی بے حد تکریم کرتے تھے بلکہ آپ کے علاوہ تصوف میں کسی کو تسلیم ہی نہ کرتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "السکون الی مالوخات الطبائع یقطع صاحبھا عن بلوغ درجات الحقائق" (طبیعت کی پسندیدہ چیزوں کی طرف سکون تلاش کرنا انسان کو حقائق کے درجات تک پہنچنے سے روک دیتا ہے) یعنی جو شخص طبیعت کی پسندیدہ چیزوں سے آرام حاصل کرتا ہے وہ حقیقت تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے کیونکہ طبیعتیں تو نفس کے اسباب و آلات ہیں اور نفس اللہ تعالیٰ سے محل حجاب میں ہے جب کہ حقیقت محل کشف ہے، اس لئے جو مرید حق سے حجاب میں ہو اور طبیعت کی مرغوبات کی طرف آرام پاتا ہو وہ کبھی اس شخص جیسا نہیں ہو سکتا جسے حق تعالیٰ کا مشاہدہ حاصل ہو۔ پس

حقائق تک رسائی کشف کا مقام ہے جو مرغوبات طبعی سے اعراض کرنے سے وابستہ ہے کیونکہ طبیعتوں کی الفت دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ایک دنیا اور اس کی چیزوں سے اور دوسری آخرت اور اس کے حالات سے۔دنیا سے تو اس لئے الفت کرتا ہے کہ اس کا ہم جنس ہے اور عقبےٰ سے اپنے باطل گھمنڈ کی وجہ سے الفت کرتا ہے کیونکہ وہ نہ تو اس کا ہم جنس ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت کا اسے علم ہے پس عقبےٰ سے اس کی محبت اپنے زعم کی بنا پر ہے نہ کہ اس کی حقیقت کے علم کی وجہ سے۔کیونکہ اگر اسے حقیقت عقبیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی تو وہ اس دنیا سے قطع تعلق کر لیتا اور جب اس دنیا سے قطع تعلقی ہو جاتی تو طبیعت کی حکمرانی ختم ہو جاتی اور پھر حقائق کا مشاہدہ نصیب ہوتا۔کیونکہ عالم عقبیٰ کا طبیعت کے ساتھ صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ طبیعت فنا ہو جائے۔''لان فیها مالا خطر علی قلب بشر ''(اس لئے کہ جنت میں وہ نعمتیں ہیں جن کا کبھی وہم انسانی میں خیال تک بھی نہیں گزرا) دل میں گزر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ راستہ پر خطر ہے اور جو چیز ایک دفعہ خیال اور وہم میں آ جائے اس کی زیادہ وقعت نہیں ہوتی۔بہر حال جب وہم و خیال حقیقت عقبیٰ کی معرفت سے عاجز ہیں تو طبیعت کو اس کی اصلی حقیقت سے الفت کیسے ہو سکتی ہے۔پس یہ بات درست ہوگئی کہ عقبیٰ کے ساتھ طبیعت کا لگاؤ ایک خیال باطل ہے۔(واللہ اعلم)

حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاج رحمۃ اللہ علیہ

معانی میں مستغرق اور اپنے دعوےٰ میں ہلاک شدہ حضرت ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاجؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک ہیں، آپ طریقت کے مشاقوں اور مستوں میں سے تھے، آپ قوی حال اور بلند ہمت کے مالک تھے، آپ کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک آپ مردود ہیں لیکن بعض کے ہاں مقبول۔ حضرات عمر بن عثمان المکیؒ، ابو یعقوب نہرجوریؒ، ابو یعقوب الاقطعؒ، علی بن سہل اصفہانیؒ اور

ان جیسے دوسرے بزرگوں نے آپ کو رد کر دیا ہے، لیکن ابن عطارؒ، محمد بن حنیفؒ، ابوالقاسم نصرآبادیؒ اور دوسرے متاخرین نے آپ کو قبول کیا ہے اور حضرات جنیدؒ، شبلیؒ، حریریؒ، مصریؒ اور ان جیسے بزرگوں کی ایک جماعت نے آپ کے بارے میں توقف کیا ہے جب کہ ایک دوسرے گروہ نے آپ کو جادو اور اس کے اسباب کی طرف منسوب کیا ہے تاہم ہمارے دور میں شیخ المشائخ حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ، حضرت شیخ ابوالقاسمؒ اور حضرت شیخ ابوالعباس مشقانیؒ نے آپ کے بارے میں اپنی رائے کو راز میں ہی رکھا ہے، البتہ ان حضرات کے نزدیک آپ بزرگ ہی تھے۔ حضرت استاد ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ وہ واقعی اہل طریقت واہل معانی میں سے ایک بزرگ تھے تو لوگوں کے نظر انداز کرنے سے وہ مردود ہرگز قرار نہیں پاتے اور اگر وہ طریقت میں مہجور اور حق تعالیٰ کے نزدیک مردود ہیں تو وہ لوگوں میں مقبول ہونے کے باعث مقبول قرار نہیں پا سکتے۔ لہذا ہم ان کے معاملے کو حق تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ البتہ جس قدر بزرگی کا نشان ہم نے ان میں پایا ہے اس قدر ان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ بہرحال صرف چند بزرگوں کے علاوہ باقی تمام مشائخ میں سے ان کی فضیلت کے کمال اور حال کی صفائی اور اجتہاد و ریاضت کی کثرت کا کوئی بھی منکر نہیں ..... اس کتاب میں ان کا تذکرہ نہ کرنا دیانت کے خلاف ہوتا کیونکہ بعض اہل ظاہر ان کی تکفیر کرتے اور ان کی فضیلت و ولایت کا انکار کرتے ہیں، اور آپ کے احوال عذر، حیلہ سازی اور جادو کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حسین بن منصور حلاج بغداد کا وہ بے دین شخص ہے جو محمد بن زکریا کا استاد اور ابوسعید قرمطی کا رفیق کار تھا۔ حالانکہ جن حسین کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے وہ بیضا کے رہنے والے فارسی النسل بزرگ تھے اور مشائخ کا ان کو ترک اور رد کرنا ان کے ذہن میں کسی طعن کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے عجیب و غریب حالات و واقعات کی وجہ سے ہے، کہ پہلے وہ حضرت سہل بن عبداللہؒ کے ارادتمند تھے لیکن پھر ان سے اجازت لئے بغیر وہاں سے چلے گئے اور حضرت عمرو بن عثمانؒ سے رابطہ پیدا کیا

پھر وہاں سے بھی بغیر اجازت چلے گئے اور حضرت جنیدؒ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا تو وقت کے دیگر تمام مشائخ نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔ پس وہ عمل میں متروک ہیں اصل طریقت میں متروک نہیں..... کیا نہیں دیکھتے کہ حضرت شبلیؒ نے فرمایا ''ابا والحلاج فی شئ واحد فخلصنی جنونی واھلکه عقله'' (میں اور حلاج ایک ہی حالت میں تھے پس مجھے تو میرے جنون نے بچالیا اور اس کی عقل نے ہلاک کر دیا) اگر وہ دین کے بارے میں مطعون ہوتے تو حضرت شبلیؒ یوں کبھی نہ کہتے کہ میں اور حلاج ایک ہی حالت میں ہیں..... اور حضرت محمد بن خفیفؒ نے فرمایا کہ ''ھو عالم ربانی'' (وہ عالم ربانی ہیں) اسی طرح آپ کی بزرگی اور فضیلت کی اور بھی بہت سی دلیلیں موجود ہیں۔ تاہم مشائخ کی ناراضگی اور نافرمانی اس راہ طریقت میں ان کیلئے وحشت اور ہجران کا باعث بن گئی..... تصوف کے اصول وفروع اور رموز وکلام میں ان کی تصنیفات بہت سی ہیں اور میں علی بن عثمان جلابیؒ نے بغداد اور اس کے گردونواح میں ان کی تصنیفات کے پچاس نسخے اور خوزستان کارس اور خراسان میں بھی بعض نسخے خود دیکھے ہیں۔ ان میں ہر قسم کی وہ باتیں موجود پائی ہیں جو ابتدا میں مریدوں پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ اس میں سے بعض باتیں تو بڑی قوی ہیں اور بعض بہت ضعیف ہیں۔ بعض بڑی آسان اور بعض انتہائی مشکل ہیں۔ درحقیقت حق تعالیٰ کی طرف سے جب کسی شخص پر کوئی بات ظاہر ہوتی ہے تو اپنے حال کی قوت کے مطابق اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے اور حق تعالیٰ کا فضل اس کی امداد کرتا ہے لیکن اگر اپنے کلام کی تعبیر میں عجلت سے کام لے اور تعجب کا مظاہرہ کرے تو اس طرح پیدا ہو جانے والے ادھام اور پیچیدگیاں سننے والے کو نفرت اور بیزاری میں مبتلا کر دیتی ہیں اور عقل اس کلام کے ادراک میں ناکام ثابت ہوتی ہے تو اس وقت لوگ کہنے لگتے ہیں کہ یہ کلام بڑا ہی بلند ہے۔ چنانچہ ایک گروہ تو اپنی جہالت کی وجہ سے اس سے منکر ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ اپنی جہالت ہی کی وجہ سے اس کا اقرار کرتا ہے، اور ایک گروہ کا انکار دوسرے

گروہ کے اقرار کی طرح ہی ہے، لیکن جب اہل تحقیق و بصیرت اس عبارت میں غور کرتے ہیں تو انہیں نہ تو کوئی الجھن ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی تعجب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کی مدح یا ذم سے فارغ اور اس کے انکار و اقرار سے ایک طرف ہو جاتے ہیں...... اور باقی وہ لوگ سخت غلطی میں مبتلا ہیں جو اس جوانمرد حسین بن منصور حلاج کے تعجب انگیز واقعات کو جادوگری سے منسوب کرتے ہیں کیونکہ اہل سنت و جماعت کے ہاں جادو کا وجود اسی طرح حق ہے جس طرح کرامت کا وجود! البتہ جادو کا اظہار ہر حالت میں کامل درجے کا کفر ہے اور کرامت کا اظہار کامل درجے کی معرفت ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ایک جادو تو حق تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا نتیجہ ہے اور دوسرا کرامت اس کی خوشنودی اور رضا کا ثمر ہے اور میں اثبات کرامات کے باب میں پوری شرح کیساتھ اس مسئلے کو بیان کروں گا اور اہل سنت و جماعت کے ارباب بصیرت کا اتفاق ہے کہ کوئی مسلمان نقصان پسند اور جادوگر نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کوئی کافر صاحب کرامت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ضدیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حالانکہ حسین بن منصور جب تک زندہ رہے نیکی کے لباس میں رہے، یعنی اچھی نمازوں اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور مناجات میں مشغول رہے...... ہمیشہ روزے سے رہتے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی عظمتوں کو بیان کرتے رہتے اور حق تعالیٰ کی صفت توحید کے عمدہ نکات بیان کرتے رہے، لہٰذا اگر آپ کے افعال سحر پر مبنی ہوتے تو اس طرح کے نیک کام آپ سے محال ہوتے۔ پس بلاشبہ یہ افعال کرامت تھے اور کرامت کسی محقق ولی سے ہی ظاہر ہوا کرتی ہے، اہل سنت کے بعض علما ان کے اس نظریئے کا رد کرتے ہیں کہ "بندہ اور خدا باہم مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں لیکن علماء کی یہ تشنیع آپ کی عبارت پر ہے نہ کہ معنی پر۔ کیونکہ مغلوب الحال شخص کا غلبہ حال کے وقت اپنی عبارت کو درست رکھ سکنا ممکن نہیں۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس عبارت کا مفہوم اس قدر مشکل ہو کہ لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہوں اور ان کے اپنے وہم نے اس عبارت سے ان کیلئے ایسی صورت پیدا کر دی ہو

کہ وہ محض اپنی کم فہمی کی وجہ سے اس کا انکار کررہے ہوں حالانکہ ان کا یہ انکار خود ان کی کم فہمی کی طرف راجع ہوگا نہ کہ اس معنی کی طرف! لیکن میں نے بغداد میں ملحدین کے ایک ایسے گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ آپ سے محبت کا مدعی ہے اور آپ کے کلام کو اپنے الحاد کیلئے محبت قرار دیتا اور اپنے آپ کو حلاجی کہلاتا ہے اور آپ کے معاملہ میں بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیتا ہے۔ جس طرح کہ رافضی (شیعہ) لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اپنی محبت کے بارے میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ میں انشاءاللہ ان کے کلام کی تردید اور ان فرقوں کے بیان میں ایک مستقل باب لاؤں گا۔ الغرض آپ چونکہ مغلوب الحال شخص تھے اور اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکتے تھے اس لئے آپ کا کلام لائق اقتدا نہیں کیونکہ صرف اسی شخص کا کلام لائق اقتدا ہوتا ہے جو اپنے آپ پر قابو رکھ سکے...... پس الحمد اللہ کہ میرے دل میں آپ کی عزت موجود ہے تاہم نہ تو آپ کا طریق کسی اصل پر صحیح ہے اور نہ ہی آپ کا حال کسی محل پر متمکن ہے اور آپ کے احوال میں بظاہر بڑا فساد ہے، مجھے اپنے مکاشفات کی ابتدا میں آپ سے متعلق بہت سے دلائل حاصل ہوئے اور میں نے آپ کے کلام کی شرح میں ایک مستقل کتاب بھی لکھی جس میں آپ کے کلام کی عظمت اور آپ کے احوال کی محبت کو دلائل و براھین سے ثابت کیا۔ علاوہ ازیں اس سے قبل ذکر کردہ اپنی کتاب ''منہاج الدین'' میں بھی آپ کے احوال کی ابتدا و انتہا کو بیان کیا ہے اور مختصراً یہاں بھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ پس جس طریق کی اصل کو اتنے اعتراضات کے ساتھ ثابت کرنا پڑے اس کے ساتھ کس طرح تعلق پیدا کیا جائے اور کس طرح اس کی اقتدا کی جائے؟ کیونکہ نفسانی خواہشات کو تو سچائی کے ساتھ ہرگز موافقت نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ حق سے انحراف اور کجروی کیلئے طریقے تلاش کرتی رہتی ہیں تاکہ اس سے لپٹ جائیں...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا'' **الالسنة مستنطقات تحت نطقها مستهلكات** ''(زبانیں بولتی ہیں لیکن ان سے نکلنے والے الفاظ میں دل کی ہلاکت کے سامان پوشیدہ ہوتے ہیں) یعنی عبارتیں اور الفاظ

باعث آفت ہیں اور معنی کی حقیقت بیان کرنے میں ناکام ہیں۔ کیونکہ اگر معنی حاصل ہو جائے تو پھر وہ عبارات کی وجہ سے گم نہیں ہوسکتا۔ اگر وہ گم ہو جائے تو پھر عبارات کی وجہ سے وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ طالب اپنی سوچ سے کسی عبارت کو کوئی معنی پہناتا ہے اور پھر ان کو حقیقی اور صحیح معنی سمجھ لیتا ہے اس لئے ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابواسحاق ابراہیم بن احمد الخواص رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی تابعینؒ سے ایک متوکلین کے سپہ سالار اور اہل تسلیم و رضا کے پیشوا حضرت ابواسحاق ابراہیم بن احمد الخواصؒ بھی ہیں۔ آپ توکل میں بڑی شان اور بلند مقام کے مالک تھے آپ نے بہت سے مشائخ کو پایا۔ آپ کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں اور معاملات طریقت میں بڑی عمدہ تصانیف موجود ہیں...... آپ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "العلم كله في كلمتين لاتتكلف في ما كفيت ولا تضع ما استكفيت" (تمام کا تمام علم دو جملوں میں مجتمع ہے ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے جس کام کا تجھے مکلف نہیں بنایا اس کا تکلف نہ کرے اور دوسرا یہ کہ جس کام کا تجھ پر فریضہ عائد کیا گیا ہے اس کو ضائع نہ کرے) تاکہ دنیا و آخرت میں تو حق تعالیٰ کے منشاء کے موافق ہو جائے۔ اس کلام سے مراد یہ ہے کہ تو اپنی قسمت کو تبدیل کرنے کی کوشش نہ کر کیونکہ یہ قسمت ازلی ہے اور تمہارے تکلف سے یہ تبدیل نہیں ہوسکتی اور ان کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کا مرتکب نہ ہو کہ حکم کا ترک تجھ کو برے انجام سے دوچار کر دے گا...... لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ عجائبات میں سے آپ نے کیا کچھ دیکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا یوں تو بہت سے عجائب دیکھے ہیں لیکن سب سے عجیب تر یہ بات دیکھی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے میری صحبت اختیار کرنا چاہی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا اس کی وجہ کیا ہے؟ تو فرمایا "میں نے یہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ مجھے ان سے زیادہ کسی اچھے رفیق کے ملنے

کی توقع تھی بلکہ صرف اس لئے کہ میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ حق تعالیٰ کو چھوڑ کر آپ پر بھروسہ نہ کرنا پڑے اور یوں آپ کی صحبت میرے توکل کو نقصان نہ پہنچائے اور میں فریضہ کو ترک کر کے نفل کی ادائیگی میں نہ لگ جاؤں ظاہر ہے کہ آپ کی یہ بات آپ کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت ابوحمزہ بغدادی رحمتہ اللہ علیہ

عزت کے سراپردہ اور اہل یقین کی بنیاد حضرت ابوحمزہ بغدادالبزازؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ اپنے حلقے کے بڑے اور مشائخ کے متکلمین میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت حارث محاسبیؒ کے مرید حضرت سری سقطیؒ کے صحبت یافتہ حضرت نوریؒ اور حضرت خیر النساجؒ کے ہمعصر اور بڑے بڑے مشائخ سے اکتساب فیض کرنے والے تھے۔ آپ بغداد کی مسجد رصافہ میں حلقہ وعظ فرمایا کرتے تھے، آپ علم تفسیر اور علم تجوید کے بلند پایہ عالم تھے اور پیغمبر علیہ السلام کی احادیث کے سلسلہ میں آپ کی روایت کردہ حدیثیں بڑی ثقہ اور مستند سمجھی جاتی ہیں۔ آپ وہی واحد قابل تعریف انسان ہیں جنہوں نے حضرت نوریؒ کا ان کی مصیبت کے دور میں ساتھ دیا تھا چنانچہ حق تعالیٰ نے ان سب کو نجات سے نوازا۔ میں انشاء اللہ اس کو حضرت نوریؒ کے مذہب کی شرح میں بیان کروں گا...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "**اذا سلمت منک نفسک فقد ادیت حقھا و اذا سلم منک الخلق فقضیت حقوقھم**" (جب تجھ سے تیرا نفس محفوظ رہ گیا تو گویا تو نے اپنے وجود کا حق ادا کر دیا اور جب تجھ سے مخلوق خدا محفوظ رہی تو گویا تو نے ان کے حق بھی ادا کر دیئے) یعنی حقوق کی دو قسمیں ہیں ایک تیرے اپنے وجود کا حق اور دوسرا لوگوں کا حق...... جب تو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ سے روک رکھے اور آخرت کی سلامتی کا راستہ تلاش کرے تو تو نے اپنے نفس کا حق ادا کر دیا اور جب تو نے لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھا اور

ان کیلئے برائی کا ارادہ نہ کیا تو تو نے ان کا حق بھی ادا کر دیا۔ لہذا اس کوشش میں لگا رہ کہ تجھ کو اور مخلوق کو تجھ سے کوئی برائی نہ پہنچے پھر اس کے بعد حق تعالیٰ کے حقوق ادا کرنے میں مشغول ہو جا۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ الواسطی رحمتہ اللہ علیہ

اپنے فن کے امام، بلند حال اور لطیف کلام حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ الواسطیؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ محقق مشائخ میں شمار ہوتے تھے اور حقائق تصوف کے بیان کرنے میں پر عظمت شان اور بلند مقام کے حامل بزرگ تھے۔ جملہ مشائخ کے نزدیک آپ قابل تعریف تھے۔ حضرت جنیدؒ کے قدیم اصحاب میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کا کلام اس قدر مشکل ہوتا تھا کہ اہل ظاہر کی آنکھ میں جچتا نہ تھا۔ آپ زیادہ عرصہ کسی شہر میں آرام کیلئے ٹھہرتے نہ تھے۔ لیکن جب آپ مرو میں تشریف لائے تو چونکہ یہاں کے لوگ اپنی لطافت طبع کی وجہ سے بڑے نیک سیرت تھے اس لئے انہوں نے آپ کا بڑا احترام کیا اور عزت کے ساتھ آپ کو قبول اور آپ کا کلام سنا چنانچہ آپ نے باقی عمر وہاں ہی گزار دی۔ ..... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''الذاکر فی ذکرہ اکثر غفلۃ الناس لذکرہ '' (اس کا ذکر کرنے والے کو ذکر کرنے میں اکثر ایسی غفلت ہو جاتی ہے کہ ایسی غفلت تو اس کا ذکر بھول جانے والوں کو بھی نہیں ہوتی) کیونکہ اگر اس کی ذات کو یاد رکھے اور زبان سے اس کا ذکر بھول بھی جائے تو نقصان دہ نہیں ،نقصان دہ حالت تو یہ ہے کہ زبان پر اس کا ذکر تو کرتا رہے لیکن اس کی ذات کو فراموش کر دے کیونکہ اس طرح ذکر بغیر مذکور کے ہوگا۔ پس حق تعالیٰ کی ذات سے روگردانی کے باوجود ذکر کرتے ہوئے کسی غرور میں مبتلا ہو جانا غفلت کے اعتبار سے اس حالت سے زیادہ ہے کہ غرور میں مبتلا کر دینے والے ذکر سے روگردانی کرے اور ذات حق تعالیٰ کو یاد رکھے۔ کیونکہ ذکر کو بھول جانے والے شخص کو

بھول جانے میں اس کے حضور کا گھمنڈ نہیں ہوتا لیکن ذاکر کو اس کی غیبت کے باوجود ذکر میں اس کے حضور کا گمان ہوتا ہے۔ پس بے حضوری کی حالت میں حضوری کا غرور اس غیبت سے زیادہ غفلت کے قریب ہے جس میں حضوری کا گھمنڈ موجود نہ ہو۔ کیونکہ طالبان حق کی ہلاکت اسی وقت واقع ہوتی ہے جب وہ کسی باطل گمانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جب زعم باطل پیدا ہو جاتا ہے تو پھر مقصود حاصل نہیں ہوتا...... اور یہ بات ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ حق تعالیٰ کے متلاشی لوگوں کا زعم درحقیقت عقل کی تہمت سے اور عقل عام طور پر ہمت سے حاصل ہوتی ہے اور ہمت کا غرور اور بڑائی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں...... بہرحال ذکر یا تو غیبت ہوتا ہے یا حضور میں! اگر ذکر کرنے والا اپنے آپ سے بے خبر ہو لیکن حق تعالیٰ کے حضور حاضر ہو تو پھر اس کا ذکر ہی نہیں بلکہ مشاہدہ بن جاتا ہے اور اگر اپنے آپ سے باخبر اور حق تعالیٰ سے غافل ہو تو وہ ذکر ہی نہیں بلکہ غیبت ہے اور غیبت دراصل غفلت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے..... (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوبکر بن دُلف بن حجدار شبلی رحمتہ اللہ علیہ

احوال کیلئے تسکین اور مقال کیلئے کشتی حضرت ابوبکر بن دُلف بن حجدار شبلیؒ بھی حضرات تبع تابعین میں سے ایک تھے۔ آپ کا شمار بڑے بزرگوں اور مشہور مشائخ میں ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ سے تعلق کے معاملہ میں آپ کی زندگی بڑی پاکیزہ اور اچھی رہی ہے اور حقیقت تصوف کے بیان میں آپ کے بڑے قابل تعریف اور لطیف اشارے موجود ہیں۔ چنانچہ متاخرین میں سے ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ ''ثلثة من عجائب الدنیا اشارات الشبلی و نکات المرتعش و حکایات الجعفر '' (تین چیزیں دنیا کے عجائبات میں سے ہیں۔ حضرت شبلیؒ کے اشارات، حضرت مرتعشؒ کے نکات اور حضرت جعفرؒ کی حکایت) آپ اپنے دور کے بزرگ صوفیا اور سرداران اہل طریقت میں سے ایک تھے۔ عمر کے ابتدائی

حصے میں خلیفہ وقت کے دربانوں کے افسر تھے لیکن پھر حضرت خیر النساج کی صحبت میں توجہ کی اور حضرت جنید بغدادیؒ کے مرید ہو گئے ان کے علاوہ بھی وقت کے دوسرے بہت سے بزرگوں کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ آپ سے روایت ہے کہ آپ نے حق تعالیٰ کے ارشاد "قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ" (مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں) کے معنی میں فرمایا "ای ابصار الرئوس عن المحارم وابصار القلوب عماسوی الله تعالی" (یعنی اپنے سر کی آنکھوں کو شہوت کے ساتھ دیکھنے سے اور اپنے دل کی آنکھوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی طرف متوجہ ہونے سے محفوظ رکھیں) پس شہوت کا اتباع اور غیر محرم کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا حق تعالیٰ سے غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اہل غفلت کیلئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے عیوب سے بھی غافل ہوتے ہیں اور جو کوئی اس دنیا میں غفلت شعار ہوگا وہ آخرت میں بھی غافل اور جاہل ہی ہوگا "وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى" (اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا) اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کسی کے دل سے شہوت کا ارادہ پاک نہ فرما دیں اس وقت تک اس کے سر کی آنکھیں شہوت کی تباہ کاریوں سے محفوظ نہیں رہ سکتیں اور جب تک حق تعالیٰ کسی کے دل میں اپنا ارادہ قائم نہ کر دیں اس وقت تک اس کے دل کی نگاہیں غیر اللہ کے نظارے سے محفوظ نہیں ہو سکتیں......

اور آپ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک روز آپ بازار میں تشریف لائے تو ایک گروہ نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ "هذا مجنون" (یہ تو کوئی دیوانہ ہے) تو آپ نے فرمایا "انا عندکم مجنون وانتم عندی اصحاء فزادی الله فی جنونی وزادنی صحتکم" (میں تمہارے نزدیک دیوانہ ہوں اور تم میرے نزدیک ہوشیار ہو۔ پس حق تعالیٰ میری دیوانگی میں اور تمہاری ہوشیاری میں اضافہ کر دیں) یعنی میری دیوانگی حق تعالیٰ کے ساتھ میری شدت محبت کی بنا پر ہے اور تمہاری ہوشیاری حق تعالیٰ سے تمہاری شدت غفلت کی وجہ

سے ہے اس لئے میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری دیوانگی میں اضافہ کر دیں تا کہ میرا قرب اور بڑھ جائے اور تمہاری ہوشیاری میں اضافہ کر دیں تا کہ تمہاری غفلت اور دوری بھی بڑھ جائے...... آپ کا یہ جوابی قول آپ کی غیرت کی وجہ سے تھا کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اس قدر کم علم کیوں ہو گئے ہیں کہ وہ جنون اور محبت الٰہی کی کیفیت میں فرق بھی محسوس نہیں کر سکتے...... (واللہ اعلم)

حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر الخالدی رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی حضرات تبع تابعین میں سے اولیاء کرامؒ کے احوال و اقوال کو لطیف پیرایہ میں بیان کرنے والے حضرت ابو محمد جعفر بن خالدیؒ بھی ایک ہیں۔ آپ کا شمار حضرت جنیدؒ کے بڑے اور پرانے اصحاب میں ہوتا ہے۔ آپ علوم تصوف کے بڑے متجر عالم۔ مشائخ کے کلام کے حافظ اور ان کے حقوق کی بڑی رعایت کرنے والے تھے۔ علم کے تمام شعبوں میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ شمار کیا جاتا ہے اور آپ نے نفس کی سرکشی کو ترک کرنے کے سلسلہ میں تمام مسائل میں بڑی عمدہ حکایتیں بیان فرمائی ہیں لیکن ان کو منسوب کسی اور کی طرف کیا ہے...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''التوکل استوا القلب عند الوجود والعدم '' (رزق کے ملنے یا نہ ملنے تمام صورتوں میں دل کے ایک حال پر برابر رہنے کا نام توکل ہے) یعنی رزق کے موجود ہونے پر خوش نہ ہو اور موجود نہ ہونے پر غمگین نہ ہو کیونکہ انسان کا جسم حق تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس کی پرورش یا ہلاکت کے معاملہ میں حق تعالیٰ ہی زیادہ بہتر اور حقدار ہیں کہ اس کو جس طرح چاہئیں رکھیں تو درمیان میں دخل نہ دے، ملک کو مالک کے حوالے کرا اور اپنے تصرف کو ترک کر دے...... حضرت ابو محمد بن جعفرؒ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ بخار میں مبتلا تھے، میں نے عرض کی استاد مکرم! اللہ تعالیٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ آپ کے جسم کو تندرستی عطا

فرمائیں، آپ نے فرمایا کل میں تندرستی کیلئے دُعا کر رہا تھا کہ میرے اندر سے آواز آئی کہ تمہارا جسم ہماری ملک ہے۔ ہم چاہئیں گے تو اسے تندرست رکھیں اور چاہئیں گے تو بیمار رکھیں گے۔ ہمارے اور ہماری ملک کے درمیان دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو، اپنے تصرف کو ترک کردو تاکہ ہمارے بندے ہو جاؤ!..... (واللہ اعلم)

حضرت ابوعلی محمد بن قاسم الرود باری رحمتہ اللہ علیہ

قابل تعریف اور سخاوت کے معدن حضرت ابوعلی محمد بن القاسم الرود باریؒ بھی انہی حضرات تبع تابعین میں سے ایک ہیں، آپ صوفیاء میں سے بڑے جوانمرد بزرگ اور بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے۔ معاملات تصوف کے جملہ فنون میں بڑی شان کے مالک تھے، آپ کے اوصاف اور کرامتیں بکثرت ہیں اور طریقت کی باریکیوں کو بیان کرنے میں آپ کا اسلوب انتہائی لطیف ہے آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''**المرید لایرید لنفسه الا ما اراد الله له والمراد لا یرید من الکونین شیاً غیره**'' (مرید وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس کے لئے وہی چیز چاہے جو اللہ تعالیٰ اس کیلئے چاہتے ہیں اور مراد وہ شخص ہے جو دونوں جہانوں میں حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کو نہ چاہے) پس ایک تو اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے پر راضی ہوتا ہے تاکہ وہ مرید ہو اور اللہ تعالیٰ کے محبت کا تو کوئی ارادہ ہی نہیں ہوتا چنانچہ وہ حق تعالیٰ کی مراد ہوتا ہے لہذا جو شخص حق تعالیٰ کو چاہتا ہے وہ اس چیز کے علاوہ کسی چیز کا ارادہ نہیں کرے گا جو چیز حق تعالیٰ اس کیلئے چاہئیں گے وہ بھی حق تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کا ارادہ نہیں کرے گا۔ پس حق تعالیٰ کے ارادے پر راضی ہو جانا طالب حق کے مقامات کی ابتدا ہے اور حق تعالیٰ سے محبت اس کے احوال کی انتہا ہے..... اور مقامات کا تعلق عبودیت کے متحقق ہونے سے ہے جب کہ انتہائی درجات کا حصول محض تائید ربانی سے ہوتا ہے اور جب ایسا ہے تو پھر مرید اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے لیکن مراد حق تعالیٰ

کے ساتھ قائم ہوتا ہے..... (واللہ اعلم)

حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی السیاری رحمۃ اللہ علیہ

اور انہی میں سے توحید خداوندی کے خزینہ اور اس کی یکتائی کی طرف رہنمائی کرنے والے بزرگ حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی السیاریؒ بھی ایک ہیں آپ اپنے دور کے بہت بڑے پیشوا اور علوم ظاہری و باطنی کے بلند پایہ عالم تھے آپ نے حضرت ابوبکر واسطیؒ کی صحبت اور دوسرے بہت سے مشائخ سے تربیت کا شرف حاصل کیا تھا آپ طبقہ صوفیاء میں بڑے ممتاز اور صاحب شرف حق تعالیٰ کی محبت میں سب سے زیادہ زاہد تھے۔ آپ کا کلام بلند پایہ اور تصانیف بڑی قابل تعریف ہیں..... آپ کے بارے میں آتا ہے کہ فرمایا "التوحید ان لایخطر بقلبک مادون التوحید" (حق تعالیٰ کی توحید کا حق یہ ہے کہ دل میں اس کے سوا کسی چیز کا گزر ہی نہ ہو) یعنی تیرے دل میں مخلوق بلکہ اپنے معاملے کی صحت وصفائی کا دھیان بھی نہ آئے کیونکہ غیر کا خیال ان کے اثبات کی وجہ سے آتا ہے اور جب غیر ثابت ہوگیا تو گویا مقصد توحید تو ساقط ہوگیا..... آپ ایک علمی اور دولتمند خاندان کے چشم و چراغ تھے اور مرو میں کسی کو بھی آپ کے خاندان پر فوقیت حاصل نہ تھی، آپ نے اپنے والد سے بہت بڑی جائیداد وراثت میں پائی تھی لیکن وہ تمام دولت و میراث دے کر آپ نے حضرت پیغمبر ﷺ کے دو موئے مبارک خرید لئے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان دو بالوں کی برکت سے آپ کو توبہ نصوح کی توفیق نصیب فرمائی اور آپ حضرت ابوبکر واسطیؒ کی صحبت میں داخل ہو گئے اور اس مقام و مرتبہ تک پہنچے کہ صوفیاء کے ایک گروہ کے امام و پیشوا ہو گئے..... جب آپ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو وصیت کی کہ یہ دونوں موئے مبارک میرے منہ میں رکھ دیئے جائیں۔ اس کے اثر سے آج تک آپ کی قبر مرو میں ظاہر ہے اور مرجع خاص و عام ہے، لوگ آپ کے توسط سے اپنی مہمات حق تعالیٰ کے حضور پیش

کرتے ہیں اور اپنی مراد حاصل کرتے ہیں۔

حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

تصوف میں اپنے دور کے بادشاہ اور تصرف وتکلف سے بے نیاز حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیفؒ بھی انہی حضرات تبع تابعینؒ میں سے ایک تھے۔آپ اپنے دور میں علوم کے تمام شعبوں کے امام رہے ہیں مجاہدات میں آپ بڑی شان اور حقائق کے بیان میں مہارت تامہ کے مالک تھے۔آپ کی پرمسرت زندگی اور مرتبہ ومقام آپ کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے۔حضرات ابن عطاشبلیؒ حسین بن منصور جریدیؒ وغیرہ کوآپ نے پایا اور مکہ مکرمہ میں حضرت یعقوب نہر جوریؒ کی صحبت کا فیض حاصل کیا تھا۔مجرد ہونے کی وجہ سے آپ نے بڑے نیک سفر اختیار کئے،آپ کا تعلق شاہی خاندان سے تھالیکن جب اللہ تعالیٰ نے توجہ کی توفیق ارزانی فرمائی تو آپ نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔اہل معانی کے دلوں میں آپ کی بڑی عظمت وبزرگی موجود ہے......آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ''التوحید الا عراض عن الطبیعه ''(اپنی طبیعت سے اعراض کرنے کا نام توحید ہے)اس لئے کہ تمام طبیعتیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محجوب اور نابینا ہوئی ہیں۔پس جب تک طبیعت سے اعراض نہ کیا جائے حق کی طرف توجہ نہیں ہوسکتی اور طبیعت کی طرف توجہ کرنے والا توحید کی حقیقت سے محجوب رہتا ہے اور جب تم نے طبیعت کی خرابیوں کو دیکھ لیا تو توحید کی حقیقت تک رسائی حاصل کرلی......اور آپ کی کرامتیں اور دلیلیں بہت ہیں۔(واللہ اعلم)

حضرت ابوعثمان سعید بن سلام المغربی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرات تبع تابعینؒ میں سے ایک سیف سیادت اور آفتاب سعادت حضرت ابو عثمان سعید بن سلام المغربیؒ بھی ہیں۔آپ اپنے حال پر قابو رکھنے والے بزرگوں میں سے

ایک تھے۔علم کے فنون میں کافی حصہ رکھتے تھے۔تصوف میں صاحب ریاست وسطوت تھے نفس کی برائیوں کو بیان کرنے میں آپ کی بہت سی روایات ہیں اور عمدہ کرامات مشہور ہیں......آپ سے روایت ہے فرمایا ''من اثر صحبة الاغنیاء علی مجالسة الفقراء ابتلا ہ اللہ تعالیٰ بموت القلب ''(جو آدمی فقراء کی مجالس پر دولتمندوں کی صحبت وہم نشینی کو ترجیح دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دل کی موت میں مبتلا کر دیتے ہیں) یعنی جو آدمی فقرا کی مجلسوں میں بیٹھنا چھوڑ کر امراء اور دولتمندوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نور معرفت سے بیگانہ کر دیتے ہیں کیونکہ فقراء سے روگردانی وہی کر سکتا ہے جس نے ابھی تک ان سے مجالست ہی اختیار کی ہو لیکن جو شخص صوفیاء فقراء کی با قاعدہ صحبت اختیار کر لیتا ہے پھر وہ روگردانی نہیں کر سکتا۔ لہذا جو فقراء کی ہم نشینی چھوڑ کر دولتمندوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے اس کا دل نیاز مندی کی موت مر جاتا ہے اور اس کا جسم غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے......پس جب فقراء کی مجالست ترک کر دینے کا ثمرہ دل کی موت ہے تو پھر ان کی صحبت سے روگردانی کا انجام کتنا خطرناک ہوگا؟......ان کلمات سے صحبت اور مجالست کا فرق معلوم ہو جاتا ہے......(واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوالقاسم محمد بن محمود النصر آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور انہی میں سے صوفیاء کے صف اول کے بہادر اور عارفان طریقت کے احوال بیان کرنے والے حضرت ابوالقاسم محمد بن محمود النصر آبادیؒ بھی ہیں آپ نیشاپور میں اسی طرح بلند حال اور عالی مرتبہ تھے جس طرح نیشاپور میں خوارزم شاہ اور حمویہ میں شاہ پور...... فرق یہ تھا کہ ان بادشاہوں کی عزت و مرتبہ اس دنیا میں تھا لیکن آپ کی عزت آخرت میں......آپ کا کلام بڑا عجیب اور کرامتیں بڑی بلند پایہ ہیں آپ حضرت شبلیؒ کے مرید اور اہل خراسان کے متاخرین صوفیاء کے استاد تھے۔اپنے دور میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔فنون

علم میں آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے متقی تھے...... آپ کے بارے میں آتا ہے کہ فرمایا ''انت بین نستین، نسبة الی آدم ونسبة الی الحق فـادا انتسبـت الـی آدم دخـلـت فـی صیـادیں الشهرات ومواضع الافات والـزلات وهی نسبة تحقق البشربه قال الله تعالیٰ انه کان ظلوما جهولا واذا نسبـت الـی الـحق دخلت فی مقامات الکشف والبراهین والعصمة والولایة وهـی نسبة تحقق العبودیة قال الله تعالیٰ و عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هــونــا '' (تو دو نسبتوں کے درمیان ہے ایک نسب آدم علیہ السلام کی طرف اور دوسری حق تعالیٰ کی طرف۔ پس جب تمہاری نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی جائے گی تو تم شہوت کے میدانوں اور خرابیوں اور خطاؤں کے مقامات میں داخل ہو جاؤ گے یہ نسبت تمہاری بشریت کو ثابت کرتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا نادان ہے...... اور جب تم حق تعالیٰ کی طرف اپنی نسبت کرو گے تو کشف، دلائل پاک بازی اور ولایت کے مقامات میں داخل ہو جاؤ گے اور یہ نسبت تمہاری عبدیت کو ثابت کرے گی جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ''اور حق تعالیٰ کے وہ بندے جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں) بندوں کی نسبت حضرت آدمؑ سے تو قیامت کے دن منقطع ہو جائے گی لیکن حق تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کی نسبت ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی تغیر نہیں آئے گا...... جب بندہ اپنے آپ کو اپنی ذات کی طرف یا حضرت آدمؑ کی طرف منسوب کرے تو اس کا کمال یہ ہے کہ یوں کہے ''اِنِّی ظَلَمتُ نفسی'' (میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے) اور جب بندہ اپنی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ کرے تو اس وقت اس مقام میں ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ''یَاعِبَادِ لَاخَوْف عَلَیْکُم الیَوْمَ'' (اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم الحصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

اورانہی حضرات تبع تابعینؒ میں سے ایک راہ حق پر چلنے والوں کے دلی سرداراور تحقیق حق میں مصروف رہنے والوں کے جانوں کا حسن حضرت بوالحسن علی بن ابراہیم الحصریؒ بھی ہیں۔آپ بارگاہ حق کے ذی احتشام بزرگوں اور صوفیاء کے بڑے اماموں میں سے تھے۔اپنے دور میں آپ بے مثال تھے اور تمام معانی طریقت میں آپ کا کلام بلند مرتبہ اور عبارات پسندیدہ ہیں......اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا"**دعونی فی بلائی هاتوا مالکم الستم ملن اولاد آدم الذی خلقه الله تعالیٰ بیده ونفخ فیه من روحه واسجد له ملئکته ثم امره بامر فخالف ناذا کان اول الدنی دریا فکیف کان آخره**"(مجھے میری مصیبت میں چھوڑ دو،لاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہے،کیا تم اس آدمؑ کی اولاد نہیں ہو جس کو حق تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا پھر اسے ایک بات کا حکم دیا تو اس نے اس کی خلاف ورزی کی۔جب مٹکے کی پہلی شراب ہی اس طرح تلچھٹ ہو تو بتاؤ اس کا آخیر کیا ہوگا)یعنی جب آدمی کو اس کی حالت پر چھوڑ دیں تو وہ پوری طرح مخالفت پر اتر آتا ہے لیکن اگر حق تعالیٰ اس پر اپنی نظر عنایت فرمائے رکھیں تو وہ مجسم محبت بن جاتا ہے......لہذا تم حق تعالیٰ کی عنایات کی خوبصورتی کا اندازہ کرو اور اپنے بدمعاملگی کا اس سے مقابلہ کرو اور تمام عمر اسی میں گزاردو......وباللہ التوفیق۔

یہ صوفیاء متقدمین اور ان کے پیشواؤں میں سے بعض بزرگوں کا تذکرہ تھا اگر ہم ان تمام کا ذکر اس کتاب میں کرتے یا اس گروہ کے مذکورہ حالات کی شرح کرتے اور ان کی حکایات بھی لکھتے تو کتاب طویل ہو جاتی اور اصلی مقصد فوت ہو جاتا۔اب ہم متاخرین صوفیاء کے ایک گروہ کے حالات بیان کرتے ہیں......توفیق،حفاظت اور امداد صرف اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔

بارھواں باب

صوفیاء متاخرین کے آئمہ کے ذکر میں

جان لو! اللہ تعالیٰ تمہیں بھلائی نصیب کریں۔ کہ ہمارے اس دور میں ایک طبقہ ایسے لوگوں کا ہے جن میں ریاضت و مجاہدہ کی تو طاقت نہیں پھر بھی ریاضت کے بغیر ہی بزرگی اور فضیلت کے خواہشمند ہیں اور تمام اہل طریقت کو اپنے جیسا ہی سمجھتے ہیں لیکن جب پہلے بزرگوں کی باتیں سنتے ان کی عزت و شرف دیکھتے اور ان کے معاملات کو پڑھتے ہیں اور پھر اپنے اندر نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے بہت دور پاتے ہیں تو اس خواہش کو ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ان کی طرح نہیں ہیں اور نیز کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ان جیسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کا یہ قول سراسر غلط ہے کہ کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین کو کسی دور میں بھی محبت کے بغیر نہیں چھوڑتے اور اس امت کو ہرگز اپنے دوستوں سے خالی نہیں کرتے جیسا کہ پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ "لایزالُ طائفة" مِن امتی علی الخیر والحق حتی تقومُ الساعة" (میری امت میں سے ایک گروہ تا قیام قیامت نیکی اور حق پر قائم رہے گا) اور نیز حضرت پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ "لایزال فی امتی اربعون علی خُلُقِ ابراهیم" (میری امت میں ہمیشہ ایسے چالیس افراد موجود رہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلق پر قائم رہیں گے)...... جس گروہ کا ابھی ہم ذکر کرنے والے ہیں ان میں سے کچھ حضرات تو اس دنیا سے گزر چکے ہیں اور اپنی روح کو راحت و آرام پہنچا چکے ہیں اور کچھ حضرات ابھی تک زندہ ہیں اللہ تعالیٰ ہم سے اور تمام مسلمانوں مرد و زن سے اپنی رحمت کے سبب راضی ہوں۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد القصاب رحمتہ اللہ علیہ

ان متاخرین صوفیاء رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ میں سے ایک راہ ولایت کی رونق جماعت

اہل ہدایت کا حسن حضرت ابو العباس احمد بن محمد القصابؒ ہیں۔ کہ آپ نے ماوراء النہر کے مقتدمین صوفیاء کی زیارت کی اور ان کی صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ آپ عالی مرتبے سچی فراست، کثرت برہان اور زہد و کرامت میں بڑے مشہور و معروف تھے۔ طبرستان کے امام حضرت ابو عبداللہ خیاطیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فضیلتوں میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کو تسلیم حاصل کئے بغیر وہ مقام عطا فرمادیں کہ جب ہم کو دین کے اصولوں اور توحید کی باریکیوں کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے تو ہم اس سے دریافت کریں اور وہ حضرت ابو العباس قصابؒ کی شخصیت ہے۔ آپ بالکل امی تھے پھر بھی آپ کا کلام اور گفتگو اصول دین اور علم تصوف میں بڑی بلند مرتبہ ہوتی تھی اور آپ اپنے ابتدائی اور انتہائی تمام حالات میں عالی حال اور نیک سیرت تھے۔ میں نے ان کی بہت سی حکایات سنی ہیں لیکن اس کتاب میں ہم اختصار کے طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بوجھ سے لدے اونٹ کی مہار پکڑے ایک لڑکا آمل کے بازار جہاں ہر وقت کیچڑ رہتا تھا سے گزر رہا تھا کہ اونٹ کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پر گر پڑا جس سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے اونٹ کی پیٹھ سے بوجھ اتارنے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ لڑکا ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو مدد کیلئے پکار رہا تھا اتنے میں اتفاقاً حضرت شیخ ابو العباسؒ اس طرف آنکلے اور پوچھا کہ ”کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ اونٹ کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے آپ نے اونٹ کی مہار تھامی اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر دعا کی ”بار خدایا اس اونٹ کی ٹانگ درست فرمادے کہ اگر اس کو درست نہیں کرنا چاہتا تو پھر اس لڑکے کے رونے سے قصاب کے دل کو تو نے کیوں بے قرار کر دیا ہے؟ آپ کا یہ کہنا تھا کہ اسی وقت اونٹ اٹھ کھڑا ہوا اور چلنے لگا...... اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا ”تمام لوگوں کو حق تعالیٰ کی تقدیر پر بہر صورت راضی رہنا چاہئے ورنہ وہ رنجیدہ رہیں گے کیونکہ اگر تو اس کی تقدیر پر راضی ہوگا تو مصیبت کے وقت آزمائش میں ڈالنے والے کی طرف دیکھے گا اور اس طرح تجھے اس مصیبت پر تکلیف نہ ہوگی لیکن اگر تو تقدیر الٰہی پر راضی نہ رہے گا تو بلا تو ضرور آئے گی کیونکہ

اللہ تعالیٰ ہماری رضامندی یا نہ رضامندی سے اپنی مقررہ تقدیر کو تبدیل نہیں کرتے تو اس طرح تو رنجیدہ خاطر رہے گا۔ پس ہمارا اس کے فیصلوں پر راضی رہنا ہماری راحت کا سبب ہے، اور جو شخص اس کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے اس کا دل آرام پاتا ہے اور جو کوئی اس کی تقدیر سے روگردانی کرتا ہے وہ اس کی تقدیر کے وارد ہونے پر رنجیدہ ہوتا ہے...... واللہ اعلم

حضرت ابوعلی بن الحسین بن محمد الدقاق رحمتہ اللہ علیہ

مریدوں کا بیان اور محققین کی برھان حضرت ابوعلی بن الحسین بن محمد الدقاقؒ بھی انہی متاخرین صوفیاء کرام میں سے ایک ہیں۔ آپ اپنے فن کے امام اور اپنے دور کے بے مثل انسان تھے۔ راہ حق کے بیان کرنے میں آپ کا بیان بڑا واضح اور زبان بڑی فصیح تھی۔ آپ نے بہت سے مشائخ کی زیارت کی اور ان سے صحبت کا شرف حاصل کیا تھا۔ آپ حضرت نصر آبادیؒ کے مرید تھے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''مَنْ اَنس بغیرہ ضَعف فِي حَالِهٖ وَمَنْ نَطَقَ مَن غیرہ كَذَبَ فِي مقالِهٖ'' (جس نے غیر حق کے ساتھ انس کیا وہ اپنے حال میں ضعیف ہو گیا اور جس نے غیر اللہ کی طرف سے نطق کیا اس نے اپنے کلام میں جھوٹ بولا) کیونکہ حق تعالیٰ کے علاوہ کسی سے انس کرنا معرفت حق کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور حق تعالیٰ سے انس کرنا غیر سے وحشت کرنا ہے اور غیر سے وحشت محسوس کرنے والا غیر اللہ کی طرف سے بول نہیں سکتا۔ میں نے ایک بزرگ سے سنا ہے کہ ایک دفعہ میں ان کی محفل میں حاضر ہوا تاکہ آپ سے متوکلین کے حال سے متعلق دریافت کروں آپ نے اس وقت بڑی عمدہ دستار پہن رکھی تھی میرے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوگئی تاہم میں نے سوال کیا کہ ''اَیھا الا ستادما التوکل'' (اے استاد توکل کیا ہے؟) آپ نے فرمایا۔ توکل یہ ہے کہ تو لوگوں کی دستار کی طمع نہ کرے یہ کہہ کر آپ نے اپنی دستار اتار کر میرے سامنے ڈال دی۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانی رحمۃ اللہ علیہ

متاخرین صوفیاء میں سے ایک اہل زمانہ کا شرف اور اپنے دور کے یگانہ صفت بزرگ حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانی'' بھی ہیں کہ آپ متقدمین مشائخ میں سے بڑے بزرگ اور اپنے وقت کے تمام اولیاء کرام کے ہاں قابل تعریف تھے۔ حضرت شیخ ابوسعید'' نے آپ کی زیارت کا ارادہ کیا اور آپ کے ساتھ گفتگو کی تو ہر فن میں آپ کا کلام انتہائی عمدہ اور لطیف پایا جب واپس جانے لگے تو آپ نے فرمایا ''میں نے تمہیں اپنے دور کی ولایت کیلئے منتخب کرلیا ہے'' میں نے حضرت شیخ ابوسعید'' کے خادم حضرت حسین مودب سے سنا ہے کہ جب شیخ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ بالکل خاموش بیٹھے رہے اور آپ کی گفتگو غور سے سنتے رہے اور آپ کی باتوں کے جواب دینے کے علاوہ کسی قسم کی کلام نہ کی، میں نے دریافت کیا کہ اے شیخ آپ کس وجہ سے خاموش ہو گئے تھے؟ فرمایا کہ ایک وقت میں ایک ہی باتیں کرنے والا کافی ہوتا ہے اور میں نے حضرت استاد ابوالقاسم قشیری'' سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا۔ جب میں ولایت خرقان میں داخل ہوا تو اس پیر کامل حضرت خرقانی'' کی حشمت و رعب کی وجہ سے میری فصاحت ختم ہو گئیں اور مجھ میں بیان کرنے کی طاقت باقی نہ رہی۔ میں نے یہ سمجھا کہ شاید میں اپنی ولایت سے معزول ہو گیا ہوں...... اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا'' راستے دو ہی ہیں، ایک گمراہی کا راستہ اور دوسرا ہدایت کا، گمراہی کا راستہ وہ ہے جو خود بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور ہدایت کا راستہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف ہے (یعنی) جو بندہ یہ کہتا ہے کہ میں حق تعالیٰ تک پہنچ گیا ہوں وہ درحقیقت نہیں پہنچا اور جو بندہ یہ کہے کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنی ذات تک رسائی نصیب فرمائی ہے تو وہ واقعی حق تعالیٰ تک پہنچ گیا ہے کیونکہ اس راہ میں پہنچنا نا پہنچنا اور نا پہنچنا پہنچنا ہے۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اپنے وقت کے بادشاہ اور مطالب ومعانی بیان کرنے میں یکتا حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بالداعستانی مقیم بہ بسطام بھی انہیں صوفیا متاخرین میں سے ایک ہیں۔ آپ جملہ علوم ظاہری و باطنی کے مایہ ناز عالم اور بارگاہ الٰہی کے ذی احتشام بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا کلام بڑا مہذب اور اشارے انتہائی لطیف ہیں۔ اس مسلک کے امام اور نیک سیرت بزرگ حضرت شیخ سہلکیؒ سے میں نے آپ کے کلام کی کچھ باتیں سنی ہیں جو بڑی ہی بلند اور پسندیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں "التوحید عنک موجود وانت فی التوحید مفقود" (توحید تو تجھ سے درست ہے لیکن تو خود توحید میں درست نہیں ہے) کیونکہ تو حق تعالیٰ کے تقاضوں کے مطابق اس میں قیام نہیں کرتا۔

اور توحید میں ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ تو اپنی ملکیت میں اپنا تصرف چھوڑ دے اور اپنے تمام معاملات کو حق تعالیٰ عزوجل کے سپرد کر دے...... اور حضرت شیخ سہلکیؒ نے بیان کیا کہ بسطام میں ایک مرتبہ ٹڈی دل آیا اور اس کی کثرت سے تمام درخت اور کھیتیاں سیاہ ہو گئیں۔ چنانچہ لوگوں نے فریاد کرنا شروع کر دی۔ شیخ نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ میں نے بتایا کہ ٹڈی دل آ گیا ہے اور لوگ اس کی وجہ سے انتہائی پریشان ہیں۔ یہ سن کر شیخ چھت پر تشریف لے گئے اور اپنا منہ آسمان کی طرف کر لیا۔ اسی وقت تمام ٹڈی دل چلا گیا۔ حتیٰ کہ نماز عصر تک ایک دانہ بھی باقی نہ رہا اور کسی کا ایک پتہ تک نقصان نہ ہو۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوسعید فضل بن محمد المہیمنی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور انہی میں سے محبان خدا کے شہنشاہ اور صوفیاء کے بادشاہوں کے بادشاہ حضرت ابوسعید فضل بن محمد المہیمنیؒ بھی ایک ہیں۔ آپ اپنے وقت کے سلطان اور طریقت کا

جمال تھے، تمام اہل زمانہ آپ کے تابع فرمان تھے کچھ لوگ آپ کے حسن و جمال کے فریفتہ اور ایک گروہ آپ کے حسن اعتقاد کا قائل اور ایک گروہ آپ کی قوت حال سے مرعوب تھا، آپ ظاہری و باطنی جملہ علوم کے بہت بڑے ماہر اور روحانی اسرار و رموز کی آگاہی میں آپ بہت بڑی شان کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ آپ کی کرامات، آثار اور دلائل بہت زیادہ ہیں چنانچہ آج تک دنیا میں آپ کے آثار نمایاں ہیں۔ آپ اپنے ابتدائی حالات میں حصول علم کیلئے مہنہ سے سرخس تشریف لائے اور حضرت ابوعلی زاہدؒ سے تعلق قائم کیا اور ایک دن میں تین دن کا سبق لیتے اور وہ تین دن عبادت میں گزار دیتے۔ یہاں تک کہ امام ابوعلی زاہدؒ آپ کے اندر رشد و ہدایت کے نمایاں آثار دیکھ کر آپ کی پہلے سے زیادہ عزت و تکریم کرنے لگے..... کہتے ہیں کہ ان دنوں شیخ ابوالفضل حسنؒ سرخس کے حاکم تھے۔ حضرت ابوسعیدؒ ایک روز ندی کے کنارے جا رہے تھے کہ شیخ ابوالفضل حسینؒ نے آپ کے سامنے آ کر کہا کہ اے ابوسعید یہ تمہاری راہ تو نہیں جس پر تم چل رہے ہو" اپنے راستہ پر چلو! آپ نے شیخ ابوالفضلؒ سے اپنا تعلق قائم نہ کیا اور اس جگہ سے واپس اپنی جگہ پر آ کر ریاضت اور مجاہدے میں مصروف ہو گئے حتی کہ حق تعالیٰ نے آپ پر ہدایت کا دروازہ کھول دیا اور آپ کو بڑے اعلیٰ درجے تک رسائی نصیب فرمائی..... حضرت شیخ ابومسلم فارسیؒ سے میں نے سنا ہے کہ میرا آپ کے ساتھ ہمیشہ کچھ جھگڑا رہا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں آپ کی زیارت کیلئے گیا اس وقت میرے جسم پر ایک گدڑی تھی جو میل کچیل سے چمڑے کی طرح ہو گئی تھی۔ اسے اوڑھ کر جب میں آپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ آپ تخت پر بیٹھے ہیں اور مصر کا ریشمی لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ان دنیاوی تعلقات اور علائق کے ہوتے ہوئے یہ فقیری کے مدعی ہیں جب کہ میں دنیوی علائق سے مجرد اور علیحدہ رہ کر فقیری کا مدعی ہوں۔ میری اس شخص کے ساتھ کس طرح موافقت ہو سکتی ہے؟ آپ میرے اس خیال سے آگاہ ہو گئے اور سر اٹھا کر فرمایا "یا ابا مسلم فی ایّ دیوان وجدت

مَنْ کَانَ قَلْبُہٗ قَائِمًا فی مشاھَدۃِ الحق یقعُ علیہ اسم الفقیر "(اے ابومسلم تم نے کس دیوان میں یہ پایا ہے کہ جس آدمی کا دل مشاہدہ حق میں قائم ہو اس پر فقیر کا اسم واقع ہو سکتا ہے) یعنی اصحاب مشاہدہ حق تعالیٰ کے ساتھ غنی ہوتے ہیں اور فقرا تو ارباب مجاہدہ ہوتے ہیں۔ حضرت ابومسلمؒ کہتے ہیں کہ میں اپنے اس خیال سے بڑا پشیمان ہوا اور اس ناپسندیدہ خیال سے توبہ کی...... اور آپ سے روایت ہے کہ فرمایا "التصوف قیام القلب مع اللہ بلاواسطہ" (دل کے حق تعالیٰ کے ساتھ بلاواسطہ قائم ہو جانے کا نام تصوف ہے) اور یہ مشاہدہ کی طرف اشارہ ہے اور مشاہدہ محبت کے غلبے شوق دیدار میں استغراق اور حق کے بقا سے صفت کے فنا کا نام ہے" کتاب الحج میں مشاہدہ اور اس کے وجود سے متعلق انشاءاللہ میں ایک مستقل باب لکھوں گا...... ایک مرتبہ آپ نے نیشاپور سے طوس کے سفر کا ارادہ کیا۔ دشوار گزار پہاڑی راستے میں سخت سردی تھی حتیٰ کہ آپ کے پاؤں موزوں کے اندر بھی سردی محسوس کرتے تھے ایک درویش کہتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ اپنی اس چادر کے دو ٹکڑے کر کے آپ کے پاؤں پر لپیٹ دوں۔ لیکن میرے دل نے نہ چاہا کیونکہ یہ چادر بڑی عمدہ تھی۔ جب ہم طوس میں پہنچ گئے تو مجلس میں میں نے سوال کیا کہ مجھے الہام اور شیطانی وسوسے کے درمیان فرق بتایئے؟ آپ نے فرمایا "الہام تو وہ تھے جس نے تیرے دل میں چادر پھاڑ کر ابوسعید کے پاؤں کے گرد لپیٹ دینے کی آرزو پیدا کی تاکہ وہ سردی سے محفوظ ہو جائیں اور شیطانی وسوسہ وہ ہے جس نے تجھے اس نیک کام سے روکے رکھا...... اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں جو آپؒ سے ظاہر ہیں لیکن ہم طوالت کے خوف سے انہیں چھوڑتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ حضرت ابوالفضل محمد بن الحسن الختلیؒ بھی انہی

صوفیا متاخرین میں سے ایک ہیں۔ طریقت میں میں انہی کی اقتدا کرتا ہوں آپ علم تفسیر اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے اور تصوف میں حضرت جنیدؒ کا مذہب رکھتے تھے آپ حضرت مصریؒ کے مرید راز دار اور حضرت ابوعمر قزوینیؒ و حضرت ابوالحسن بن سالبہؒ کے ہمعصر تھے آپ ساٹھ سال تک سچی خلوت پسندی کی وجہ سے پہاڑوں میں دوڑتے رہے اور اپنے آپ کو لوگوں میں گمنام کر لیا۔ زیادہ عرصہ آپ نے کوہ لگام میں بسر کیا آپ نے بڑی اچھی عمر پائی، اور آپ کی کرامات و براہین بہت ہیں لیکن آپ صوفیانہ لباس اور رسوم کے پابند نہ تھے بلکہ اہل رسم کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ میں نے آپ سے زیادہ پر ہیبت انسان نہیں دیکھا...... آپ سے روایت ہے کہ فرمایا'' الدنیا یوم و لنا فیھا صوم '' (یہ دنیا دن ہے اور ہم خود اس میں روزہ دار ہیں) یعنی ہم اس میں سے نہ کوئی حصہ لیتے ہیں اور نہ اس میں الجھتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے اس کی خرابی کو دیکھ لیا ہے اور اس کے پردوں سے واقفیت حاصل کر کے ہم نے اس سے منہ موڑ لیا ہے...... میں ایک دفعہ آپ کے ہاتھ دھلا رہا تھا کہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جب تمام معاملات تقدیر اور حق تعالیٰ کی تقسیم پر موقوف ہیں تو پھر آزاد منش لوگ اپنے آپ کو کرامت کی امید پر پیروں کا غلام کیوں بنا لیتے ہیں؟...... آپ نے فرمایا'' بیٹا تم نے جو کچھ خیال کیا ہے مجھے اس کا علم ہو گیا ہے چنانچہ جان لے! کہ ہر حکم کا ایک سبب ہوتا ہے جب حق تعالیٰ کسی بچے کو ولایت کا تاج اور حکومت دینے کا ارادہ فرماتے ہیں تو پہلے اس کو توبہ کی توفیق نصیب فرماتے ہیں اور پھر اس کو اپنے کسی دوست کی خدمت میں بھیج دیتے ہیں تاکہ اس کی یہ خدمت اس کیلئے کرامت کا سبب بن جائے...... ایسے ہی بہت سے لطائف روزانہ ہم پر ظاہر ہوتے تھے...... جس روز آپ کی وفات ہوئی آپ بانیان اور دمشق کے درمیان ایک گھاٹی سے ملحقہ گاؤں بیت الجن میں قیام پذیر تھے اور میری گود میں آپ نے اپنا سر رکھا ہوا تھا۔ عام عادت کے مطابق ایک سچے دوست کی جدائی کا میرے دل پر شدید اثر اور رنج تھا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا'' بیٹا میں تجھے

اعتقاد کا ایک مسئلہ بتاتا ہوں اگر تو نے اپنے آپ کو اس کے مطابق درست کر لیا تو تو ہر قسم کے رنج و غم سے چھوٹ جائے گا جان لے! کہ نیک و بد ہر قسم کے حالات اور مقامات حق تعالیٰ ہی پیدا فرماتے ہیں اس لئے تمہیں اس کے کسی فعل پر نہ تو جھگڑا کرنا چاہئے اور نہ ہی دل میں رنج کرنا چاہئے اس کے علاوہ آپ نے کوئی لمبی وصیت نہ فرمائی اور جان دے دی...... (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ

انہی میں سے ایک مسلمانوں کے استاد امام اور اسلام کی زینت حضرت ابوالقاسم عبدالکریم ابن ہوازن القشیری ؒ بھی ہیں۔ آپ اپنے دور میں یکتا۔ بلند مرتبہ اور عالی مقام بزرگ تھے۔ اہل زمانہ آپ کی فضیلتوں اور بزرگی سے بخوبی واقف ہیں۔ تمام فنون میں آپ کے لطائف بہت ہیں اور بڑی عمدہ و تحقیقی تصنیفات موجود ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کے حال اور زبان کو فضولیات سے محفوظ فرما دیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے سنا تو آپ فرما رہے تھے "**مثل التصوف کعلة البرسام اوله هذیان و اخره سکوت و اذ تمکن خرس**" (تصوف کی مثال مرض برسام کی طرح ہے کہ اس کی ابتدا ہذیان گوئی اور انتہا خاموشی ہے اور جب مضبوط ہو گئی۔ تو گونگا پن ہو گیا) پس صفوت کے دو پہلو ہیں ایک وجد اور دوسرا نمود۔ نمود مبتدی حضرات کیلئے ہے اور نمود میں نمود سے عبارت ہذیان گوئی ہوتا ہے اور وجد منتہی حضرات کیلئے ہے اور وجد کی حالت میں وجد سے عبادت محال ہے۔ پس جب تک وہ طالب حق ہوتے ہیں اپنے بلند مقصد کے سبب ناطق ہوتے ہیں اور ہمت و نطق میں اہل آرزو کو ان کا نطق ہذیان معلوم ہوتا ہے اور جب وہ انتہا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر تمام باتوں سے خلاصی پا جاتے ہیں یہاں تک کہ ان میں بیان کرنے بلکہ اشارہ کرنے کی ہمت بھی باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال وہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی مبتدی تھے اور

ان کی تمام ہمت صرف رویت حق تک ہی تھی اس لئے آپ نے اس قصد کو بیان کرتے ہوئے درخواست کی کہ "رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ" (اے میرے رب مجھے اپنا دیدار نصیب کرتا کہ میں تجھے دیکھوں) آپ کی یہ عبارت مقصود کے حاصل نہ ہوسکنے کے سبب ہذیان اور بے فائدہ دکھائی دیتی ہے۔لیکن ہمارے رسول ﷺ چونکہ منتہی اور متمکن تھے اس لئے جب آپ کی شخصیت مقام ہمت تک پہنچ گئی اور آپ کی ہمت فانی ہوگئی تو آپ نے فرمایا "لا اُحصی ثناءً علیک" (اے اللہ! میں تیری حمد وثنا نہیں کرسکتا) اور یہ منزل بڑی بلند اور مقام انتہائی عالی ہے۔(واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد رحمتہ اللہ علیہ

شیخ وامام یکتا اور اپنے طریق میں منفرد حضرت ابوالعباس احمد بن محمد الاشقانی ؒ بھی انہی متاخرینؒ میں سے تھے۔آپ علم اصول وفروع کے تمام شعبوں میں امام تھے طریقت کے تمام معانی ومطالب میں کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔آپ نے بہت سے مشائخ کی زیارت کی اور خود بھی جلیل القدر اہل تصوف میں شمار ہوتے تھے۔اپنے طریق کو مشکل عبارت میں فنا سے تعبیر کرتے تھے اور اس عبارت میں آپ ہی مخصوص تھے میں نے جاہلوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ ان عبارات میں آپ کی تقلید کرتا ہے اور آپ کے مشکل اور مبہم کلمات کو اختیار کر رکھا ہے حالانکہ تقلید تو معنی میں بھی ناپسندیدہ ہے بھلا عبارت میں تقلید کیسے درست ہوسکتی ہے۔مجھے آپ سے بڑا انس تھا اور آپ بھی مجھ پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔بعض علوم میں آپ میرے استاد بھی ہیں۔میں نے اپنی زندگی میں کسی گروہ کے کسی فرد کو آپ سے زیادہ شریعت کی تعظیم کرنے والا نہیں دیکھا۔آپ نے تمام موجودات سے قطع تعلق کر رکھا تھا......علم اصول میں آپ کی مشکل علمی عبادات کی وجہ سے کسی امام محقق کے علاوہ کسی کو آپ سے فائدہ نہ ہوتا تھا......آپ کی طبیعت دنیاوعقبیٰ سے ہمیشہ متنفر رہی،

اور جوش میں ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اشتھی عدمًا لاوجود لہ'' (میں ایسا عدم چاہتا ہوں جس کیلئے کوئی وجود نہ ہو) اور فارسی میں فرمایا کرتے تھے کہ ''ہر آدمی کو جس طرح ہونا چاہئے وہ نہیں ہوسکتا اور مجھے بھی جیسا ہونا چاہئے ایسا ہونا محال ہے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا اور وہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس عدم میں لے جائے جس کیلئے ہرگز وجود نہ ہو کیونکہ مقامات وکرامات میں سے جو کچھ بھی ہے۔حجاب اور بلا کا محل ہے۔اور بندہ اپنے حجاب کا ہی عاشق ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ آرزوئے دیدار میں بندے کا فنا ہو جانا اس آرام سے بہتر ہے جو حجاب کے ساتھ ہو اور چونکہ حق تعالیٰ ایسی ذات ہے کہ جس پر عدم کا اطلاق جائز ہی نہیں اس لئے اگر میں اس کے ملک میں نیست ہو جاؤں تو کیا نقصان ہے؟ کیونکہ میری اس فنا کو کبھی وجود نہیں ہوگا...... اور صحت فنا میں یہ اصل بڑی ہی قوی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمتہ اللہ علیہ

قطب زمانہ اور اپنے زمانہ میں پیر یگانہ حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی ؒ بھی انہی حضرات متاخرینؒ میں سے ایک تھے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔آپ اپنے وقت میں بے مثل اور اپنے دور میں بے بدل بزرگ تھے۔آپ کی ابتدائی حالت بڑی اعلیٰ اور بلند تھی۔آپ نے بڑی کڑی شرائط کے ساتھ طریقت کی خاطر بڑے کٹھن سفر اختیار کئے۔اس دوران تمام اہل درگاہ کے دل آپ کی طرف متوجہ تھے اور تمام طالبان حق کا اعتقاد آپ پر تھا۔آپ کو مریدوں کے واقعات کے کشف میں بڑی مہارت حاصل تھی اور تمام فنون علم میں آپ کی نشانیاں بڑی واضح ہیں۔آپ کے مریدوں میں سے ہر ایک اپنے زمانے کی زینت رہا ہے اور انشاءاللہ آپ کے خلفا بھی قوم کے پیشوا ہوں گے۔آپ لسان الوقت یعنی مستجاب الدعوات تھے۔حضرت ابوعلی ابوالفضل بن محمد انصار مدنی ؒ کو جنہوں نے

اپنا تمام حصہ آپ کے حق میں چھوڑ دیا تھا اور تمام دنیا سے روگردانی کر لی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ ہی کی زبان حال کی برکت سے سید و سردار بنا دیا تھا...... میں ایک روز حضرت شیخ کے سامنے بیٹھا اپنے مشاہدات و احوال آپ کے سامنے پیش کر رہا تھا تا کہ کھوٹے اور کھرے کی مجھے پرکھ حاصل ہو جائے کیونکہ آپ ہی اس دور کے ناقد تھے اور آپ بڑی حرمت کے ساتھ ان باتوں کو سن رہے تھے میں اپنی جوانی کے جوش اور بچپن کے غرور کی بنا پر ان باتوں میں حریص ہوا جا رہا تھا اس طرح کہ شاید حضرت شیخ کو ابتدا میں ان حالات سے واسطہ ہی نہیں پڑا کہ آپ میرے معاملے میں اتنی عاجزی و انکساری سے کام لے رہے ہیں۔ آپ نے میرے باطن میں دیکھا اور فرمایا اے دوست! میری یہ عاجزی تیرے یا تیرے احوال کی وجہ سے نہیں کیونکہ اصول کو تبدیل کرنا بڑا مشکل ہے بلکہ میں یہ انکساری اور گڑگڑاہٹ احوال کو تبدیل کرنے والے مریدوں کو آداب صحت سکھانے کیلئے کرتا ہوں اور یہ سب طالبان حق کیلئے برابر ہے نہ کہ خاص تیرے لئے۔ جب میں نے یہ بات سنی تو حیران رہ گیا...... آپ نے ایک دفعہ مجھے دیکھ کر فرمایا ''اے بیٹا! آدمی کو طریقت میں اس سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا کہ جب کسی کو اس کا پیر طریقت سے وابستہ کرتا ہے تو اس کو طریقت کے حاصل کر لینے کا غرور پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جب پیر اس کو طریقت سے معزول کر دے تو وہ اپنے غرور کو بیان کرنے میں بھی بند ہو جاتا ہے پس اس کا حق تعالیٰ کے ماسویٰ کی نفی کرنا اور وجود باری تعالیٰ کو ثابت کرنا بلکہ اپنا وجود و عدم سب کا سب غرور اور زعم باطل ہوتا ہے اور انسان زعم باطل کی قید سے آزاد نہیں ہوتا اس لئے اس کو چاہئے کہ درگاہ عبودیت کو لازم پکڑے اور بندگی کی نسبت کے علاوہ تمام نسبتوں کو اپنے آپ سے دور کر دے...... اس واقعہ کے بعد بھی آپ کے بہت سے اسرار مجھ پر ظاہر ہوئے اور اگر میں آپ کی کرامات کے بیان کرنے میں مشغول ہو جاؤں تو اصل مقصد بیان کرنے سے قاصر رہ جاؤں گا (واللہ اعلم)

حضرت ابواحمد المظفر بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ

اورانہی حضرات صوفیاء متاخرینؒ میں سے ایک اولیاء کے رئیس اوراہل صفاء کے ناصح حضرت ابواحمد المظفر بن حمدانؒ بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسند ریاست پر ہی آپ کیلئے اس طریقت کی راہیں کشادہ فرمادی تھیں اور آپ کے سر پر کرامت کا تاج رکھ دیا تھا۔ فنا و بقا میں آپ کا بیان بڑا عمدہ اور عبارت بڑی بلند مرتبہ ہوتی تھی۔ حضرت شیخ المشائخ ابوسعیدؒ فرماتے تھے کہ ہم بندگی کی راہ سے حق تعالیٰ کی درگاہ تک پہنچتے ہیں جب کہ خواجہ مظفر خداوندی کی راہ سے..... یعنی ہم نے تو مجاہدہ سے مشاہدہ حق کا مقام حاصل کیا ہے لیکن وہ مشاہدۂ حق سے مشاہدہ کی طرف آئے ہیں..... میں نے آپ سے سنا ہے کہ فرمایا کہ جو کچھ دوسرے بزرگوں کو وادیوں اور جنگلوں کو قطع کرنے سے میسر آیا ہے مجھے وہ مسند نشینی اور ریاست کے دوران ہی مل گیا ہے..... اہل رعونت آپ کے اس قول کو محض دعویٰ پر ہی محمول کرتے ہیں لیکن یہ ان کی کوتاہی فہم ہے کیونکہ اہل معانی کا اپنی کسی حالت کی خبر دینا ہرگز محض دعویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتا۔ آپ کے نیک خلفاء آج تک باقی اور موجود ہیں..... اور بزرگوار خواجہ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو نیشاپور کے مدعیوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا کہ طالب پہلے فانی ہو جائے تب باقی ہوتا ہے۔ خواجہ مظفرؒ نے فرمایا کہ "فنا پر بقا کیسے متصور ہو سکتی ہے کیونکہ فنا تو نیستی سے عبارت ہے اور بقا ہستی کی طرف اشارہ ہے اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نفی کرتا ہے پس فنا معلوم ہے تاہم جب یہ نیست ہو جائے پھر اگر ہست ہو بھی تو یہ بعینہ وہ نہ ہوگی بلکہ وہ خود کوئی دوسری ہی چیز ہو گی اور یہ درست نہیں کہ ذوات یعنی اصل ہی فانی ہو جائیں البتہ صفت اور سبب کا فنا ہونا درست ہے۔ پس جب صفت و سبب فنا ہو جائیں تو موصوف اور مسبب باقی رہتا ہے اور اس کی ذات پر فنا کا وارد ہونا درست نہیں۔ میں علی بن

عثمان کہتا ہوں کہ مجھے حضرت خواجہ کی عبارت بلفظ تو یاد نہیں تاہم معنی وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں اور میں اس عبارت کی مراد زیادہ واضح کر دیتا ہوں تا کہ عام فہم ہو جائے، پس مراد اس سے یہ ہے کہ بندہ کا اختیار اس کی اپنی صفت ہے اور وہ اپنے اختیار کی بدولت حق تعالیٰ کے اختیار سے محجوب ہے پس بندہ کی اپنی صفت اس کیلئے حق تعالیٰ سے حجاب ہے اور لامحالہ حق تعالیٰ کا اختیار ازلی ہے اور بندہ کا اختیار حادث اور ازلی پر فنا درست نہیں اور جب حق تعالیٰ کا اختیار بندہ کے حق میں بقا حاصل کر لے گا تو لامحالہ اس کا اپنا اختیار فانی اور اس کا تصرف منقطع ہو جائے گا...... (واللہ اعلم)

گرمیوں کے موسم میں ایک دفعہ میں سفر کا لباس پہنے پریشان حال آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا ''ابوالحسن! مجھے بتاؤ اس وقت تمہارا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا'' میرے لئے سماع کی محفل ہونی چاہئے! آپ نے اسی وقت آدمی بھیج کر ایک قوال اور اہل عشرت کی ایک جماعت کو بلوایا'' میرے بچپن کی گرمی اور قوت وارادہ اور محبت کی سوزش نے ابتدا ہی میں سماع کے اندر میری حالت کو مضطرب کر دیا۔ جب کچھ وقت گزر گیا اور اس آفت کے جوش دغلبہ میں کچھ کمی واقع ہوئی تو آپ نے مجھے فرمایا ''تمہارے لئے یہ سماع کیسا رہا؟ میں نے عرض کیا۔ شیخ مجھے بہت ہی پسند آیا'' فرمایا'' ایک وقت آئے گا کہ یہ راگ اور گویے کی آواز تمہیں ایک جیسی محسوس ہو گی۔ کیونکہ سماع کی قوت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک مشاہدہ حق حاصل نہ ہو۔ جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو پھر سماع کی قوت ختم ہو جاتی ہے، یاد رکھو! اس سماع کو اپنی عادت نہ بنالینا کہ یہ تمہاری طبیعت ثانیہ ہی بن جائے اور اس طرح اپنے اصل مقصود سے ہی باز رہ جاؤ...... (واللہ اعلم بالصواب)

تیرھواں باب

متاخرین صوفیا کرام کا مختصر تذکرہ

مختلف شہروں میں موجود تمام صوفیاء کرام کے حالات اگر بیان کروں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی اور اگر سب کو نظر انداز کر دوں تو کتاب کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لئے میں اپنے عہد کے ان صوفیاء اور مشائخ کے مختصر حالات بیان کرتا ہوں جو ارباب معانی ہیں اور اہل رسوم کی بجائے صرف اسرار ربانی سے واقف حضرات کا تذکرہ کرتا ہوں تا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو تو اپنی مراد کے حصول سے زیادہ قریب ہو جاؤں چنانچہ وہ یہ حضرات ہیں!

متاخرین صوفیاء اہل شام و عراق

(۱) حضرت شیخ زکی بن العلاؒ اپنے دور کے بزرگ مشائخ اور سادات میں سے تھے میں نے آپ کو محبت کے شعلوں یں سے ایک شعلہ جوالہ کی مانند پایا۔ آپ کی براہین اور کرامات بڑی ظاہر ہیں..... (۲) حضرت شیخ بزرگوار ابو جعفر محمد بن المصباح العیدلانی صوفیاء کے رئیس حضرات میں سے تھے آپ حطارف کی تحقیق میں کامل مہارت کے مالک تھے اور زبان بڑی ہی خوب پائی تھی۔ آپ حضرت حسین بن منصور حلاجؒ کے ساتھ بڑی عقیدت اور میلان طبع رکھتے تھے۔ میں نے آپ کی بعض تصانیف خود آپ ہی سے پڑھی ہیں...... (۳) حضرت ابو القاسم سدسی کہ آپ صاحب مجاہدہ اور بڑے نیک حال بزرگ تھے درویشوں کے نگران اور ان کے ساتھ اچھا اعتقاد رکھنے والے تھے۔

صوفیاء اہل فارس

(۱) حضرت شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سالبہ۔ تصوف میں بڑے فصیح اللسان اور مسئلہ توحید میں بڑے ہی واضح بیان کے مالک بزرگ تھے آپ کے کلمات بڑے مشہور ہیں...... (۲) حضرت شیخ مرشد ابو اسحاق ابن شہریار صوفیا میں صاحب حشمت تھے اور انتظامی امور کا پورا ملکہ رکھتے تھے...... (۳) حضرت شیخ طریقت ابوالحسن علی بن بکرانؒ بزرگ صوفیاء میں سے تھے (۴) حضرت شیخ ابومسلم ہرویؒ وقت کے پسندیدہ اور نیک حال بزرگ تھے...... (۵) حضرت شیخ ابوالفتحؒ اپنے والد محترم کے نیک خلف الرشید اور سچے امیدوار تھے...... (۶) اور حضرت شیخ ابوطالبؒ کلمات حق کے گرفتار بزرگ تھے...... باقی ان میں سے شیخ الشیوخ حضرت ابواسحاقؒ کی میں نے زیارت نہیں کی۔

قہستان آذربیجان اور طبرستان کے صوفیاء

۱۔ شیخ شفیق فرح معروف باضی زنجانیؒ ایک نیک سیرت اور پسندیدہ طریقت کے بزرگ تھے، (۲) شیخ وندریؒ اس گروہ کے بزرگوں میں سے ہیں اور آپ کے نیک کام بے شمار ہیں۔ (۳) بادشاہ تائب راہ حق کے تیز رفتار صوفی ہیں۔ (۴) شیخ ابوعبداللہ جنیدیؒ۔ نرم دل اور قابل احترام بزرگ ہیں۔ (۵) شیخ ابوطاہر مکشوف اس دور کے بڑے بزرگوں میں سے ہیں...... (۶) خواجہ حسن سمنانی محبت الٰہی میں گرفتار اور خوش نصیبی کے امیدوار صوفی ہیں۔ (۷) شیخ سہلکی صوفی حضرات کے بڑے درویش ہیں۔ (۸) احمد پسر شیخ خرقانی اپنے والد بزرگوار کے اچھے جانشین ہیں۔ (۹) اور ادیب کمندی اس دور کے سادات میں سے ہیں۔

اہل کرمان کے صوفیاء

(۱) حضرت خواجہ علی بن الحسین السیر کانی آپ اپنے دور کے سیاح ہوئے ہیں اور آپ نے بڑے اچھے سفر کئے ہیں اور آپ کے صاجزادے حکیم بھی ایک مرد یگانہ تھے۔ (۲) شیخ محمد بن سلمہ اپنے وقت کے بزرگوں میں سے ہیں......اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے کچھ بزرگ پوشیدہ ہیں اور نوجوان ونوخیز امیدوار تصوف بھی ہیں۔

اہل خراسان کے صوفیاء متاخرین

خراسان کہ جہاں آج حق تعالیٰ کی رحمتوں اور توجہ کا سایہ ہے بزرگوں میں سے (۱) شیخ مجتہد ابوالعباس وامغانی ہیں آپ کی زندگی بڑی اچھی اور وقت بڑا ہی پسندیدہ گزرا ہے۔ (۲) خواجہ ابوجعفر محمد بن علی الجوینی اس طائفہ صوفیاء کے محققین اور بزرگوں میں سے ایک ہیں۔ (۳) خواجہ ابوجعفر ترشیزی اپنے دور کے یکتا دبے مثال لوگوں میں سے تھے۔ (۴) خواجہ محمود نیشاپوری اپنے دور کے پیشوا اور بڑی اچھی زبان کے مالک تھے۔ (۵) شیخ محمد معشوق۔ بڑی اچھی زندگی اور اچھے وقت کے مالک تھے۔ آپ عشق الٰہی کی چنگاری تھے اور بڑے نیک باطن اور خوش سیرت بزرگ تھے۔ (۶) خواجہ رشید مظفر پسر شیخ ابوسعید راہ تصوف کے امیدوار اپنی قوم کے مقتداء اور صوفیاء کے دلوں کا قبلہ تھے......(۷) خواجہ شیخ احمد جمادی سرخسی اپنے وقت کے مرد میدان تھے اور ایک عرصہ تک میرے رفیق بھی رہے ہیں۔ میں نے آپ کے بہت سے عجیب کام خود دیکھے ہیں اور آپ واقعی صوفیاء میں سے ایک مرد مجاہد تھے (۸) شیخ احمد تجار سمرقندی مرو میں مقیم تھے اور اپنے دور کے سلطان الصوفیاء تھے۔ (۹) اور شیخ ابوالحسن علی بن علی الاسود اپنے والد بزرگوار کے سچے خلیفہ اور اپنے معاملات میں صدقہ فراست اور بلند ہمتی میں بے مثال بزرگ تھے میں نے خراسان میں

تین سوصوفی بزرگ دیکھے ہیں جن میں سے ہر ایک تصوف میں ایک مشرب رکھتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک تمام دنیا کیلئے کافی تھا اور یہ سب اس لئے ہے کہ محبت خداوندی کا آفتاب اور طریقت کا قابل خراسان میں طلوع ہوا تھا لیکن میں ان سب حضرات کا شمار کروں تو کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔

صوفیاء اہل ماورا النہر

(۱) خواجہ امام ابو جعفر محمد بن الحسین الحرمیؒ خواص وعوام میں بڑے مقبول تھے۔ آپ کلام حق سننے والے اور حق تعالیٰ کی محبت میں گرفتار صوفی تھے۔ آپ بڑی بلند ہمت اور اچھے حالات کے مالک تھے...... (۲) خواجہ فقیہ ابو محمد پالفری اچھے حالات اور مضبوط معاملات کے ساتھ ساتھ اپنے اصحاب میں بڑے ہی صاحب عظمت تھے...... (۳) حضرت احمد ایلاقی اپنے وقت کے شیخ اور زمانے کے بزرگ تھے آپ دنیوی رسوم وعادات کے تارک تھے...... (۴) حضرت خواجہ عارف اپنے وقت کے یکتا موتی اور زمانہ کے بے نظیر انسان تھے...... (۵) اور حضرت علی بن ابی اسحاق اپنے زمانہ کے بزرگ اور مرد ذی وقار تھے اور آپ کی کلام بڑی اثر انگیز تھی۔ یہ اسما گرامی ان بزرگوں کے تھے جنہیں میں نے خود دیکھا ہے اور ان کے حالات سے مجھے اچھی طرح واقفیت حاصل ہے اور یہ سب بزرگ اہل تحقیق میں سے ہوئے ہیں۔

اہل غزنی کے صوفیاء

(۱) حضرت ابوالفضل بن الدسدی معرفت کے شیخ اور بزرگ پیر تھے آپ کی براھین ظاہر اور کرامات بڑی روشن ہیں آپ محبت خداوندی کی آگ کے ایک شعلہ تھے اور آپ کے معاملات بالکل گمنام ہیں۔ (۲) حضرت اسماعیل اشاشی۔ علائق دنیا سے مجرد اور

کنارہ کش بزرگ تھے۔آپ ایک صاحب حشمت پیر تھے اور آپ نے ملازمت کا راستہ اختیار کیا تھا۔(۳) شیخ سالار طبری علما تصوف میں سے ہیں اور بڑی اچھی سیرت کے مالک ہیں۔(۴) حضرت ابوعبداللہ محمد بن الحکیم المعروف بمرید آپ اسرار تصوف کے معدن اور راہ حق کے تیز گام بزرگ تھے آپ بارگاہ الٰہی کے دیوانوں میں سے تھے اور اپنے دور میں اپنے فن کے بے مثل ولا ثانی صوفی تھے آپ کے معاملات لوگوں پر پوشیدہ ہی رہے آپ کی براہین بڑی واضح اور نشانیاں بڑی ظاہر ہیں اور دیدار کے مقابلہ میں آپ کی صحبت کا معاملہ بہت بہتر ہے(۵) حضرت سعید بن ابی سعید ذی احترام شیخ اور سب سے زیادہ مقدم بزرگ ہیں۔آپ حضرت پیغمبر ﷺ کی احادیث کے حافظ تھے آپ نے بڑی اچھی عمر پائی اور بہت سے مشائخ کی زیارت کی،آپ بڑے قوی الحال اور باخبر صوفی تھے لیکن آپ نے معاملات لوگوں سے پوشیدہ رکھے اور اپنے معانی کسی کو نہیں دکھائے......(۶) حضرت ابو العلا عبدالرحیم بن احمد اسعدی بڑے بزرگوار سردار اور صاحب عزت و وقار صوفی تھے آپ اپنی قوم کے عزیز اور وقت کے سردار تھے میرا دل آپ سے بڑا خوش ہے آپ بڑے مہذب حالات اور نیک معاملات کے مالک تھے اور علم کے جملہ فنون سے بخوبی واقف تھے(۷) اور شیخ یکتا روزگار سورۃ بن محمد بن الجرویزی۔اہل طریقت کے ساتھ پوری شفقت رکھتے تھے اور آپ کے نزدیک ہر ایک کی ایک عزت تھی۔آپ نے مشائخ کی زیارت کی تھی۔ عوام وعلما شہر کی خوش اعتقادی کے پیش نظر میں بھی بڑی امید رکھتا ہوں کہ آپ کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے کہ ہمارا اعتقاد ان سے وابستہ ہوگا۔اور یہ پراگندہ حال لوگوں کا گروہ جو اب اس شہر میں راہ پا چکا ہے اور طریق تصوف کو قبیح کر دیا ہے وہ اس شہر سے مٹ جائے گا اور یہ شہر پھر ایک دفعہ اولیاء اور بزرگوں کی قیام گاہ قرار پائے گا......اب ہم ان فرقوں کے مذاہب کا فرق بیان کریں گے۔(واللہ اعلم بالصواب)

چودھواں باب

مذاہب صوفیاء میں مختلف فرقوں کا باہمی فرق

اس سے قبل حضرت ابوالحسن نوریؒ کے تذکرہ میں میں نے بیان کیا تھا کہ صوفیاء کے بارہ گروہ ہیں۔ ان میں سے دو گروہ مردود اور دس گروہ مقبول ہیں اور ان دس گروہوں میں سے ہر گروہ کا معاملہ اور طریق مجاہدات میں نیک اور درست ہے اور مشاہدات میں بھی آداب بڑے ہی عمدہ ہیں اور یہ لوگ تصوف کے معاملات، مجاہدات اور ریاضات میں مختلف ہونے کے باوجود شریعت کے اصول و فروع اور توحید میں بالکل باہم موافق ہیں۔ حضرت ابویزیدؒ نے فرمایا ہے کہ ''اختلاف العلماء رحمة الافی تجرید التوحید'' (مسئلہ توحید خالص کے علاوہ علماء کا اختلاف رحمت ہے) اور اس کلمہ کے موافق ایک حدیث پاک بھی مشہور ہے۔ غرضیکہ تصوف کی حقیقت ان مشائخ کے درمیان حقیقی معنی میں متفق علیہ ہے اور مجازی و رسمی لحاظ سے اس میں اختلاف ہے۔ پس میں اختصار و اعجاز کے ساتھ ان کے کلام کو تصوف کے بیان میں تقسیم کرتا ہوں اور اصل مذہب میں ہر ایک کیلئے مقام عزت متعین کرتا ہوں تاکہ طالبان حق کو اس کا علم حاصل ہو علماء کیلئے ہتھیار مریدوں کیلئے اصلاح، اہل محبت کیلئے کامیابی اہل مروت و ذی عقل لوگوں کیلئے تنبیہ اور میرے لیے دونوں جہان میں یہ چیز باعث ثواب ہو۔ (وباللہ التوفیق)

فرقہ محاسبیہ

محاسبی فرقے کے لوگ حضرت ابوعبداللہ حارث بن اسد المحاسبیؒ کی طرف منسوب ہیں۔ جو تمام اہل زمانہ کے نزدیک مقبول النفس اور مقتول النفس بزرگ تھے۔ اصول و فروغ اور حقائق کے بڑے زبردست عالم تھے اور آپ کا کلام معاملات ظاہری و

باطنی کی صحت کے ساتھ خالص توحید کے بیان میں تھا۔ اور آپ کا عجیب مذہب یہ تھا کہ آپ رضا کو طریقت کے مقامات میں شمار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ احوال میں سے ایک حالت ہے۔ اس اختلاف کی ابتدا تو انہوں نے ہی کی تھی لیکن اب اہل خراسان نے اس قول کو لے لیا ہے اس کے برعکس عراقی حضرات کہتے ہیں کہ رضا بھی مقامات میں سے ایک مقام ہے اور یہ توکل کی انتہاء ہے اور اس قوم میں آج تک یہ اختلاف موجود ہے۔ اب ہم انشاءاللہ اس قول کو بیان کرتے ہیں۔

رضا کی حقیقت

ان مذاہب کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ہم رضا کی حقیقت کو ثابت اور اس کی اقسام کو بیان کریں گے اور اس کے بعد حال و مقام کی حقیقت اور ان کا فرق واضح کریں گے جاننا چاہئے کہ رضا کی حقیقت کتاب وسنت سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡه — اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔

نیز فرمان الٰہی ہے کہ

لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُومِنِیۡنَ اِذۡیُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ. — تحقیق اللہ تعالیٰ مومنین سے راضی ہوا جب وہ آپ پیغمبر ﷺ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

اور پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے۔

ذَاقَ طَعۡمَ الۡاِیۡمَانَ مَنۡ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا۔ — اس آدمی نے ایمان کا مزہ چکھ لیا جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوا۔

رضا کی اقسام

رضا دو طرح کی ہوتی ہے۔ایک اللہ تعالیٰ کا بندے سے راضی ہونا اور دوسری بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا۔حق تعالیٰ کی رضا کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کیلئے ثواب نعمت اور کرامت عطا کرنے کا ارادہ فرمالیں اور بندے کی رضا کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس کے احکام پر ثابت قدم رہے اور اس کے ہر فرمان کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دے۔پس حق تعالیٰ کی رضا بندے کی رضا پر مقدم ہوتی ہے کیونکہ جب تک حق تعالیٰ بندے کو توفیق نہ بخشیں وہ نہ تو اس کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے فرمان پر ثابت قدم رہ سکتا ہے۔اس لیے کہ رضا بندہ رضا الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کا قیام اس کی ذات کے ساتھ ہے،خلاصہ کلام بندہ کی رضا یہ ہے کہ اس کا دل قضائے الٰہی کی دونوں طرفوں یعنی قضائے منع اور قضائے عطا پر یکساں طور پر مطمئن رہے اور اس کا باطن جمالی اور جلالی دونوں طرح کے احوال کا نظارہ کرنے پر مستقیم رہے۔چنانچہ قضائے الٰہی اگر کسی چیز کے نہ دینے پر ٹھہر جائے یا اس کے عطا کرنے پر سبقت کرے تو رضائے بندہ کے نزدیک دونوں حالتیں برابر ہوں اور اگر ہیبت وجلال خداوندی کی آگ سے جل جائے یا اس کے جمال اور نور لطف سے روشن ہو جائے تو یہ جلنا اور روشن ہونا اس کے دل کے نزدیک برابر ہو کیونکہ وہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔لہٰذا اس کی ذات سے جو کچھ بھی مشاہدہ میں آئے بندہ کیلئے بہتر ہی ہے،جیسا کہ امیر المومنین حضرت حسن بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لوگوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے اس قول کے متعلق پوچھا کہ

اَلْفَقْرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الْغِنَاءِ وَ	میرے لیے فقر، دولت مندی سے اور
السَّقْمُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الصِّحَّةِ	بیماری صحت سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

تو حضرت حسنؓ نے فرمایا۔

رَحِمَ اللّٰهُ اَبَاذَرٍّ اَمَّا اَنَا اَقُوْلُ مَنْ اَشْرَفَ عَلٰى حُسْنِ اِخْتِيَارِ اللّٰهِ لَهٗ لَمْ يَتَمَنَّ غَيْرَ مَا اخْتَارَ اللّٰهُ لَهٗ

اللہ تعالیٰ حضرت ابوذرؓ پر رحم کرے تاہم میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو آدمی اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کی پسند کردہ چیز کے حسن پر آگاہ ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کی اپنے لیے اختیار کردہ چیز کے علاوہ کسی چیز کی آرزو نہیں کرتا۔

اور بندہ جب حق تعالیٰ کے اختیار کو دیکھ کر اپنی پسند اور اختیار سے اعراض کرتا ہے وہ ہر قسم کے غم واندوہ سے نجات پالیتا ہے اور یہ چیز حق تعالیٰ سے دوری کی حالت میں نصیب نہیں ہوتی کیونکہ اس کیلئے تو حضور حق ضروری ہے۔

لِاَنَّ الرِّضَا لِلْاَحْزَانِ نَافِيَةٌ" وَ لِلْغَفْلَةِ مَعَالِجَةٌ" شَافِيَةٌ"

کیونکہ قضائے الٰہی پر رضا غموں کو دور کرنے والی اور غفلت کیلئے علاج شافی ہے۔

یعنی حق تعالیٰ کے فیصلوں پر رضا انسان کو غموں سے دور کرتی ہے پنجہ غفلت سے چھڑاتی غیر خدا کا خیال دل سے دور کرتی اور مشقتوں کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ کیونکہ رضا کی صفت رہائی دلانا ہے۔ لیکن رضا کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ یہ جان لے کہ کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا اللہ عزوجل کے علم اور ارادہ کے مطابق ہوتا ہے اور یہ اعتقاد رکھے کہ ہر طرح کے احوال میں اللہ تعالیٰ اس کو دیکھتے ہیں۔

ارباب رضا کی قسمیں

اور اس طرح کا اعتقاد رکھنے والے حضرات چار طرح کے ہیں۔

۱۔ وہ گروہ جو دنیا کی نعمتوں پر راضی رہتا ہے۔

۲۔ وہ گروہ جو دنیا کی آزمائشوں اور مصائب وآلام پر راضی رہتا ہے۔

۳۔ وہ گروہ جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس سے محبت پر راضی رہتا ہے۔

۴۔ اور وہ گروہ جو معرفت حق تعالیٰ پر راضی رہتا ہے۔

پس جو شخص عطا کرنے والے کو پیش نظر رکھتے ہوئے عطا کو دیکھتا ہے وہ اس عطا کو صدق دل سے قبول کرتا ہے اور جب صدق دل سے قبول کر لیتا ہے تو ہر قسم کی کلفت اور مشقت اس سے دور ہو جاتی ہے اور جو آدمی عطا کو پیش نظر رکھ کر عطا کرنے والے کو دیکھتا ہے وہ عطا میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور رضا کے راستے پر تکلف کے ساتھ چلتا ہے۔ جب کہ تکلف میں تمام رنج اور مشقتیں موجود ہیں، اور معرفت حقیقت کی صورت اس وقت اختیار کرتی ہے جب بندہ معرفت کے حق میں مکاشف ہو جائے لیکن اگر معرفت ہی اس کیلئے مشاہدہ حق میں حجاب اور رکاوٹ بن جائے تو وہ معرفت ناشناسائی وہ نصیحت عذاب اور وہ عطا درحقیقت پردہ ہو جاتی ہے اور باقی جو آدمی حق تعالیٰ سے دنیا پر ہی راضی ہو جائے وہ ہلاکت اور نقصان میں رہتا ہے کیونکہ وہ رضا اس کیلئے آتش دوزخ کا سبب بن جاتی ہے کیونکہ تمام کی تمام دنیا بھی اس لائق نہیں کہ اس سے دل لگایا جائے یا ذرہ برابر بھی اس کے غم کا بوجھ دل پر ڈالا جائے اور نعمت تو اسی وقت نعمت ہوتی ہے جب وہ انعام کرنے والے کی طرف رہنمائی کرے لیکن اگر وہ منعم سے حجاب بن جائے تو پھر وہ نعمت مصیبت ہوتی ہے اور جو شخص آزمائش پر حق تعالیٰ سے راضی رہتا ہے وہ وہ شخص ہے جو بلا میں بھی بلا بھیجنے والے کی طرف دیکھے اور اس بلا کی مشقت کو بلا بھیجنے والے کے مشاہدہ سے برداشت کرے کیونکہ دوست کے مشاہدہ کی صورت میں بلا کی مشقت، مشقت ہی نہیں رہتی اور رہا باقی وہ لوگ جو حق تعالیٰ کی طرف سے برگزیدگی اور اس کی محبت پر راضی رہتے ہیں وہ حق تعالیٰ کے ایسے عاشق ہیں کہ رضا اور ناراضگی میں ان کا وجود عارضی ہوتا ہے ان کا دل حق تعالیٰ کی محبت کے علاوہ کسی کی منزل نہیں ہوتا اور اس کے اسرار کا خیمہ محبت الٰہی کے گلستان کے بغیر کہیں نہیں ہوتا۔ یہ بارگاہ خداوندی کے وہ حاضر ہیں جو ماسویٰ اللہ سے غائب ہیں۔ وہ فرشی ہیں جن کا تصور عرش پر ہے وہ جسم ہیں جن کی روح نورانی ہے اور وہ موحد ربانی ہیں کہ جن کا دل مخلوق سے جدا ہے یہ لوگ تمام کائنات سے اپنے باطن کو روک کر مکافات اور احوال کی جستجو میں

گرفتار ہیں اور محبت الٰہی میں کمر بستہ ہو کر اس کے لطف و کرم کے لیے سراپا انتظار بنے بیٹھے ہیں۔ انہی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَایَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّاوَّلَا نَفْعًاوَّلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّ لَاحَیٰوۃً وَّلَانُشُوْرًا

وہ اپنے نفسوں کیلئے نہ تو نقصان اور نفع کے مالک ہیں اور نہ ہی موت زندگی اور دوبارہ اٹھائے جانے کا ان کے پاس کوئی اختیار ہے۔

پس حق تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کیلئے رضا نقصان ہے اور کسی چیز کے بغیر حق تعالیٰ سے رضاء رضوان الٰہی کا ذریعہ ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی چیز سے راضی ہونا ہلاکت اور صرف حق تعالیٰ پر راضی ہو جانا بڑی سعادت ہے اور اسی میں عافیت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

مَنْ لَّمْ یَرْضَ بِاللّٰهِ وَبِقَضَائِهٖ شَغَلَ قَلْبَه، وَتَعَبَ بَدَنَه،

جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتا وہ اپنے دل کو اسباب کی تلاش میں مشغول اور اپنے بدن کو مصیبتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

فصل

مشائخ کے اقوال

آثار میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی

اَللّٰهُمَّ دُلَّنِیْ عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُ رَضِیْتَ عَنِّی

اے اللہ! ایسا عمل بتا جسے میں سرانجام دوں تو تو مجھ سے راضی ہو جا۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

اِنَّکَ لَاتُطِیْقُ ذٰلِکَ یَامُوْسٰی

اے موسیٰ تجھ میں اس چیز کی طاقت موجود نہیں۔

فَخَرَّ مُوسٰى سَاجِدًا مُتَضَرِّعًا فَاَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ يَابْنَ عِمْرَانَ اِنَّ رِضَائِي فِي رِضَاكَ بِقَضَائِي

پس حضرت موسیٰ سجدے میں گر کر عاجزی وزاری کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ اے عمران کے بیٹے میری رضا، میری قضا پر تیرے راضی رہنے میں ہے۔

یعنی جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہیں۔ حضرت بشر حافیؒ نے ایک مرتبہ حضرت فضیل بن عیاضؒ سے پوچھا کہ زہد کی فضیلت زیادہ ہے یا رضا کی؟ حضرت فضیلؒ نے فرمایا:

اَلرِّضَاءُ اَفْضَلُ مِنَ الزُّهْدِ لِاَنَّ الرَّاضِي لَايَتَمَنّٰى فَوْقَ مَنْزِلِه'

رضا زہد سے افضل ہے کیونکہ قضا پر راضی رہنے والا اپنی اس منزل سے اوپر کی آرزو نہیں رکھتا۔

یعنی زہد کی منزل سے اوپر اور بھی منزل ہے جس کے لیے زاہد کے دل میں تمنا پیدا ہو۔ پس سب سے آخری منزل افضل ہے اس منزل سے جس کے بعد بھی منزلیں موجود ہیں اور یہ حکایت حضرت محاسبیؒ کے قول کی صحت پر دلیل ہے کہ رضا احوال میں سے ہے منازل میں سے نہیں اور یہ حق تعالیٰ کی عطا پر منحصر ہے اس کا حصول کسب و محنت سے نہیں ہوتا...... اور پیغمبر علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ اپنی دُعا میں کہا کرتے تھے کہ:

سئلک الرضا بعد القضاء

اے اللہ! میں قضا کے آجانے پر تیری رضا کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

یعنی مجھے وہ صفت عطا کر کہ جب تیری طرف سے قضا میرے مقدر ہو تو مجھ کو اس پر راضی پائے۔ اس سے یہ بات بھی درست ہوگئی کہ قضا کے ورود سے پہلے رضا درست نہیں کیونکہ قضا کے وارد ہونے سے پہلے رضا کا ارادہ تو ہوتا ہے لیکن عزم رضا عین رضا نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابوالعباس بن عطا فرماتے ہیں کہ:

الرضاء نظر القلب اِلیٰ قدیم اختیار اللّٰهِ للعبد — رضا یہ نام ہے دل کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کیلئے ازلی اختیار پر نگاہ رکھنے کا۔

یعنی اسے جو بھی مصیبت پہنچے جان لے کہ میرے لیے اس مصیبت کا حق تعالیٰ کی طرف سے ازلی ارادہ اور حکم موجود تھا اور اس پر بیقرار نہ ہو بلکہ اپنے دل میں خوشی محسوس کرے۔ اس مذہب والے حضرت حارث محاسبیؒ فرماتے ہیں کہ

الرضاء سکون القلبِ تحت مجاری الاحکام — احکام الٰہی کے جاری ہونے پر دل کے مطمئن رہنے کا نام رضا ہے۔

اور اس معاملے میں آپ کا مذہب بڑا قوی ہے کیونکہ سکون اور طمانیت قلب بندہ کے کسب و محنت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطیات میں سے ایک عطیہ ہے اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ رضا احوال میں سے ہے مقامات میں سے نہیں..... کہتے ہیں کہ حضرت عتبۃ الغلامؒ ایک مرتبہ پوری رات نہ سوئے اور صبح تک یہی کہتے رہیں:

ان تعذبنی فانالک محبٌ" وان ترحمنی فانالکَ محبٌ" — اگر تو مجھے عذاب دے پھر بھی میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور اگر مجھ پر رحم کرے پھر بھی میں تیرا محب ہی ہوں۔

یعنی عذاب کی تکلیف اور نعمت کی لذت دونوں جسم پر ہوتی ہیں جب کہ دوستی کی بیقراری دل میں ہوتی ہے لہذا جسم کی تکلیفیں، دل کی محبت پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں، یہ بھی حضرت محاسبیؒ کے قول کی تائید ہی ہے کہ رضا محبت کا نتیجہ ہوتی ہے کہ محبوب کے ہر فعل پر محب راضی رہے، اگر محبوب اس کو عذاب میں رکھے تو بھی دوستی کی وجہ سے حجاب میں نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہے اور اگر محبوب اس کو نعمت میں رکھے تو بھی دوستی سے حجاب میں نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ کے اختیار کے مقابلہ میں اپنے اختیار کو ہیچ سمجھتا ہے..... حضرت ابوعثمان حیریؒ فرماتے ہیں کہ:

منذا ربعین سنۃً ما اقامنِیَ اللّٰهُ فی حالٍ کرھتہ نہ وَمَا — چالیس سال کے عرصہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے جس حال بھی رکھا میں نے ناپسند نہیں کیا اور

نَقَلَنِی اِلیٰ غیرِہٖ فسخطتہ' اگر اس حال سے دوسرے حال میں تبدیل کیا تو میں نے برا نہیں منایا۔

یہ دوام رضا اور کمال محبت کی طرف اشارہ ہے...... حکایات میں ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک درویش دریائے دجلہ میں گر پڑا جب کہ وہ تیرنا بھی نہیں جانتا تھا۔ کنارے سے ایک آدمی نے کہا کہ تم چاہتے ہو کہ میں سب کو آگاہ کروں تاکہ وہ تمہیں باہر نکال لیں؟ درویش نے کہا ''نہیں'' پھر اس نے پوچھا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ غرق ہو جاؤ؟ درویش نے کہا نہیں اس نے پوچھا پھر تم کیا چاہتے ہو؟ درویش نے کہا میں وہی چاہتا ہوں جو حق تعالیٰ میرے لیے چاہتے ہیں...... اور رضا کے بیان میں مشائخ کے اقوال بہت ہیں۔ گو عبارت میں اختلاف ہے تاہم اس کا قاعدہ انہی دو باتوں پر مشتمل ہے جو میں نے بیان کر دی ہیں۔ اور طوالت کو ترک کر کے انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ البتہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں حال اور مقام کے درمیان فرق بیان کروں اور ان کی حدود کو واضح کر دوں تاکہ تجھ پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر اس معنی کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

حال اور مقام کے درمیان فرق

جان لو کہ یہ دونوں لفظ گروہ صوفیاء کے درمیان مستعمل ہیں ان کی عبارت میں جاری اور ان کے علوم میں بکثرت موجود ہیں۔ ان کے اثبات اور توضیح کیلئے اس مقام پر گنجائش نہ تھی لیکن چونکہ علم تصوف کے طالب علموں کیلئے ان کے بغیر چارہ نہیں اس لیے اس مقام پر ہم ان کو بیان کر رہے ہیں۔ وباللہ التوفیق والعظمۃ والعون۔

مقام کی تحقیق

جان لو کہ ''مقام'' میم کے پیش کے ساتھ بندہ کے کھڑا ہونے اور میم کے زبر کے

ساتھ کھڑا ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں، لیکن دراصل یہ تفصیل اور معنی سہو اور غلط ہیں کیونکہ عربی لغت میں مقام میم کی پیش کے ساتھ قائم ہونے اور قائم ہونے کی جگہ کو اور مقام میم کی زبر کے ساتھ قیام کرنے اور قیام کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں لیکن تصوف میں مقام بندے کے راہ حق میں قیام کرنے اس کے حقوق ادا کرنے اور اس کے اس مقام کی رعایت ملحوظ رکھنے کو کہتے ہیں تاکہ جس طرح بھی ہو سکے اس مقام کا کمال حاصل کرے اور جب تک حق تعالیٰ اس مقام سے نہ گزاریں بندہ خود نہیں گزر سکتا چنانچہ مقامات تصوف میں سے پہلا مقام توبہ (ترک گناہ) ہے، دوسرا انابت (رجوع الی اللہ) تیسرا زہد (ترک دنیا) اور چوتھا توکل (اللہ کی ذات پر بھروسہ) ہے اسی طرح دوسرے مقامات تصوف کا درجہ آتا ہے کسی کیلئے یہ درست نہیں کہ توبہ کے بغیر انابت کا دعویٰ کرے، انابت کے بغیر زہد کا اور زہد کے بغیر توکل کا دعویٰ بھی قطعاً درست نہیں اور خدائے عزوجل نے ہمیں جبرئیل کے متعلق یہ چیز دی کہ انہوں نے کہا:

وَمَامِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ اور ہم میں سے ایک کیلئے ایک معین مقام ہے۔

تحقیق حال

اور حال اس کیفیت کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے صوفی کے دل پر طاری ہوتی ہے۔ اس طرح کہ جب وہ کیفیت طاری ہو جائے تو اپنے اختیار سے اس کو دور نہیں کر سکتے اور جب وہ ختم ہو جائے تو اپنی کوشش سے اسے حاصل نہیں کر سکتے، پس مقام تو طالب کے راستے، محل مجاہدہ میں اس کی قیام گاہ اور اس کی محنت کے مطابق بارگاہ الٰہی میں اس کے درجے سے عبارت ہے، اور حال، بندہ کے مجاہدات میں مصروف ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل و لطف کے طاری ہونے سے عبارت ہے۔ اس لیے کہ مقام اعمال میں سے ایک عمل ہے جب کہ حال افضال میں سے ایک فضل گویا کہ مقام میں انسانی محنت اور اکتساب کا دخل

ہے جب کہ حال اللہ تعالیٰ کے عطیات میں سے ایک عطیہ ہے پس صاحب مقام اپنے مجاہدات کے ساتھ قائم ہوتا ہے جب کہ صاحب حال اپنے آپ سے فانی ہوتا ہے اور اس کا قیام اس حالت کے ساتھ ہوتا ہے جو حق تعالیٰ خود اس میں پیدا فرماتے ہیں...... اور اس جگہ مشائخ رحمہم اللہ کا آپس میں اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ تو حال کی ہمیشگی کو جائز سمجھتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے دوام کو درست نہیں جانتا۔ حضرت حارث محاسبیؒ حال کے دوام کو جائز رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ محبت، شوق، قبض اور بسط یہ سب احوال ہیں اگر ان میں دوام کو درست نہ سمجھا جائے تو نہ محب، محب ہوگا اور نہ ہی مشتاق، مشتاق اور جب تک حال بندہ کی صفت نہ بن جائے اس وقت تک اس کے نام کا اطلاق اس بندے پر نہیں ہوسکتا۔ اور اسی لئے آپ رضا کو بھی منجملہ احوال کہتے ہیں اور حضرت ابو عثمانؒ نے جو فرمایا تھا کہ منذ اربعین سنة ما اقامنی اللّٰهُ علی حال فکرهته اس میں بھی اشارہ اسی بات کی طرف تھا۔ اور دوسرا گروہ حال کے دوام و بقا کو درست نہیں سمجھتا۔ جیسا کہ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں۔

الاحوال کالبروق فان بقیت فحدیث النفس	احوال تو بجلیوں کی مانند ہوتے ہیں کہ نظر آتے ہیں اور چھپ جاتے ہیں وہ اگر باقی رہ جائیں تو نفس کی بات ہوتی ہے۔

یعنی اگر انہیں دوام حاصل ہو تو وہ حال نہیں ہوتے بلکہ نفس کی بات اور طبیعت کی ہوس ہوتی ہے...... اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ

الاحوال کاسمها یعنی انّها کما تحلُّ فی القلب تزول	احوال اپنے ناموں کی طرح ہوتے ہیں کہ جس طرح دل میں واقع ہوتے ہیں اسی طرح زائل ہوتے ہیں۔

یعنی ایک حالت میں حال دل میں طاری ہوتا ہے اور دوسری حالت میں اس سے

زائل ہو جاتا ہے اور جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ صفت بن جاتی ہے اور صفت کا قیام موصوف کے ساتھ ہوتا ہے اور موصوف کو اپنی صفت سے زیادہ کامل ہونا چاہئے جب کہ یہ سب کچھ محال ہے...... حال اور مقام کے درمیان یہ فرق میں نے یہاں اس لیے بیان کر دیا ہے تا کہ صوفیا کی عبارات میں اور اس کتاب میں جہاں کہیں حال اور مقام کی اصطلاح کو دیکھو، سمجھ لو کہ اس جگہ کیا چیز مراد ہے...... تاہم یہ جان لو کہ رضا مقامات تصوف کی انتہا اور احوال کی ابتدا ہے اور یہ وہ جگہ ہے کہ جس کی ایک جانب کسب اور اجتہاد میں ہے اور دوسری جانب محبت اور غلبہ شوق میں۔ اور اس سے اوپر اور کوئی مقام نہیں ہے اور اس حالت میں آ کر مجاہدات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ پس اس کی ابتدا اکتساب بندہ سے ہوتی ہے اور انتہا فضل و عطا خداوندی پر ہوتی ہے یہاں پر یہ احتمال بھی موجود ہے کہ صوفی و سالک جب رضا کی ابتدا میں خود اپنی طرف دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ مقام ہے اور جب اس کی انتہا میں حق تعالیٰ کے فضل و انعام کی طرف دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ حال ہے۔ تصوف کے اصول مین حضرت محاسبیؒ کا مذہب یہی ہے جو بیان ہو چکا البتہ معاملات طریقت میں انہوں نے باقی صوفیا سے کوئی اختلاف نہیں کیا تاہم وہ اپنے مریدوں کو ان عبارات اور معاملات سے منع فرمایا کرتے تھے جن میں خطا کا وہم وموجود ہوتا گو ان کی اصل درست ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن آپ کے مرید ابوحمزہ بغدادیؒ آپ کے پاس آئے جو سماع سننے والے اور صاحب حال مرد تھے۔ حضرت محاسبیؒ نے ایک شاہ مرغ رکھا ہوا تھا جو بانگ دیتا تھا اس نے اس وقت بانگ دی تو ابوحمزہ نے نعرہ بلند کیا۔ حضرت حارث محاسبیؒ نے اٹھ کر اس کو پکڑ لیا اور کہا تو کافر ہو گیا ہے اور اس کو ذبح کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ مریدوں نے پاؤں پر گر کر آپ کو اس سے جدا کر دیا تاہم آپ نے ابوحمزہ سے کہا۔

اَسْلِمْ یَا مَطْرُوْد — اے مردود دوبارہ اسلام لا۔

مریدوں نے عرض کی اے شیخ! ہم سب تو اس کو خواص اولیاء اور موحدین میں سے سمجھتے ہیں

شیخ کواس کے بارے میں یہ تردد کیسے پیدا ہوا! آپ نے فرمایا مجھے اس کے اسلام کے متعلق کوئی تردد نہیں بلکہ میں اس میں خوبی کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور اس کے باطن کو بھی توحید میں مستغرق پاتا ہوں لیکن اس نے ایسا کام کیوں کیا جو حلولیوں (حلولی ایک گروہ جس کا عقیدہ ہے کہ خدا اپنی مخلوق میں حلول کرتا ہے) سے مشابہ ہوتے تاکہ ان کے مقالات میں سے کسی چیز کا اس کے معاملات میں دخل ہو کہ ایک مرغ جو عقل نہیں رکھتا اس نے تو اپنی عادت اور خواہش کے مطابق بانگ دی ہے لیکن اس کی آواز سے اس کو سماع کی کیفیت کیوں واقع ہو گئی حالانکہ حق جل وعزی کی ذات قابل تقسیم نہیں کہ اس کا کچھ حصہ اس مرغ میں حلول کر گیا ہو اور صوفی اس کی آواز پر وجد میں آ جائے۔ اور حق تعالیٰ کے دوستوں کو اس کے کلام کے بغیر آرام اور اس کے اسلام کے بغیر وقت اور حال نصیب نہیں ہوتا اور حق تعالیٰ اشیاء میں نہ تو حلول ونزول فرماتے ہیں اور نہ ہی ذات قدیم کا حادث اشیاء کے ساتھ اتحاد اور امتزاج درست ہوسکتا ہے۔ جب ابوحمزہ نے اس وقت شیخ کی طرف دیکھا تو فوراً پکار اٹھے کہ اے شیخ! اگرچہ میں اصل میں صحیح تھا تاہم چونکہ میرا فعل اس وقت ایک گمراہ قوم کے فعل کی مانند ہو گیا تھا اس لیے میں توبہ کرتا ہوں اور اس سے باز آتا ہوں...... اور اس معاملہ میں آپ کے بہت سے طریق ہیں میں نے تو مختصراً بیان کر دیا ہے اور یہ طریق بڑا قابل تعریف ہے کہ سلامتی کی راہ میں صحو ہوشیاری کو چھوڑے بغیر کمال درجے کی سلامتی حاصل ہو جاتی ہے۔

اور پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

من كان يومن بالله واليوم الاخر	جو کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر یقین رکھتا ہے
فلايقفن مواقف التهم	اسے چاہیے کہ تہمت کے مقامات پر نہ کھڑا ہو۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کرتا ہوں کہ مجھے ایسے ہی عمل کی توفیق نصیب فرمائے۔ لیکن یہ بات زمانہ کے رسمی صوفیوں کی محبت میں نہیں مل سکتی کیونکہ اگر تم مصیبت اور ریاکاری میں ان کی موافقت نہیں کرو گے تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے

پس ہم جہالت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔(واللہ اعلم بالصواب)

قصاری فرقہ

قصاری حضرات کی محبت حضرت ابی صالح بن حمدون بن احمد بن عمار القصار ؒ کے ساتھ ہے جو بڑے بزرگ علما اور اس طریقت کے سرداروں میں سے تھے۔آپ کا طریقہ ملامت کے اظہار اور نشر کا طریقہ تھا اور معاملات طریقت کے تمام فنون میں آپ کا کلام بڑا بلند پایہ ہے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا تمہارے بارے میں علم اس علم سے زیادہ اچھا اور نیک ہونا چاہئے جو تیرے متعلق مخلوق کو حاصل ہے، یعنی تمہیں چاہئے کہ خلوت و تنہائی میں حق تعالیٰ کے ساتھ تمہارا معاملہ مخلوق کے سامنے تمہارے معاملے سے زیادہ بہتر ہو...... کیونکہ حق تعالیٰ سے تمہارا سب سے بڑا حجاب یہی ہے کہ تمہارا دل غیر حق میں مشغول ہو۔مخلوق کے ساتھ آپ کے معاملہ ملامت کے متعلق کتاب کے شروع میں احوال و حکایات کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں لہذا یہاں طوالت کو ترک کر کے اختصار کو اپنا رہا ہوں...... آپ کی نادر حکایات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک دن میں نیشاپور کی نہر حیرہ کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ میری ملاقات نوح نام کے ایک عیار کے ساتھ ہوگئی جو جوانمردی میں بڑا شہرت یافتہ رہا اور نیشاپور کے تمام عیار اور راہزن اس کے تابع فرمان تھے۔میں نے اس کو دیکھا تو دریافت کیا کہ "اے نوح" جوانمردی کیا چیز ہے؟ اس نے پوچھا میری جوانمردی پوچھتے ہو یا اپنی جوانمردی! میں نے کہا دونوں کے متعلق بتا دیں۔کہنے لگا میری جوانمردی تو یہ ہے کہ میں قبا اتار کر گدڑی زیب تن کر لوں اور اسی کے لوازمات اپنا لوں تا کہ صوفی بن جاؤں اور پھر حق تعالیٰ سے حیا کرتا ہوا معصیت سے پرہیز کروں اور تیری جوانمردی یہ ہے کہ تم گدڑی اتار دو تا کہ تم مخلوق کیلئے اور مخلوق تمہارے لیے فتنہ کا باعث نہ بنے۔تاہم میری جوانمردی شریعت کی حفاظت کرنے اور تمہاری جوانمردی باطن میں حقیقت

کی حفاظت کا نام ہوگا۔ اور یہ بنیاد بڑی ہی مضبوط ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

طیفوری فرقہ

یہ گروہ حضرت ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان البسطامیؒ کے ساتھ محبت رکھتا ہے جو صوفیا کے رؤسا اور بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ غلبہ شوق اور مستی آپ کا طریق تھا۔ حق تعالیٰ کی محبت کا شوق اور اس میں مستی انسان کے اپنے اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی اور جو چیز انسان کے اپنے دائرہ اختیار سے خارج ہو اس کا دعویٰ کرنا باطل ہوتا ہے اور اس کی تقلید بالکل محال ہوتی ہے اس لیے لامحالہ ہوشمند کیلئے صفت سکر ثابت نہیں ہوسکتی اور آدمی کو اپنے اندر سکر کی حالت پیدا کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، اور حالت سکر والا صوفی مغلوب ہوتا ہے۔ اس کو مخلوق کی طرف کوئی توجہ نہیں ہوتی کہ اس سے تکلف والے اوصاف میں سے کوئی وصف ظاہر ہو۔ مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ احوال کی منزل سے گزر چکنے والے مستقیم الحال صوفی کے علاوہ کسی کی پیروی درست نہیں۔ پھر اگر صوفیا کا ایک گروہ انسان کے اپنے آپ پر تکلفاً صحو و سکر طاری کر لینے کو درست گردانتا ہے کیونکہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ

اَبْکوا فَاِن لَّمْ تَبکُوا فَتَبَاکُوْا — گریہ کرو اور اگر رونہ سکو تو رونے والی شکل بنالو۔

اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک ریاکاروں کے گروہ کی مانند اپنے آپ کو کر لینا یہ تو صریح شرک ہے۔ دوسرے اپنے کو صوفیا کی مانند کر لینا تاکہ حق تعالیٰ ان کے اس تشبہ کو دیکھ کر انہیں اس درجہ پر پہنچا دیں جس پر وہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں اس طرح پیغمبر ﷺ کے ارشاد کے موافق ہو جائیں کہ:

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ — جو آدمی کسی قوم کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے وہ اسی میں سے ہوگا۔

پس حق کی راہ میں مجاہدات کی اقسام میں سے جو بھی درپیش آئے اسے اختیار کرے اور حق تعالیٰ سے امیدوار رہے تا کہ حق تعالیٰ اس پر معانی کی تحقیق کا دروازہ کھول دیں کیونکہ مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ

المشاهداتِ مواريث المجاهدات　　　مشاہدے، مجاہدات کی میراث ہوتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مجاہدات ہر اعتبار سے بہتر اور مفید ہوتے ہیں لیکن سکر اور صحو آدمی کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے کہ مجاہدات کے ذریعہ ان کو حاصل کر لیں اور نہ ہی مجاہدات کو سکر کے حصول کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور مجاہدات تو حالت صحو میں ہی کئے جا سکتے ہیں اور صاحب صحو کا قیام سکر کو قبول کرنے کے ساتھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا مجاہدات سے سکر اور صحو کی حالت کو حاصل کرنا محال ہے اور اب میں مشائخ طریقت کے اختلاف کی بنیاد پر سکر اور صحو کی حقیقت کو بیان کرتا ہوں تا کہ اگر اللہ عزوجل چاہیں تو یہ اشکال دور ہو جائے۔

سُکر اور صحو کا بیان

جان لو! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت نصیب کریں کہ سکر اور غلبہ ارباب معانی کے نزدیک ایسی عبارت ہے جس سے حق تعالیٰ کی محبت کا غلبہ مراد لیا جاتا ہے اور صحو عبارت ہے مقصد و مراد کو حاصل کر لینے سے..... ان کے متعلق اہل معانی کے بہت سے اقوال ہیں ایک جماعت سکر کو صحو پر فضیلت دیتی ہے اور دوسری صحو کے سکر سے افضل ہونے کی قائل ہے۔ جو حضرات سکر کو صحو پر فضیلت دیتے ہیں وہ حضرت ابویزید اور ان کے پیرو ہیں وہ کہتے ہیں کہ صحو تو صفت آدمیت کے معتدل اور مستحکم ہونے کی صورت میں متصور ہوتا ہے اور یہ چیز حق تعالیٰ سے حجاب اعظم ہے لیکن سکر اس وقت متحقق ہوتا ہے جب آفت زائل ہو جائے صفات بشریت کم ہو جائیں، اپنی تدبیر اور اختیار ختم ہو جائے اور اپنے وجود میں اپنی جنس بشریت کے خلاف موجود معانی اور قوتوں کی بقا کی وجہ سے اپنے حق میں تصرف فنا ہو جائے اور یہ

حالت اس دوسری حالت سے زیادہ کامل و مکمل اور بہتر ہے، جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام حالت صحو میں تھے اور ان سے ایک کام سرزد ہوا تو حق تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو انہی کی طرف منسوب کیا اور فرمایا کہ:

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ — اور حضرت داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا۔

اور ہمارے پیغمبر ﷺ حالت سکر میں تھے اور آپؐ سے ایک فعل وجود میں آیا تو حق تعالیٰ نے آپؐ کے فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی اور کہا کہ

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى — جب آپؐ نے مشرکین کے لشکر پر مٹھی بھر خاک پھینکی تو وہ آپؐ نے نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

پس دیکھو تو سہی ایک بندے اور دوسرے بندے کے درمیان کتنا فرق ہے کہ جو بندہ (حضرت داؤد علیہ السلام) اپنی ذات کے ساتھ قائم اور اپنی صفات کے ساتھ ثابت ہے اس کے بارے میں تو بطور کرامت کے فرمایا ہے کہ تو نے خود یہ کام سرانجام دیا ہے لیکن جو بندہ (پیغمبر ﷺ) اپنی صفات سے فانی ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہے اس کے فعل کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہم نے خود کیا ہے جو بھی کیا ہے۔ پس بندہ کے فعل کی اضافت حق تعالیٰ کی طرف اس حالت سے بہت زیادہ بہتر ہے کہ حق تعالیٰ کے فعل کی اضافت بندے کی ذات کی طرف کی جائے کیونکہ جب حق تعالیٰ کے کسی فعل کی اضافت بندے کی طرف کی جائے گی تو بندہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت داؤدؑ کی ایک نظر جب وہاں پڑی جہاں نہ پڑنی چاہئے تھی یعنی روریا کی بیوی پر تو آپ کو حق تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کا سامنا کرنا پڑا لیکن جب بندہ حق تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوتا ہے تو صورت حال مختلف ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی ایک اسی طرح کی نگاہ حضرت زیدؓ کی بیوی پر پڑی تو حضرت زید پر حرام ہو گئیں۔ اس لیے کہ حضرت داؤدؑ کی نظر حالت صحو میں تھی اور ہمارے

پیغمبر ﷺ کی نظر حالت سکر میں تھی۔

اور جو حضرات صحو کو سکر پر فضیلت دیتے ہیں وہ حضرت جنیدؒ اور آپ کے پیروؒ ہیں وہ کہتے ہیں کہ سکر حالت آفت میں ہے کیونکہ وہ احوال کی تشویش، صحت کے ختم ہو جانے اور اپنی حالت پر قابو باقی نہ رہنے کا باعث ہے، اور جب کہ جملہ معانی کی بنیاد خود طالب ہے خواہ اپنے فنا کی وجہ سے ہو یا بقا کی وجہ سے اور خواہ اپنے آپ کو محو کر دینے کی بنیاد پر خواہ اپنے آپ کو ثابت کرنے کی بنیاد پر۔ تو جب وہ طالب خود ہی صحیح الحال نہ ہوگا اس کو تحقیق کا کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوگا کیونکہ اہل حق کا دل تو تمام اشیائے ثابتہ سے مجرد ہونا چاہئے، اور ایک نابینا آدمی کو تو اشیاء کے ساتھ تعلق سے نہ کوئی راحت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی خرابی سے چھٹکارا نصیب ہوتا ہے۔ باقی لوگوں کا حق تعالیٰ کے ماسویٰ دوسری چیزوں میں الجھے رہنا۔ انہیں صرف اس لیے کہ وہ ان چیزوں کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے۔

اور درست طور پر دیکھنا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ دیکھنے والا اپنی آنکھ سے اس کے بقا کو دیکھے اور دوسرا یہ کہ اپنی آنکھ سے اس کے فنا کو دیکھے، اور اگر آنکھ کے ساتھ اس کے بقا کو دیکھے گا تو تمام چیزوں کو اپنی بقاء میں ناقص پائے گا کیونکہ وہ ان کی حالت کے بقا میں بذات خود ان کو قائم دیکھ رہا ہے اور اگر ان کے فنا کو دیکھے گا تو حق تعالیٰ کی بقا کے مقابلے میں تمام موجودات کی بقا کو فانی پائے گا اور یہ دونوں صورتیں اس کو موجودات سے روگردان کر

ـــ فائدہ۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے برگزیدہ اور صاحب کتاب رسول ہیں اس اعتبار سے آپ معصوم عن الخطاء ہیں کہ عصمت اور نبوت لازم و ملزوم ہیں۔ آپ کی طرف رور یا نامی شخص کی بیوی کو دیکھنے وغیرہ کی جملہ روایات غلط ہیں، محقق مفسرین نے ان کو یکسر رد کر دیا ہے اور یہ بعض غیر محتاط حضرات نے اسرائیلی روایات سے لے کر متعلقہ آیات کے ضمن میں بیان کر دی ہیں۔ ان کو درست مان لینے کی صورت میں حضرت داؤدؑ کی عصمت پر حرف آتا ہے۔ اسی طرح حضرت زید بن حارثہؓ کی زوجہ کی طرف حضور ﷺ کے دیکھنے کی روایت بھی بالکل غلط لغو اور بیہودہ ہے۔ کسی نبی اور خصوصاً امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ایسا سوچنا اور تصور کرنا بھی بہت بری بات ہے! عاذ ناللہ۔ نہ جانے بعض صوفیاء نے صحو اور سکر کے بیان میں ایسی غلط روایات کو مثال کے طور پر بیان کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ (مترجم)

دیں گی۔ اسی لیے تو پیغمبر ﷺ نے اپنی دُعا کی حالت میں عرض کی کہ:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْاَشْیَاءَ کَمَا ھِیَ — اے اللہ! ہمیں چیزیں اس طرح دکھادے جس طرح کہ وہ ہیں۔

کیونکہ جو آدمی چیزوں کی اصلی حالت اور حقیقت دیکھ لے گا وہ آسودہ حال ہو جائے گا، اور حق تعالیٰ کے اس قول کا بھی یہی معنی ہے کہ:

فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ — اے آنکھوں والو، عبرت حاصل کرو۔

کیونکہ جب تک وہ چیزوں کو اسی طرح نہ دیکھیں گے جس طرح کہ وہ ہیں تو عزت حاصل نہ کر سکیں گے۔ پس یہ تمام باتیں حالت صحو کے علاوہ کسی حالت میں درست نہیں ہوتیں اور اہل سکر کو ان معانی سے کچھ بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حالت سکر میں تھے تو اللہ تعالیٰ کی ایک تجلی کو بھی برداشت نہ کر سکے اور بیہوش ہو گئے۔

خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا — موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

لیکن ہمارے رسول ﷺ حالت صحو میں مکہ سے عین تجلیات الٰہی میں قاب قوسین تک چلے گئے پھر بھی ہر دم ہوشیار اور زیادہ بیدار رہے..... شعر

شربت الراح کاسًا بعد کَاسٍ — میں نے پے بہ پے پیالے پر پیالہ شراب پی۔
فَمَا نفد الشراب وَمَا رویتُ — لیکن نہ تو شراب ختم ہوئی اور نہ ہی میں سیراب ہوا۔

میرے مرشد جو جنیدی مذہب رکھتے تھے، نے فرمایا کہ سکر تو بچوں کے کھیلنے کا میدان ہے اور صحو مردوں کی فنا گاہ ہے اور میں علی بن عثمان الجلابی بھی اپنے شیخ کی موافقت میں کہتا ہوں کہ صاحب سکر کی حالت کا کمال صحو میں ہے اور صحو میں کم از کم درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی بشریت کے دور ہو جانے کو دیکھ لے۔ پس وہ صحو جو خرابی اور آفت کو ظاہر کرے اس سکر سے بہت بہتر ہے جو عین آفت ہے..... حضرت ابو عثمانؒ کے متعلق حکایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے ابتدائی بیس سال تک بیابانوں میں اس طرح خلوت نشنی

اختیار کی کہ آدمی کی آہٹ تک نہ سنی، یہاں تک کہ کثرت ریاضت اور مجاہدات سے آپ کا جسم گھل گیا۔ آپ کی آنکھیں اندر کو گھس گئیں اور آپ کی صورت آدمیوں کی سی نہ رہی۔ بیس سال کے بعد حق تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ مخلوق کی محبت اختیار کرو۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ سے کہا کہ پہلے اہل اللہ اور اللہ تعالیٰ کے گھر کے پڑوسیوں کی محبت اختیار کرنی چاہیئے تاکہ زیادہ باعث برکت ہو۔ اس لیے آپ نے مکہ مکرمہ کا ارادہ فرمایا، مشائخ کو دلی طور پر آپ کے آنے کی پہلے سے خبر تھی لہذا وہ آپ کے استقبال کیلئے شہر سے باہر نکلے تو آپ کو اس حالت میں پایا کہ آنکھیں بدلی ہوئی ہیں اور مخلوق کی رمق کے سوا آپ پر کوئی چیز نہ تھی۔ مشائخ نے پوچھا کہ اے ابو عثمانؒ تم نے بیس سال تک زندگی اس طرح گزاری ہے کہ اولاد آدم تجھ کو پہچاننے سے بھی عاجز ہو گئی ہے۔ ہمیں بتاؤ کہ تم کس لیے گئے تھے کیا دیکھا کیا حاصل کیا اور کیوں واپس آ گئے؟ آپ نے فرمایا ''میں سکر کی وجہ سے گیا تھا، سکر کی آفت کو دیکھا، ناامیدی کو حاصل کیا اور عاجزی کے ساتھ واپس آ گیا ہوں۔ مشائخ نے کہا ''اے ابو عثمانؒ تیرے بعد تعبیر کرنے والوں پر حرام ہے کہ وہ صحو اور سکر کے معانی بیان کریں کیونکہ تم نے سکر کی صحیح تحقیق کر لی اور پھر اس کی آفت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پس سکر عین بقا میں فنا کا سراسر گمان ہے اور اس کی صفت حجاب ہے اور صحو فنائے صنعت میں سراسر دیدار بقا ہے اور یہ عین کشف ہے۔ باقی اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ صحو کے مقابلہ میں سکر فنا سے زیادہ قریب ہے تو یہ محال ہے کیونکہ سکر حالت صحو پر ایک زائد صفت ہے۔ جب تک بندہ کے اوصاف روبہ ترقی ہوتے ہیں وہ بے خبر رہتا ہے لیکن جب وہ کم ہونے لگتے ہیں تو اس وقت طالبوں کو اس سے حصول مقصود کی امید ہو جاتی ہے اور صحو و سکر میں ان کے حال کی انتہا یہی ہے...... اور حضرت ابو یزیدؒ جو مغلوب الحال تھے کے بارے میں ایک حکایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے آپ کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ اس آدمی کے بارے میں کیا رائے ظاہر فرماتے ہیں کہ جس نے حق تعالیٰ کی محبت

سے صرف ایک قطرہ ہی پیا اور مست ہو گیا؟ حضرت بایزیدؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے دریا محبت کی شراب بن جائیں اور وہ ان سب کو پی کر بھی تشنگی سے چلاتا رہے؟ صوفیا کا خیال ہے کہ حضرت یحیٰؒ نے حالت سکر سے اور حضرت بایزیدؒ نے حالت صحو سے عبارت کی۔ اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ صاحب صحو وہ ہوتا ہے جو ایک قطرہ کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو اور صاحب سکر وہ ہے جو مستی میں سب کچھ پی جائے اور ابھی اس کو اور بھی ضرورت ہو اس لیے کہ شراب سکر کا آلہ ہے اور جنس کو اپنی ہی جنس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ اور صحو اس کی ضد ہے اس کو شراب پینے سے آرام حاصل نہیں ہوتا۔

باقی سکر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سکر دوستی کی شراب سے اور دوسرا محبت کے پیالہ سے...... دوستی کا سکر کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا وجود کسی نعمت کو دیکھنے سے ہوتا ہے۔ پس جو کوئی نعمت کو دیکھتا ہے وہ دراصل اپنی ذات سے دیکھتا ہے لہذا اپنے آپ کو ہی دیکھتا ہے اور جو کوئی منعم کو دیکھتا ہے وہ چونکہ اس کے واسطے سے ہی دیکھتا ہے اس لیے اپنے آپ کو نہیں دیکھتا۔ وہ اگرچہ بظاہر سکر کی حالت میں ہو لیکن درحقیقت اس کا سکر بھی صحو ہوتا ہے...... اور صحو بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ پہلا صحو غفلت پر اور دوسرا صحو محبت پر ہوتا ہے۔ جو صحو غفلت پر ہوتا ہے وہ تو حجاب اعظم ہے، اور جو صحو محبت پر ہوتا ہے وہ بہت زیادہ واضح کشف ہوتا ہے۔ پس جو حالت غفلت سے ملی ہوئی ہو اگرچہ صحو ہو، سکر ہو گی اور جو حالت محبت سے مقرون ہے وہ اگرچہ سکر ہے صحو ہو گی۔ جب بنیاد اور اصل مستحکم ہو تو صحو سکر کی طرح ہو گا اور سکر صحو کی طرح، اور جب بنیاد ہی مستحکم نہ ہو تو دونوں بے فائدہ ہیں...... خلاصہ کلام یہ ہے کہ صوفیا کی حد نگاہ میں علتوں کے اختلاف کی بنا پر صحو اور سکر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور جب حقیقت کا سلطان اپنے جمال کو دکھاتا تو صحو اور سکر دونوں طفیلی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان دونوں معانی کے اطراف سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ ایک کی انتہا

دوسرے کی ابتدا ہوتی ہے، اور ابتداء وانتہا باہمی تفرقہ کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتے اور جس چیز کی نسبت تفرقہ کے ساتھ ہو وہ حکم میں مساوی ہوتی ہے اور ان کو ایک چیز میں جمع کرنا گویا تفریق کی نفی کرنا[1] ہے۔ اسی معنی کو بیان کرنے کیلئے کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

اِذا طلع الصباحُ بنجم راحٍ	جب خوشی کے ستارے کے ساتھ صبح طلوع
تساوی فیہِ سُکران" وصَاح	ہوتی ہے تو اس وقت مست اور ہوشیار دونوں
	برابر ہوتے ہیں۔

سرخس میں دو بزرگ رہتے تھے ایک لقمان اور دوسرے ابو الفضل حسنؒ لقمان ایک روز ابو الفضلؒ کے پاس آئے تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک جزو پکڑا ہوا ہے۔ انہوں نے پوچھا اے ابو الفضل اس جزو میں کیا تلاش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا "وہی کچھ جو تم اس کو ترک کرنے میں ڈھونڈتے ہو" لقمانؒ نے کہا "کہ یہ اختلاف کیوں ہے؟" ابو الفضل نے جواب دیا "اختلاف تو تمہیں نظر آ رہا ہے جو تم مجھ سے پوچھ رہے کہ میں اس میں کیا ڈھونڈتا ہوں۔ مستی سے ہوشیار اور ہوشیاری سے بیدار ہو جاؤ تاکہ یہ اختلاف اٹھ جائے اور تم جان لو کہ میں اور تم کیا تلاش کر رہے ہو..... پس طیفوریوں کا جنیدیوں سے یہی اختلاف ہے جو میں نے بیان کر دیا، اور مطلق معاملات میں ان کا مذہب لوگوں کی صحبت کا ترک کرنا اور گوشہ نشینی کو اختیار کرنا ہے اور وہ اپنے مریدوں کو بھی یہی حکم دیتے ہیں اور اگر میسر آ جائے تو یہ طریق بڑا قابل تعریف اور یہ سیرت بڑی قابل ستائش ہے۔

جنیدی فرقہ

جنیدی حضرات، حضرت ابو القاسم جنید بن محمدؒ سے محبت کرتے ہیں اور ان کے دور میں ان کو طاؤس العلماء کہتے تھے، آپ اس گروہ کے سردار اور ان کے امام الائمہ تھے۔

---

[1] مفہوم یہ ہے کہ طالب کیلئے مقصود تو کشف اور مشاہدہ حق ہے جب تک وہ حاصل نہ ہو صحو اور سکر دونوں الگ الگ چیزیں ہیں لیکن جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو پھر یہ دونوں ہی مفید ہیں۔

طیفوریوں کے برعکس ان کا طریق صحو پر مبنی تھا اور ان کا اختلاف بیان کر دیا گیا ہے تمام مذاہب صوفیاء میں معروف اور مشہور ترین مذہب آپ کا ہی ہے اور تمام مشائخ بھی جنیدی مذہب کے ہی ہوئے ہیں، تاہم اس کے علاوہ اس طریقت کے معاملات میں ان کے اقوال بہت زیادہ مختلف ہیں لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی پر اختصار کیا ہے، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دوسری جگہ پڑھ لے تا کہ اس سے بہتر طور پر اسے معلوم ہو جائے کیونکہ اس کتاب میں میرا مذہب تو اختصار کرنا اور تطویل کو ترک کرنا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

حکایات میں میں نے پایا ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ اپنے غلبہ کی حالت میں حضرت عمر بن عثمانؒ سے بیزار ہو کر حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت جنیدؒ نے ان سے پوچھا "میرے پاس کس لیے آئے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "تا کہ میں شیخ کی صحبت اختیار کروں" آپ نے فرمایا "میرے پاس مجنونوں کی صحبت کیلئے گنجائش نہیں کیونکہ صحبت کیلئے دماغ کی صحت ضروری ہے کیونکہ جب تم مستی کی آفت کے باوجود صحبت اختیار کرو گے تو وہی انجام ہوگا جو تم نے سہل بن عبداللہ تستریؒ اور عمر کے ساتھ کیا ہے۔

انہوں نے عرض کیا:

ایها الشیخ الصحو السکر صفتان للعبد ومادام للعبد محجوبا عن ربه حتی فنی اوصافه	اے شیخ! صحو اور سکر بندہ کی دو صفتیں ہیں، بندہ اس وقت تک اپنے رب سے محجوب ہی رہتا ہے جب تک اس کی صفات فنا نہ ہو جائیں۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا:

یا بن المنصور! خطات فی الصحو والسکر لان الصحو بلاخلاف عبارة عن صحة حال	اے ابن منصور! تم نے صحو اور سکر کو سمجھنے میں خطا کھائی ہے، کیونکہ صحو بغیر کسی اختلاف عبارت ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے

العبد مع الحق وذالک لا یدخل تحت صفة العبد والکتساب الخلق وانا اری فی کلامک یا بن منصور فضولا کثیرا او عبارات لاطائل تحته

کے صحیح سے، اور یہ چیز بندے کی صفت اور مخلوق کے کسب کے تحت داخل نہیں ہوتی، اور اے ابن منصور! اس کے علاوہ بھی میں تیری کلام میں فضول گفتگو اور ایسی عبارتیں پاتا ہوں جن کا کوئی فائدہ نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

نوری فرقہ

نوری فرقے کے حضرات کی محبت حضرت ابوالحسن احمد بن محمد نوریؒ کے ساتھ ہے۔ جو علماء صوفیا کے سرداروں میں سے ایک تھے اور نور کے لقب سے زیادہ مشہور تھے۔ صوفیاء میں روشن مناقب اور قاطع دلائل کے ساتھ آپ کا ذکر ہوتا ہے اور تصوف میں آپ کا مذہب بڑا پسندیدہ ہے جس کی بنیاد یہ ہے کہ صفوت کو فقر پر فضیلت حاصل ہے اور آپ کا معاملہ حضرت جنیدؒ کے موافق ہے۔ آپ کے طریق کی نادر باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کے نزدیک محبت میں دوسرے کے حق کو اپنے حق پر ترجیح دینا ضروری ہے، اور آپ بغیر ایثار کے محبت کو حرام قرار دیتے اور فرماتے ہیں کہ درویشوں کیلئے محبت ایک فریضہ ہے اور عزلت نشینی ناپسندیدہ فعل ہے، اسی طرح دوست کا دوست کے ساتھ ایثار کرنا بھی فریضہ ہے اور آپ سے نقل ہے کہ آپ نے فرمایا:

ایاکم والعزلة فان العزلة مقارنة الشیطان وعلیکم بالصحبة فان الصحبة رضا الرحمن

تم عزلت نشینی سے بچو کہ خلوت نشینی شیطان کی ہم نشینی ہے، اور صحبت کو اختیار کرو کہ صحبت میں خداوند عزوجل کی خوشنودی ہے۔

اب میں ایثار کی حقیقت بیان کروں گا، اور جب عزلت وصحبت کے باب پر پہنچوں گا تو وہاں ان کے رموز کی شرح کروں گا تاکہ فائدے زیادہ عام ہو جائیں۔ انشاء

اللہ تعالیٰ عزوجل۔

ایثار کا بیان

اللہ تعالیٰ عزوجل کا ارشاد ہے وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" اور صحابہ کرامؓ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ اس کے حاجت مند ہوں۔ اس آیت کا نزول خصوصی طور پر فقرا اصحابہ کرامؓ کی شان میں ہوا ہے، اور ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ دوستی میں اپنے دوست کے حق کا خیال رکھے اور اپنے حصے کو اس حصے میں چھوڑ دے اور اپنے ساتھی کی راحت کیلئے اپنے آپ پر تکلیف برداشت کرے۔

لِاَنَّ الْاِيْثَارَ القيامُ بمعاونة الاَغْيَار مَعَ الاشتغال بما امره الجبارُ لِرَسولِهِ المختار صلى الله عليه وسلم قال الله تعالىٰ خُذِالْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِض عَنِ الْجَاهِلِيْنَ	کیونکہ ایثار دوسروں کی امداد پر قائم رہنے اور اس امر میں مشغول رہنے کا نام ہے جو حق تعالیٰ نے اپنے رسول مختار علیہ السلام کو فرمایا تھا چنانچہ فرمان الٰہی ہے کہ درگزر اختیار کیجئے اور نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے اعراض فرمایئے۔

اس کی پوری تفصیل اداب صحبت کے بیان میں ہوگی تاہم یہاں آیت کریمہ میں ایثار ہی مراد ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو صحبت میں جیسا کہ اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے اور دوسرا محبت میں...... اپنے ساتھی کیلئے ایثار کرنے میں ایک طرح کا رنج اور تکلیف ہوتی ہے لیکن محبوب کے حق میں ایثار کرنے سے خوشی اور راحت ہی ہوتی ہے...... حکایات میں مشہور ہے کہ جب غلام الخلیل نے صوفیا کے ساتھ اپنی دشمنی ظاہر کی اور ہر ایک کے ساتھ اپنی عداوت کا اظہار کیا تو سرکاری کارندے حضرت نوریؒ، حضرت رقامؒ اور حضرت ابوحمزہؒ کو گرفتار کر کے دارالخلافہ میں لے گئے، غلام الخلیل نے امیر المومنین سے کہا کہ یہ لوگ زندیق اور بے دین ہیں۔ اگر امیر المومنین ان کے قتل کا فرمان جاری کر دیں تو بے دینی کی بنیاد ختم ہو جائے گی کیونکہ یہی لوگ بے دینوں کے سرکردہ ہیں، اور جو کوئی بھی یہ نیکی سرانجام دے گا

میں حق تعالیٰ کے ہاں اس کیلئے بڑے اجر وثواب کا ضامن ہوں۔ امیر المومنین نے اسی وقت ان حضرات کی گردنیں مار دینے کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ جلاد آ گیا اور ان تینوں حضرات کے ہاتھ باندھ دیئے۔ جلاد نے جب پہلے حضرت امامؒ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا حضرت نوریؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت امام کی جگہ پر جلاد کے سامنے بڑی گرم جوشی سے آ کر بیٹھ گئے۔ تمام لوگ بڑے حیران ہوئے اور جلاد نے آپ سے کہا ''اے جوانمرد یہ تلوار ایسی چیز نہیں کہ کوئی اتنے شوق سے اس کے سامنے آئے جس طرح تو آیا ہے حالانکہ ابھی تمہاری باری بھی نہیں آئی۔ آپ نے فرمایا ''یہ سب کچھ درست ہے لیکن میرا طریق ایثار پر مبنی ہے اور دنیا میں زندگی ہی سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی کے چند سانس اپنے ان بھائیوں کے کام میں لگا دوں، کیونکہ میرے نزدیک دنیا کا ایک سانس آخرت کے ہزار سال سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے کہ دنیا خدمت کا مقام ہے اور آخرت ثواب کا اور ثواب تو خدمت کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے قاصد نے یہ اطلاع خلیفہ تک پہنچائی تو خلیفہ ان کی اس حالت میں بھی رقت طبع اور کلام کی باریکیوں سے سخت حیران ہوا اور ایک آدمی کو بھیجا کہ سر دست ان حضرات کے بارے میں توقف کیا جائے، اس وقت حضرت ابوالعباس بن علی قاضی القضاةؒ تھے خلیفہ نے ان حضرات کا معاملہ ان کے سپرد کر دیا وہ ان حضرات کو اپنے گھر لے گئے اور شریعت و حقیقت کے احکام میں سے جو کچھ بھی ان سے پوچھا اس میں ان کو درست پایا اور ان کے حال سے اپنی غفلت پر بڑے پشیمان اور پریشان ہوئے اس وقت حضرت نوریؒ نے فرمایا ''اے قاضی! آپ نے یہ جو کچھ پوچھا ہے یہ تو کچھ بھی نہیں''

فَاِنَّ لِلّٰهِ عِبَادٌ يَاكُلُوْنَ بِاللّٰهِ وَيَشْرَبُوْنَ بِاللّٰهِ ويجلسون بِاللّٰه ويقولون بِاللّٰهِ	بے شک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کا کھانا پینا بیٹھنا اور بولنا سب کچھ اللہ کے ساتھ ہے۔

کیونکہ ان کا قیام اس کے ساتھ ہے اور قعود، نطق، حرکت اور سکون سب کچھ اسی کے ساتھ ہے، وہ اسی کے ساتھ زندہ ہیں، اور اسی کے مشاہدہ سے پائندہ ہیں کہ اگر مشاہدہ حق ایک لمحہ کیلئے بھی ان حال سے منقطع ہو جائے تو ان کے وجود میں ایک شور برپا ہو جائے'' قاضی آپ کے کلام کی باریکی اور حال کی صحت پر بڑا متعجب ہوا اور خلیفہ کو لکھا بھیجا کہ اگر یہ گروہ ملحدوں کا ہے تو:

فمن الموحدُ فی العالم پھر دنیا میں موحد کون ہے؟

میں گواہی دیتا اور فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ بے دین ہیں تو پوری دنیا میں ایک آدمی بھی توحید پرست نہیں ہے۔ خلیفہ نے ان کو بلوا کر فرمایا کہ اگر کوئی ضرورت ہے تو مجھ سے طلب کرلو، انہوں نے کہا کہ اے خلیفہ! ہماری تم سے حاجت صرف یہ ہے کہ آپ ہمیں بالکل فراموش کر دیں، نہ تو قبول کر کے ہمیں اپنے دربار کا مقرب بنائیں اور نہ ہی چھوڑ کر ہمیں راندہ قرار دیں کیونکہ آپ کا چھوڑ دینا ہمارے نزدیک آپ کے قبول کر لینے کی طرح ہے اور آپ کا قبول کر لینا ہمارے نزدیک آپ کے چھوڑ دینے کے برابر ہے، خلیفہ یہ سن کر رو پڑا اور عزت و تکریم سے ان کو واپس کر دیا...... حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کو ایک دفعہ مچھلی کی خواہش ہوئی۔ پورے شہر میں تلاش کے باوجود مچھلی نہ مل سکی، چند روز کے بعد مجھے ایک مچھلی میسر آئی تو آپ نے مجھے اس کے بھوننے کا حکم دیا۔ میں جب بھون کر آپ کے سامنے لایا تو مچھلی کے لائے جانے پر آپ کے چہرے پر میں نے خوشی کے آثار دیکھے، اسی وقت ایک سائل دروازے پر آ گیا۔ آپ نے حکم دیا کہ یہ مچھلی اس سائل کو دے دو! غلام نے عرض کیا اے میرے آقا! اتنے دنوں کے بعد تو یہ ملی ہے پھر اب آپ یہ کیوں دیتے ہیں ہم سائل کو اس کی بجائے اور کوئی چیز دے دیتے ہیں، آپ نے فرمایا'' اے غلام! اب اس کا کھانا مجھ پر حرام ہو گیا ہے کہ میں نے اس کو اپنے دل سے ہی نکال دیا ہے کیونکہ میں نے حضرت رسول ﷺ سے سنا ہے کہ:

اَیّمَا امرءٍ یشتھی شھوۃً فَرَدَّ شھوتَہ، واثر الاٰخرَ علی نفسِہٖ غُفِرَلَہ، — جو شخص کسی چیز کی خواہش کرے پھر حاصل ہو جانے پر اس سے اپنا ہاتھ روک لے اور دوسرے شخص کو اپنے اوپر ترجیح دے دے تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بخش دیں گے۔

میں نے حکایات میں دیکھا ہے کہ دس درویش جنگل میں سفر کرتے ہوئے راستہ بھول گئے انہیں شدت کی پیاس محسوس ہوئی جب کہ ان کے پاس پانی کا ایک ہی پیالہ تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر ایثار کرتے رہے، اور کسی نے بھی پانی نہ پیا حتیٰ کہ ایک کے سوا باقی سب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ ایک درویش کہتا ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ سب ہی مر گئے ہیں میں نے وہ پانی پی لیا اور اسی کی قوت سے راستے پر واپس پہنچ گیا کسی آدمی نے اس سے کہا کہ اگر تو بھی پانی نہ پیتا تو زیادہ بہتر تھا۔ درویش نے کہا نہیں میں نے شریعت کو اسی طرح سمجھا ہے کہ اگر میں اب بھی نہ پیتا تو اپنی جان کا قاتل بن جاتا۔ اس نے کہا تو کیا وہ سب اپنی جانوں کے قاتل قرار پائیں گے؟ درویش نے کہا نہیں! کیونکہ ان میں سے ہر ایک نے اس لیے پانی نہ پیا تاکہ دوسرا پی لے لیکن جب وہ سب ایک دوسرے کی موافقت میں فوت ہو گئے اور صرف میں باقی رہ گیا تو لامحالہ شریعت کے حکم کے مطابق مجھ پر واجب ہو گیا کہ وہ پانی میں پی لوں...... جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؓ ہجرت کی رات پیغمبر ﷺ کے بستر پر سو گئے اور آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مکہ سے باہر آ گئے اور غار (ثور) میں تشریف لے آئے، اس رات کفار مکہ نے آنحضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ کر رکھا تھا خداوند تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ اور حضرت میکائیلؑ سے کہا کہ میں نے تم دونوں میں بھائی چارہ قائم کر دیا ہے اور دونوں کی زندگی ایک دوسرے سے دراز کر دی ہے تم میں سے کون ہے جو اپنی زندگی کا دوسرے بھائی کے حق میں ایثار کرے اور اپنے لیے موت کو اختیار کرے، دونوں نے اپنی زندگی کو موت پر ترجیح دی تو حق تعالیٰ عزوجل نے جبرئیلؑ و میکائیلؑ سے

فرمایا تم اپنے مقابلے میں حضرت علیؓ کی فضیلت اور شرف دیکھو کہ میں نے ان کے اور اپنے رسول اللہ علیہ ﷺ کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا ہے تو انہوں نے اپنے قتل اور موت کو اختیار کرلیا ہے اور پیغمبر علیہ ﷺ کی جگہ پر سو گئے ہیں، اپنی جان کو ان پر فدا اور اپنی زندگانی کو ان پر نچھاور کر دیا ہے، اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور ان کو دشمنوں سے محفوظ رکھو! چنانچہ جبرائیلؑ و میکائیلؑ دونوں آئے اور ان میں سے ایک آپ کے سرہانے اور دوسرا پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔ اور جبرائیلؑ نے کہا:

بخ بخ من مثلک یا بن ابی طالب انَّ اللّٰہَ تعالیٰ یباھی بکَ علی مَلٰئِکَتِہٖ	ابوطالب کے بیٹے! تمہارے جیسا کون ہے؟ کہ اللہ تعالیٰ تمام فرشتوں پر آپ کے سامنے فخر کرتے ہیں۔

اور آپ میٹھی نیند سو رہے ہیں، اسی وقت آپ کی شان میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشرِیْ نَفْسَہُ ابتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَؤُفٌ بِالْعِبَاد.	اور لوگوں میں سے وہ بھی تو ہے جو اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بیچ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

جنگ احد کی مصیبت میں جب حق تعالیٰ نے مومنوں کو آزمائش میں مبتلا کیا تو انصار کی نیک عورتوں میں سے ایک بیان کرتی ہیں کہ میں پینے کا تھوڑا سا پانی لے کر باہر نکلی تاکہ مجاہدین میں سے کسی کے پاس لے جاؤں۔ میدان جنگ میں صحابہ کرامؓ میں سے ایک کو میں نے دیکھا کہ زخمی حالت میں پڑے اپنے سانس گن رہے ہیں، انہوں نے مجھے اشارہ کیا کہ مجھے پانی دو! میں پانی انہیں دینے لگی تو دوسرے زخمی صحابیؓ نے آواز دی کہ ''مجھے پانی دو'' پہلے صحابیؓ نے پانی نہ پیا اور مجھے کہا ''اس کے پاس لے جاؤ'' اسی طرح جب میں اس کے پاس لے گئی تو ایک اور نے آواز دی کہ ''مجھے پانی دو'' تو انہوں نے بھی خود نہ پیا اور کہا ''اس کے پاس لے جاؤ'' اسی طرح سات حضرات کے پاس میں پانی لے کر گئی لیکن ہر ایک نے خود پینے کی بجائے دوسرے کی طرف بھیج دیا حتیٰ کہ جب ساتویں صحابیؓ نے مجھ

سے پانی لینا چاہا تو ان کی روح پرواز کرگئی، میں واپس لوٹی تا کہ دوسرے کو دے دوں لیکن وہ چھ صحابیؓ بھی اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرچکے تھے، اسی وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ" صحابہ کرام دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ اس کے حاجت مند ہوں

بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا کہ اس نے چار سو سال تک حق تعالیٰ کی عبادت کی تھی ایک دن کہنے لگا "یا خدایا! اگر آپ ان پہاڑوں کو پیدا نہ کرتے تو تیرے بندوں کیلئے چلنا اور سیاحت کرنا بڑا آسان ہو جاتا۔" اس وقت کے پیغمبر صلوات اللہ علیہ پر وحی آئی کہ اس عابد کو جا کر کہو کہ تمہیں ہماری ملک میں تصرف کرنے سے کیا کام تھا؟ اگر اب پھر تم نے تصرف کیا تو تمہارا نام سعادت مندوں کے دیوان سے کاٹ کر بدبختوں کے دیوان میں لکھ دیا جائے گا۔ یہ سن کر اس عابد کے دل میں خوشی پیدا ہوئی اور خداوند کے حضور سجدہ شکر ادا کیا۔ پیغمبر وقت نے کہا "نادان! بدبختی پر سجدہ شکر تو ادا نہیں کرتے" اس نے جواب دیا "میرا شکر بدبختی پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ میرا نام حق تعالیٰ کے دفتروں میں سے کسی دفتر میں تو ہے تاہم اے پیغمبر خدا میری ایک خواہش ہے انہوں نے کہا" کہو تا کہ میں اللہ تعالیٰ سے عرض کروں" کہنے لگا حق تعالیٰ سے کہیے! اگر اب تو مجھے دوزخ میں بھیجتا ہے تو مجھے اس طرح کر دے کہ میں تمام گنہگار مسلمانوں کی جگہ گھیر لوں تا کہ وہ سب جنت میں چلے جائیں" حق تعالیٰ کا فرمان آیا کہ اے پیغمبر! میرے اس بندے سے کہہ دو کہ تمہارا یہ امتحان تمہاری اہانت کیلئے نہ تھا بلکہ مخلوقات پر تجھے ظاہر کرنا مقصود تھا اور قیامت کے دن تو جن کی شفاعت کرے گا وہ سب جنت میں ہوں گے۔ اور حضرت احمد حماد سرخسیؒ سے میں نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ آپ کی توبہ کا آغاز کیسے ہوا؟ آپ نے فرمایا ایک دفعہ میں اپنے اونٹوں کو لے کر سرخس سے باہر بیابان کی طرف نکل گیا اور ایک عرصہ تک وہیں رہا۔ اور میں اس بات کو ہمیشہ پسند کرتا تھا کہ خود بھوکا رہ جاؤں اور اپنا حصہ کسی دوسرے کو دے دوں اور حق تعالیٰ عزوجل کا یہ قول

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلىٰ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَة'' ہروقت میرے دل میں تازہ رہتا تھا اور ایسے لوگوں کے ساتھ میرا بڑا اعتقاد تھا ایک دن ایک بھوکا شیر جنگل سے ظاہر ہوا اور میرے اونٹوں میں سے ایک اونٹ کو مار ڈالا اور بلندی پر بیٹھ کر چنگھاڑنے لگا۔ اس کے نزدیک نزدیک جتنے درندے اس کی آواز سنتے گئے اس کے گرد جمع ہوتے چلے گئے وہ آیا اور اونٹ کو پھاڑ ڈالا۔ خود کچھ نہ کھایا اور بلندی پر چڑھ گیا وہ درندے لومڑی، گیدڑ، بھیڑیئے اور اسی طرح دوسرے جانوروں نے اس کو کھانا شروع کر دیا اور خود وہیں کھڑا رہا تاکہ وہ سب واپس لوٹ گئے، اس وقت اس نے ارادہ کیا تاکہ تھوڑا سا خود بھی کھا لے کہ ایک لنگڑی لومڑی دور سے آتی ہوئی نظر آئی، شیر واپس لوٹ کر بلندی پر چڑھ گیا یہاں تک کہ وہ لومڑی اس میں سے جو کچھ کھا سکتی تھی کھا کر واپس چلی گئی تو اب شیر آیا اور اس میں سے تھوڑا سا کھا لیا۔ میں دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو مجھے فصیح زبان میں کہنے لگا ''اے احمد! ایک لقمے کا ایثار تو کتے بھی کر لیتے ہیں۔ مردان حق تو اپنی جان اور زندگی کا ایثار کرتے ہیں'' جب میں نے یہ برہان دیکھ لی تو تمام اشغال دنیا سے دست بردار ہو گیا۔ اور یہی میری توبہ کی ابتدا تھی...... حضرت جعفری فلامیؒ کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت ابوالحسن نوریؒ خلوت میں مناجات کر رہے تھے۔ میں وہاں گیا تاکہ ان کی مناجات اس طرح سن لوں کہ انہیں علم نہ ہو سکے کہ آپ بڑے فصیح اور ہوشیار تھے میں نے سنا تو آپ کہہ رہے تھے کہ ''بار خدایا! آپ دوزخ والوں کو عذاب دیں گے حالانکہ وہ سب علم، قدرت اور آپ کے قدیم ارادے سے آپ کے اپنے ہی پیدا کردہ ہیں۔ اور اگر آپ دوزخ کو انسانوں سے ضرور ہی بھرنا چاہتے ہیں تو آپ اس پر بھی قادر ہیں کہ دوزخ اور اس کے تمام طبقات کو صرف میرے وجود سے ہی پر کر دیں اور ان کو جنت میں بھیج دیں حضرت جعفر کہتے ہیں کہ میں ان کے معاملے میں بڑا متحیر ہوا۔ کچھ روز بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی آنے والا آیا اور کہنے لگا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ابوالحسن کو کہہ دو کہ میں نے تمہیں اس شفقت اور تعظیم کی

بدولت بخش دیا ہے جو تجھے میرے اور میرے بندوں کے ساتھ ہے..... آپ کو نوری اس لیے کہتے ہیں کہ جب آپ کسی تاریک مکان میں گفتگو کرتے تو آپ کے باطنی نور سے وہ مکان جگمگا اٹھتا تھا۔ نیز آپ نور خداوندی سے اپنے مریدوں کے اسرار جان لیا کرتے تھے حتیٰ کہ حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ابوالحسن دلوں کے جاسوس ہیں..... یہ آپ کے مذہب کی خصوصیت ہے اور اہل بصیرت کے نزدیک یہ بڑی مضبوط بنیاد اور پر عظمت معاملہ ہے اور آدمی پر اس سے زیادہ سخت چیز کوئی نہیں کہ وہ اپنی روح کو دوسرے کیلئے خرچ کر دے اور اپنی پسندیدہ چیز سے دست کش ہو جائے۔ خداوند تعالیٰ نے بھی تمام نیکیوں کی کنجی اپنی پسندیدہ چیز کو خرچ کر دینے کو ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی محبوب چیزوں میں سے راہ حق میں خرچ نہ کرو۔

جب کسی کی روح ہی دوسرے کیلئے فدا ہو جائے تو پھر حال و منال اور خرقہ ولقمہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور اس طریقت کی اصل وہی ہے جیسا کہ ایک آدمی حضرت رویمؒ کے پاس آیا کہ مجھے وصیت کیجئے! آپ نے فرمایا:

یَابُنَیَّ لَیْسَ الْاَمْرَ غیر بذل الروح ان قدرتَ عَلٰی ذٰلِکَ وَاِلَّا فَلَاتَشْتَغِلُ بترهاتِ الصوفية	اے بیٹا! تصوف اپنی جان کو خرچ کرنے کے سوا کچھ نہیں اگر تو یہ کر سکتا ہے تو ٹھیک! ورنہ صوفیوں کی فضول باتوں میں مشغول نہ ہو۔

کیونکہ جان خرچ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے سب فضول ہے، اور خداوند عزوجل ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَلاَ تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَا تَابَلْ اَحْیَاء'' عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ

جولوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کر دیئے جاتے ہیں انہیں مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔

اور نیز ارشاد خداوندی ہے:

وَلاَ تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَات'' بَلْ اَحْیَاء''

اور جولوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

پس یہ لوگ اپنی جان قربان کر کے قرب الٰہی میں ہمیشہ کی زندگی پا لیتے ہیں اور فرمان الٰہی کے مطابق حق تعالیٰ کے دوستوں کیلئے اپنا حصہ چھوڑ دیتے ہیں..... باقی ایثار اور اختیار بنظر ظاہر جدا جدا ہیں مگر حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ حقیقت ایثار یہ ہے کہ اپنے حصہ کو چھوڑ دیا جائے اور یہی اصل اپنا حصہ بن جاتا ہے۔ طالب کی روش جب تک اپنے کسب سے متعلق رہتی ہے وہ اس کیلئے ہلاکت کا موجب بنی رہتی ہے اور جب حق تعالیٰ کی کشش اپنی ولایت ظاہر کرتی ہے تو اس کے افعال و احوال سب پریشان ہو جاتے ہیں اور پھر اس کیلئے نہ کوئی عبارت رہتی ہے اور نہ ہی اس کے معاملہ کیلئے کوئی نام باقی رہتا ہے کہ کوئی اس کا نام رکھے یا کسی عبارت سے اسے تعبیر کرے یا کسی چیز کو اس کے حوالے کرے اسی معنی میں شبلیؒ نے فرمایا ہے..... شعر

غبت عنی فما احس بنفسی وتلاشت بہ صفاتی الموصوفة

(میں اپنے آپ سے غائب ہو گیا ہوں پس مجھے اپنے نفس کا بھی احساس نہیں رہا اور اس کی وجہ سے میری تمام صفات موصوفہ لاشی ہو گئی ہیں)

فانی الیوم غائب عن جمیع لیس الاالعبارة الملھوفة

(پس میں آج ہر چیز سے غائب ہوں کہ پریشان عبارت کے سوا کچھ نہیں رہا۔)

فرقہ سہلیہ

سہلی حضرات، حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو اہل تصوف کے ذی احتشام اور بڑے بزرگوں میں سے تھے جیسا کہ پہلے تذکرہ ہو چکا ہے فی الجملہ آپ اپنے دور میں سلطان وقت اور اس طریقت کے اہل حل وعقد میں تھے آپ کی دلیلیں بڑی ظاہر ہیں کہ آپ کی حکایات کے ادراک سے عقل عاجز آ جاتی ہے اور آپ کا طریق اجتہاد مجاہدہ نفس اور ریاضت پر مبنی ہے اور آپ اپنے مریدوں کو مجاہدہ کے ذریعہ درجہ کمال پر پہنچا دیتے تھے...... حکایات میں مشہور ہے کہ آپ نے ایک مرید سے فرمایا کہ کوشش کرحتی کہ ایک روز دن بھر تو ''یااللہ یااللہ یااللہ'' کہتا رہے، اسی طرح دوسرے اور پھر تیسرے دن بھی یہی ورد کرتا رہے اس نے ایسا ہی کیا حتی کہ اس کی عادت بن گئی تو آپ نے فرمایا اب راتوں کو بھی ساتھ ملا لے، اس نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ اس طرح ہو گیا کہ اگر اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا تو بھی یہی ورد کرتا یہاں تک کہ یہ اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تو اس وقت حکم دیا کہ اب اس سے باز آ اور اس کو یاد رکھنے میں مشغول ہو جا وہ یاد الٰہی میں مشغول ہو گیا یہاں تک کہ اس کا سارا وقت اسی میں مستغرق ہو گیا۔ ایک وقت اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ ہوا کے ساتھ ایک لکڑی اندر آ پڑی اور اس کے سر پر لگی اور اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے سر سے خون کے جو قطرے زمین پر آئے تھے ان میں اللہ اللہ لکھا ہوا ظاہر ہوتا تھا......

مجاہدات وریاضت کے ذریعہ مریدوں کی تربیت سہلیوں کا طریقہ ہے۔ جب کہ درویشوں کی خدمت اور ان کی تعظیم حمدونیوں کا طریق ہے اور مراقبہ باطن جنیدیوں کا طریقہ ہے۔ تاہم مجاہدہ اور ریاضت ہر آدمی کیلئے نفع بخش نہیں ہوتا۔

اب میں نفس کی پہچان اور اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے اس کے بعد مجاہدات کے بارے میں صوفیہ کے مذاہب اور ان کے احکام تحریر کروں گا

تا کہ طالب معرفت پر یہ دونوں چیزیں ظاہر ہو جائیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حقیقت نفس اور معنی ''ہویٰ''

جان لو کہ نفس، لغت کی رو سے کسی چیز کے وجود اس کی حقیقت اور اس کی ذات کو کہتے ہیں، لیکن عام عادات اور لوگوں کی عبارتوں میں یہ کئی معانی کا متحمل ہے جو اسے متضاد معانی میں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی گروہ کے نزدیک تو نفس بمعنی روح کے ہے اور کسی گروہ کے ہاں بمعنی مروت کے ہے اسی طرح ایک گروہ نفس سے جسم مراد لیتا ہے تو ایک اور جماعت اس سے خون مراد لیتی ہے لیکن محقق صوفیہ کے نزدیک ان میں سے کوئی معنی بھی مراد نہیں بلکہ درحقیقت وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ شر کا سر چشمہ اور برائی کا رہنما ہے...... باقی ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ جسم کے اندر روح کی طرح ودیعت رکھی گئی ایک چیز ہے اور ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ جسم کے اندر زندگی کی طرح ایک صفت ہے۔ تاہم وہ متفق ہیں کہ برے اخلاق کا اظہار اس سے ہوتا ہے اور یہی قابل مذمت افعال کا سبب بنتا ہے اور ان کی دو قسمیں ہیں اول معاصی یعنی گناہوں کا سرزد ہونا اور دوسرے برے اخلاق، مثلاً تکبر، حسد، بخل، غصہ، کینہ اور دوسرے وہ افعال جو شریعت اور عقل دونوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ پس ان اوصاف کو ریاضت کے ذریعہ اپنے آپ سے اسی طرح دفع کیا جاتا ہے جیسا کہ معاصی کو تجربہ کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔ معاصی یعنی گناہ ظاہری اوصاف میں سے ہے اور یہ برے اخلاق باطنی اوصاف سے اور ریاضت ظاہری افعال میں سے ہے اور توبہ باطنی افعال میں سے۔ چنانچہ باطن میں جو برے اوصاف پیدا ہوتے ہیں وہ ظاہری اچھے اوصاف کے ذریعہ پاک ہو جاتے ہیں اور جو برے افعال ظاہر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ باطن کے پسندیدہ اوصاف کے ذریعہ پاک ہو جاتے ہیں۔ اور جس طرح جہان میں شیاطین، فرشتے، جنت اور دوزخ موجود ہیں اسی

طرح انسان جسم میں نفس اور روح دونوں لطائف میں سے ہیں، تاہم ان میں سے ایک ''روح'' تو محل خیر ہے اور دوسرا ''نفس'' محل شر ہے جس طرح آنکھ محل نظر کان محل شنوائی، زبان محل ذوق اور اسی طرح دوسرے محسوسات اور اوصاف جو آدمی کے جسم میں ودیعت رکھے گئے ہیں۔ پس نفس کی مخالفت ہی تمام عبادات کی اصل اور تمام مجاہدات کا کمال ہے اور بندہ اس کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف راہ نہیں پا سکتا کیونکہ نفس کی موافقت بندے کی ہلاکت اور اس کی مخالفت بندے کی نجات ہے۔ حق تعالیٰ نے نفس کی مخالفت کرنے کا حکم دیا ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اس کی مخالفت میں کوشاں رہتے ہیں اور جو لوگ اس کی موافقت میں چلتے ہیں ان کی مذمت کی ہے حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ — اور جس نے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا پس جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

اور نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ:

اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَالاَ تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ — کیا ایسا نہیں کہ جب کبھی رسول ایسے احکام لایا جنہیں تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے تو تم اکڑ گئے۔

اور حق تعالیٰ نے ہمیں حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کی طرف سے خبر دی کہ:

وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَارَحِمَ رَبِّي — میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا کیونکہ نفس تو بلاشبہ برائی کا حکم دینے والا ہے۔ بجز اس کے کہ میرا پروردگار رحم کرے۔

اور پیغمبر علیہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا بَصَّرَهٗ بِعُيُوْبِ نَفْسِهٖ — جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اسے اس کے نفس کے عیوب دکھا دیتے ہیں۔

اور آثار میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ عزوجل نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا کہ:

یَادَاؤدُ عَادِ نَفسکَ فَاِنَّ وُدِّیَ فِی عَدَاوَتِهَا	اے داؤدؑ اپنے نفس کے ساتھ عداوت رکھ کیونکہ میری محبت نفس کی عداوت میں ہے۔

پس یہ تمام جو میں نے بیان کئے ہیں اوصاف ہیں اور صفت کیلئے ایک موصوف ضروری ہے کہ جس کے ساتھ یہ قائم ہو کیونکہ صفت بذات خود قائم نہیں ہوتی اور اس صفت کی پہچان پورے جسم کی شناخت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور جسم کی شناخت کا طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کے اوصاف اور اس کے اسرار بیان کیے جائیں انسانیت کی حقیقت میں لوگوں نے کلام کی ہے کہ انسانیت کس چیز کا نام ہے اور یہ کس چیز کیلئے سزاوار ہے؟ اور اس کا علم تمام متلاشیان حق کیلئے فرض ہے کہ جو کوئی اپنے آپ سے جاہل ہے وہ غیر کی حقیقت سے بہت زیادہ جاہل ہوگا...... جب بندہ کو خداوند تعالیٰ کی معرفت کا مکلف بنایا گیا ہے تو اسے اپنی معرفت بھی حاصل ہونی چاہئے تاکہ اپنے حادث ہونے کی صحت سے حق تعالیٰ کے قدیم ہونے کو پہچان لے اور اپنی فنا سے حق تعالیٰ کی بقا کو معلوم کرے اور کتاب اللہ صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ سے جاہل ہونا ہی کافروں کی صفت بیان کی اور فرمایا ہے:

وَمَن یَّرغَبُ عَنْ مِلَّةِ اِبرَاهِیمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَه'	اور ملت ابراہیمی سے وہی آدمی روگردانی کر سکتا ہے جو اپنی ذات سے جاہل ہو۔

اور مشائخ میں سے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ:

وَمَنْ جَهِلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ بِالْغَیْبِ اَجْهَلُ	جو آدمی اپنی ذات سے جاہل ہو وہ غیر سے بہت زیادہ جاہل ہوتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ، فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہ،

جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا ہے۔

یعنی

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ، بالفناء فقد عرف ربَّہ، بالبقاء ویقالُ من عرف نفسہ، بالذل فقد عرف ربَّہ، بالعز ویقالُ مَن عَرَف نفسَہ، بالعبودیۃ فَقَدْ عرف رَبَّہ، بِالربوبیَّۃِ

جس نے اپنے نفس کو فنا سے پہچان لیا اس نے اپنے رب کو بقا سے پہچان لیا اور کہا جاتا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو ذلت سے پہچان لیا اس نے اپنے رب کو عزت سے پہچان لیا اور بعضوں نے کہا کہ جس نے اپنی ذات کو عبودیت سے پہچان لیا اس نے اپنے رب کی ربوبیت کی معرفت حاصل کرلی۔

پس جو آدمی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ تمام چیزوں کی معرفت سے محروم رہتا ہے اور اس جگہ اس جملے سے مراد انسانیت کی معرفت ہے.....اہل قبلہ میں سے بعض حضرات کا انسان کی حقیقت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ انسان روح کے سوا کچھ نہیں، یہ جسم اس کیلئے زرہ اور ڈھانچہ ہے اور اس کا مقام اور ٹھکانہ ہے تاکہ وہ طبیعتوں کے خلل سے محفوظ رہے اور حسن اور عقل اس کی صفتیں ہیں.....لیکن یہ قول باطل ہے اس لیے کہ جب اس جسم سے جان جدا ہو جاتی ہے اس وقت بھی اس کو انسان ہی کہتے ہیں اور یہ نام مردہ شخص سے اٹھا نہیں لیا جاتا۔ بلکہ جب اس میں جان ہوتی ہے تو اسے زندہ انسان کہتے ہیں اور جب بے جان ہو جاتا ہے تو انسان مردہ کہہ دیتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ جان تو ایک حیوان میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن اس کو انسان نہیں کہتے، اگر انسانیت کی علت صرف روح ہی ہے تو پھر تو جس جگہ بھی جان ہو اس پر انسانیت کا حکم موجود ہونا چاہئے۔ بس ان کے اس قول کے بطلان پر تو یہ دلیل قائم ہے.....اور ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ

نام روح اور جسم دونوں کے مجموعے پر واقع ہوتا ہے چنانچہ جب ان میں سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائے تو اسم انسان ساقط ہو جاتا ہے، جیسا کہ گھوڑے پر جب کالا اور سفید دو رنگ اکٹھے ہو جائیں تو اس کو ابلق کہتے ہیں اور جب ایک رنگ دوسرے سے جدا ہو جائے تو ان میں سے ایک رنگ کو سیاہ اور دوسرے کو سفید کہتے ہیں۔

یہ قول بھی باطل ہے حق تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ" مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا (انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی آ چکا ہے کہ اس کا ذکر تک نہ تھا۔ اس آیت مبارکہ میں آدمی کی بے جان مٹی کو انسان کہا ہے جب کہ اس کے جسم کے ساتھ ابھی تک جان کا تعلق نہیں ہوا تھا اب ایک اور گروہ کہتا ہے کہ انسان ایک ایسا جزو ہے جس کی آگے تقسیم نہیں کی جا سکتی اور محل دل ہے کہ آدمی کے تمام اوصاف کی اصل وہی ہے لیکن یہ قول بھی محال ہے کیونکہ اگر کسی کو قتل کر دیا جائے اور دل اس سے نکال لیں تو بھی انسانیت کا نام اس سے گرتا نہیں اور بالاتفاق روح سے پہلے جسم انسانی میں دل موجود نہ تھا...... اور مدعیان تصوف کے ایک گروہ کو اس کے معانی میں غلطی واقع ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کھانے پینے والی اور محل تغیر ذات انسان نہیں بلکہ وہ ایک سرِ الٰہی ہے اور یہ جسم اس کا لباس ہے اور وہ طبیعت کے امتزاج اور جسم و روح کے اتحاد میں ودیعت کیا گیا ہے...... میں کہتا ہوں کہ تمام عقلمندوں، دیوانوں، کافروں فاسقوں اور جاہلوں کو بالاتفاق انسان ہی کہا جاتا ہے اور ان کے اندر اسرار خداوندی میں سے کوئی چیز بھی موجود نہیں، اور تمام تغیر پذیر اور کھانے پینے والے ہیں اور کسی شخص کے جسم اور وجود میں کوئی ایسے معنی نہیں جن کو انسان کہا جائے اور اس کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی کوئی ایسے معنی نہیں جن کو انسان کہا جا سکے...... اور خداوند عزوجل نے ان معنوں کے بغیر جو بعض انسانوں میں نہیں پائے جاتے ان تمام ماہیتوں کو جنہیں ہمارے وجود میں ترکیب دیا ہے، انسان کہا ہے۔ جیسے کہ حق تعالیٰ کا قول ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

اور تحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا پھر اس کو ایک مضبوط قرار گاہ (رحم) میں نطفہ بنایا پھر ہم نے نطفہ خون بستہ بنایا، پس خون بستہ کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھادیا، پھر اسے اور ہی مخلوق یعنی مکمل انسان بنادیا، پس اللہ برکتوں والا ہے سب سے اچھا پیدا کرنے والا ہے۔

پس خداوند تعالیٰ کے قول کے مطابق ''کہ وہ سب سچوں سے زیادہ سچا ہے'' پاک مٹی سے بننے والی یہ مخصوص صورت تمام تغیرات کے ساتھ انسان ہے جیسا کہ اہل سنت کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ انسان نام ہے اس جاندار کا کہ اس کی صورت اس طرح موجود ہے کہ موت بھی اس نام کو اس سے نفی نہ کرے جب تک یہ صورت معہودہ ظاہر و باطن کے ساتھ موسوم ہو۔ صورت معہود سے مراد ظاہر میں تندرست اور بیمار ہوتا اور باطن میں مجنوں اور عقلمند سے موسوم ہوتا ہے، اور بالاتفاق جو انسان جتنا زیادہ صحیح ہے وہ اتنا ہی پیدائش میں زیادہ کامل ہے۔ پس جان لو کہ انسان کی ترکیب جن چیزوں سے مکمل ہوتی ہے وہ محقق صوفیہ کے نزدیک تین ہیں...... ایک روح دوسری نفس اور تیسری جسم...... اور ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک صفت ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے۔ روح کیلئے عقل...... نفس کیلئے خواہش...... اور جسم کیلئے حس صفات ہیں...... اور انسان تمام عالم کا نمونہ ہے جب کہ عالم نام ہے دونوں جہانوں کا۔ اور دونوں جہانوں سے انسان میں نشان موجود ہے، چنانچہ پانی، مٹی، ہوا اور آگ اس جہان کی علامت ہیں اور اس کی ترکیب بلغم، خون، صفرا اور سودا سے ہوئی ہے جب کہ اس جہان کا نشان جنت، دوزخ اور عرصات ہیں۔ پھر جان اپنی لطافت کی وجہ سے

جنت، نفس اپنی آفت اور وحشت کی وجہ سے دوزخ اور اہم عرصات (میدان حشر) کی جگہ ہے......اور ان دونوں کا جمال، غضب اور باہمی انس سے ہے، پس بہشت اس کی خوشنودی کی تاثیر ہے اور دوزخ اس کی ناراضی کا نتیجہ ہے اور اس کا نفس حق تعالیٰ سے حجاب اور گمراہی سے ہے اور مومن قیامت میں جب تک دوزخ سے خلاصی پا کر بہشت میں نہیں پہنچے گا اور روایت کی حقیقت نہیں پائے گا اس وقت تک۔یقیناً قرب الٰہی تک نہیں پہنچ سکے گا۔اسی طرح دنیا میں بندہ جب تک نفس سے نجات حاصل کر کے حق تک نہیں پہنچتا کہ جس کا اصل وہ روح ہے یقیناً قربت اور معرفت خداوندی تک نہیں پہنچ سکتا......پس جو بندہ دنیا میں اس کو پہچان لے اور دوسروں سے اعراض کر لے اور شریعت کی راہ پر گامزن رہے وہ قیامت کے دن دوزخ اور پل صراط کو نہ دیکھے گا۔غرضیکہ مومن کی روح اس کو بہشت کی طرف بلانے والی ہے کیونکہ وہی دنیا میں بہشت کا نمونہ ہے اور مومن کا نفس اس کو دوزخ کی طرف دعوت دینے والا ہے کہ دنیا میں وہی دوزخ کا نمونہ ہے اس روح کیلئے تدبیر کرنے والی کامل عقل ہے جب کہ اس نفس کیلئے قائد و رہنما ناقص خواہش ہے۔وہ ایک یعنی عقل کی تدبیر حق ہے اور یہ ایک یعنی خواہش کی تدبیر خطا ہے۔پس درگاہ خداوندی کے طالبوں کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اس نفس کی مخالفت پر کمر بستہ رہیں تاکہ بخلاف اس کے روح اور عقل کی مدد کر سکیں جو سر خداوندی کا مقام ہے۔(واللہ اعلم بالصواب)

فصل

مشائخ کے اقوال

باقی جو کچھ نفس کے بارے میں مشائخ نے فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ:

اشد الحجاب رُویتُ النفس — بندے کیلئے سخت ترین حجاب یہ ہے کہ وہ

وتدبیرھا — نفس کا اور اس کی تدبیر کا لحاظ رکھے۔

اس لیے کہ اس کی متابعت حق تعالیٰ کی مخالفت ہے اور حق تعالیٰ کی مخالفت تمام حجابوں کی جڑ ہے۔

اور حضرت بایزید بسطامیؒ نے کہا ہے کہ:

النفس صفة لا تَسکُنُ اِلاَّ بِالباطل — نفس ایک ایسی صفت ہے جو صرف باطل سے ہی سکون پاتی ہے۔

یعنی وہ ہرگز راہ حق کو اختیار نہیں کرتا..... حضرت محمد بن علی الترمذی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ:

تریدان تعرف الحق مع بقاءِ نفسک فیک ونفسک لاتعرفها فکیف تعرف غیرها — تو چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے اور تیرا نفس تیرے اندر موجود بھی ہو۔ حالانکہ تیرا نفس تو اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا تو پھر اپنے غیر کو کیسے پہچانے گا۔

یعنی اپنے بقا کی صورت میں نفس خود اپنے آپ سے حجاب ہے تو اسے مشاہدہ حق کیسے حاصل ہوگا..... حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ:

اساس الکفر قیامک علی مراد نفسک — تیرا اپنے نفس کی مراد پر قائم ہونا ہی کفر کی بنیاد ہے۔

اس لیے کہ نفس کو اسلام کے ساتھ کوئی مقارنت نہیں تو لامحالہ وہ اسلام سے اعراض کرنے میں کوشاں رہے گا اور اسلام سے اعراض کرنے والا منکر ہوتا ہے اور منکر حق سے بیگانہ ہوتا ہے.....اور حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ

النفس خائنة مانعة وافضل الاعمال خلافها — نفس، امانت میں خیانت کرنے والا اور رضا الٰہی کی جستجو سے روکنے والا ہے اور اس کی مخالفت کرنا ہی افضل عمل ہے۔

اس لیے کہ امانت میں خیانت کرنا بیگانگی ہے اور رضا الٰہی کا ترک کر دینا گمراہی ہے نفس کے

بارے میں مشائخ کے اقوال اتنے زیادہ ہیں کہ ان تمام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں لہذا میں اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے نفس کے مجاہدات کی صحت اور اس کی ریاضت سے متعلق مذہب سہلیہ بیان کرتا ہوں اور ساتھ ہی اس کی حقیقت کے بارے میں ان کا طریق ذکر کرتا ہوں۔

مجاہدہ نفس کا بیان

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا	اور جو لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے کی رہنمائی فرما دیتے ہیں۔

اور نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

المجاهد من جاهد نفسه فی اللّٰهِ	مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔

اور نبی ﷺ نے مزید فرمایا ہے کہ:

رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر قیل یا رسول اللّٰهِ ماالجهاد الاکبر قال الاوهی مجاهدة النفس	ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ کر آئے ہیں، عرض کیا گیا یا رسول ﷺ وہ بڑا جہاد کیا ہے آپؐ نے فرمایا آگاہ رہو کہ وہ مجاہدۂ نفس ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مجاہدہ نفس کو جہاد پر فضیلت دی اس لیے کہ اس کی تکلیف زیادہ ہے کیونکہ جہاد دشمن کو ہٹاتا ہے اور مجاہدہ نفس کو مغلوب کرتا ہے۔ پس جان لو اللہ تعالیٰ تمہیں عزت دے کہ نفس کا مجاہدہ اور اس کو مغلوب کیے رکھنا بڑا ظاہر اور واضح ہے کہ ہر دین اور ملت کے لوگوں میں یہ پسندیدہ فعل ہے اور اہل طریقت اس کی رعایت رکھنے میں خاص ہیں۔ اہل طریقت کے عوام و خواص میں یہ عبارت مستعمل اور جاری ہے اور مشائخ کے اس معاملے میں کلمات اور رموز بہت سے ہیں۔ خصوصاً حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ اس کی

اصل میں بڑا غلو کرتے ہیں اوران کیلئے مجاہدات کے اندر براہین بھی بہت ہیں ...... کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح کرر کھا تھا کہ پندرہ دن کے اندر صرف ایک بار کھانا کھاتے تھے اور اسی تھوڑی سی غذا پر ہی طویل عمر گزار دی۔ یوں تو تمام محققین نے مجاہدے کا اثبات کیا ہے اور اس کو مشاہدہ کے اسباب میں شمار کیا ہے لیکن حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ نے تو اسے مشاہدہ حق کی علت قرار دیا ہے اور طالب حق کیلئے اس میں بڑی تاثیر بیان کی ہے، اور آپ حصول مراد کی خاطر دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر فضیلت دیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ آخرت کی زندگی تو اس دنیا کی زندگی کا ہی ثمرہ ہے کہ جب اس دنیا میں خدمت کرو گے تو آخرت میں قرب الٰہی حاصل کرو گے اور بغیر عمل کے اس کی قربت حاصل نہیں ہوسکتی۔ لہذا ضروری ہے کہ حق تعالیٰ تک وصول کی علت بندے کا وہ مجاہدہ ہو جو وہ اس کی توفیق سے کرتا ہے کہ:

المشاهدات مواريث المجاهدات مشاہدہ حق، مجاہدات کی میراث ہے۔

اور دوسرے مشائخ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی علت نہیں، کیونکہ جو کوئی بھی حق تعالیٰ تک پہنچا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے پہنچا ہے اور اس کے فضل کا بندوں کے افعال کے ساتھ کیا کام ہے۔ پس مجاہدے نفس کی درستی کیلئے ہیں، قرب کی حقیقت کیلئے نہیں، اس لیے کہ مجاہدے کا رجوع بندے کی طرف ہوتا ہے جب کہ مشاہدے کا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، پس محال ہے کہ یہ مجاہدہ مشاہدے کیلئے علت بن سکے یا مشاہدہ اس مجاہدے کیلئے آلہ قرار پائے۔ حضرت سہلؒ کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے مشاہدہ پالیتا ہے، اور نیز تمام انبیاء کی بعثت، شریعت کا اثبات، کتابوں کا نزول اور تکلیف کے تمام احکام مجاہدہ ہی ہیں۔ اگر مجاہدہ، مشاہدہ کیلئے علت نہ ہوتا تو ان تمام کا حکم باطل ہو جاتا۔ نیز دنیا وآخرت کے تمام احوال حکمتوں اور علتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اگر علتوں کی نفی کر دیں تو شریعت اور

رسم تمام اٹھ جائیں، پھر نہ اصل میں تکلیف کا اثبات درست ہوگا اور نہ ہی فرع میں...... کھانا پیٹ بھرنے کیلئے اور کپڑا پہننا سردی ہٹانے کیلئے علت ہے، اور یہ علت کی نفی تو تمام امور کو معطل کر دینے کا موجب ہے، پس افعال میں اسباب کا لحاظ رکھنا توحید ہے اور ان کا رد کر دینا تمام امور کو معطل کر دینا ہے، اور مشاہدہ کے اندر اس بات کی دلیلیں موجود ہیں اور مشاہدہ کا انکار تو واضح مکابرہ ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک سرکش گھوڑے کو ریاضت کے ذریعہ حیوانی صفات سے انسانی صفات کی طرف لے آتے ہیں اور اس کے اندر حیوانی صفات کو بدل دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ زمین سے چابک کو اٹھا کر اپنے مالک کو دے دیتا ہے اور گیند کو اپنے ہاتھ سے چکر دے دیتا ہے اور اسی طرح بے عقل عجمی لڑکے کو ریاضت کے ذریعہ عربی زبان سکھلا دیتے ہیں اور اس طرح اس کا طبعی نطق اس کے اندر تبدیل کر دیتے ہیں اور ایک وحشی جانور کو ریاضت کے ذریعہ اس درجہ پر پہنچا دیتے ہیں کہ جب اس کو کھولتے ہیں تو وہ چلا جاتا ہے لیکن پھر جب آواز دیتے ہیں تو لوٹ آتا ہے اور قید کی تکلیف اس کو آزادی اور چھوٹ جانے سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہے اور ایک ناپاک کتے کو ریاضت کے ذریعہ اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں کہ اس کا مارا ہوا شکار حلال ہو جاتا ہے جب کہ مجاہدہ اور ریاضت حاصل نہ کرنے والے آدمی کا مارا ہوا بھی حرام ہو جاتا ہے، پس تمام شریعت اور رسم کا مدار مجاہدے پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو قرب حق، عاقبت کے مقصود و امن کے حصول اور معصومیت کے متحقق ہونے کے باوجود طویل وقت تک بھوکا رہنے، مسلسل روزے رکھنے اور راتوں کو بیدار رہنے کی صورت میں اس قدر مجاہدے کیے کہ آپ کو حق تعالیٰ کا حکم آیا کہ اے محمد ﷺ:

طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى : ہم نے آپ پر قرآن اس لیے تو نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت برداشت کریں۔

حتیٰ کہ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

مسجد نبوی کی تعمیر کے دوران خود اینٹیں اٹھاتے تھے اور میں دیکھتا تھا کہ آپ تکلیف برداشت کر رہے ہیں تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ وہ اینٹیں مجھے دیں کہ آپ کی جگہ میں یہ کام سرانجام دوں، آپؐ نے فرمایا:

یَا اباهریره خُذغیر هافانه لا علیش الاعیش الاٰخرة	اے ابو ہریرہؓ تم دوسری اینٹیں اٹھالو کیونکہ اچھی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

یعنی آرام کا مقام تو آخرت ہے اور یہ دنیا رنج و مشقت اٹھانے کا مقام ہے...... حضرت حیان بن خارجہ رحمتہ اللہ علیہ کی روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ غزوے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

اِبدا بنفسکَ فجاهدها وَابْدَا بنفسکَ فاغزها فانک ان قُتِلتَ فَارًّا بعثک اللّٰهُ فارًّا وان قُتِلْتَ مرائیا بعث اللّٰه مرائیا وان قُتِلْتَ صابراً محتسبا بعثک اللّٰه صابرًا محتسبًا	جہاد کی ابتدا اپنے نفس سے کر اور غزوہ کی ابتدا بھی اپنے نفس سے کر کہ اگر تو بھاگتا ہوا قتل کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تجھے بھاگتا ہوا ہی اٹھائیں گے اور اگر تو ریاکاری کی حالت میں مقتول ہوا تو تجھے اللہ تعالیٰ ریاکار ہی اٹھائیں گے اور اگر ثواب کی نیت سے صبر کرتے ہوئے تو مقتول ہوا تو اللہ تعالیٰ تمہیں صبر کرنے والا اور ثواب کی نیت کرنے والا ہی اٹھائیں گے۔

پس معانی کے بیان میں جس قدر عبارت کی ترکیب و تالیف کا اثر ہوتا ہے ہے اصول معانی کے حصول کیلئے بھی اس قدر مجاہدات کی تالیف و ترکیب کا اثر ہوتا ہے جس طرح کوئی بیان، عبارت اور اس کی تالیف کے بغیر درست نہیں ہوتا اسی طرح مجاہدہ اور اس کی ترکیب کے بغیر وصول الی اللہ درست نہیں ہوتا، اور جو کوئی مجاہدہ کے بغیر حق تعالیٰ تک پہنچنے کا دعویٰ کرے وہ خطا کار ہے اس لیے کہ جہان اور اس کے حادث ہونے کا ثابت کرنا

اس کے پیدا کرنے والے کی معرفت کیلئے دلیل ہے اسی طرح نفس اور مجاہدے کی معرفت بھی وصول الی اللہ کی دلیل ہے، اور دوسرے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تفسیر میں مقدم ومؤخر ہے چنانچہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْ فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یہ تفسیر کے اعتبار سے یوں ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ هَدَيْنَا هُمْ سُبُلَنَا جَاهَدُوْا فِيْنَا

کہ جن کو ہم نے اپنے راستے کی ہدایت فرمائی ہے وہ لوگ ہمارے بارے میں کوشش کرتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ:

لَمْ ينجوا احد كم بعَلمهٖ قِيْلَ وَلَا انت يا رسولَ اللّٰهِ قال وَلَا اَنَا اِلَّا ان يتغمدنِى اللّٰهُ بَرحْمَتِهٖ

تم میں سے کوئی شخص بھی صرف اپنے عمل کے سبب نجات نہیں پائے گا، عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی؟ تو آپؐ نے فرمایا ہاں میں بھی نجات نہیں پا سکوں گا سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے۔

پس مجاہدہ بندے کا اپنا فعل ہے اور یہ محال ہے کہ اس کا اپنا فعل اس کی اپنی ہی نجات کیلئے کافی ہو جائے پس بندے کی نجات اور خلاصی حق تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے نہ کہ مجاہدہ کے ساتھ۔ اسی لیے تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا

پس اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینے کا ارادہ فرما لیں تو اس کے سینے کو اسلام کیلئے کھول دیتے ہیں اور جس کو گمراہ کرنا چاہیں تو اسکا سینہ تنگ اور سخت کر دیتے ہیں۔

اور نیز فرمایا ہے کہ:

تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ. اے اللہ تو جس کو چاہتا ہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے۔

تمام اہل عالم کا مکلف ہونا خود ان کی اپنی حیثیت کی نفی کرنا ہے کہ اگر محض مجاہدہ وصول حق کیلئے علت ہوتا تو ابلیس کبھی مردود نہ ہوتا اور اگر مجاہدے کا ترک راندہ اور مردود ہونے کی علت ہوتا تو حضرت آدم علیہ السلام ہرگز مقبول اور برگزیدہ نہ بنتے۔ پس معلوم ہوا کہ مجاہدے کی کثرت زیادہ کارآمد نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی عنایت کی سبقت زیادہ کارآمد ہے، اور جو کوئی زیادہ مجاہدوں میں مصروف رہے وہ حق تعالیٰ کے مواخذہ سے زیادہ محفوظ نہیں بلکہ جس کو حق تعالیٰ کی زیادہ عنایت نصیب ہو وہی حق تعالیٰ سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے، چنانچہ کوئی تو عبادت خانہ میں عبادت کرتا ہو بھی حق تعالیٰ سے دور ہے اور کوئی خرابات کے اندر گناہوں میں مصروف بھی انجام کار کسی وقت گناہوں سے تائب ہو کر، حق تعالیٰ سے نزدیک ہوسکتا ہے اور تمام معانی سے اشرف ایمان ہے، ایک لڑکا جو ابھی احکام کا مکلف نہیں اور اسی طرح دیوانوں کیلئے بھی مومن کہنا ٹھیک ہے پس جب زیادہ شرف والی حالت یعنی ایمان کیلئے بھی مجاہدہ علت نہیں ہے تو جو حالتیں اس سے کم درجہ کی ہیں وہ بھی علت کی محتاج نہ ہوں گی...... اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ یہ صرف لفظی اختلاف ہے معنی میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ ایک کہتا ہے کہ:

مَنْ طَلَبَ وَجَدَ جس نے کوشش کی اس نے پالیا۔

اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ:

مَنْ وَجَدَ طَلَبَ جس نے پالیا اس نے کوشش کی۔

لہٰذا پالینے کا سبب طلب کرنا اور طلب کرنے کا سبب پالینا ہوا۔ وہ ایک تو اس لیے مجاہدہ کرتا ہے تاکہ مشاہدہ حاصل کرلے اور یہ دوسرا اس لیے مشاہدہ کرتا ہے تاکہ مجاہدہ پالے۔ اور اس

کی حقیقت یہ ہے کہ مشاہدے کے اندر مجاہدے کا درجہ وہی ہے جو اطاعت خداوندی میں توفیق الٰہی کا ہے اور توفیق تو حق وعزوجل کی عطا ہے پس جب اطاعت کے حصول کی طلب توفیق الٰہی کے بغیر محال ہے تو توفیق بھی اطاعت کے بغیر محال ہی ہے اسی طرح جیسے مشاہدے کے بغیر مجاہدہ موجود نہیں ہوتا، مجاہدے کے بغیر مشاہدہ بھی محال ہے۔ پس جمال خداوندی کی شعاع آتی ہے تاکہ بندے کو مجاہدہ کی طرف رہنمائی کرے۔ لہذا جب وجود مجاہدہ کی علت جمال خداوندی کی وہ روشنی ہے تو گویا ہدایت، مجاہدے سے مقدم ہوگی......

باقی جو کچھ حضرت سہلؒ اور ان کے ساتھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ جو شخص مجاہدے کا اثبات نہیں کرتا وہ تمام انبیاء کے ورد تمام آسمان کتابوں اور شریعتوں کا منکر ہوتا ہے کیونکہ انسان کے مکلف ہونے کا مدار تو مجاہدے پر ہے......لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ مکلف ہونے کا مدار حق تعالیٰ کی ہدایت پر سمجھا جائے کہ مجاہدات اثبات صحت کیلئے ہیں حقیقت وصول الی اللہ کیلئے نہیں......جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتے ہیں کہ:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَلٰئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ	اور اگر ہم ان پر فرشتوں کو نازل کرتے اور مردے ان کے ساتھ گفتگو کرتے اور ان کے سامنے آنے والی ہر چیز کو ان کیلئے زندہ کو دیتے تو بھی ایمان قبول نہ کرتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتے لیکن ان کے اکثر تو جاہل ہیں۔

یعنی اس لیے کہ ایمان کی علت ہماری مشیت ہے، ان کے مجاہدے اور دلائل کا دیکھنا ایمان کی علت نہیں، اور نیز ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ	جو لوگ کافر ہیں، برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یعنی کافروں کیلئے صحبت کا ظاہر کرنا، دلائل کا پیش کرنا، قیامت کی سختیوں سے

ڈراتا اور ان کا ترک دونوں مساوی ہیں وہ ایمان نہ لائیں گے کیونکہ ہم نے ان کو اہل ایمان میں شمار نہیں کیا ہے اور ان کی ازلی بدبختی کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے پس انبیاء کا ورود کتابوں کا نازل کرنا اور شریعتوں کا ثبوت حق تعالیٰ تک پہنچنے کے اسباب تو ہیں علت نہیں ہیں۔ اس لیے کہ مکلف ہونے میں تو حضرت ابوبکرؓ بھی اسی طرح ہیں جس طرح ابوجہل۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ تو عدل اور فضل الٰہی سے حق تعالیٰ تک پہنچ گئے اور ابوجہل اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہونے کی وجہ سے رہ گیا۔ پس وصول الی اللہ کی علت عین وصول ہے نہ کہ طلب وصول۔ کیونکہ اگر طالب اور مطلوب دونوں ایک ہی ہوں تو طالب ہی واجد (پانے والا) ہوگا اور جب وہ واجد ہوگا تو طالب نہ ہوگا کیونکہ جو حق تعالیٰ تک پہنچا ہوا ہے وہ آرام میں ہوتا ہے جب کہ طالب پر آرام درست نہیں ہوتا۔ اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْن" جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ نقصان زدہ ہوتا ہے۔

یعنی طالبان حق پر اگر دو دن برابر گزریں تو وہ نقصان زدہ ہیں کیونکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس کا ہر دن پہلے دن سے بہتر ہو اور یہ درجہ طالبان حق کا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا:

اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تَحْصُوْا استقامت اختیار کرو اور ہرگز ابھارے نہ جاؤ!

پس مشائخ نے مجاہدہ کو سبب کہا ہے اور سبب تو اثبات حجت کو ثابت کرنا، اور حقیقت خداوندی تک وصول کی نفی کرتا ہے..... اور باقی جو کہتے ہیں کہ مجاہدہ کے ذریعہ گھوڑے کی صفت میں تبدیلی کر دی جاتی ہے تو جاننا چاہئے کہ گھڑے میں ایک صفت پوشیدہ ہوتی ہے کہ مجاہدہ اس کے اظہار کیلئے سبب ہے۔ جب تک گھوڑا ریاضت حاصل نہیں کرتا وہ صفت ظاہر نہیں ہوتی، اور گدھے کے اندر چونکہ یہ صفت موجود نہیں ہوتی وہ ہرگز گھوڑا نہیں بن سکتا۔ نہ گھوڑے کو مجاہدہ کے ذریعہ گدھا بنا سکتے ہیں اور نہ ہی گدھے کو ریاضت کے ذریعہ گھوڑا بنا سکتے ہیں کیونکہ یہ ذات کا تبدیل کرنا ہے، پس جس طرح کسی چیز کی ذات کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا اسی

طرح اس چیز کا حق تعالیٰ کی جناب کیلئے ثابت کرنا بھی محال ہے...... اس پیر یعنی حضرت سہل تستریؒ پر اس طرح کے مجاہدے کی کیفیت گزری تھی کہ وہ اس سے آزاد ہوتے تھے اور اس کے بیان کرتے وقت درحقیقت اس کی عبارت سے منقطع ہوتے تھے، ان لوگوں کی طرح نہیں جنہوں نے بغیر معاملہ کے ان کی عبارت کو اپنا شعار بنالیا ہے اور جو کچھ معاملہ مجاہدات میں پیش آتا ہے اس کو پوری طرح عبارت میں بیان کرنا محال ہے...... بہرحال اہل طریقت کے نزدیک مجاہدہ اور ریاضت بالاتفاق ثابت ہیں۔ لیکن ان کو وصول الی اللہ کی علت قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پس جو شخص مجاہدہ کی نفی کرتا ہے اس کی مراد عین مجاہدہ کی نفی نہیں بلکہ مجاہدے کو وصول الی اللہ کا مدار سمجھنے اور اپنے افعال پر بارگاہ اقدس میں مغرور نہ ہونے کی نفی ہے۔ اس لیے کہ مجاہدہ بندے کا فعل ہوتا ہے اور مشاہدہ نعمت الٰہی۔ جب تک خدا تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہو بندے کا فعل کسی قیمت کا نہیں ہوتا۔

میری جان! کیا تیرا دل خود گرفت محسوس نہیں کرتا کہ اپنے آپ کی تو اتنی آرائش کرتا ہے اور حق تعالیٰ کے فضل کو نہیں دیکھتا کہ اپنے فعل کی اتنی تعریفیں کرتا ہے۔ پس دوستان حق کا مجاہدہ تو محض فعل حق ہوتا ہے کہ ان کا اپنا اختیار اس میں موجود نہیں ہوتا اور یہ محبت الٰہی میں مقہور اور پگھل جاتا ہے اور یوں پگھلنا محض اللہ تعالیٰ کی نوازش ہے اور جاہلوں کا مجاہدہ ان کا اپنا فعل ہوتا ہے اور اس میں ان کے اپنے اختیار کا دخل ہوتا ہے اور وہ تشویش اور پراگندگی ہوتی ہے اور جو دل پہلے سے ہی پراگندہ ہو وہ آفت سے زیادہ پراگندہ ہو جاتا ہے...... پس جہاں تک ہو سکے اپنے کسی فعل کا تذکرہ نہ کرو اور کسی معاملہ میں بھی نفس کی متابعت نہ کرو کیونکہ تمہاری ہستی کا وجود ہی تمہارے لیے حجاب ہے اگر تم کسی ایک فعل سے محجوب ہو گے تو کسی دوسرے فعل سے وہ حجاب اٹھ جائے گا۔ اور اگر تمہارا پورا وجود ہی تمہارے لیے حجاب ہے تو جب تک تم کلی طور فنا نہیں ہو گے بقا کے قابل نہیں ہو گے:

لِاَنَّ النفس کلب باغ وجلد الکلب لایطھر الا بالدباغ
کیونکہ نفس ایک سرکش کتا ہے اور کتے کی کھال دباغت کے بغیر پاک نہیں ہوتی۔

حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ نے کوفہ میں حضرت محمد بن الحسین علویؒ کے مکان پر قیام فرما رکھا تھا کہ حضرت ابراہیم خواص بھی کوفہ میں تشریف لائے، انہوں نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو ان کے پاس آئے۔ حضرت حسین بن منصورؒ نے دریافت کیا کہ اے ابراہیم! چالیس سال سے جو آپ نے اس طریق کے ساتھ تعلق قائم کر رکھا ہے اس سے آپ کو کیا چیز حاصل ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے مجھے توکل حاصل ہوا ہے۔ تو حضرت حسینؒ نے کہا:

ضَیَّعْتَ عمرک فی عمران باطنک فَاَیْنَ الفناء فی التوحید
آپ نے اپنے باطن کی تعمیر میں اپنی عمر کو ضائع کر دیا پس فنا فی التوحید کہاں ہے؟

یعنی توکل تو اپنے معاملات کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینے اور اپنے باطن کی درستی کیلئے اس پر اعتماد کرنے کا نام ہے لیکن جب کسی نے باطن کے علاج میں ایک عمر صرف کر دی ہو تو اسے ظاہری معاملات کی درستی کیلئے ایک اور عمر کی ضرورت ہوگی تاکہ اسے خرچ کر سکے اور یوں دونوں عمریں ضائع ہو جائیں گے۔ لیکن ابھی تک حق تعالیٰ کا اس تک کوئی اثر نہیں پہنچا ہو گا...... حضرت شیخ ابوعلی سیاہ مروزیؒ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ میں نے نفس کو خود اپنی ہی شکل وصورت میں دیکھا کہ ایک آدمی نے اسے بالوں سے پکڑ رکھا ہے اور اس طرح اسے میری گرفت میں دے دیا۔ میں نے اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور اس کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن وہ مجھے کہنے لگا۔ اے بوعلی! مجھے قتل کرنے کی تکلیف نہ کر کیونکہ میں خدا تعالیٰ کا لشکر ہوں تم مجھے گم نہیں کر سکتے...... اور حضرت جنیدؒ کے ایک بڑے بزرگ ساتھی حضرت محمد بن علیانی نسویؒ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے ابتدائی حالات میں ہی نفس کی مصیبتوں سے آگاہ ہو گیا تھا اور اس کی کمین گاہوں اور چالوں کو جانتے ہوئے اس

کی دشمنی میں لگا رہتا تھا ایک روز لومڑی کے بچے جتنی ایک چیز میرے گلے سے باہر نکلی تو حق تعالیٰ نے مجھے اس سے روشناس کر دیا اور میں نے جان لیا کہ یہ نفس ہے چنانچہ میں نے اسے پاؤں تلے روندنا شروع کر دیا لیکن میں جو ٹھوکر بھی اسے لگاتا وہ پہلے سے بڑا ہو جاتا میں نے اسے کہا "اے فلانے! تکلیف دینے اور زخم لگانے سے دوسری تمام چیزیں ہلاک ہوتی ہیں۔ لیکن تو کس طرح بڑا ہوتا جا رہا ہے؟ وہ کہنے لگا میری پیدائش ہی الٹی ہے کہ جو کام دوسری چیزوں کیلئے تکلیف دہ ہو وہ میرے لیے باعث راحت ہوتا ہے اور جو کام دوسروں کیلئے راحت بخش ہو وہ میرے لیے باعث رنج ہوتا ہے...... اور اپنے وقت کے امام حضرت شیخ ابو العباس شقانی" فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک زرد رنگ کا کتا میرے بستر پر سویا ہوا ہے میں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ محلے کا کوئی کتا اندر آ گیا ہے اس کو نکالنے کا ارادہ کیا تو وہ میرے دامن کے نیچے گھس گیا اور غائب ہو گیا...... اور اس وقت کے قطب اور مدار علیہ حضرت شیخ ابو القاسم گرگانی" "اللہ تعالیٰ ان کو سلامت رکھے" نے اپنے ابتدائی حال کا حوالہ دے کر فرمایا کہ میں نے نفس کو ایک سانپ کی شکل میں دیکھا...... اور ایک درویش فرماتے ہیں کہ "میں نے نفس کو ایک چوہے کی صورت میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ کہنے لگا میں غافل لوگوں کی ہلاکت ہوں کہ ان کیلئے شر اور برائی کا داعی ہوں اور دوستان حق کی نجات ہوں کہ میں جس کا وجود ایک آفت ہے اگر ان کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی پاکی پر مغرور اور اپنے افعال پر متکبر ہو جاتے کیونکہ جب وہ اپنے دل کی طہارت، باطن کی پاکیزگی، ولایت کے نور اور اطاعت پر استقامت کو دیکھتے ہیں تو برائی کی خواہش ان میں پیدا ہونے لگتی ہے لیکن پھر جب مجھے اپنے دونوں پہلوؤں کے درمیان دیکھتے ہیں تو تمام عیب ان سے پاک ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام حکایات اس بات کی دلیل ہیں کہ نفس ایک ذات ہے صفت نہیں، اور اس کیلئے الگ ایک صفت ہے اور ہم اس کے اوصاف کو واضح طور پر دیکھتے رہتے ہیں رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

اَعْدٰی عدوک نفسک الّتی بین جَنبیکَ	تیرے دشمنوں میں سے سب سے بڑا دشمن تیرا اپنا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

پس جب اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو تم جان لینا کہ ریاضت کے ذریعہ اس کو قابو میں لایا جاسکتا ہے تاہم اس کی ذات اور ماہیت کو فنا نہیں کیا جاسکتا اور جب اس کی اچھی طرح شناخت ہو جائے تو طالب اگر اس کا مالک بن کر اس پر قابو رکھے تو اس کے باقی رہنے میں بھی کوئی باک نہیں۔

لِاَنَّ النفس کلب" نباح" وامساک الکَلْبِ بعد الریاضة مباح"	کیونکہ نفس ایک بھونکنے والا کتا ہے اور کتے کو شکار کی ریاضت کے بعد رکھنا مباح ہے۔

پس نفس کے مجاہدات اوصاف نفس کو فنا کرنے کیلئے ہیں عین نفس کے فنا کیلئے نہیں۔ اس معاملے میں مشائخ کے اقوال کا سلسلہ بڑا طویل ہے لیکن میں نے اس کتاب کی طوالت کے خوف سے اسی مقدار پر اکتفا کیا ہے اور اب میں ''ھویٰ'' کی حقیقت اور شہوات کو ترک کرنے سے متعلق گفتگو کروں گا۔ انشاء اللہ عزوجل......اور توفیق اللہ کی طرف سے ہی ہے۔

حقیقت ھویٰ

جان لو! اللہ تعالیٰ تمہیں عزت نصیب کرے کہ صوفیہ کے ایک گروہ کے نزدیک ''ھویٰ''، نفس کے اوصاف سے عبارت ہے، اور ایک دوسرے گروہ کے نزدیک طبیعت کے اس ارادے کا نام ہے جس کا متصرف اور مدبر نفس ہے جس طرح کہ عقل عبارت ہے روح کے ارادے سے۔ اور جس روح کو جسم کے اندر عقل سے قوت حاصل نہ ہو وہ ناقص ہوتی ہے اسی طرح جس نفس کو ''ھویٰ'' سے قوت حاصل نہ ہو وہ بھی ناقص ہوتا ہے پس روح کا

ناقص ہونا عین قربت حق ہے...... اور بندہ کو ہمیشہ دو دعوتیں ملتی رہتی ہیں ایک دعوت عقل کی طرف سے اور دوسری ھوی کی طرف سے۔ البتہ جو آدمی عقل کی دعوت کا اتباع کرتا ہے وہ ایمان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے لیکن جو شخص ھویٰ کی دعوت پر لبیک کہتا ہے وہ گمراہی اور کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پس ھویٰ حجاب اور گمراہ کن ہے۔ مریدوں کو اس سے بلند رہنا اور طالبوں کو اس سے اعراض کرنا چاہئے اور بندہ اس کی مخالفت کرنے پر مامور ہے اور اس کا اتباع کرنے سے روکا گیا ہے۔

لِاَنَّ مَنْ رَکِبَھا ھَلَکَ وَمَنْ خَالفھا ملک

کیونکہ جو اس پر سوار ہوا وہ تباہ ہو گیا اور جس نے اس کی مخالفت کی فرشتہ صفت ہو گیا۔

جیسا کہ حق عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی

اور باقی جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روک لیا پس اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

اخوف مَا اخَاف علی امتی اتباع الھَوٰی وطول الاَمَل

جس چیز سے میں اپنی امت کے بارے میں زیادہ ڈرتا ہوں وہ خواہشات کی پیروی اور لمبی امید ہے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد:

اَفَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ

کیا تم نے دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں:

اَیْ الھَو الٰھا معبودًا

یعنی خواہش کو اپنا الہ اور معبود بنا رکھا ہے۔

اس آدمی کیلئے ہلاکت ہے جس نے حق تعالیٰ کی بجائے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے اور شب و روز کی تمام جدوجہد نفس کو خوش کرنے کیلئے صرف کرتا ہے۔

اور تمام خواہشات کی دو قسمیں ہیں ایک لذت و شہوت کی خواہش ...... اور دوسری مخلوق میں مرتبہ اور ریاست کی خواہش ...... لذت و شہوت کی خواہشات کا اتباع کرنے والا شراب خانوں میں رہتا ہے اور مخلوق اس کے فتنوں سے محفوظ رہتی ہے لیکن جو شخص جاہ طلبی اور ریاست کی خواہش کا تابع ہو وہ عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں رہتے ہوئے مخلوق کیلئے باعث فتنہ ہے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی گمراہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ پس ہم خواہشات کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی پناہ گاہ کے طلبگار ہیں۔ پس جس کی تمام حرکات خواہشات نفس کے تابع ہوں اور وہ نفس کی پیروی پر مطمئن ہو وہ اگرچہ مسجد میں تمہارے ساتھ موجود رہتا ہے پھر بھی حق تعالیٰ سے دور ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص خواہشات نفس سے بیزار ہو اور اس کی پیروی سے گریزاں ہو وہ بت کدے میں ہی کیوں نہ ہو حق تعالیٰ سے نزدیک ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں "ایک دفعہ میں نے سنا کہ روم کے اندر ایک پادری ہے جو ستر سال سے رہبانیت اختیار کئے ہوئے ایک کلیسا میں بیٹھا ہے میں بڑا حیران ہوا کہ رہبانیت کی شرط تو چالیس سال ہے یہ شخص کس مشرب پر عمل کرتے ہوئے ستر سال تک کلیسا میں آرام سے بیٹھا ہوا ہے، چنانچہ میں نے اس سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ جب میں اس کے کلیسا کے نزدیک پہنچا تو اس نے دریچہ کھول کر مجھے کہا "اے ابراہیم! میں جانتا ہوں کہ تم کس لیے آئے ہو (تو سنو) میں یہاں ستر سال سے رہبانیت کیلئے نہیں بیٹھا ہوا بلکہ میرے اندر خواہشات سے بھرا ہوا ایک کتا موجود ہے۔ میں اس کلیسا میں بیٹھا اس کی نگرانی کر رہا ہوں اور اس کا شر مخلوق سے روکے ہوئے ہوں۔ باقی میں ویسا نہیں ہوا جیسا تم نے گمان کیا تھا۔ ابراہیمؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اس سے یہ بات سنی تو میں نے کہا

''بارِ خدایا! تو اس پر قادر ہے کہ گمراہی میں بھی کسی آدمی کو سیدھا راستہ دکھا دے اور نیکی کے راستے پر گامزن کر دے'' وہ پادری کہنے لگا ''اے ابراہیم! کب تک لوگوں کو تلاش کرتے رہو گے۔ جاؤ! اور اپنے آپ کی جستجو کرو! اور جب اپنے آپ کو پالو تو پھر پاسبانی کرو کیونکہ خواہش نفس روزانہ معبودیت کے تین سو ساٹھ طرح کے لباس پہنتی اور بندے کو گمراہی کی طرف دعوت دیتی ہے...... بہرحال شیطان کو بندے کے دل اور باطن میں گھسنے کی اس وقت تک مجال نہیں ہوتی جب تک اس کے دل میں نافرمانی کی خواہش پیدا نہ ہو جائے، جب اس خواہش گناہ کا مادہ نفس میں ظاہر ہو جاتا ہے اس وقت شیطان اس کو پکڑ لیتا اور اس کو آراستہ کر کے بندے کے دل کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اس حالت کو وسوسہ کہتے ہیں۔ پس گناہ کی ابتدا خواہش نفس سے ہوتی ہے اور ابتدا کرنے والا زیادہ ظالم ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی ہے کہ جب شیطان نے کہا کہ ''میں تمام انسانوں کو راہ راست سے ہٹادوں گا، تو حق تعالیٰ نے ابلیس کو فرمایا تھا کہ:

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطَان''	بے شک میرے خاص بندہ پر تیرا کوئی بس نہ چل سکے گا۔

پس درحقیقت بندہ کا نفس اور خواہش ہی شیطان ہیں۔ اسی وجہ سے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ:

وَمَا مِنْ احدٍ اِلَّا وَ قد غلبه شیطانُه' اِلَّا عمر فانه غَلَبَ شیطانه	کوئی آدمی ایسا نہیں جس پر اس کا شیطان (خواہش نفس) غلبہ حاصل نہ کرے سوائے عمر فاروقؓ کے کہ وہ اپنے شیطان پر غالب ہیں۔

پس خواہشات حضرت آدمؑ کی سرشت میں داخل اور بنی آدم کی جان کی راحت ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

الھویٰ والشھوۃ معجونۃ بطنیۃ ابن آدم — خواہش اور شہوت ابن آدم کی سرشت میں ملا دی گئی ہیں۔

خواہشات کا ترک بندے کو امیر کرتا ہے اور خواہشات کا ارتکاب امیر کو اسیر بنا دیتا ہے جیسا کہ امیر ہوتے ہوئے جب زلیخا نے خواہش کا ارتکاب کیا تو اسیر بن گئی اور حضرت یوسف علیہ السلام باوجودیکہ اسیر تھے لیکن خواہش کو ترک کر دیا تو امیر بن گئے۔

حضرت جنیدؒ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ:

مَا الوُصَلُ — وصال حق کیا چیز ہے؟

تو آپ نے فرمایا:

ترک ارتکاب الھویٰ — خواہشات کا ارتکاب ترک کر دینے کا نام وصل حق ہے۔

جو آدمی وصل حق سے مشرف ہونا چاہے اس چاہیے کہ خواہشات نفس کی مخالفت کرے کہ بندہ خواہشات کی مخالفت سے بڑھ کر کسی بھی بڑی عبادت کے ذریعہ قرب خداوندی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ آدمی کیلئے ایک پہاڑ کو اپنے ناخن سے کھودنا، نفس کی مخالفت سے زیادہ آسان ہے..... اور حکایات میں میں نے پایا ہے کہ حضرت ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھا تو اس سے پوچھا کہ تم نے کس عمل کی بدولت یہ درجہ حاصل کیا ہے؟ وہ کہنے لگا "میں نے ہوا (خواہش) کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے یہاں تک کہ ہوا میں پرواز کرنے لگا ہوں"..... حضرت محمد بن فضل البلخیؒ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں اس آدمی پر حیران ہوتا ہوں جو اپنی خواہش سے خانہ خدا کی طرف جاتا اور اس کی زیارت کرتا ہے، وہ اپنی خواہش کو پاؤں تلے کیوں نہیں روند دیتا کہ حق تعالیٰ تک پہنچ جائے اور اس کے دیدار سے مشرف ہو، باقی نفس کی سب سے زیادہ ظاہر صفت شہوت ہے اور شہوت ایک کیفیت ہے جو آدمی کے تمام اجزاء میں پھیلی ہوئی ہے اور تمام

حواس اس کے کاموں میں مصروف ہیں۔ بندہ ان سب کی حفاظت کا مکلّف اور ان میں سے ہر ایک کے کام سے متعلق جوابدہ ہے۔ آنکھ کی شہوت، دیکھنا، کان کی شہوت سننا، ناک کی شہوت سونگھنا، زبان کی شہوت بولنا، تالو کی شہوت چکھنا، جسم کی شہوت چھونا اور گھسنا اور سینے کی شہوت سوچنا ہے۔ پس طالب کو اپنا نگران اور حاکم ہونا چاہئے اور دن رات اس کام میں لگے رہنا چاہئے کہ حواس میں پیدا ہونے والے خواہشات کے اسباب کو اپنے آپ سے دور کر دے اور خدا تعالیٰ سے امداد کا طلب گار رہے کہ وہ اس میں ایسی صفت پیدا کر دے کہ اس کے باطن سے یہ خواہشات دفع ہو جائیں کیونکہ جو آدمی شہوت کے کسی حصے میں بھی مبتلا ہو جائے تمام معانی سے محجوب ہو جاتا ہے۔ پس بندہ اگر بتکلف اس کو اپنے آپ سے دفع کرے تو اس کی تکلیف طویل ہو جائے گی کیونکہ خواہشات کا وجود تو پے در پے ہوتا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے ہی سپرد کر دینا بہتر ہے تا کہ گوہر مقصود حاصل ہو جائے۔ ...اور حضرت ابو علی سیاہ مروزیؒ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا ”میں ایک دفعہ حمام میں گیا ہوا تھا اور سنت کے مطابق (زیر ناف) استرہ استعمال کر رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ سے کہا ”اے ابو علی سرچشمہ شہوات اور تجھے اتنی آفات میں مبتلا رکھنے والے اس عضو کو اپنے وجود سے الگ کر دے تا کہ تو شہوات سے بچا رہے“ میرے باطن سے آواز آئی کہ اے ابو علی! تو ہماری ملک میں تصرف کرنا چاہتا ہے؟ حالانکہ جسم کی ساخت میں کوئی عضو دوسرے عضو سے زیادہ موزوں نہیں۔ ہمیں اپنی عزت کی قسم! اگر تو اس کو اپنے وجود سے جدا کر دے گا تو ہم تمہارے ہر بال میں سینکڑوں گنا شہوت اور خواہش پیدا کر دیں گے۔ اسی معنی میں کسی نے کہا ہے شعر

تبتغی الاحسانَ دَع احسانک اترک بخشی اللّٰہ ریحانک

(تو نیکی کا متلاشی ہے تو احسان کو چھوڑ دے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اپنی راحتوں کو چھوڑ دے)

بندہ کو اپنے جسم کی خرابی میں تصرف کرنے کا کوئی اختیار نہیں البتہ اپنی کسی صفت کو حق تعالیٰ کی توفیق اور اس کے حکم کی تعمیل کے ذریعہ تبدیل کر سکتا ہے، درحقیقت جب بندہ حق تعالیٰ کی تسلیم و رضا کا مرتبہ حاصل کرتا ہے تو اسے حق تعالیٰ کی عصمت حاصل ہو جاتی ہے، اور بندہ مجاہدے کی بہ نسبت حق تعالیٰ کی تائید و عصمت کے ذریعہ تمام آفات سے زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔

لان نفی الذباب بالمکنۃِ ایْسَر	کیونکہ ڈھانپنے والی چیز سے مکھیوں کو روکنا
عن نفیہ بالمذبۃِ	مگس ران کے ذریعہ ہٹاتے رہنے سے زیادہ آسان ہے۔

پس حق تعالیٰ کی عصمت تمام آفات کو زائل اور تمام برائیوں کو مٹانے والی ہے اور بندہ کو کسی صفت میں بھی حق تعالیٰ کے ساتھ مشارکت حاصل نہیں جیسا کہ اس نے فرمایا ہے کہ اس کی ملک میں کسی کو تصرف کا اختیار نہیں۔ اور جب تک حق تعالیٰ کی حفاظت مقدر میں نہ ہو بندہ اپنی کوشش کی بنیاد پر کسی چیز سے رک نہیں سکتا کیونکہ اس کی اپنی کوشش کوئی کوشش نہیں ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کی کوشش بندہ کے شامل نصیب نہ ہو بندے کی اپنی کوشش سودمند نہیں ہوسکتی۔ تاہم محض کوشش سے اطاعت کی قوت ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ انسان کی تمام کوششیں دو طرح کی ہوتی ہیں یا تو وہ کوشش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو اپنے آپ سے پھیر دے اور یا پھر خود تقدیر کے خلاف کسی چیز کی اپنی طرف نسبت کرتا ہے اور یہ دونوں صورتیں جائز نہیں کیونکہ نہ تو تقدیر جدوجہد کے ذریعہ تبدیل ہوسکتی ہے اور نہ ہی کوئی کام تقدیر کے بغیر وقوع پذیر ہوتا ہے...... اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت شبلیؒ ایک دفعہ بیمار ہو گئے تو ایک طبیب آپ کے پاس آیا اور کہا ''آپ پرہیز کریں'' آپ نے فرمایا ''میں کس چیز سے پرہیز کروں؟ اس چیز سے پرہیز کروں جو میرا رزق مقدر ہے یا اس چیز سے جو تقدیر میں میرا رزق ہی نہیں! اگر میں اپنے مقدر سے پرہیز کرنا بھی چاہوں تو ہرگز نہیں کر سکتا اور اگر مقدر

کے علاوہ سے پرہیز کروں تو وہ تو خود ہی مجھے نہیں دیں گے پھر پرہیز کے کیا معنی...... کیونکہ مشاہدہ مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتا...... اس مسئلہ کو انشاء اللہ دوسری جگہ پر پوری احتیاط سے بیان کروں گا۔

فرقہ حکیمیہ

حکیمی حضرات حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی الحکیم الترمذیؒ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ جو تمام علوم ظاہری و باطنی میں اپنے دور کے ائمہ میں سے تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں اور آپ کے کلام اور طریقہ کی بنیاد ولایت پر ہے۔ آپ نے حقیقت ولایت کو بیان کیا اور اولیاء کے درجات اور ان کے مراتب کی رعایت کو واضح کیا جو ایک الگ ناپیدا کنار سمندر ہے جس میں بڑے عجائبات موجود ہیں۔ آپ کے مذہب کو جاننے کیلئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ اولیاء ہیں جن کو اس نے اپنی مخلوق سے چن لیا ہے اور ان کے معاملات کو دنیوی تعلقات سے منقطع اور نفس و خواہش کی مقتضیات سے آزاد کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک درجے کو متعین کر کے ان پر تصوف کے اسرار کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس سلسلے میں کلام بڑا طویل ہے لیکن میں چند اصولوں کی شرح بیان کروں گا کہ تمہیں علم حاصل ہو جائے چنانچہ اب میں اختصار کے ساتھ اس کی تحقیق اسباب اور اوصاف بیان کرتا ہوں اور اس بارے میں مشائخ کا کلام بھی پیش کروں گا۔ انشاءاللہ عزوجل۔

اثبات ولایت

جان لو کہ معرفت وتصوف کے طریق کی اساس اور قاعدہ، ولایت اور اس کو ثابت کرنے پر منحصر ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے معاملے میں تمام مشائخ باہم متفق ہیں تاہم

ہر ایک نے اس کو الگ عبارت میں بیان کیا ہے۔ حضرت محمد بن علی الحکیمؒ ولایت کو حقیقت کیلئے مطلق چھوڑنے میں مخصوص ہیں۔ باقی ولایت واؤ کے زبر کے ساتھ لغت کے اعتبار سے تصرف کرنے کو کہتے ہیں اور ولایت واؤ کی زیر کے ساتھ دولت مندی کے معنی میں مستعمل ہے۔ نیز یہ دونوں فعل ولی کے مصدر ہیں۔ جب ایسا ہے تو ضروری ہے کہ دو لغت ہوں جیسا کہ دلالت دال کے زبر کے ساتھ رہنمائی کرنے اور دال کے زیر کے ساتھ ناز کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز ولایت ربوبیت کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ خداوند عزوجل نے فرمایا ہے کہ:

هُنَالِکَ الْوَلَایَةُ لِلّٰہِ الْحَقِ — قیامت میں ربوبیت خدائے برحق کیلئے ہے۔

کہ کفار اس کے ساتھ محبت اور گرویدگی کا اظہار کریں گے اور اپنے معبودوں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور نیز ولایت محبت کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن اس صورت میں ولی، فعل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

وَھُوَ یَتَوَلَّی الصَّالِحِیْنَ — وہ نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس کے اوصاف و افعال پر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لیتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ فصیل کے وزن پر فاعل میں مبالغہ کے معنی پر ہو کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے محبت کرتا اس کے حقوق کو پورا کرنے پر مداومت کرتا اور غیر اللہ سے اعراض کرتا ہے گویا یہ بندہ مرید اور حق تعالیٰ مراد ہوتا ہے اور یہ تمام باتیں حق تعالیٰ سے بندہ کیلئے اور بندہ سے حق تعالیٰ کیلئے درست ہیں اس لیے کہ یہ جائز ہے کہ وہ حق تعالیٰ اپنے دوستوں کا ناصر ہو کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کے صحابہؓ میں سے اپنے دوستوں کے ساتھ نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ:

اَلاَ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْب" — آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی امداد قریب ہے۔

نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ:

وَاَنَّ الْکَافِرِیْنَ لاَمَوْلٰی لَهُمْ — کہ بے شک کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں۔

یعنی ان کا کوئی مددگار نہیں۔ جب وہ کافروں کا ناصر نہیں تو لامحالہ مومنوں کا ناصر ہوگا کہ ان کی عقلوں کو آیات سے استدلال کرنے، ان کے دلوں پر معانی کے بیان کرنے اور ان کے باطن میں براہین کو کھولنے میں ان کی امداد کرتا ہے اور نیز نفس اور شیطان کی مخالفت اور اپنے احکام کی موافقت میں ان کی نصرت کرتا ہے اور نیز یہ بھی جائز ہے کہ وہ ان کو اپنی دوستی کیلئے مخصوص کر کے اپنی عداوت کے مقامات سے انہیں بچائے رکھے جیسا کہ فرمایا ہے:

یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ — وہ ان کے ساتھ محبت کرتا ہے اور وہ اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔

تا کہ وہ اس کے ساتھ اس کی دوستی کی وجہ سے دوستی رکھیں اور مخلوق سے روگرداں ہو جائیں تا کہ وہ ان کا ولی بن جائے اور وہ بھی اس کے اولیاء بن جائیں اور یہ بھی درست ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو اپنی بندگی پر قائم رہنے کی ولایت عطا فرمائیں اور اس کو اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھیں تا کہ وہ ان کی اطاعت پر قائم رہے ان کی مخالفت سے پرہیز کرے اور اس کے اطاعت پر حسن اقامت سے شیطان دور بھاگ جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو ولایت اس لیے دیں تا کہ ملک میں اس کا وجود حل ہو جائے۔ انتظام سلطنت اسے نصیب ہو، اس کی دُعا مستجاب ہو اور اس کے انفاس مقبول ہوں جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ:

رُبَّ اشعثٍ اغبر ذی طمرین لایصبایه لَوْ اَقْسَمَ صَلی اللّٰه لَاَبَّره' — بسا اوقات پریشان بال، غبار آلود، پھٹی چادروں والا جس کو کوئی اہمیت نہ دیتا ہو اگر کسی معاملے میں اللہ کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کرتے ہیں۔

اور مشہور ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ کے دور خلافت میں دریائے نیل کا پانی اپنی عادت کے مطابق رک گیا اس لیے کہ دور جاہلیت میں یہ رسم تھی کہ ہر سال ایک لڑکی

خوب آراستہ کر کے اس میں ڈالتے تھے تب وہ جاری ہوتا تھا (گورنر مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کی اطلاع پر) حضرت عمرؓ نے ایک کاغذ پر رقعہ لکھا کہ "اے دریا اگر تو اللہ کے حکم سے چلتا تھا تو ہم خدائے واحد وقہار سے درخواست کریں گے کہ تجھے جاری کرے اور اگر تو خود اپنی مرضی سے چلتا تھا تو ہمیں تیری کوئی حاجت نہیں ہے (اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو لکھ بھیجا کہ یہ رقعہ دریا میں ڈال دیا جائے) چنانچہ جب یہ رقعہ دریا میں ڈالا گیا تو پانی فوراً چلنے لگا۔ درحقیقت امارت یہ ہے پس ولایت اور اس کے ثابت کرنے میں میری مراد یہ ہے کہ تو جان لے کہ ولی اس شخص کو کہا جا سکتا ہے جس میں ولی کے یہ اوصاف موجود ہوں اور اس کا حال اس طرح ہو جس طرح میں نے بیان کیا ہے نہ کہ صرف دعویٰ کرتا ہو..... اس سے پہلے بھی مشائخ نے اس معاملے میں کتابیں تصنیف کی تھیں لیکن وہ جلد ہی ناپید ہو گئیں۔ اب میں صاحب مذہب اور بزرگ پیر حضرت محمد بن علی الحکیم ترمذیؒ کی عبارت پیش کرتا ہوں جیسا کہ میرا ان پر اعتقاد ہے تاکہ تجھے بہت فائدہ حاصل ہو اور تیرے علاوہ بھی اس طریقت کے طالبوں میں سے جسے یہ کتاب پڑھنے کا اتفاق ہو وہ اس سے استفادہ کر سکے۔

فصل

ولایت کی تشریح اور درجات

اللہ تعالیٰ تمہیں ہمت بخشے، جان لو کہ لفظ ولی لوگوں کے درمیان مستعمل ہے اور کتاب وسنت بھی اس پر ناطق ہیں، جیسا کہ خداوند عزوجل فرماتے ہیں کہ:

اَلاَ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لاَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُوْنَ — آگاہ رہو! کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کو نہ خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

نیز فرمایا کہ:

نَحْنُ اَوْلِيَاءُ كُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الاٰخِرَةِ

دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں ہم ہی تمہارے ولی ہیں۔

اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے۔

اور پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

اِنَّ مِن عِبَادِ اللّٰهِ لعباداً يغبطهم الْاَنْبِيَاءُ والشهداءُ قيل مَنْ هُمْ يَا رَسول اللّٰه صفهُمْ لنَا لَعَلَّنَا تُحِبُّهُمْ قالَ قوم تحابُوا بروحِ اللّٰهِ غير اموالٍ وَلاَ اكتسابٍ وجوههم نور على منابر من نودٍ لا يخافون اذاحزن الناس ثم تلا اَلاَ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لاَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُوْنَ.

بے شک اللہ کے بندوں میں سے بعض بندے ایسے ہیں جن پر انبیاء اور شہدا بھی رشک کریں گے صحابہؓ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہمیں ان کے اوصاف بتایئے تاکہ ہم ان کے ساتھ محبت کریں۔ آپؐ نے فرمایا" وہ لوگ ہیں جو مال اور دنیوی منفعت کے بغیر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں (قیامت کے دن) ان کے چہرے نورانی ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہونگے جب دوسرے لوگ خوف زدہ ہونگے تو انہیں کوئی خوف لاحق نہ ہوگا اور جب دوسرے لوگ غمگین ہونگے تو انہیں کوئی غم نہ ہوگا۔

نیز حضور ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اَلاَ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لاَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُوْن

جس نے ولی کو ایذا پہنچائی اس نے میرے ساتھ جنگ کو حلال سمجھا۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ اولیاء ہیں جنہیں اس نے اپنی دوستی اور ولایت کیلئے

مخصوص کرلیا ہے، درحقیقت وہی ملکوں کے والی ہیں کہ ان کو حق تعالیٰ نے چن لیا ہے اور ان کو اپنے افعال کے اظہار کی علامت قرار دیا ہے، ان کو مختلف قسم کی کرامات سے مخصوص کیا اور ان کے وجود سے طبعی آفات کو پاک کر دیا اور ان کو نفس و ہوا کی پیروی سے رہا کر دیا ہے یہاں تک کہ ان کا مقصود اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ان کا انس بھی کسی کے ساتھ نہیں۔ ایسے لوگ ہم سے پہلے گزشتہ زمانوں میں بھی ہوئے ہیں اب بھی موجود ہیں اور اس کے بعد بھی قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اس امت کو دوسری تمام امتوں پر شرف عطا کیا ہے اور اس بات کی ضمانت دی ہے کہ میں خود محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کا تحفظ کروں گا۔ جس طرح آج بھی علماء کے درمیان نقلی دلائل اور عقلی براہین موجود ہیں اسی طرح اولیاء اور خاصان الٰہی کے پاس ایسے عینی دلائل موجود ہونے چاہئیں جن کا مخلوق کے ندر انکار نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس معاملے میں ہمارا دو فرقوں ''معتزلہ اور عام حشویہ'' کے ساتھ اختلاف ہے، معتزلہ اولیاء اللہ میں سے بعض کی دوسرے بعض پر فضیلت کا انکار کرتے ہیں (یعنی سب اولیاء کو فضیلت کے اعتبار سے برابر جانتے ہیں) حالانکہ اولیاء میں تخصیص کی نفی سے انبیاء میں بھی تخصیص کی نفی لازم آتی ہے اور یہ تو کفر ہے...... اور عام حشوی اولیاء میں ایک دوسرے کی تخصیص کو تو جائز سمجھتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسے اولیاء اللہ ماضی میں ہوا کرتے تھے۔ آج موجود نہیں ہیں۔ حالانکہ ماضی اور مستقبل کا انکار دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ ایک طرف کا انکار دوسرے طرف کے انکار کو بطریق اولیٰ لازم ہے۔ پس حق تعالیٰ نے نبی ﷺ کے براہین کو آج تک باقی رکھا ہوا ہے اور اولیاء کو ان کے اظہار کا سبب کر دیا ہے تاکہ حق تعالیٰ کی نشانیاں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے دلائل ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں اور اللہ تعالیٰ نے ایسے حضرات کو جہان کا والی بنا دیا ہے یہاں تک کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی بات کیلئے وقف ہیں اور نفس کو ان کا تابع بنا دیا گیا ہے تاکہ ان ہی کے قدموں کی برکت کے باعث آسمان سے بارش نازل ہو۔ ان کے قدموں کی برکت اور ان کے احوال کی

صفائی کے باعث ہی زمین سے فصلیں پیدا ہوں اور انہی کی دُعاؤں سے مسلمانوں کو کافروں پر فتح و کامرانی حاصل ہو۔ ایسے لوگ چار ہزار کی تعداد میں ہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ یہ حضرات اپنے حال کی خوبصورتی بھی نہیں جانتے اور تمام احوال میں اپنے آپ سے اور تمام مخلوق سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس بارے میں آثار حدیث وارد ہوئے ہیں اور اولیاء اللہ کا کلام بھی اس پر ناطق ہے نیز خود میرے اوپر الحمدللہ یہ بات عیاں ہو چکی ہے۔

اس کے علاوہ جو حضرات ارباب حل وعقد اور درگاہ حق کے سردار ہیں وہ تین سو کی تعداد میں ہیں۔ جن کو اخیار کہتے ہیں...... اور چالیس دوسرے ہیں جنہیں ابدال کہا جاتا ہے...... اور سات دیگر جو ابرار کہلاتے ہیں۔ اور چار اور ہیں جنہیں اوتار کہتے ہیں۔ اور تین دوسرے ہیں جنہیں نقبا (نقیب کی جمع) کہتے ہیں اور ایک دوسرا ہوتا ہے جس کو قطب اور غوث کہا جاتا ہے۔ یہ تمام ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور معاملات کی انجام دہی میں ایک دوسرے کی اجازت کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس پر بھی روایات ناطق ہیں اور تمام اہل سنت کا اس پر اجماع ہے۔ تاہم اس مقام پر اس کی شرح اور تفصیل مقصود نہیں......

اور اس جگہ میں نے جو کہا ہے کہ ان میں سے تمام حضرات ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ولی ہے تو اس پر عام لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس طرح تو ان حضرات کو اپنی عاقبت سے متعلق امن میں ہونا چاہئے حالانکہ یہ محال ہے کہ ولایت کی معرفت عاقبت کے بارے میں امن میں ہونے کی مقتضی ہو۔ کہ جب یہ درست ہے کہ ایک مومن اپنے ایمان کے بارے میں جانتے ہوئے بھی اپنی عاقبت کے متعلق امن میں نہ ہو تو یہ بھی درست ہے کہ ولی اپنی ولایت کو پہچانتا ہو لیکن عاقبت کے متعلق امن میں نہ ہو۔ تاہم یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کسی ولی کو اس کے حال میں صحت اور اپنی نافرمانی سے محفوظ کر کے اپنے خصوصی فضل و کرم سے عاقبت کے بارے میں امن سے مشرف فرما دیں۔ اس جگہ مشائخ کا

آپس میں اختلاف ہے اور میں نے منشا اختلاف واضح کر دیا ہے کہ جو کوئی ان چھپے ہوئے چار ہزار حضرات میں سے ہیں وہ اپنی ولایت کے بارے میں خود علم ہونے کو جائز نہیں سمجھتے اور جو حضرات ان دوسرے بزرگوں میں سے ہیں وہ اس معرفت کو درست سمجھتے ہیں۔ فقہا میں سے بہت سے حضرات اس گروہ کی موافقت کرتے ہیں اور بہت سے فقہا اس گروہ کے موافق ہیں...... متکلمین میں سے استاد ابو اسحٰق اسفرائنیؒ جیسے حضرات اور متقدمین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے اور استاد ابو بکر بن فورک اور متقدمین کی ایک دوسری جماعت اس بات پر ہے کہ ولی اپنے بارے میں یہ جانتا ہوتا ہے کہ وہ ولی ہے میں اس پہلے گروہ سے کہتا ہوں کہ ولی کے اپنے آپ کو پہچاننے میں حرج اور نقصان کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ جب وہ جانتا ہو کہ میں ولی ہوں تو غرور میں مبتلا ہو جائے گا میں کہتا ہوں کہ ولایت کی شرط تو حق تعالیٰ کی نگہبانی ہے اور جو حق تعالیٰ کی طرف سے محفوظ ہو وہ مغرور کیسے ہو سکتا ہے۔

نیز یہ بات تو بڑی ہی عامیانہ سی ہے کہ کوئی شخص ولی ہو اور اس پر عام عادت کے خلاف کرامات بھی ظاہر ہوتی ہوں اور وہ یہ بھی نہ جانتا ہوں کہ میں ولی ہوں اور میرے اوپر گزرنے والی یہ حالت کرامت۔ عوام میں سے ایک گروہ اس طبقے کی تقلید کرتا ہے اور بعض لوگ اس دوسرے طبقے کی تقلید کرتے ہیں۔ لیکن عام لوگوں کی باتوں کا کوئی اعتبار نہیں۔

باقی معتزلہ تو اولیاء اللہ میں تخصیص اور کرامات کے بالکل ہی منکر ہیں۔ حالانکہ کرامت اور تخصیص ہی تو ولایت کی حقیقت ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ "تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں۔ بشرطیکہ فرمانبردار ہوں اور جو کوئی بھی ایمان کے جملہ تقاضوں کو پورا کرے، حق تعالیٰ کی صفات اور رویت باری کا منکر ہو۔ گنہگار مومن کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا قائل ہو اور انسان کے رسولوں کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نازل نہ ہونے کی صورت میں محض عقل کی بنا پر مکلف ہونے کا اقرار کرے، وہ ولی ہے، اور تمام مسلمان کے نزدیک یہ

شخص ولی ہوگا (حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ) لیکن وہ شیطان کا ولی ہوگا۔ اور معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ولایت کیلئے کرامت واجب ہوتی تو تمام مومنوں کو کرامت حاصل ہوتی اس لیے کہ یہ تمام ایمان کے اندر مشترک ہیں اور جب اصل میں مشترک ہیں تو انہیں فرع میں بھی مشترک ہی ہونا چاہئے! بلکہ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح جائز ہے کہ مومن اور کافر دونوں کو کرامت حاصل ہو کہ خواہ ان میں سے کوئی دوران سفر شدید بھوک محسوس کرتا ہو تو اچانک کوئی میزبان یا دسترخوان ظاہر ہوجاتی کہ کوئی اسے اس دسترخوان پر بٹھا دے (تو یہ چیز تو مومن و کافر ہر شخص کے ساتھ پیش آ سکتی ہے) اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص (کرامت کے طور پر) طویل مسافت ایک رات میں طے کرسکتا ہوتا تو یہ چیز تو پیغمبر ﷺ کو اس وقت حاصل ہوتی جب آپ نے مکہ مکرمہ کا ارادہ کیا تھا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا:

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍلَّمْ تَكُوْنُوْا بَالِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ	جہاں تم لوگ بڑی مشقت سے پہنچ سکتے ہو وہاں یہ چوپائے تمہارا بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ تمہارا قول غلط اور باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى	پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے کو رات کے تھوڑے حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

باقی تمام صحابہؓ کے جانوروں پر بوجھ لاد کر مکہ کی طرف لے جانے کا تو معنی یہی ہے کہ کرامات خاص ہیں نہ کہ عام۔ ہاں اگر وہ تمام کرامت کے ذریعہ مکہ پہنچ جاتے تو کرامات عام ہوتیں پھر ایمان بالغیب ضروری نہ رہتا اور ایمان بالغیب کے تمام احکام اٹھ جاتے۔ اس لیے کہ ایمان تو نیک اور بدکار سب کے درمیان عمومی محل میں ہے لیکن ولایت محل خصوصی میں ہے۔ پس حق تعالیٰ نے جہاں ایمان کو محل عموم میں رکھا وہاں حضور ﷺ کو اپنا بوجھ

جانوروں پر لادنے کے موافق حکم دیا اور جس چیز کو محل خصوصی میں رکھا وہاں ایک ہی رات میں مکہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے قاب قوسین تک لے گیا اور تمام عالم کے اسرار و رموز آپ کو دکھا دیے اور جب آپ واپس تشریف لائے تو ابھی تک رات کا کافی حصہ باقی تھا۔ بہرحال ایمان کے معاملے میں آپؐ دوسرے عام لوگوں کے ساتھ عام تھے لیکن کرامت اور خصوصیت کے معاملے میں آپ خاص کے ساتھ خاص تھے اور تخصیص کی نفی تو کھلا مکابرہ ہے۔ جیسا کہ بادشاہ کے دربار میں حاجب، دربان اور وزیر بھی ہوتے ہیں۔ اور باوجودیکہ یہ تمام حکم برداری میں برابر ہیں لیکن ان میں سے بعض کو دوسرے بعض پر خصوصیت حاصل ہوتی ہے۔ پس ہر چند کہ تمام مومن حقیقت ایمان میں برابر ہوتے ہیں تاہم ان میں سے کوئی گنہگار ہوتا ہے اور کوئی اطاعت شعار اور کوئی عالم ہوتا ہے تو کوئی جاہل! پس یہ بات ثابت ہوئی کہ تخصیص اور فضیلت کا انکار تمام معانی کے انکار کی طرح ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

مشائخ کے رموز

ولایت کی تحقیق بیان کرنے میں مشائخ میں سے ہر ایک کے رموز موجود ہیں، حتی الامکان ان کے منتخب رموز کو میں بیان کردوں گا تاکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہئیں تو پوری طرح تمہیں فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ حضرت ابوعلی جرجانیؒ کہتے ہیں کہ:

اَلْوَلی ھو الفانی فی حالہ و الباقی فی مشاھدۃ الحق لم یکن لہ عن نفسہ اخبار و لا مع غیر اللہ قرار"

ولی وہ ہے جو اپنے حال میں فانی ہو اور مشاہدہ حق میں باقی ہو، اس کیلئے اپنے حال سے خبر دینا ممکن نہ ہو اور نہ ہی حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کے ساتھ اسے آرام نصیب ہو۔

کیونکہ بندہ کا خبر دینا اپنے حال سے ہی ہوسکتا ہے۔ جب اس کے تمام احوال ہی خالی ہو چکے ہوں تو اس کیلئے اپنے آپ سے خبر دینا درست نہ ہوگا اور نہ ہی وہ غیر حق کے ساتھ آرام پاتا ہے کہ اپنے حال کی اسے اطلاع دے کیونکہ پوشیدہ حال کی خبر دینا محبوب کے راز کو غیر پر کھولنے کے برابر ہے حالانکہ محبوب کا راز محبوب کے علاوہ کسی پر کھولنا محال ہے اور نیز وہ جب حالت مشاہدہ میں ہے تو مشاہدہ میں تو غیر کی طرف دیکھنا ہی محال ہے۔ لہذا جب غیر کو دیکھنا ہی نہ پایا جائے گا تو مخلوق کے ساتھ قرار کس طرح ممکن ہوگا۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ:

الولی لایکون له خوف لان الخوف ترقب مکروہ یحل فی المستقبل وانتظار المحبوب یفوت فی المستانف والولیُّ ابن وقته لَیسَ لَه' وقت مستقبل" فیخاف شیئًا وکما لاخوفَ لَه' لارَجَاءَ لَه' لِاَنَّ الرجاءَ انتظار محبوبٍ یَحْصِلُ اومَکْرُوهٍ یَکْشِفُ وذالک فی الثانی من الوقت وکذالک لایحزن من حزونةِ الوقت من کان فی ضیاء الرضا ونور الشکر وروضة الموافقة فانی یکن له حزن. قال اللّٰه تعالیٰ اَلاَ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا

ولی وہ ہے جسے کوئی خوف نہ ہو کیونکہ خوف مستقبل میں پیش آنے والی اس حالت کو کہتے ہیں جس سے دل پر تکلیف یا جسم پر کسی مصیبت کا اندیشہ ہو یا محبوب کے جدا ہو جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ اور ولی اپنے وقت کا پابند ہوتا ہے کہ اس کیلئے کوئی زمانہ مستقبل نہیں ہوتا کہ وہ کسی چیز سے خوف رکھے اور جس طرح اسے کوئی خوف نہیں ہوتا اس کی کوئی امید بھی نہیں ہوتی اس لیے کہ امید مستقبل میں محبوب کے حاصل ہونے یا کسی تکلیف کے دور ہونے کے انتظار کا نام ہے اور یہ بھی آنے والے دوسرے وقت کے ساتھ متعلق ہے اسی طرح اسے کوئی غم بھی لاحق نہیں ہوتا کیونکہ غم بھی تو وقت کی کدورت کا نام ہے۔ جو آدمی رضا الٰہی کی روشنی اور شکر خداوندی کے نور اور موافقت حق کے باغ میں ہو پس اس

خَوْف'' عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ کوغم کیسے لاحق ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ

حضرت جنیدؒ کے مذکورہ قول سے عوام کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب ولی کو خوف، امید اور حزن کچھ بھی لاحق نہیں ہوتا تو لامحالہ وہ اپنی عاقبت سے امن میں ہوگا حالانکہ یہ امن بھی اسے حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ امن غیب کو دیکھنے اور وقت سے اعراض کرنے کے سبب ہوتا ہے اور یہ ان لوگوں کی صفت ہے جو اپنی بشریت کو نہیں دیکھتے اور نہ ہی کسی صفت سے آرام پاتے ہیں۔ حالانکہ خوف، امید، حزن اور امن یہ تمام نفس کے ساتھ متعلق ہیں اور جب وہ نفس فانی ہوگیا تو حق تعالیٰ کی رضا ہی بندے کی صفت بن گئی اور جب رضا الٰہی حاصل ہوگئی تو اپنے احوال سے اعراض ظاہر ہوگیا اور تمام حالات کو بدلنے والے خدا تعالیٰ کی رویت میں تمام احوال درست ہو گئے۔ اس وقت ولایت دل پر ظاہر ہو گئی اور باطن پر اس کا معنی ظاہر ہوگیا۔

اور حضرت ابوعثمان مغربیؒ فرماتے ہیں کہ:

اَلْوَلِیُّ قَدْیکون مشھورًا ولایکون مقتونا ولی مخلوق کے اندر مشہور تو ہوتا ہے لیکن فتنہ پرور نہیں ہوتا۔

اور ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ:

الولی قدیکون مسورا ولایکون مشھورًا ولی پوشیدہ ہوتا ہے اور مشہور نہیں ہوتا۔

اور یہ بات کہ ولی وہ ہوتا ہے جو شہرت سے احتراز کرے کیونکہ شہرت میں فتنہ ہوتا ہے۔ حضرت ابوعثمانؒ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو جائز ہے کہ وہ مشہور ہو لیکن اس کی شہرت بے فتنہ ہونی چاہئے اس لیے کہ فتنہ تو جھوٹ میں ہے اور جب ولی ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی ولایت میں سچا ہو تو جھوٹے آدمی پر تو ویسے ہی ولی کا اطلاق نہ ہوگا اور نیز جھوٹے آدمی کے ہاتھ پر کرامت کا ظہور بھی محال ہے تو فتنہ تو اس کے حالات کے پیش نظر ہی ساقط ہو جاتا

چاہیے۔ درحقیقت یہ دونوں اقوال اس اختلاف کا شناخسانہ ہیں کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا کہ وہ ولی ہے کیونکہ اگر اپنی ولایت کو پہچانے گا تو مشہور ہو جائے اور اگر نہ پہچانے تو فتنہ میں واقع ہو جائے گا اور اس کی شرح بڑی طویل ہے۔

اور میں نے حکایات میں دیکھا ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے ایک شخص سے فرمایا کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تو اولیاء اللہ میں سے ایک ولی بن جائے؟ اس نے کہا "ہاں میں چاہتا ہوں" آپ نے فرمایا:

لا ترغب في شئ من الدنيا و الاخرة و فرغ نفسك للّٰهِ و اقبل بوجهك عليه	دنیا اور آخرت کی کسی چیز میں رغبت نہ رکھ، اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کیلئے فارغ کر دے اور اپنی تمام تر توجہ حق تعالیٰ کی طرف مبذول کر دے۔

یعنی دنیا و عقبیٰ کی طرف رغبت نہ کر کیونکہ دنیا کی طرف رغبت کرنا دراصل حق تعالیٰ سے ایک فانی چیز کی طرف رغبت کرنا ہے اور عقبیٰ کی طرف رغبت کرنا دراصل حق تعالیٰ سے اعراض کر کے ایک باقی چیز کی طرف رغبت کرنا ہے۔ جب کسی فانی چیز کی طرف اعراض ہو گا تو جب فانی چیز فنا ہو گی تو یہ اعراض بھی فنا ہو جائے گا لیکن جب ایک باقی رہنے والی چیز کی طرف رغبت کرو گے تو باقی چیز پر تو فنا جائز نہیں لہذا اس رغبت پر بھی فنا واقع نہیں ہو گی اس کلمے کا فائدہ یہ ہے کہ دنیا اور عقبیٰ کسی چیز کے بدلے بھی حق تعالیٰ کو نہ چھوڑ اور آپ نے فرمایا اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی دوستی کیلئے فارغ کر دے اور دنیا و عقبیٰ کو اپنے دل میں گزرنے کی اجازت نہ دے اور اپنے دل کو پوری طرح حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کرے! جب تیرے اندر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں گے تو تو ولی ہو جائے گا..... حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ ولی کون ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا:

الولی هو الصابر تحت الامر والنهی	خدا تعالیٰ کے حکم اور نہی پر صبر کرنے والا ولی ہوتا ہے۔

اس لیے کہ جس آدمی کے دل میں حق تعالیٰ کی دوستی جتنی زیادہ ہوگی اس کے دل پر حق تعالیٰ کا حکم اتنا ہی باعظمت ہوگا اور اس کا جسم حق تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے اتنا ہی دور ہوگا......

نیز حضرت بایزیدؒ سے حکایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''ایک دفعہ لوگوں نے مجھ سے بیان کیا کہ فلاں شہر میں اولیاءاللہ میں سے ایک ولی رہتا ہے۔ میں اٹھا اور اس کی زیارت کے ارادہ سے چل پڑا، جب میں اس کی مسجد میں پہنچا تو وہ اپنے گھر سے باہر آیا اور مسجد کے اندر اپنے منہ سے تھوک دیا۔ میں اس جگہ سے واپس لوٹ آیا اور اس کو سلام تک نہ کہا۔ میں نے سوچا کہ ولی تو وہ ہوتا ہے جو اپنے اوپر شریعت کی نگرانی رکھے تاکہ حق تعالیٰ اس کی ولایت پر نگاہ رکھیں۔ اگر یہ شخص ولی ہوتا تو اپنے منہ سے تھوک نکال کر مسجد کی زمین پر نہ پھینکتا اور مسجد کی حرمت کا لحاظ رکھتا تاکہ حق تعالیٰ اس کی کرامت کی صحت کا تحفظ کرے۔ اسی رات مجھے پیغمبر علیہ السلام ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی کہ آپ فرما رہے ہیں 'اے بایزید! جو عمل تو نے کیا ہے اس کی برکات تمہارے باطن میں پہنچ چکی ہیں'' اور دوسرے روز میں اس مقام پر پہنچ گیا جس پر تم مجھے دیکھ رہے ہو......

میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ ابوسعید کے پاس ایک شخص آیا اور مسجد میں پہلے اپنا بایاں پاؤں اندر رکھا۔ آپ نے فرمایا ''اس کو واپس لوٹا دو کیونکہ جو شخص حق تعالیٰ کے گھر میں داخل ہو رہا ہو اور اپنا بایاں پاؤں پہلے اندر رکھے ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

ملحدین (اللہ ان پر لعنت کرے) کے ایک گروہ نے اس مقدس طریق کے ساتھ اس طرح تعلق پیدا کر رکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خدمت اس حد تک کرنی چاہیے کہ بندہ ولی ہو جائے جب ولی بن جائے تو عبادت اس سے اٹھالی جاتی ہے اور اس کو نیکیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور یہ کھلی گمراہی ہے کیونکہ راہ حق میں کوئی ایسا مقام نہیں کہ ارکان اسلام میں سے کوئی رکن اٹھ جائے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔ میں انشاءاللہ اپنے مقام پر اس کی پوری شرح بیان کروں گا۔

کرامت کا اثبات

جان لو کہ ولی پر تکلیف شرعی کے صحیح ہونے کی حالت میں کرامت کا ظہور بالکل درست ہے۔اس پر اہل سنت کے دونوں فریق بھی متفق ہیں اور عقلاً بھی یہ امر محال نہیں ہے اس لیے کہ یہ چیز خداوند تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور اس کا اظہار اصول شریعت میں سے کسی اصل کے منافی بھی نہیں۔ اس طرح کے امور سے ارادت محض اوہام کی بنیاد پر دور نہیں ہوتی...... کرامت، ولی کے سچا ہونے کی علامت ہوتی ہے اور اس کا ظہور کسی جھوٹے سے درست نہیں سوائے اس بات کے کہ اس کے دعویٰ کے جھوٹا ہونے کی علامت ہو...... کرامت وہ خلاف عادت کام ہوتا ہے جو کسی آدمی کے احکام شریعت پر قائم رہنے کی حالت میں اس سے ظاہر ہو...... اور جو شخص حق تعالیٰ کے جتلانے سے صدق کو کذب سے تمیز کرتا ہو وہ بھی ولی ہے...... اہل سنت کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ کرامت تو درست ہے تاہم معجزہ کی حد سے کم معاملات میں۔ جیسا کہ دُعا کا قبول ہونا اور اس سے مقصد کا حاصل ہونا اور اسی سطح کے دوسرے افعال کہ عادات جن کے خلاف ہوں میں کہتا ہوں کہ تمہیں شریعت کے احکام پر قائم رہنے والے سچے ولی کے ہاتھ پر خلاف عادت کام کے ظاہر ہونے میں کیا قباحت نظر آتی ہے؟ اگر وہ کہیں کہ یہ چیز خداوند تعالیٰ کی قدرت میں نہیں تو یہ تو خود گمراہی ہے اور اگر وہ کہیں کہ یہ قسم حق تعالیٰ کی قدرت میں تو ہے لیکن کسی ولی کے ہاتھ پر اس کا ظہور گویا نبوت کو باطل کرنا اور انبیاء کی خصوصیت کو نفی کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی محال ہے اس لیے کہ ولی کرامات کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور نبی معجزات کے ساتھ۔

والمعجزة لم تكن معجزة بعينها	اور معجزہ اپنی ذات کے ساتھ معجزہ نہیں ہوتا
انما كانت معجزة لحصولها ومن	بلکہ وہ اپنے حصول کے سبب معجزہ ہوتا ہے۔

شـرطها اقتـران دعـوی النبوۃ فالمعجزۃ تخص للانبیاءِ

اس کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ مدعی نبوت سے ظاہر ہو۔پس معجزہ انبیاء کے ساتھ مختص ہے اور کرامات اولیاء کے ساتھ خاص ہیں۔

اور جب ولی ولی ہوتا ہے اور نبی، نبی.....تو ان کے درمیان کسی طرح اشتباہ لازم نہیں آ تا تا کہ اس سے احتراز کرنا پڑے اور پیغمبروں (علیہم السلام) کے مرتبے کا شرف ان کے بلند رتبے اور عصمت کی صفائی کے سبب ہوتا ہے نہ کہ محض معجزے یا کرامت یا ان سے خلاف عادت افعال کے ظاہر ہونے کی وجہ سے.....اور اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ تمام انبیاء کرام کے جملہ معجزات خلاف عادت ہی ہوتے ہیں.....اور اصل اعجاز میں سب برابر ہوتے ہیں۔لیکن درجات اور تفصیل میں ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے اور جب انبیاء کرام کے خلاف عادت افعال کے اصولی طور پر متساوی ہونے کے باوجود ان میں ایک دوسرے پر فضیلت درست ہے تو اولیاء کرام کیلئے خلاف عادت کرامت کا ظہور کس طرح درست نہ ہوگا؟ اور انبیاء کرام تو ان اولیاء سے بہت زیادہ افضل ہوتے ہیں جب وہاں خلاف عادت فعل ان میں ایک دوسرے پر فضیلت اور تخصیص کی علت نہیں بن سکے گا۔یعنی اولیاء کسی طرح بھی انبیاء کے برابر نہیں ہو سکتے۔عقلمندوں میں سے جس کو یہ دلیل معلوم ہو جائے اس کے ذہن میں کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا۔البتہ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ جب کسی ولی کو خلاف عادت کرامت حاصل ہو جائے تو وہ کہیں دعویٰ نبوت ہی نہ کر لے۔تو یہ امر محال ہے۔اس لیے کہ ولایت کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے قول میں سچا ہو اور حقیقت کے خلاف دعویٰ کرنا تو کذب ہوتا ہے اور کاذب آدمی ولی نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی ولی نبوت کا دعویٰ کرے تو یہ گویا معجزہ پر تنقید ہو گی اور معجزے پر نکتہ چینی کفر ہے اور کرامت سوائے فرمانبردار مومن کے کسی کو حاصل نہیں ہوتی اور جھوٹ تو نافرمانی ہے نہ کہ فرمانبرداری، اور جب معاملہ اسی طرح ہے تو ولی کی کرامت، نبی، کے اثبات محبت کے موافق ہو گی اور

معجزے اور کرامت کے درمیان طعن کرنے کا کوئی شبہ واقع نہیں ہوگا اس لیے کہ پیغمبر علیہ السلام معجزے کے ثابت کرنے سے اپنی نبوت کو ثابت کرتے ہیں اور ولی بھی اپنی کرامت سے آپ کی نبوت کو ہی ثابت کرتا ہے نیز اس طرح یہ اپنی ولایت کا ثبوت بھی فراہم کر دیتا ہے۔ پس ایک سچا ولی اپنی ولایت کے بارے میں وہی کچھ کہتا ہے جو ایک سچا نبی اپنی نبوت کے بارے میں کہتا ہے......اور ولی کی کرامت بعینہ نبی کا اعجاز ہوتا ہے اور ایک مومن کو ولی کی کرامت دیکھنے سے نبی کی نبوت پر اور زیادہ یقین حاصل ہوتا ہے نہ کہ اس میں شبہ واقع ہو۔ اس لیے کہ ان کے دعوؤں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی نفی کرے کیونکہ ایک کا دعویٰ بعینہ دوسرے کے دعویٰ کی دلیل ہوتا ہے۔ جیسا کہ شریعت کے قانون میں جب ورثا کا ایک گروہ کسی دعوے میں متفق ہو تو جب ان میں سے ایک کی حجت ثابت ہو جائے گی تو اس کی حجت دوسروں کیلئے بھی حجت قرار پائے گی کیونکہ وہ سب دعویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ متفق ہیں اور اگر دعوے مختلف ہوں تو ایک کی حجت دوسروں کیلئے حجت قرار نہیں پائے گی۔ پس جب نبی معجزے کی دلالت کے ساتھ اپنی نبوت کے صحیح ہونے کا مدعی ہو اور ولی اس کی تصدیق کرتا ہو تو اس کے دعویٰ کے اثبات شبہ کا واقع ہونا محال ہے۔ واللہ اعلم۔

معجزے اور کرامت میں فرق

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ جھوٹے آدمی کے ہاتھ پر معجزے اور کرامت کا ظہور محال ہے تو لامحالہ فرق زیادہ ظاہر ہونا چاہیے تا کہ اچھی طرح معلوم اور واضح ہو جائے۔ جان لو کہ معجزوں کیلئے شرط یہ ہے کہ ان لوگوں پر ظاہر کیا جائے اور کرامات کیلئے شرط ان کو چھپانا ہے۔ کیونکہ معجزہ تو دوسروں کیلئے مفید ہوتا ہے اور کرامت صرف صاحب کرامت کیلئے ہی ہوتی ہے اور نیز صاحب معجزہ کو یہ کامل یقین ہوتا ہے کہ یہ عین معجزہ ہے لیکن ولی قطعی طور پر نہیں جان سکتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج! اور نیز صاحب معجزہ یعنی نبی خدائے عزوجل

کے حکم سے شریعت میں تصرف کرتا اور احکام و منہیات میں ترتیب دیتا ہے۔ لیکن صاحب کرامت یعنی ولی کو نبی کے احکام کو تسلیم اور قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں اس لیے کہ ولی کی کرامت کسی طرح بھی نبی کے شرعی احکام کی مخالفت نہیں کرتی ...... اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب تم نے خلاف عادت فعل کو معجزہ اور ولایت کو نبی کی صداقت کی دلیل کہا ہے تو جب اس طرح کا خلاف عادت فعل تم غیر نبی کیلئے بھی جائز سمجھتے ہو تو وہ تو عادت کے موافق ہو جائے گا اور اثبات معجزہ پر تمہاری دلیل ہی اثبات کرامت کو باطل کر دے گی۔ میں جواب دوں گا کہ صورت حال یوں نہیں جس طرح تم نے اعتقاد بنالیا ہے کیونکہ معجزہ مخلوق کی عادت کے خلاف کام کو کہتے ہیں۔ لہذا جب ولی کی کرامت بعینہ نبی کا معجزہ ہوتا ہے اور جو دلیل نبی کا معجزہ ظاہر کرتا ہے وہی دلیل ولی کی کرامت بھی ظاہر کرتی ہے تو ایک اعجاز دوسرے اعجاز کی مخالفت نہیں کرتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت خبیبؓ کو مکہ میں جب کافروں نے سولی پر لٹکا دیا تو رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ کے اندر مسجد میں تشریف فرما ان کو دیکھ رہے تھے اور کافر جو سلوک ان کے ساتھ کر رہے تھے آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کو بتلا رہے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت خبیبؓ کی آنکھوں کے سامنے سے بھی پردے اٹھا دیئے تا کہ وہ بھی پیغمبر ﷺ کی زیارت کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ حق تعالیٰ نے ان کا سلام حضور ﷺ کے کانوں تک پہنچا دیا اور آپ کا جواب ان کو سنوا دیا آپ ﷺ نے ان کیلئے دعا فرمائی حتیٰ کہ ان کا رخ قبلہ کی طرف پھر گیا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ......

پس یہ جو پیغمبر ﷺ نے مدینہ منورہ میں ہوتے ہوئے ان کو دیکھ لیا جب کہ وہ مکہ مکرمہ میں تھے تو یہ ایک ناقص عادت فعل ہے اور حضرت خبیبؓ کا مکہ مکرمہ سے آپ کو دیکھ لینا ان کی کرامت تھی۔ اس لیے بالاتفاق کسی غائب چیز کو دیکھنا خلاف عادت فعل ہے۔ پس غیب زمانی اور غیب مکانی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کہ حضرت خبیبؓ کی کرامت پیغمبر ﷺ سے غیب مکانی کی حالت میں تھی اور متاخرین اولیاء کی کرامات آپ سے غیب زمانی کی حالت

میں ہوئی ہے اور یہ معجزہ اور کرامت کے درمیان فرق بڑا واضح ہے اور اس بات کی بڑی کھلی دلیل ہے کہ معجزے اور کرامت میں تضاد محال ہے کیونکہ صاحب معجزہ کی تصدیق کے بغیر کرامت نہ تو ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی فرمانبردار مومن کے علاوہ کسی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ امت کی کرامات درحقیقت پیغمبر کا معجزہ ہی ہوتی ہیں کیونکہ جب آپ کی شریعت باقی ہے تو آپ کی حجت بھی باقی رہنی چاہیے۔ پس اولیاء کرام رسول ﷺ کی رسالت کی سچائی پر گواہ ہوتے ہیں اس لیے یہ درست نہیں کہ شریعت رسول ﷺ بیگانہ آدمی کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو۔

اس بارے میں حضرت ابراہیم خواصؒ کی ایک حکایت بیان کی جاتی ہے جو اس موقع کے نہایت مناسب ہے۔ کہ حضرت ابراہیم خواصؒ نے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ اپنی عادت کے مطابق اکیلا جنگل میں جا رہا تھا اور ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک کونے سے ایک آدمی اٹھا اور مجھ سے مصاحبت کی درخواست کی۔ میں نے اس کے اندر توجہ کی تو اس کو دیکھنے سے مجھے نفرت سی لاحق ہوئی۔ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کہنے لگا ''اے ابراہیم رنجیدہ خاطر نہ ہو کہ میں نصاریٰ کے پادریوں میں سے ایک ہوں اور تیرے ساتھ مصاحبت کی امید پر ملک روم کے ایک دور دراز شہر سے یہاں آیا ہوں۔ حضرت ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ جب مجھے علم ہو گیا کہ یہ بیگانہ آدمی ہے تو میرے دل کو اطمینان ہوا اور اس کو اپنی صحبت میں رکھنا اور اس کے حق کو ادا کرنا میرے لیے آسان ہو گیا۔ میں نے کہا ''اے نصاریٰ کے راہب میرے پاس کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تمہیں اس جنگل میں تکلیف نہ پہنچے۔'' اس نے کہا ''اے ابراہیمؒ دنیا میں تیری اتنی شہرت ہے اور تو ابھی کھانے پینے کے غم میں مبتلا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کی اس خوش دلی سے مجھے تعجب ہوا اور میں نے اسے اپنی صحبت میں قبول کر لیا تاکہ میں تجربہ کروں کہ وہ اپنے دعوے میں کہاں تک سچا ہے'' جب ہم سات رات اور دن تک چلتے رہے تو ہمیں شدید پیاس نے آن گھیرا

وہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ''اے ابراہیمؒ پوری دنیا میں تیرا اس قدر طوطی بولتا ہے، حق تعالیٰ کی بارگاہ سے کوئی کرامت تو لا کہ پیاس کی شدت سے اب میرے اندر تو چلنے کی طاقت نہیں رہی'' آپ کہتے ہیں کہ ''میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور کہنے لگا ''بار خدایا! مجھ کو اس اجنبی و بیگانہ کے سامنے رسوا نہ کرنا کیونکہ وہ اس بیگانگی کے باوجود میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہے تیرے لیے کیا مشکل ہے کہ اس کافر کا گمان میرے بارے میں صحیح کر دے'' آپ کہتے ہیں کہ ''جب میں نے سر اوپر اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ایک طبق ہے جس میں دو روٹیاں اور دو پیالے شربت کے رکھے ہیں، ہم نے انہیں کھایا اور وہاں سے چل دیئے۔ جب دوسرے سات روز گزر گئے تو میں نے دل میں سوچا ''مجھے بھی اس کا تجربہ کرنا چاہیے تا کہ اس سے پہلے کہ وہ کسی دوسری چیز کے ذریعہ میرا امتحان لے اور کسی چیز کے ذریعہ میرے ساتھ معارضہ کرے وہ خود ہی اپنی ذلت کو دیکھ لے'' چنانچہ میں نے کہا ''اے نصاریٰ کے راہب! آج تیری باری ہے لہذا جو کچھ تمہاری ریاضت کا پھل تمہارے پاس موجود ہے اسے سامنے لا'' اس نے بھی سر زمین پر رکھا اور کچھ کہا تو ایک طبق ظاہر ہوا جس پر چار روٹیاں اور چار پیالے شربت کے رکھے تھے۔ میں بڑا حیران ہوا اور رنجیدہ خاطر ہو کر اپنے حال سے نا امید ہو گیا اور اپنے دل میں سوچا کہ میں تو اس میں سے ہرگز نہیں کھاؤں گا کیونکہ یہ ایک کافر کیلئے ظہور پذیر ہوا ہے اور کسی کی امداد ہے میں یہ کیسے کھا سکتا ہوں؟ وہ مجھے کہنے لگا ''اے ابراہیمؒ! کھائیے میں نے کہا ''میں نہیں کھاتا'' اس نے پوچھا کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا اس لیے کہ تو اس کا اہل نہ تھا اور یہ سب کچھ تیری حالت کے مناسب نہیں اور میں تیرے اس کام میں حیران ہوں اگر اس کو کرامت پر محمول کروں تو یہ درست نہیں کیونکہ تو کافر ہے اور کافر سے کرامت ظاہر نہیں ہو سکتی اور اس کو اعانت کہوں تو مدعی اس شبہ میں مبتلا ہو جائے گا کہ جب اللہ تعالیٰ اس کی اعانت سلام قبول کیے بغیر کرتا ہے تو اسے اسلام قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے مجھے کہا ''اے ابراہیمؒ! نوش فرمایئے! آپ کو دو باتوں کی بشارت ہو!

ایک میرے اسلام قبول کرنے کی:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔

اور دوسری اس بات کی کہ حق تعالیٰ کے ہاں آپ کا بڑا بلند مقام ہے" میں نے پوچھا یہ کیسے؟ وہ کہنے لگا "اس لیے کہ مجھے کرامات میں سے کوئی حصہ حاصل نہیں لیکن میں نے آپ کے شرم سے سر زمین پر رکھ لیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ "بار خدایا! اگر محمد ﷺ کا دین حق اور تیرا پسندیدہ ہے تو مجھے دو روٹیاں اور شربت کے دو پیالے عطا فرما اور اگر ابراہیمؒ خواص تیرا ولی ہے تو مجھے دو روٹیاں اور دو پیالے شربت مزید عطا فرما۔ چنانچہ جب میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو یہ طبق اپنے سامنے موجود پایا۔ حضرت ابراہیمؒ نے اس میں سے کھا لیا اور وہ مرد خدا جو پہلے ایک راہب تھا۔ بزرگان دین میں سے ایک ہو گیا۔

اور یہ ولی کی کرامت کے ساتھ ملا ہوا نبی کا معجزہ ہی ہے اور یہ چیز بڑی نادر ہے کہ نبی کی عدم موجودگی میں غیر نبی کو اس نبی کی برہان نظر آئے اور ولی کی موجودگی میں غیر ولی کو اس ولی کی کرامت نصیب ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ولایت کی انتہا اس کے مبتدی کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اس لیے کہ وہ راہب، فرعون کے جادوگروں کی طرح چھپا ہوا ولی تھا۔ پس ابراہیم خواصؒ نے تو معجزہ نبی کی صداقت کو ثابت کیا۔ لیکن وہ دوسرا تو نبی کی صداقت کے ساتھ ولی کی عزت کا بھی طلب گار تھا تو خداوند تعالیٰ نے اپنے ازلی حسن عنایت سے اس کو اس کا مقصود عطا کر دیا اور کرامت اور معجزہ کے درمیان یہ بڑا ہی واضح فرق ہے...... اس موضوع پر باتیں تو بہت ہیں لیکن یہ کتاب اس سے زیادہ کی متحمل نہیں...... اور اولیاء پر کرامت کا اظہار ایک دوسری کرامت ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس کو پوشیدہ

رکھا جائے اور بتکلف ظاہر نہ کیا جائے اور میرے شیخ فرماتے تھے کہ اگر ولی صحیح الحال ہو اور عاجزی وانکساری کے ساتھ اپنی ولایت کو ضرورت کے مطابق ظاہر کر دے تو کوئی نقصان نہیں لیکن اگر تکلف کے ساتھ اسے ظاہر کرے تو یہ رعونت اور سرکشی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مدعی الوہیت کے ہاتھ پر معجزے جیسے افعال کا ظاہر ہونا

مشائخ صوفیاء اور تمام اہل سنت و جماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معجزے اور کرامت کی طرح کا خلاف عادت فعل کسی کافر کے ہاتھ پر بھی ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس کے ظہور میں شبہ کرنے کے تمام اسباب ختم ہو جائیں اور کسی کو اس کے جھوٹا ہونے کا شک نہ ہو۔ لیکن اس طرح کے افعال کا ظاہر ہونا خود اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہوگا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے فرعون نے چار سو سال عمر پائی کہ اس دوران اسے کوئی بیماری لاحق نہ ہوئی...... اور پانی اس کے پیچھے پیچھے بلندی کی طرف بھی جاری رہتا تھا اور جب وہ کھڑا ہوتا تو پانی بھی کھڑا ہو جاتا اور جب وہ چلتا تو پانی بھی اس کے پیچھے جاری ہو جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عقلمندوں کو کوئی شبہ واقع نہیں ہوا کہ وہ خدائی کا جھوٹا دعویٰ کر رہا ہے کیونکہ عقلمند اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ مجسم اور مرکب نہیں ہے...... اور اگر اسے یا اس طرح کے اور بہت سے افعال بھی اس سے ظاہر ہو جاتے تب بھی کسی عقلمند انسان کو اس کے جھوٹا ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوتا۔ اسی طرح باغ ارم کے مالک شداد اور نمرود کے بارے میں جو خلاف عادت افعال کی روایات آتی ہیں ان کو بھی اسی پر قیاس کرو۔ اور اسی طرح مخبر صادق حضرت محمد ﷺ نے بھی ہمیں خبر دی ہے کہ آخری زمانہ میں دجال ظاہر ہوگا اور خدائی کا دعویٰ کرے گا دو پہاڑ دائیں بائیں اس کے ساتھ چلیں گے۔ دائیں طرف کا پہاڑ نعمتوں کا اور بائیں طرف کا پہاڑ عذاب اور سزا کا ہوگا اور وہ مخلوق کو اپنی الوہیت کی طرف بلائے گا۔ جو کوئی اس کی خدائی کو تسلیم نہ کرے وہ اس کو سزا و عذاب میں مبتلا کرے گا اور خدا تعالیٰ اس کی گمراہی

کے سبب مخلوق کو ماریں گے اور زندگی دیں گے اور دنیا میں اس کا حکم مطلق پھیلا دیا جائے گا۔ لیکن اگر اس طرح کے سینکڑوں افعال خارق عادت بھی اس سے ظاہر ہو جائیں تو بھی عقلمند انسان کو اس کے جھوٹا ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا کیونکہ عقلمند آدمی کو اچھی طرح یہ علم ہوگا کہ حقیقی خدا تعالیٰ گدھے پر سوار نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تغیر پذیر متلون یا بھینگا ہے، لہٰذا اس طرح کے تمام افعال پر استدراج[1] کا حکم لگایا جائے گا۔

نیز جس طرح رسالت کا سچا دعویٰ کرنے والے رسول ﷺ کے ہاتھ پر خلاف عادت افعال ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی صداقت کی دلیل بنتے ہیں اسی طرح رسالت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے شخص کے ہاتھ پر بھی خلاف عادت افعال ظاہر ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہوں گے۔ تاہم یہ جائز نہیں کہ کوئی ایسا فعل ظاہر ہو جس میں کسی کو کوئی شبہ واقع ہو کیوں جب شبہے کا اثبات جائز ہوگا تو جھوٹے کو سچے سے اور سچے کو جھوٹے سے پہچان نہ سکیں گے۔ اس وقت طالب نہیں جان سکے گا کہ کس کی تصدیق کرنی چاہئے اور کس کی تکذیب کرنی چاہئے! اس جگہ ثبوت کا حکم بالکل ہی باطل ہو جائے گا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کسی مدعی ولایت کے ہاتھ کرامت کی جنس سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جو دین میں درست ہو۔ اگرچہ اس کا معاملہ زیادہ اچھا نہ بھی ہو کیونکہ وہ اس سے رسول ﷺ کی صداقت ثابت کرتا ہے اور اپنے آپ پر حق تعالیٰ کے فضل کو ظاہر کر رہا ہے اور اس فعل کی طاقت اور قوت کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتا اور جو آدمی اصل ایمان میں بغیر دلیل کے سچ کہنے والا ہو وہ ولایت کے ساتھ اعتقاد رکھنے میں بھی احوال کے اعتبار سے سچا ہی ہوگا۔ کیونکہ تمام احوال میں اس کا اعتقاد ولی کے اعتقاد کی طرح ہوتا ہے اگرچہ اس کے اعمال اس کے اعتقاد کے موافق نہیں ہوتے، اور نہ ہی دعویٰ ولایت اس سے معاملات کو ترک کرنے کے منافی ہے، جس طرح کہ ایمان کا دعویٰ اعمال کے ترک کرنے کے منافی نہیں...... اور درحقیقت

[1] استدراج: وہ خلاف عادت افعال جو کسی کافر، ملحد یا فاسق وفاجر کے ہاتھ پر ظاہر ہوں۔

کرامت اور ولایت حق تعالیٰ کے عطیات میں سے ایک عطیہ ہے یہ بندہ کی کمائی میں سے نہیں ہے۔ پس بندے کا کسب، ہدایت کی حقیقت کیلئے علت نہیں بنتا اور اس سے پہلے میں بیان کر چکا ہوں کہ اولیاء معصوم نہیں ہوتے کیونکہ معصومیت نبوت کی شرط ہے تاہم اولیاء ان گناہوں سے محفوظ ضرور ہوتے ہیں جو ولایت کی نفی کے مقتضی ہوں اور ولایت کی نفی اس کے وجود کے بعد ان چیزوں سے وابستہ ہے جو ایمان کی منافی ہیں اور ایمان کی منافی چیزوں کا ارتکاب تو صرف معصیت ہی نہیں بلکہ اس سے انسان مرتد ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت محمد بن علی حکیم ترمذی، حضرت جنیدؒ، حضرت ابوالحسن نوریؒ، حضرت حارث محاسبیؒ اور ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اہل حقائق کا یہی مذہب ہے لیکن حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ، حضرت ابوسلیمان دارانیؒ، حضرت ابوحمدون قصارؒ اور دوسرے اہل معاملات کا مذہب یہ ہے کہ اطاعت پر ہمیشگی اختیار کرنا۔ ولایت کیلئے شرط ہے لہذا جب ولی کا دل کسی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے تو وہ ولایت سے معزول ہو جاتا ہے۔ لیکن میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اس امر پر امت کا اجماع ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کوئی بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ پس یہ ولایت اس ولایت (ایمان) سے زیادہ فضیلت والی تو نہیں لہذا جب ولایت معرفت (ایمان) جو تمام کرامتوں کی بنیاد ہے معصیت سے ساقط نہیں ہوتی تو یہ محال ہے کہ جو ولایت (طریقت) شرف اور کرامت کے اعتبار سے اس سے کمتر ہے وہ ارتکاب معصیت سے زائل ہو جائے۔ مشائخ کے درمیان یہ بڑا طویل اختلاف ہے جسے یہاں ثابت کرنا میرا مقصد نہیں۔ لیکن اس باب کو سمجھنے میں مشکل ترین چیز یہ ہے کہ تو یقینی علم کے ساتھ جان لے کہ ولی پر کرامت کس حالت میں ظاہر ہوتی ہے۔ صحو کی حالت میں یا سکر کی حالت میں۔ غلبہ حال میں یا حال کے قابو میں ہونے کی حالت میں؟ صحو اور سکر کی تفصیل حضرت بایزیدؒ کے مذہب میں میں بیان کر چکا ہوں...... چنانچہ حضرت بایزیدؒ، حضرت ذوالنونؒ مصری، حضرت محمد بن حنیفؒ، حضرت حسین ابن منصورؒ، حضرت یحییٰ بن

معاذؒ اور صوفیہ کی ایک جماعت اس مذہب پر ہیں کہ ولی پر کرامت کا ظہور اس کے حالت سُکر میں ہونے کے علاوہ کسی حالت میں نہیں ہوتا۔ اور جو چیز حالت صحو میں ہوتی ہے وہ انبیاء کا معجزہ ہوتا ہے۔ ان کے مذہب میں تو کرامت اور معجزے کے درمیان یہ فرق واضح ہے کہ کرامت کا اظہار ولی پر اس کے حالت سکر میں ہونے کے وقت ہوتا ہے کہ وہ مغلوب ہو اور دعوت کی پرواہ نہ رکھتا ہو اور نبی پر معجزے کا اظہار اس کے حالت صحو میں ہونے کے وقت ہوتا ہے تا کہ وہ لوگوں کو اس کا چیلنج کرے اور اس کا مقابلہ کر سکنے کی دعوت دے...... اور صاحب معجزہ کو حکم کے دونوں طرف کا اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جہاں چاہے معجزے کا اظہار کرے اور جہاں چاہے اسے چھپائے رکھے۔ لیکن اولیاء کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی کہ انہیں کرامت کے بارے میں اختیار ہو۔ کیونکہ وہ کبھی کرامت ظاہر کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں لیکن وہ ظاہر نہیں ہوتی اور کبھی وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ولی، دعوت دینے والا نہیں ہوتا کہ اس کا حال اوصاف کے بقا کی طرف منسوب ہو بلکہ وہ تو روپوش ہوتا ہے اور اس کا حال صفات کے فنا کی طرف موصوف ہوتا ہے۔ پس ان میں سے ایک (نبی) صاحب شریعت ہوتا ہے اور دوسرا (ولی) صاحب ستر! پس یہ ضروری ہوا کہ غیبت، دہشت اور مدہوشی کے علاوہ کسی حالت میں کرامت ظاہر نہ ہو، اور اس میں تمام کا تمام تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے ہو اور جس شخص کی حالت یہ ہو اس کی تمام گفتگو حق تعالیٰ کی ترتیب سے ہوتی ہے اس لیے کہ جس میں بشریت کے خصائل پوری طرح موجود ہوں وہ یا تو غافل ہوتا یا بھولنے والا اور یا پھر اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دینے والا ہوتا ہے۔ لیکن انبیاء کرام نہ تو غافل ہوتے ہیں اور نہ ہی بھولنے والے، اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑنے والے بیوقوفوں کے سوا کوئی نہیں ہوتے۔ یہاں اس طرح کا تلون اور تردد موجود ہے نہ کہ تحقیق و تمکین!...... اور اولیاء کرام جب تک اپنی بشریت کے حال کے ساتھ قائم رہیں حق تعالیٰ سے محجوب رہتے ہیں لیکن جب انہیں مشاہدہ حق نصیب ہو جائے تو وہ مدہوش اور حق

تعالیٰ کے انعامات کی حقیقت میں متحیر ہو جاتے ہیں، اور کرامت کا اظہار حالت کشف کے علاوہ درست نہیں ہوتا کیونکہ وہ قرب الٰہی کا درجہ ہوتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ ان کے دل کے ہاں سونا اور پتھر برابر ہوتے ہیں۔ اور یہ حالت انبیاء کے علاوہ کسی آدمی کی صفت نہیں بنتی۔ البتہ اگر کسی کو حاصل ہوتی تو وہ بالکل عارضی اور غیر مستقل ہوتی ہے اور وہ بھی صرف حالت سُکر میں...... جیسا کہ حضرت حارثہؓ ایک روز دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہوئے دنیا میں ہی عقبیٰ کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور فرمایا:

اعرضت نفسی من الدنیا — میں نے اپنے نفس کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا

فاستوت عندی حجرها و ذهبها — تو میرے لیے سونا اور پتھر اور چاندی اور

وفضتها ومَدَرهاَ — ڈھیلا سب برابر ہو گئے۔

لیکن دوسرے روز آپ کو لوگوں نے دیکھا کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے کام کر رہے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا ''اے حارثہؓ! کیا کر رہے ہو؟'' جواب دیا کہ روزی ڈھونڈ رہا ہوں کہ اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ پس اس وقت اس حالت میں تھے اور اس وقت اس حالت میں! پس اولیاء کے صحو کا مقام، عوام کا درجہ ہوتا ہے اور ان کے سُکر کا مقام انبیاء کا درجہ ہوتا ہے اور جب وہ اس درجے سے واپس آ جاتے ہیں تو اپنے آپ کو عام لوگوں کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور جب اپنے آپ سے غائب ہو کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں تو ان کا سُکر پا کر صاف ہو جاتا ہے اور یہ بارگاہ خداوندی کیلئے مہذب ہو جاتے ہیں اس وقت تمام جہان ان کے حق میں سونے کی طرح ہو جاتا ہے۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں

ذهب اینما ذهبنا و دُرّ — حیث درنا وفضة فی الفضاءِ

(جہاں ہم گئے وہاں سونا اور جدھر ہم گھومے ادھر موتی تھے اور فضا میں چاندی تھی)

اور میں نے استاد و امام حضرت ابو القاسم قشیریؒ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ''میں نے حضرت لجرائیؒ سے ان کی ابتدائی حالت سے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا

''ایک مرتبہ مجھے پتھر کی ضرورت تھی تو سرخس کی ندی سے جو پتھر بھی پکڑتا تھا وہ ایک گوہر (موتی) بن جاتا تھا اور میں اس کو پھینک دیتا...... اور یہ اس لیے ہوتا تھا کہ پتھر اور موتی ان کے نزدیک دونوں یکساں تھے بلکہ اس وقت گوہر زیادہ ذلیل تر تھا کیونکہ انہیں پتھر کی ضرورت تھی نہ کہ موتی کی خواہش...... اور حضرت خواجہ امام خزائیؒ سے میں نے سرخس میں خود سنا ہے کہ فرماتے تھے میں بچپن میں ریشم کے کپڑوں کیلئے شہتوت کے پتے لینے ایک محلے میں گیا اور درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخ کاٹنے لگا۔ میں درخت پر ہی تھا کہ شیخ ابوالفضل ابن الحسنؒ کا اس گلی سے گزر ہوا۔ نہ تو انہوں نے مجھے دیکھا اور نہ ہی مجھے کوئی شک گزرا کہ وہ حالت سُکر میں ہیں اور ان کا دل حق کی طرف متوجہ ہے۔ پس انہوں نے سر اوپر اٹھایا اور کہنے لگے ''بار خدایا! ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے کہ تو نے مجھے ایک پیسہ بھی عنایت نہیں کیا کہ میں سر کے بال ہی منڈ وا سکوں۔ اے اللہ! کیا آپ دوستوں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں'' حضرت امام خزائیؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے دیکھا کہ اسی وقت درختوں کے تمام پتے، ٹہنیاں اور جڑیں سنہری ہو گئیں'' تو آپ نے فرمایا ''عجیب معاملہ ہے کہ ہمارا مقصد تو دنیا سے اعراض ہے۔ لیکن دل کی فراخی کیلئے تجھ سے کوئی بات بھی نہیں کر سکتے؟

حضرت شبلیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دفعہ چار ہزار دینار دریائے دجلہ میں پھینک دیئے۔ لوگوں نے کہا ''آپ یہ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا پتھر پانی میں زیادہ بہتر رہتے ہیں'' لوگوں نے کہا ''آپ یہ لوگوں میں کیوں تقسیم نہیں کر دیتے؟'' تو آپ نے فرمایا ''سبحان اللہ! میں اللہ تعالیٰ کے حضور کیا عذر پیش کروں گا کہ حجاب اپنے دل سے اٹھاؤں اور اپنے مسلمان بھائیوں کے دل پر رکھ دوں۔ حالانکہ دین کی شرط یہ نہیں کہ مسلمان بھائیوں کیلئے اپنے سے زیادہ برائی چاہوں اور یہ تمام سُکر کے حالات ہیں۔ جس کی شرح میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس جگہ تو میرا مقصد کرامت کا اثبات ہے۔

علاوہ ازیں حضرت جنیدؒ، حضرت ابو العباس سیاریؒ، حضرت ابوبکر واسطیؒ اور

حضرت محمد بن علی ترمذیؒ جو ارباب طریقت ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ کرامت صحو اور تمکین کی حالت میں ظاہر ہوتی ہے نہ کہ حالت سُکر میں! اس لیے کہ اولیاء اللہ ملک کے تدبیر کنندہ اور جہان کے احوال سے آگاہ ہیں اور حق تعالیٰ نے ان کو جہان کا والی بنایا ہے اور جہان کا حل وعقد ان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور جہان کے معاملات کو ان کے ارادوں کے سات ملا دیا ہے۔ پس ہونا یہ چاہئے کہ ان کی رائے تمام آراء سے زیادہ صحیح ہو اور مخلوق خدا کیلئے تمام دلوں سے زیادہ ان کے دل ہی شفیق ہوں کیونکہ وہ بارگاہ خداوندی میں پہنچے ہوئے حضرات ہیں، جب کہ تلون مزاجی اور سُکر ابتدائی حالات میں ہوتا ہے اور جب بارگاہ الٰہی میں رسائی حاصل ہو جائے تو تلوین، تمکین کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ اس وقت وہ حقیقی ولی بنتا ہے اور اس کی کرامتیں صحیح ہوتی ہیں...... اور ارباب طریقت میں یہ بات معروف ہے کہ اوتار کو چاہئے کہ وہ ہر رات تمام عالم کے گرد ایک چکر لگائیں اور اگر کوئی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان کو اپنے وقت کے قطب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے تا کہ وہ اپنی توجہ اس طرف مبذول کرے اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے وہ خلل زائل فرما دیں۔

باقی وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ سونا اور مٹی کا ڈھیلا ان کے نزدیک یکساں ہے تو یہ سب کچھ سُکر اور مشاہدہ حق کی نا درستی کی علامت ہے اور اس میں کوئی شرف نہیں کیونکہ شرف ان مردان حق آگاہ کیلئے ہوتا ہے جو صحیح دیکھنے اور درست جاننے والے ہوں کہ سونا ان کو سونا دکھائی دے اور ڈھیلا ان کو ڈھیلا ہی نظر آئے تاہم ان کی آفات سے انہیں آگاہ ہونا چاہیے تا کہ وہ کہہ سکیں کہ:

یَا صَفُرَاءُ یا بیضاء غِرّیْ غَیْرِی لَاْلی	اے زرد سونے! اور اے سفید چاندی! میرے علاوہ کسی اور کو دھوکہ دو، تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔

اس لیے کہ میں نے تمہاری خرابیوں کو دیکھ رکھا ہے، پس جو شخص اس کی خرابیوں کو دیکھ لیتا ہے

وہاس کو محل حجاب سمجھتا ہے اور جب اس کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔ پھر جب کسی آدمی کو سونا بھی ڈھیلا ہی معلوم ہوتا ہے تو اس کا ڈھیلے کو چھوڑ دینا تو درست نہ ہوا۔تم نے دیکھا نہیں کہ جب حضرت حارثہؓ حالت سکر میں تھے تو انہوں نے کہا کہ سونا، پتھر، چاندی اور ڈھیلا سب میرے نزدیک برابر ہیں......اور حضرت ابوبکر صدیقؓ صاحب صحو تھے انہوں نے دنیا کا مال سنبھال رکھنے کی آفت دیکھ لی اور اس کو ترک کرنے کی روش اختیار کرنے کا ثواب بھی انہیں معلوم ہو گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اس سے کھینچ لیا حتی کہ پیغمبر ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ ''اے ابوبکرؓ! اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑ آئے ہو؟'' تو آپ نے عرض کی ''اللہ اور اس کے رسول کی محبت چھوڑ آیا ہوں''......حضرت ابوبکر وراق ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد بن علیؒ نے ایک دن مجھے فرمایا ''اے ابوبکر! آج میں تمہیں ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں میں نے عرض کی ''جو میرے شیخ کا حکم ہو۔ میں تعمیل کروں گا'' چنانچہ میں ان کے ساتھ چل پڑا ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ میں نے سخت دشوار جنگل دیکھا جس کے درمیان ایک سبز درخت کے نیچے ایک سنہری تخت بچھا ہوا تھا، پاس ہی پانی کا چشمہ جاری تھا اور تخت پر ایک آدمی بیٹھا تھا جس نے بڑا ہی عمدہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جب حضرت محمد بن علیؒ اس کے قریب پہنچے تو وہ اٹھا اور آپ کو تخت پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد تمام اطراف سے کچھ حضرات آنے شروع ہو گئے یہاں تک چالیس حضرات وہاں جمع ہو گئے۔اس بزرگ نے ایک اشارہ کیا تو اسی وقت آسمان سے کھانے کی چیزیں اترنے لگیں، ہم سب نے ان میں سے کھایا۔ پھر حضرت محمد بن علیؒ نے اس بزرگ سے ایک سوال کیا جس کے جواب میں اس نے بہت سی گفتگو کی۔ جس کا ایک جملہ بھی میں سمجھ نہ سکا۔ جب کچھ دیر گزری تو حضرت محمد بن علیؒ نے اجازت لی اور واپس لوٹ آئے اور مجھ سے کہا ''چلو تم سعادت مند ہو گئے ہو'' تھوڑی دیر میں ہم ترمذ واپس پہنچ گئے۔ تو میں نے آپ سے دریافت کیا ''شیخ! وہ کون سی جگہ تھی اور وہ بزرگ کون تھے؟ آپ نے جواب دیا ''وہ بنی

اسرائیل کا جنگل تھا اور وہ بزرگ قطب مدار علیہ تھے'' میں نے عرض کی ''شیخ! ہم ذرا سی دیر میں کس طرح ترمذ سے بنی اسرائیل کے جنگل میں پہنچ گئے؟'' تو آپ نے فرمایا ابوبکر! تمہیں وہاں پہنچنے سے غرض ہے نہ کہ پوچھنے سے اور اس کی کیفیت معلوم کرنے سے'' اور حال کے صحیح ہونے کی علامت ہے نہ کہ سُکر کی...... میں نے اس سلسلے کو مختصر کر دیا ہے کیونکہ اس کی تفصیل میں مشغول ہو جاؤں اور ان معاملات کی شرح بیان کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی اور میں اصل مقصد سے قاصر رہ جاؤں گا۔ پس کرامات اور حکایات میں سے بعض وہ دلائل جو اس کتاب سے متعلق ہیں اب میں ان کو بیان کرتا ہوں تاکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت شامل حال ہو تو ان کے پڑھنے سے مریدوں کو تنبیہ علماء کو راحت محققین کیلئے یاد دہانی اور عوام کیلئے یقین کی زیادتی اور شبہات کو رفع کرنے کا باعث ہو...... وباللہ التوفیق

کرامات اولیاء کا بیان

جان لو کہ جب صحت کرامات پر عقلی حجت ثابت ہو چکی اور اس کے ثبوت پر دلائل قائم ہو چکے تو اب نقلی دلائل بھی معلوم ہو جانے ضروری ہیں۔ چنانچہ صحیح آثار میں وارد ہے کہ کرامت کی صحت اور اہل ولایت کے ہاتھوں پر خلاف سنت افعال کے ظاہر ہونے پر کتاب وسنت ناطق ہیں اور ان تمام کا انکار نصوص قطعیہ کا انکار ہوگا ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں اپنی کتاب میں خبر دی ہے کہ:

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُم الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى — اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من وسلوی نازل کیا۔

بادل ان کے سروں پر سایہ کیے رکھتا تھا اور ہر رات تازہ من وسلویٰ ان کیلئے اترتا تھا...... اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا تو میں جواب دوں گا کہ یہ درست ہے اس لیے کہ اولیاء کی کرامات سب کی سب محمد ﷺ کا معجزہ ہی تو ہیں، اور اگر

کوئی کہے کہ وہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں تھا لیکن یہ حضور ﷺ کی غیبت میں ظاہر ہونے والی کرامت ہے یہ کس طرح آپ کا معجزہ ہوگی۔تو میں جواب میں کہوں گا کہ ''وہاں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے غائب ہوکر کوہ طور پر تشریف لے گئے تو یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا، پس غیبت مکانی اور غیبت زمانی میں کیا فرق ہے کہ جب ہاں غیبت مکانی کی صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ درست ہے تو یہاں حضور ﷺ کی غیبت زمانی کے باوجود آپ کا معجزہ درست ہوگا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں آصف بن برخیاء کی کرامت کی خبر دی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ ضرورت درپیش آئی کہ بلقیس کا تخت اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے یہاں موجود ہو اور حق تعالیٰ نے بھی آصف بن برخیاء کا شرف لوگوں کو دکھانے اور اس کی کرامات کو ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا اور اہل زمانہ کو دکھانا چاہا کہ اولیاء کی کرامات جائز ہیں تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا ''کون ہے جو بلقیس کے یہاں پہنچنے سے قبل اس کا تخت یہاں حاضر کردے؟''تو حق تعالیٰ ہمیں بتاتے ہیں کہ:

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ	جنات میں ایک دیو نے کہا میں اس کو آپکے پاس آپکے دربار سے اٹھنے سے پہلے لاسکتا ہوں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا ''میں تو اس سے بھی زیادہ جلدی چاہتا ہوں'' تو آصف نے عرض کی:

اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ	میں آپکے پاس اسکو آپکی پلک جھپکنے سے بھی قبل لے آؤں گا۔پس جب اسکو دیکھا تو انکے پاس رکھا تھا۔

آصف کی اس گفتگو سے حضرت سلیمانؑ نہ تو اس پر ناراض ہوئے، نہ انکار کیا اور نہ ہی اس کو محال قرار دیا، اور یہ کسی طرح بھی معجزہ نہ تھا کیونکہ آصف پیغمبر نہ تھے، لامحالہ اسے کرامت

ہی ہونا چاہئے کیونکہ اگر معجزہ ہوتا تو اس کا اظہار حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ہوتا، علاوہ ازیں حق تعالٰی نے ہمیں حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے بارے میں بھی خبر دی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب آپ کے حجرے میں آتے تو گرمی کے موسم میں سردیوں کے اور سردی کے موسم میں گرمیوں کے پھل آپ کے پاس موجود پاتے، یہاں تک کہ پوچھتے:

اَنّٰی لَکِ ھٰذَا قَالَتْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ	اے مریم، یہ پھل تمہارے پاس کہاں سے آئے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "یہ اللہ تعالٰی کے پاس سے آئے ہیں۔

حالانکہ بالاتفاق حضرت مریمؑ پیغمبر نہ تھیں...... نیز خداوند تعالٰی نے ہمیں بڑے واضح بیان کے ذریعہ ان کی حالت کی خبر دی ہے کہ:

وَھُزِّی اِلَیْکِ بِجِذْعِ النَّخْلَۃِ تُسَاقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا	اے مریم! تو کھجور کے اس تنے کو اپنی طرف ہلا، تجھ پر یہ تازہ کھجوریں گرائے گا۔

نیز اصحاب کہف کے احوال، کتے کا ان کے ساتھ گفتگو کرنا، ان کا سونا اور غار کے اندر ان کو دائیں بائیں کروٹ بدلوانا، جیسا کہ قرآن میں ہے:

وَنُقَلِّبُھُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَکَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ	اور ہم دائیں بائیں انکی کروٹ بدلتے رہتے ہیں اور انکا کتا بازو پھیلائے بیٹھا ہے۔

یہ تمام افعال عادت کے خلاف ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ معجزہ نہیں ہیں تو لامحالہ کرامت ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ یہ کرامتیں زمانہ تکلیف میں امور موہومہ کیلئے مانگی جانے والی دعاؤں کی قبولیت کا نتیجہ ہوں اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک ساعت میں بہت سے مسافت طے کرانا ہو، اور یہ بھی روایت ہے کہ نامعلوم جگہ سے طعام ظاہر کرنے کی صورت میں ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ لوگوں کے اندیشوں پر آگاہ ہو جانے کی صورت میں ہو...... صحیح احادیث میں پیغمبر ﷺ سے "حدیث نماز" مروی ہے کہ ایک دن صحابہ کرامؓ نے پیغمبر ﷺ سے عرض کی

کہ یارسول اللہ علیہ گذشتہ امتوں کا کوئی عجیب واقعہ ہمیں سنائیے! آپؐ نے بیان فرمایا ''تم سے پہلے ایک امت کے تین افراد کسی جگہ جا رہے تھے، جب رات ہوئی تو انہوں نے ایک غار میں ٹھہرنے کا ارادہ کیا اور اس کے اندر جا کر سو رہے جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تو پہاڑ سے ایک بڑا پتھر لڑھکا اور اس غار کا منہ بند ہو گیا وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے ''ہمیں اب اس سے کوئی رہائی نہیں دے سکتا ہاں یہ صورت ہے کہ اپنے اپنے کسی پر خلوص عمل کو خداوند تعالیٰ کے حضور بطور سفارش پیش کریں۔ چنانچہ ایک نے کہا ''میرے ماں باپ زندہ تھے اور میرے پاس چند بکریوں کے علاوہ دنیا کی کوئی دولت نہ تھی کہ انہی کا دودھ میں اپنے ماں باپ کو پلاتا تھا، اور میں روزانہ جنگل سے ایندھن کا ایک گٹھر لایا کرتا تھا۔ جس کی قیمت ان کی اور اپنی خوراک پر خرچ کرتا تھا۔ ایک رات میں ذرا دیر سے گھر آیا تو میرے بکریوں کا دودھ دوہنے اور ان کی غذا کو اس میں بھگونے سے پہلے ہی وہ سو گئے میں وہ پیالہ اپنے ہاتھ میں لیے اپنے پاؤں پر کھڑا رہا حتی کہ صبح ہو گئی تو وہ بیدار ہوئے اور جب وہ کھانا کھا چکے تو پھر میں بیٹھا...... وہ کہنے لگا ''بار خدایا اگر میں اس معاملے میں سچا ہوں تو ہمارے لیے کشادگی پیدا فرما اور ہماری فریاد رسی کر'' پیغمبر علیہ فرماتے ہیں کہ اسی وقت اس پتھر نے ایک جنبش لی اور ایک شگاف ظاہر ہو گیا...... دوسرے آدمی نے کہا ''میرے چچا کی ایک خوبصورت بیٹی تھی، میرا دل اس پر فریفتہ ہو گیا تھا، میں اس کو اپنی طرف دعوت دیتا تھا لیکن وہ مانتی نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ بڑے بہانوں سے ایک سو بیس دینار میں نے اس کی طرف بھیجے تاکہ ایک رات میرے ساتھ خلوت کرے، وہ راضی ہو گئی۔ لیکن جب وہ میرے پاس پہنچ گئی تو میرے دل میں حق تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو گیا اور میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا اور وہ دینار بھی اس کے پاس ہی رہنے دیئے۔ پس اس نے کہا ''بار خدایا! اگر میں نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے تو ہمیں رہائی نصیب فرما'' پیغمبر علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت اس پتھر میں ایک دفعہ پھر جنبش پیدا ہوئی اور وہ شگاف زیادہ ہو گیا لیکن ابھی تک وہ اس سے

باہر نہ نکل سکتے تھے۔ چنانچہ تیسرے آدمی نے بیان کیا ''میرے پاس مزدوروں کی ایک جماعت کام کرتی تھی، جب کام ختم ہوگیا تو تمام مزدوروں نے اپنی اجرت مجھ سے وصول کر لی لیکن ایک ان میں سے غائب تھا۔ میں نے اس کی مزدوری کے پیسوں سے ایک بکری خرید لی، دوسرے سال بکریاں دو ہوگئیں اور تیسرے سال وہ چار ہوگئیں اسی طرح ہر سال ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا حتی کہ چند سال گزرنے پر بہت سا مال جمع ہوگیا۔ وہ مزدور میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دفعہ میں نے آپ کے ہاں کام کیا تھا، مجھے اب اس اجرت کی ضرورت ہے وہ مجھے دے دیجئے! میں نے اسے کہا جاؤ! یہ تمام بکریاں تمہارا مال اور ملکیت ہیں انہیں لے جاؤ! وہ کہنے لگا آپ میرے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ میں نے کہا نہیں! میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں! میں نے دہ مال اس کو دے دیا اور وہ لے گیا اب اس نے کہا ''بار خدایا! اگر میں اس معاملے میں سچ کہہ رہا ہوں تو ہمارے لیے کشادگی بھیج''...... پیغمبر ﷺ نے فرمایا اب وہ پتھر غار کے دھانے سے دور ہٹ گیا یہاں تک کہ وہ تینوں باہر نکل آئے...... یہ فعل بھی ناقض عادت تھا...... اور پیغمبر ﷺ سے حدیث جریج مشہور ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ''بچپن میں گہوارے کے اندر تین افراد کے علاوہ کسی نے کلام نہیں کی...... ان میں سے ایک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کے متعلق تم سب جانتے ہو...... اور دوسرے بنی اسرائیل میں جریج نام کے ایک راہب تھے وہ خود بڑے صاحب مجاہدہ تھے اور ان کی والدہ بھی پردہ دار خاتون تھیں ایک دن وہ بیٹے کو دیکھنے آئیں، تو وہ نماز میں مشغول تھے اس لیے عبادت خانے کا دروازہ نہ کھولا۔ دوسرے پھر تیسرے دن بھی اسی طرح ہوا تو ماں نے تنگدل ہو کر کہا ''اے میرے رب! میرے بیٹے کو رسوا کر اور میرے حق کے بدلے اس کی گرفت کر! اس زمانے میں ایک فاحشہ عورت تھی اس نے ایک گروہ کے سامنے کہا کہ میں جریج کو گمراہ کر دوں گی۔ چنانچہ وہ ان کے عبادت خانے میں آئی لیکن جریج نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے واپسی پر راستے میں

ایک چرواہے کے ساتھ صحبت کی اور حاملہ ہو گئی۔ شہر میں آ کر اس نے لوگوں سے کہا کہ یہ حمل مجھے جریج سے قرار پایا ہے۔ چنانچہ جب اس عورت نے بچہ جنا تو لوگ جریج کے عبادت خانے کی طرف آئے اور انہیں پکڑ کر قصر بادشاہی کے دروازے پر لے آئے، جریج نے سب کے سامنے اس بچے کو کہا "اے لڑکے! تمہارا باپ کون ہے؟ اس بچے نے بول کر کہا اے جریج! میری ماں آپ پر جھوٹا بہتان لگا رہی ہے میرا باپ تو فلاں چرواہا ہے......

اور تیسرا بچہ وہ کہ اس کی ماں اسے گود میں لیے اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھی تھی کہ ایک بڑا ہی خوبصورت اور خوش لباس نوجوان گھوڑے پر سوار وہاں سے گزرا عورت نے دُعا کی! اے میرے رب تو میرے اس بچے کو اس سوار کی سی شان وشوکت عطا کرنا اس بچے نے کہا "اے اللہ! مجھے اس جیسا ہرگز نہ کرنا تھوڑی دیر گزری تو ایک بدنام عورت کا وہاں سے گزر ہوا۔ بچے کی ماں نے دُعا کی یا اللہ! میرے بچے کو اس عورت کی طرح نہ کر دینا" اس بچے نے کہا "یا رب! مجھے اس عورت کی طرح بنا دے" ماں بڑی حیران ہوئی اور کہنے لگی بیٹے تم اس طرح کیوں کہتے ہو؟" اس بچے نے جواب دیا "ماں وہ سوار آدمی ظالموں میں سے ایک ظالم تھا اور یہ ایک نیکوکار عورت تھی لیکن لوگ خواہ مخواہ اس کو برا کہتے ہیں اور اس کی نیکی سے ناواقف ہیں۔ میں ظالموں میں سے نہیں ہونا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ نیکوکار لوگوں میں سے ہو جاؤں...... اسی طرح حضرات زاہدہؓ سے متعلق ایک حدیث مشہور ہے جو امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کی باندی تھیں کہ وہ ایک دن پیغمبر علیہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ کو سلام عرض کیا۔ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا "اے زاہدہ تم ہمارے یہاں دیر۔ دیر سے کیوں آتی ہو؟ تیرا انتظار ہوتا ہے اور ہم تمہیں اچھا جانتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ علیہ ﷺ آج میں ایک عجیب خبر لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آپؐ نے پوچھا "وہ کیا خبر ہے؟" وہ کہنے لگیں "میں صبح ایندھن کی تلاش میں جنگل کی طرف گئی۔ جب ایک گٹھا باندھ کر میں نے ایک پتھر پر رکھ لیا تا کہ میں اسے اٹھالوں۔ تو اچانک میں نے دیکھا کہ آسمان

سے ایک سوار زمین پر آیا اور مجھے سلام کہہ کر کہنے لگا "محمد ﷺ کو میری جانب سے سلام عرض کرنا اور کہنا کہ جنت کے داروغہ رضوان نے کہا ہے کہ آپ کو خوشخبری ہو کہ آپ کی امت کیلئے بہشت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آپ کی امت کا ایک گروہ حساب و کتاب کے بغیر اس میں چلا جائے گا۔ دوسرے گروہ کیلئے حساب آسان کر دیں گے اور تیسرے گروہ کو آپ کی شفاعت کے طفیل بخش دیں گے" یہ کہہ کر وہ آسمان کی طرف روانہ ہو گیا اور زمین و آسمان کے درمیان پہنچ کر اس نے میری طرف توجہ کی تو مجھے اس حالت میں پایا کہ میں وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھانا چاہتی ہوں لیکن اٹھا نہیں سکتی" اس نے آواز دی "اے زاہدہ! اس گٹھے کو پتھر پر ہی چھوڑ دے" اور اس پتھر سے کہا "اے پتھر! اس گٹھے کو زاہدہ کے ہمراہ حضرت عمرؓ کے گھر کے دروازے تک لے جاؤ! چنانچہ وہ پتھر لکڑیوں کے اس گٹھے کو اٹھا کر میرے ساتھ حضرت عمرؓ کے گھر کے دروازے تک لایا ہے" یہ سن کر پیغمبر ﷺ اپنے صحابہؓ کے ہمراہ حضرت عمرؓ کے گھر کے دروازے پر تشریف لائے اور اس پتھر کے آنے اور جانے کے نشانات دیکھے تو فرمایا "اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ مجھے اس دنیا سے اٹھانے سے قبل ہی رضوان کے ذریعے مجھے میری امت کے بارے میں بشارت دی ہے اور میری امت کی ایک عورت کو حضرت مریم کے درجے تک پہنچا دیا ہے...... اور مشہور ہے کہ حضرت پیغمبر ﷺ نے حضرت علا بن الحضرمیؓ کو ایک غزوے پر بھیجا۔ راستے میں دریا کا پانی آپ کے سامنے آ گیا۔ آپ نے قدم پانی کے اوپر رکھا اور تمام لشکر اس طرح پار گزر گیا کہ کسی کا پاؤں تک پانی سے تر نہ ہوا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق آتا ہے کہ ایک راستے پر تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک گروہ کو دیکھا جو راستے کے درمیان رکا ہوا ہے کہ ایک شیر نے ان کی راہ روک رکھی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا "اے کتے! اگر تو حق تعالیٰ کے حکم سے یہاں بیٹھا ہے تو بیٹھا رہ لیکن اگر ایسا نہیں تو ہمیں راستہ دے تاکہ ہم گزر جائیں۔ شیر یہ سن کر اٹھا اور حضرت ابن عمر کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کر کے وہاں سے چلا گیا...... حضرت

ابراہیم نخعیؒ کے متعلق معروف ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جو ہوا میں بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا "بندہ خدا تم نے کس عمل سے یہ مقام حاصل کیا ہے؟" اس نے کہا "معمولی سی چیز سے یہ مرتبہ نصیب ہو گیا ہے" آپ نے پوچھا "وہ کیا چیز ہے؟" تو اس نے جواب دیا "میں نے اپنا منہ دنیا سے موڑ کر حق تعالیٰ کے فرمان کی طرف کر لیا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ "اب کیا چاہتے ہو؟" میں نے کہا میری خواہش ہے کہ ہوا کے اندر میرا ٹھکانہ بنا دیا جائے تا کہ میرا دل مخلوق سے الگ ہو جائے۔

یوں ہی جب وہ عجمی جوانمرد مدینہ منورہ میں آیا اور حضرت عمرؓ سے ملاقات کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اسے بتایا کہ امیر المومنین اس وقت جنگل میں کسی جگہ سو رہے ہوں گے۔ وہ گیا اور دیکھا کہ آپ اپنا دُرہ سر کے نیچے رکھ کر مٹی پر سو رہے ہیں۔ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ساری دنیا میں اسی کی وجہ سے تو فتنہ بپا ہے اس وقت اس کو قتل کرنا میرے لئے بڑا ہی آسان ہے، یہ سوچ کر جونہی اس نے تلوار کھینچی، دو شیر نمودار اور اس پر حملہ آور ہونے لگے، اس صورت حال کو دیکھ وہ چیخنے اور فریاد کرنے لگا اور حضرت عمرؓ بیدار ہو گئے۔ اس نے تمام واقعہ آپ کے سامنے بیان کیا اور پھر اسلام قبول کر لیا...... یوں ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس عراق کے علاقہ میں کچھ تحفے آئے جن میں ایک ایسی ڈبیہ بھی تھی جس میں ایسا زہر قاتل تھا کہ کسی بادشاہ کے خزانے میں اتنا خطرناک زہر موجود نہ تھا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس ڈبیہ کو کھول کر اس زہر کو اپنی ہتھیلی پر رکھا اور بسم اللہ پڑھ کر اپنے منہ میں ڈال لیا لیکن آپ کو کوئی نقصان نہ ہوا لوگ بڑے حیران ہوئے اور ان میں سے بہت سے افراد یہ دیکھ کر ایمان لے آئے۔

حضرت حسن بصریؒ بیان فرماتے ہیں کہ عبادان کے علاقہ میں ایک سیاح تھا جو ویرانے میں رہتا تھا۔ ایک روز میں نے بازار سے کوئی چیز خریدی اور اس کے پاس لے گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "یہ کیا ہے" میں نے کہا یہ کھانا ہے اور میں اس لئے لے کر آیا ہوں کہ

شاید تمہیں اس کی ضرورت ہو! اس نے اپنے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس دیا۔ میں نے اس ویرانے کی دیواروں کے پتھروں اور ڈھیلوں کو دیکھا کہ وہ سب سونا ہو گئے تھے...... میں اپنے کیے پر بڑا پشیمان ہوا اور جو کچھ لے کر گیا تھا وہیں چھوڑ کر فوراً واپس آ گیا...... حضرت ابراہیم بن ادہمؒ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرا اور اس سے پانی طلب کیا وہ کہنے لگا ''میرے پاس دودھ بھی ہے اور پانی بھی۔ تم کیا پینا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں پانی پینا چاہتا ہوں وہ اٹھا اور اپنا عصا ایک پتھر پر مارا۔ تو اس میں سے بڑا عمدہ اور شفاف پانی بہہ نکلا۔ میں اس پر بڑا متعجب ہوا تو وہ مجھ سے کہنے لگا حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب کوئی بندہ حق تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے تو سارا جہان اس کا فرمانبردار بن جاتا ہے۔

حضرت ابودرداؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ ایک دفعہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے کہ ان کا برتن تسبیح پڑھ رہا تھا جو انہیں سنائی دے رہی تھی۔

اور حضرت ابوسعید خرازؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ ایک عرصہ تک میرا معمول یہ رہا کہ میں ہر تین دن کے بعد ایک دفعہ کھانا کھایا کرتا تھا میں ایک دفعہ جنگل میں جا رہا تھا کہ تین دن کے بعد اور تین دن گزر گئے۔ لیکن مجھے کھانا نہ ملا اور میرے جسم میں ضعف پیدا ہو گیا۔ طبیعت عادت کے مطابق کھانے کا تقاضہ کر رہی تھی کہ میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اتنے میں ہاتف نے آواز دی کہ ''اے ابوسعید نفس کی تسکین کیلئے کچھ کھانا چاہتے ہو یا بغیر طعام کے ہی سستی اور ضعف کو ختم کرنے کیلئے کوئی اور ذریعہ چاہتے ہو؟'' میں نے کہا ''الٰہی میں اپنے اندر چلنے کی قوت چاہتا ہوں (خواہ کسی طرح بھی ہو جائے) بس فوراً ہی میرے اندر قوت پیدا ہو گئی میں اٹھ کھڑا ہوا اور مزید بارہ منزل بغیر کچھ کھائے پیئے طے کر لیں...... اور مشہور ہے کہ تستر میں حضرت سہل ابن عبداللہ تستریؒ کے گھر کو لوگ آج کل درندوں گھر کہتے ہیں اور تستر رہنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ بہت سے

''درندے اور شیر آپ کے گھر میں آیا کرتے تھے اور آپ ان کو کھانا کھلاتے اور ان سے پیار کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوالقاسم مرزدیؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوسعید خرازؒ کے ہمراہ کہیں جا رہا تھا کہ دریا کے کنارے ایک نوجوان نظر آیا جو گدڑی پہنے ہوئے تھا اور ایک توشہ دان اس نے اپنے کندھے کے ساتھ لٹکا رکھا تھا۔ حضرت ابوسعید کہنے لگے، اس جوان کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاملہ میں کوئی چیز ضرور ہے کہ جب میں اس کے اندر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارگاہ خداوندی تک پہنچا ہوا ہے لیکن جب اس کے توشہ دان کو دیکھتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ ابھی طالب راہ ہے! آؤ اس سے پوچھیں تو سہی کہ وہ کیا چیز ہے! چنانچہ حضرت ابوسعید نے پوچھا ''اے جوان خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے؟''...... اس نے جواب دیا خدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں ایک عوام کا راستہ اور دوسرا خواص کا راستہ۔ خواص کے راستے کے بارے میں تو تمہیں کچھ پتہ نہیں، تاہم عوام کا راستہ وہی ہے جس پر تو چل رہا ہے! اور اپنے معاملہ کو وصول حق کی علت سمجھے بیٹھا ہے اور توشہ دان کو حجاب کا سبب سمجھتا ہے...... حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مصر سے جدہ پہنچنے کیلئے مسافروں کی ایک جماعت کے ہمراہ ایک کشتی میں سوار ہوا۔ کشتی میں ہمارے ساتھ ایک گدڑی پوش نوجوان بھی شریک سفر تھا۔ میرے دل میں اس کے ساتھ دوستی کرنے کی خواہش تو تھی لیکن اس کا رعب مجھے اس کے ساتھ بات چیت کرنے سے روکے ہوئے تھا۔ کیونکہ وہ اپنے معمولات میں بڑا سخت تھا اور کوئی وقت بھی عبادت سے خالی نہ رہنے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک سوداگر کا قیمتی موتی گم ہو گیا اور موتی کے مالک نے اسی جوان پر چوری کا الزام لگا دیا۔ کشتی والوں نے اس جوان پر تشدد کرنے کا ارادہ بھی کر لیا لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ محض شبہے کی بنا پر اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنا اچھا نہیں۔ مجھے اس سے اچھی طرح پوچھ لینے دو! چنانچہ میں اس کو ایک طرف لے گیا اور بڑی نرمی سے اسے بتایا

کہ ان لوگوں نے اس طرح تجھے چور گردانا ہوا ہے لیکن میں ابھی تک ان کو سختی اور تشدد سے روکے ہوئے ہوں۔ اب تم بتاؤ کیا کرنا چاہئے میری یہ گفتگو سن کر اس نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور کچھ کہا میں نے دیکھا کہ اچانک بہت سی مچھلیاں پانی کی سطح پر نمودار ہوئیں کہ ان میں سے ہر ایک کے منہ میں ایک قیمتی موتی موجود تھا۔ اس جوان نے ان میں سے ایک موتی لیا اور اس سوداگر کو دے دیا۔ جب کشتی والوں نے دیکھا تو وہ نوجوان کشتی سے اترا اور پانی کی سطح پر پاؤں رکھ روانہ ہو گیا...... پس جس نے واقعی وہ موتی چرایا تھا وہ کشتی والوں میں سے ہی تھا اس نے وہ موتی اٹھا کر مالک کے سامنے پھینک دیا اور پھر تمام کشتی والے بڑے ہی شرمسار ہوئے...... حضرت ابراہیم رقی ؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا ''میں نے اپنے ابتدائی حالات میں حضرت مسلم مغربی ؒ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب میں ان کی مسجد میں داخل ہوا وہ نماز کی امامت کرا رہے تھے لیکن ''الحمد للہ'' غلط پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا ''میری محنت ضائع ہو گئی، تاہم اس رات میں وہیں ٹھہر گیا۔ صبح میں طہارت کیلئے فرات کے کنارے کی طرف چل پڑا، ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک شیر میرے راستے میں سویا پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر میں واپس مڑا تو ایک اور شیر میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میں عاجز و لاچار ہو کر شور مچانے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت مسلم، عبادت کے حجرہ سے باہر تشریف لے آئے۔ جب شیروں نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو ان کی تعظیم کی۔ حضرت مسلم نے ان میں سے ہر ایک کے کانوں کو پکڑا اور انہیں مروڑا اور فرمایا ''اے خدا کے کتو! میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ ہمارے مہمانوں کو چھیڑا نہ کرو! پھر مجھے مخاطب ہوئے اور کہا ''اے ابو اسحاق! تم مخلوق کی خاطر ظاہر کو درست کرنے میں مشغول ہو گئے ہو یہاں تک کہ مخلوق سے ڈرنے لگے ہو اور ہم حق تعالیٰ کیلئے اپنے باطن کو درست کرنے میں اس حد تک مشغول ہو گئے ہیں کہ تمام مخلوق ہم سے ڈرنے لگی ہے۔

میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دن بیت الجن سے دمشق جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں بھی ہمراہ تھا کہ بارش برسنا شروع ہوگئی۔ میں کیچڑ میں بڑی ہی مشکل کے ساتھ چل رہا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ شیخ کی جوتیاں اور کپڑے بالکل خشک ہیں۔ میں نے حیران ہوکر اس کی وجہ پوچھی تو شیخ نے فرمایا ''ہاں! جب سے میں نے توکل کی راہ سے تمام توہمات کو اٹھا دیا اور اپنے دل کو حرص کی وحشت سے محفوظ کرلیا ہے اس وقت سے خداوند عزوجل نے مجھے کیچڑ سے بچالیا ہے۔

میں جو علی بن عثمان ہوں ایک دفعہ مجھے ایک ایسا واقعہ درپیش آیا کہ اس کو حل کرنا میرے لیے دشوار ہوگیا۔ میں نے طوس میں جا کر حضرت شیخ ابوالقاسم گرگانی کی زیارت کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر میں انہیں کے گھر کے پاس والی مسجد میں پایا کہ آپ اکیلے وہی میرا واقعہ ایک ستون سے بیان فرمارہے ہیں۔ میں نے کہا ''اے شیخ آپ یہ کس سے بیان کررہے تھے؟'' تو آپ نے فرمایا ''بیٹے! حق تعالیٰ نے اس ستون کو ابھی میرے سامنے بولنے کی طاقت دی تھی اور اس نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔

فرغانہ کے قرب وجوار میں ایک گاؤں ہے جسے سلاتک کہتے ہیں، وہاں زمین کے اوتاد حضرات میں سے ایک بزرگ رہتے تھے جنہیں ''باب عمر'' کہا جاتا تھا۔ اس علاقے کے تمام درویش بزرگ مشائخ کو ''باب'' ہی کہتے ہیں۔ ان کے پاس ایک فاطمہ نام کی بڑھیا بھی رہتی تھی۔ میں ان کی زیارت کے ارادہ سے روانہ ہوا اور جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے پوچھا ''تم کس لیے آئے ہو؟'' میں نے عرض کی ''میں اس لیے حاضر ہوا ہوں تاکہ میں شیخ کی زیارت کرسکوں اور شیخ مجھ پر شفقت کی نظر کریں'' آپ نے فرمایا ''اے بیٹے! میں تو فلاں دن سے مسلسل تم پر نظر کئے ہوئے ہوں اور جب تک مجھے تم سے غائب نہ کردیا جائے میں برابر تمہیں دیکھتا رہوں گا...... حضرت ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے دنوں اور سالوں کو شمار کیا تو یہ وہی دن تھا جب میری توبہ کی ابتدا ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے فرمایا ''اے بیٹے! مسافتیں طے کرنا تو بچوں کا کام ہے لہٰذا اس زیارت کے بعد ہمت

کرو کہ تمہیں حضور قلب نصیب ہو جائے کیونکہ کوئی چیز اس سے بڑی نہیں...... پھر اس بڑھیا فاطمہ سے فرمایا "اے فاطمہ! جو کچھ تمہارے پاس ہے لے آؤ تاکہ یہ درویش کھا لے، وہ تازہ انگوروں کا ایک طباق لے کر آئیں۔ حالانکہ انگوروں کا وہ موسم نہ تھا اور ان پر چند تازہ کھجوریں رکھی تھیں حالانکہ فرغانہ میں تازہ کھجوروں کا ملنا ناممکن تھا۔

مہنہ نامی گاؤں میں ایک دفعہ حضرت شیخ ابو سعیدؒ کی قبر کے سرہانے اپنی عادت کے مطابق تنہا بیٹھا تھا کہ میں نے ایک سفید کبوتر کو دیکھا کہ وہ آیا اور اس کپڑے میں چھپ گیا جو قبر پر پڑا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید یہ کسی کے ہاتھ سے چھوٹ کر آیا ہوگا کہ یہاں چھپ گیا ہے۔ لیکن مین نے اٹھ کر غلاف کے نیچے دیکھا تو کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ دوسرے اور پھر تیسرے روز بھی اسی طرح مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور حیران ہو کر اس کی حقیقت سے میں عاجز آ گیا۔ حتیٰ کہ ایک رات میں نے حضرت شیخ ابو سعیدؒ کو خواب میں دیکھا تو وہ واقعہ ان سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا "وہ کبوتر میرے معاملہ کی صفائی ہے جو ہر روز قبر میں میرے ساتھ مصاحبت کرتا ہے۔

حضرت ابو بکر وراقؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت محمد بن علی حکیم ترمذیؒ نے اپنی تصانیف کے کچھ اوراق مجھے دیئے اور فرمایا کہ انہیں دریائے جیحون میں پھینک آؤ! میں نے جب باہر نکل کر انہیں دیکھا تو وہ لطائف و معارف سے پر تھے، میرے دل نے دریا میں پھینک آنے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ میں نے اپنے گھر میں انہیں رکھ دیا اور واپس آ کر کہہ دیا کہ میں دریا میں ڈال آیا ہوں، انہوں نے پوچھا تو پھر تم نے کیا دیکھا؟ میں نے کہا میں نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا "اس کا مطلب ہے کہ تم پھینک کر نہیں آئے۔ میں نے سوچا کہ مشکلیں دو ہو گئیں۔ ایک یہ کہ حضرت پانی میں ڈال آنے کا حکم کیوں دے رہے ہیں اور دوسری یہ کہ وہ کون سی برھان ہے جو ان کو دریا میں ڈالنے سے ظاہر ہوگی۔ بہر حال میں نے واپس آ کر ان اوراق کو اٹھایا اور درد دل کے ساتھ جیحون کے

کنارے کھڑے ہو کر ان اجزاء کو دریا میں ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ پانی دو حصوں میں بٹ گیا اور اس میں سے ایک صندوق نمودار ہوا جس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ یہ اوراق اس صندوق کے اندر جا پڑے تو اس کا ڈھکنا برابر ہو گیا اور پانی اپنی پہلی حالت پر جاری ہو گیا۔ میں نے واپس آ کر تمام صورت حال بیان کی تو حضرت نے فرمایا "ہاں اب تم واقعی ڈال کر آئے ہو" میں نے کہا "اے شیخ آپ کو خداوند عزوجل کی عزت کی قسم! مجھے یہ راز ضرور بتایئے آپ نے فرمایا" جان لو کہ میں نے اہل تصوف کے علوم پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کی تحقیق اور سمجھنا تمام عقلوں کیلئے مشکل تھا اس لیے میرے بھائی حضرت خضر علیہ السلام نے وہ مجھ سے مانگ لی تھی۔ چنانچہ اس صندوق کو مچھلیاں اٹھا کر لائی تھیں اور خداوند تعالیٰ نے پانی کو حکم دیا تھا کہ وہ اس کو حضرت خضر علیہ السلام تک پہنچا دے۔

اس طرح کی بہت سی حکایات بھی میں بیان کر دوں تو بھی وہ ختم نہ ہوں لیکن اس کتاب سے میرا ارادہ فروع اور معاملات میں طریقت کے اصولوں کو ثابت کرنے کا ہے۔ نقل کرنے والوں نے خود بہت سی کتابوں میں ان حکایات کو جمع کر دیا ہے اور واعظ لوگ برسر منبر اس کو نشر بھی کرتے رہتے ہیں...... اس لئے اب اس کتاب میں مضمون کی پیروی کرتے ہوئے وہ فصلیں لاتا ہوں جو اس علم طریقت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں تا کہ اس راز کو حاصل کرنے کیلئے کسی اور جگہ جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ انشاء اللہ عزوجل۔

انبیاء کی اولیاء پر فضیلت کا بیان

جان لو کہ جملہ احوال و اوقات میں تمام مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ اولیاء کرام انبیاء علیہم السلام کے تابع اور ان کی دعوت کے تصدیق کنندہ ہیں اور انبیاء علیہم السلام اولیاء سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ ولایت کی انتہا، نبوت کی ابتدا ہوتی ہے، تمام انبیاء علیہم السلام ولی بھی ہوتے ہیں لیکن اولیاء میں سے کوئی نبی نہیں ہوتا۔ انبیاء صفات بشریت

کی نفی میں ہمیشہ متمکن رہتے ہیں لیکن اولیاء کو اس میں عارضی عمل، دخل حاصل ہوتا ہے کہ اس گروہ پر نفی صفات بشریت کی حالت طاری ہوتی ہے، جب کہ گروہ انبیاء کیلئے ایک مخصوص مقام ہے اور جو مرتبہ اولیاء کو حاصل ہوتا ہے انبیاء کیلئے تو وہ حجاب ہوتا ہے۔ علمائے اہل سنت اور محققین طریقت میں سے کسی نے اس معاملے میں کبھی اختلاف نہیں کیا..... سوائے حشوی گروہ کے جو اہل خراسان میں سے خدا تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں اور اصول توحید میں متناقض کلام کرتے ہیں کیونکہ وہ اس طریقت کی اصل کو ہی نہیں پہچانتے لیکن پھر بھی اپنے آپ کو ولی کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ ولی ہوں گے لیکن شیطان کے ولی..... وہ کہتے ہیں کہ اولیاء کرام کو انبیاء پر فضیلت حاصل ہے، ان کیلئے یہ گمراہی کافی ہے کہ وہ ایک جاہل کو محمد ﷺ سے افضل جانتے ہیں..... اسی طرح ایک دوسرا گروہ مشبہین میں سے بھی ہے جو اس طریقت کے ساتھ اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسری شے میں حلول کر سکتے ہیں اوپر سے نیچے نازل ہوتے ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں اور حق تعالیٰ کا مختلف حصوں میں تقسیم ہو جانا بھی جائز ہے اور ان باتوں کی تفصیل انشاء اللہ میں ان دونوں بُرے مذاہب کے بیان میں پیش کروں گا خلاصہ کلام یہ کہ دونوں گروہ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود انبیاء کی فضیلت کی نفی میں برہمنوں کے ساتھ متفق ہیں، اور جو کوئی انبیاء کی تخصیص وفضیلت کا انکار کرے وہ کافر ہوتا ہے..... پس انبیاء علیہم السلام داعی اور امام ہیں اور اولیاء کرام تمام نیک کام کرنے میں ان کے فرمانبردار ہیں اور مقتدی کا امام سے افضل ہونا محال ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ جان لو کہ اگر تمام اولیاء کے جملہ احوال وانفاس اور رتبوں کو ایک سچے نبی کے ایک قدم کے مقابلے میں بھی لایا جائے تو وہ تمام احوال وانفاس ہیچ اور کمتر ہوں گے کیونکہ اولیاء حق تعالیٰ کے طالب اور اس کی رضا کے مرتبے کی طرف چلنے والے ہوتے ہیں لیکن انبیاء کرام حق تعالیٰ تک پہنچے ہوئے اور منزل مقصود کو حاصل کیے ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کیلئے دعوت الی

اللہ کا حکم لے کر آتے اور اس دعوت کے ذریعہ ایک قوم کو حق تعالیٰ کی طرف لے جاتے ہیں۔

اگر ان مذکورہ بے دین گروہوں میں سے (اللہ ان پر لعنت کرے) کوئی شخص یہ اشکال کرے کہ عادت اور طریق کار تو اس طرح ہے کہ جب کسی بادشاہ کی طرف سے کوئی قاصد آتا ہے تو جس کی طرف اس کو بھیجا جا رہا ہے وہ اس قاصد سے افضل ہوتا ہے۔ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام، جبرئیل علیہ السلام سے افضل ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام کو قاصد بنا کر انبیاء کی طرف بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ان کا یہ اشکال بالکل غلط ہے کیونکہ میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی فرشتہ پیغام لے کر کسی ایک فرد واحد کی طرف آئے تو اس فرد واحد ''مرسل الیہ'' کو اس فرشتے سے افضل ہی ہونا چاہئے جیسا کہ جبرئیل علیہ السلام کو انبیاء میں سے ایک ایک کے پاس بھیجا گیا اور ان میں سے ہر ایک حضرت جبرئیل علیہ السلام سے افضل تھا لیکن جب کوئی رسول اور پیغامبر کسی جماعت یا پوری قوم کی طرف بھیجا جائے تو لامحالہ وہ رسول اس جماعت سے افضل ہوگا۔ جیسا کہ پیغمبروں کا امتوں کے مقابلے میں معاملہ ہے اور اس بارے میں کسی بھی عقلمند کو کوئی اشکال واقع نہیں ہوتا...... پس انبیاء کرام کا ایک فرد تمام اولیاء سے افضل ہوگا۔ کیونکہ اولیاء جب عادت اور عرف کے مطابق انتہائی مقام تک پہنچ جاتے ہیں تو مشاہدے کی خبر دیتے ہیں اور بشریت کے حجاب سے خلاصی پا جاتے ہیں باوجودیکہ وہ عین بشر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن رسول کا تو پہلا قدم ہی مشاہدہ حق میں ہوتا ہے۔ جب رسول کی ابتدا ہی ولی کی انتہا ہے تو ولی کو نبی پر قیاس کرنا درست نہیں ہوسکتا...... کیا تم نہیں دیکھتے کہ اولیاء میں سے تمام طالبان حق اس بات پر متفق ہیں کہ تمام کثرتوں کا ایک وحدت میں گم ہو جانا ولایت کا کمال ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب بندہ دوستی کے غلبہ میں اس درجے تک پہنچ جائے کہ اس کی عقل اپنے افعال کو دیکھنے میں مغلوب ہو جائے اور محبت الٰہی کے جذبہ میں تمام جہان کے فاعل کو ہو بہو وہی جاننے لگے۔ جیسا کہ حضرت ابوعلی رودباریؒ کہتے ہیں کہ:

لَوْزَالَتُ عنّا رئویته مَاعَبَدْنَاه' اگر ہم سے اس کا دیدار زائل ہو جائے تو ہم اس کی عبادت ہی نہ کر سکیں۔

یعنی ہم سے عبودیت کا نام ہی ساقط ہو جائے کیونکہ ہم اس کے دیدار کے بغیر عبادت کا شرف حاصل نہیں کر پاتے۔ لیکن انبیاء کرام کیلئے یہ صورت ابتدائی حالات میں ہی موجود ہوتی ہے کیونکہ ان کے معاملہ میں تفرقہ کوئی صورت اختیار نہیں کر سکتا کہ وہ نفی و اثبات، سلوک وعدم سلوک، توجہ و اعراض اور ابتدا و انتہا ہر معاملے میں عین جمع کے مقام پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ابتدائے حال سورج کو دیکھا تو فرمایا:

ھٰذَا رَبِّی یہ میرا رب ہے۔

اور چاند اور ستارے کو دیکھا تو بھی فرمایا ھٰذَا رَبِّی اس لیے کہ وہ اپنے دل پر محبت الٰہی کے غلبہ اور تمام احوال کے عین مقام جمع میں ثابت ہونے کی وجہ سے کسی غیر کو نہ دیکھتے تھے اور اگر دیکھا تو اسی مقام جمع کی آنکھ سے دیکھا اور عین دیدار میں اپنے دیدار سے بیزاری کا اظہار کر دیا اور فرمایا:

لَآاُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ میں ڈوب جانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

گویا آپ کے حال کی ابتداء بھی جمع اور انتہا بھی جمع کیونکہ ولایت کی ایک ابتداء ہوتی ہے اور ایک انتہاء لیکن نبوت کیلئے ابتداء و انتہا نہیں ہوتی کہ وہ نبی جب سے ہوتا ہے نبی ہوتا ہے اور جب تک رہتا ہے نبی ہی رہتا ہے اور دنیا میں موجود ہونے سے پہلے بھی وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادے میں نبی ہوتا ہے۔

حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ انبیاء کے حال سے متعلق کیا کہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا ''انبیاء کے معاملے میں ہمارے علم کا کوئی دخل نہیں کہ ہم جس قدر بھی ان کے بارے میں تصور کرتے ہیں وہ آخر ہماری طرف سے ہی تو ہوگا لیکن حق تعالیٰ نے انبیاء کرام کو نفی و اثبات کے اس درجے میں رکھا ہوا ہے کہ مخلوق کی نگاہ وہاں تک پہنچ ہی

نہیں سکتی۔ پس جس طرح اولیاء کا مرتبہ و مقام مخلوق کے ادراک سے بالاتر ہے اسی طرح انبیاء کا مرتبہ اولیاء کے ادراک سے بہت بلند ہے...... اور حضرت بایزیدؒ جو کہ زمانہ کی حجت ہوئے ہیں فرماتے ہیں کہ:

اول مَــا سِــرُتُ اِلَـى الـوحــدانية فـصــرت لـحيـرا جـسـمــهُ من الاحـدية وجـنـاحُه من الديمومية فـلـم ازل الـحيـر في هواء الهوية حتـى الى هواء التنزية ثم اشرفت عـلــى ميـدان الازلية ورايتُــه شـجـر الاحـدية فنظرتُ فعلمتهُ ان هذا كُلّه' غيره

یعنی پہلے جب میں نے وحدانیت کی طرف سیر کی تو میں نے دیکھا کہ میرے باطن کو آسمان پر لے گئے ہیں اور اس نے کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی۔ اسے دوزخ و بہشت دکھائی لیکن اس نے ان کی طرف التفات نہ کیا اور مجھے کائنات اور پردوں کے اوپر لے گئے تو پھر میں ایک پرندہ بن گیا جس کا جسم احدیت سے اور بال و پر دوام سے بنے ہوئے تھے پس وہ مسلسل اڑتا ہوا تزیہہ کی ہوا کے دوش پر میدان ازلیت پر مشرف ہو گیا۔ اس میدان میں میں نے احدیت کے درخت کو دیکھا جب اس میں غور کیا تو وہ سب کچھ میں خود ہی تھا۔

میں نے کہا "بارخدایا! مجھے اپنی خودی سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا اور اپنی خودی کے ہوتے ہوئے مجھے تجھ تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تو حکم آیا کہ اے بایزیدؒ! تیرا اپنی خودی سے خلاصی پانا ہمارے دوست حضرت محمد ﷺ کی پیروی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اپنی آنکھوں کو ان کے قدموں کی خاک کے سرمہ سے روشن کر اور ان کی پیروی پر مداومت کر" "تو تو اپنی خودی سے نجات پا لے گا" ...... یہ حکایت بڑی طویل ہے اور اہل طریقت اس کو حضرت بایزیدؒ کی معراج قرار دیتے ہیں۔ اور معراج حق تعالیٰ کے قرب سے

عبارت ہے۔ پس انبیاء کی معراج تو جسم اور بدن کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے لیکن اولیاء کی معراج ارادے اور باطن کے ساتھ ہوتی ہے اور پیغمبروں کا جسم، پاکیزگی صفائی اور قرب کے اعتبار سے اولیاء کے دل اور باطن کی طرح ہوتا ہے اور یہ فضیلت بڑی واضح ہے اور یہ اس طرح ہے کہ ولی کو اپنے حال میں مغلوب کرتے ہیں تاکہ وہ مست ہو جائے پھر اس کے باطن کو اس سے غائب کر دیتے ہیں اور اس کو قرب الٰہی کیلئے آراستہ کر دیتے ہیں اور جب وہ صحو کی حالت میں واپس آ جاتا ہے تو وہ تمام دلائل اس کے دل پر نقش ہو چکے ہوتے ہیں اور اس کا علم ولی کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے۔ پس یہ ان کے درمیان بڑا فرق ہے کہ نبی کے تو جسم کو قرب الٰہی میں لے جایا جاتا ہے لیکن ولی کے صرف فکر کو وہاں تک پہنچایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

انبیاء اور اولیاء کی فرشتوں پر فضیلت

جان لو کہ اہل سنت و جماعت اور جمہور مشائخ طریقت اس بات پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء کرام اور وہ اولیاء جو گناہوں سے محفوظ ہیں، فرشتوں سے افضل ہیں۔ بخلاف معتزلہ کے کہ وہ فرشتوں کو انبیاء سے افضل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتے مرتبے کے اعتبار سے بلند تر، پیدائش کے اعتبار سے زیادہ لطیف اور حق تعالیٰ کے سب سے زیادہ فرمانبردار ہیں ہم کہتے ہیں کہ حقیقت تمہارے خیال کے خلاف ہے کیونکہ فرمانبردار جسم، رتبہ بلند اور خلعت لطیف افضیلت کی علت نہیں ہو سکتے کہ فضیلت اس کو حاصل ہوتی ہے جس کو حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہو کیونکہ یہ سب امور جو معتزلہ بیان کرتے ہیں وہ ابلیس کو بھی حاصل تھے لیکن سب کا اتفاق ہے کہ وہ ملعون اور رسوا ہو گیا۔ پس فضیلت اس کیلئے ہوتی جس پر حق تعالیٰ اپنا فضل فرمائیں اور دوسری مخلوق پر اس کو بزرگی عطا فرمائیں اور انبیاء کرام کی فضیلت کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور یہ بات ثابت

ہے کہ جس کو سجدہ کیا جائے اس کا مرتبہ سجدہ کرنے والے سے زیادہ بلند ہوتا ہے...... اور اگر وہ اعتراض کریں کہ خانہ کعبہ پتھر اور جماد ہے اور مومن اس سے افضل ہے پھر بھی وہ اس کو سجدہ کرتا ہے تو اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ملائکہ حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہوتے ہوئے بھی ان کو سجدہ کریں...... تو میں جواب دوں گا کہ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ مومن، خانہ کعبہ یا محراب یا دیوار کو سجدہ کرتے ہیں بلکہ تمام حضرات یہی کہتے ہیں کہ مومن حق تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں کلام الٰہی کی موافقت میں سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے ذکر کیا کہ:

اُسْجُدُوْ الِاٰدَمَ — ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔

لیکن جب حق تعالیٰ نے مومنوں کے سجدے کا ذکر کیا تو فرمایا:

وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْ ارَبَّكُمْ وَافْعَلُو الْخَيْرَ — اپنے رب کو سجدہ کرو، اسی کی عبادت کرو اور نیک کام کرو۔

پس خانہ کعبہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح نہیں ہوسکتا۔ نیز یہ کہ کوئی مسافر اپنی سواری پر بیٹھے ہوئے خدا تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہے تو اگرچہ اس کا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہ ہو وہ عبادت کرسکتا ہے اور اسی طرح جس آدمی پر خانہ کعبہ کی سمت گم ہو جائے کہ جنگل یا بیابان کے اندر اس پر قبلہ کے دلائل واضح نہ ہوسکیں تو وہ جس سمت بھی منہ کر کے نماز پڑھ لے درست ہوگا اور وہ فرمان خداوندی کو پورا کرنے والا ہو جائے گا لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے میں فرشتوں کیلئے کوئی عذر نہ تھا۔ وہ ایک جس نے خود عذر پیدا کیا وہ ملعون اور رسوا ہو گیا صاحب بصیرت کیلئے یہ دلائل بڑے واضح ہیں۔ نیز یہ بھی جان لو کہ ملائکہ اگر معرفت حق میں برابر ہو بھی جائیں تو بھی وہ مرتبے اور مقام میں انبیاء کے برابر کیسے ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی خلقت اور پیدائش میں شہوت نہیں، اسی طرح نہ ان کے دل

میں حرص اور فساد ہے اور نہ ہی ان کی طبیعت میں حیلہ اور بہانہ..... حق تعالیٰ کی اطاعت ان کی غذا ہے اور حق تعالیٰ کے فرمان پر قائم رہنا ان کا طریقہ..... لیکن آدمی کی سرشت میں شہوت ملی ہوئی ہے۔ اس کے وجود میں ارتکاب معاصی کا احتمال موجود ہے، اس کے دل میں دنیا کی زینت اثر انداز ہے، لالچ اور حیلہ سازی اس کی طبیعت میں منتشر ہے اور پھر یہ کہ شیطان کو اس کے جسم میں اس قدر غلبہ حاصل ہے کہ وہ اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اور مزید برآں تمام گناہوں کو دعوت دینے والا نفس اس کے ساتھ ملا ہوا ہے..... پس جس کسی کے وجود میں یہ تمام وصف موجود ہوں وہ اگر غلبہ شہوت کے امکان کے باوجود فسق و فجور سے پرہیز کرے اور حرص کی موجودگی کے باوجود دنیا سے اعراض کرے اور دل میں شیطانی وسوسوں کے باوجود گناہوں سے اجتناب کرے اور نفسانی فساوات سے روگرداں ہو کر عبادت پر اقامت کرنے اور اطاعت پر ہمیشگی کرنے اور نفس پر مجاہدہ کرنے اور شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنے میں مشغول ہو جائے تو درحقیقت یہ شخص اس فرشتے سے افضل ہوگا جس کی صفت میں شہوت کی معرکہ آرائی نہ ہو اور جس کی طبیعت میں غذا اور لذتوں کا ارادہ نہ ہو۔ نہ اسے بیوی بچوں کا غم ہو اور نہ خویش و اقارب کی فکر، نہ اسے اسباب و آلات کی احتیاج ہو اور نہ ہی وہ امیدوں اور آرزوں میں مستغرق ہو۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے میں اس آدمی پر بڑا حیران ہوتا ہوں جو اعمال میں فضیلت دیکھتا ہے یا عزت، حسن و جمال میں دیکھتا ہے، یا بزرگی جذب و منال میں دیکھتا ہے۔ ایسا آدمی بہت جلد اپنے آپ سے وہ بزرگی اور نعمت زائل دیکھے گا۔ وہ فضیلت حق تعالیٰ کے فضل و کرم میں اور عزت حق تعالیٰ سبحانہ کی رضا میں اور بزرگی حق تعالیٰ کی معرفت اور اس پر ایمان لانے میں کیوں نہیں دیکھتا تا کہ وہ اپنے آپ پر اس نعمت کو ہمیشہ پائے اور اپنے دل کو دونوں جہان میں اسی کے ساتھ خوش اور شادمان دیکھے۔ جبرئیل علیہ السلام جنہوں نے کئی ہزار سال خلوت کے انتظار میں عبادت کی بالآخر انہیں خلعت، محمد مصطفے ﷺ کی غاشیہ برداری کی

صفحہ 385 سے 400 تک
اصل کتاب میں
موجود نہیں تھا

MISSING PAGE
385 to 400
IN ORIGINAL
BOOK

اس قصہ سے یہ حکمت اس معنی میں بڑی واضح ہے۔ اچھی طرح غور کرو تا کہ تم جان لو۔ حضرت جنیدؒ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے کہا "ایک وقت تھا کہ زمین و آسمان والے میری حیرانی پر روتے تھے، پھر ایسا ہوا کہ ان کی اس رغبت پر میں روتا تھا۔ لیکن اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ نہ مجھے ان کی کوئی خبر ہے اور نہ اپنا کچھ پتہ۔ حضور حق کی طرف یہ بڑا اچھا اشارہ ہے۔

غیبت وحضور کے یہ معنی تھے جو میں نے مختصراً بیان کر دیئے تا کہ پورا مسلک خفیفان تجھے معلوم ہو جائے، نیز تمہیں یہ علم بھی ہو جائے کہ حضور وغیبت سے اس گروہ کی مراد کیا ہے اس کی مزید شرح اور تفصیل اس کتاب کو طویل کر دے گی حالانکہ اس کتاب میں میں اختصار کا انداز اپنائے ہوئے ہوں...... وباللہ العون والتوفیق۔

فرقہ سیاریہ

سیاری فرقہ کے حضرات کی عقیدت ونسبت حضرت ابوالعباس سیاریؒ کے ساتھ ہے جو مرو کے پیشوا تمام علوم کے عالم اور حضرت ابوبکر واسطیؒ کے ہم نشین تھے۔ نسا اور مرو میں آج بھی آپ کے طبقہ کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں، آپ کے مذہب کے علاوہ کوئی مذہب بھی تصوف میں اپنی حالت پر باقی نہیں رہا۔ مرو اور نسا میں کوئی زمانہ اس مذہب کے پیشوا سے خالی نہیں رہا اور وہ پیشوا آپ سے متعلق لوگوں کو آپ کے مذہب پر قائم رکھنے کیلئے آج تک ان کی حفاظت کرتا رہا ہے نسا میں رہنے والے آپ کے اصحاب کے نام اہل مرو کے بڑے لطیف رسائل ہیں۔ اور ان کے درمیان خط وکتابت کی صورت میں کلام ہوتی رہی ہے میں نے مرو میں ان میں سے بعض مکتوبات دیکھے ہیں جو بڑے عمدہ ہیں...... ان کی عبارات جمع اور تفرقہ کی بنیاد پر ہیں یہ ایک ایسا لفظ ہے جو تمام اہل علم میں مشترک ہے اور ہر طبقہ اپنے اپنی عبارتوں کا مفہوم واضح کرنے کیلئے اس لفظ کو استعمال کرتا ہے تاہم اس سے ہر

طبقے کی مراد مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ محاسبی فرقہ کے حضرات جمع اور تفریق سے کسی چیز کے اعداد کا جمع ہونا اور علیحدہ ہونا مراد لیتے ہیں۔ نحوی حضرات لفظوں کا لغوی اور رسمی طور پر اتفاق اور معانی کے اعتبار سے افتراق مراد لیتے ہیں..... فقہا قیاس کا جمع ہونا اور صفات نص کا علیحدہ ہونا یا نص کا جمع ہونا اور قیاس کا علیحدہ ہونا..... اور اصولی ذات حضرات، ذاتی صفات کا جمع اور فعلی صفات کا افتراق مراد لیتے ہیں۔ لیکن سیاری حضرات کے نزدیک ان میں سے کوئی معنی بھی مراد نہیں۔ اس لئے اب میں ان عبارات سے اس گروہ کا مقصد اور ان کے مشائخ کا اختلاف اس کتاب میں بیان کروں گا تاکہ تمہیں اس کی حقیقت معلوم ہو جائے اور جمع و تفرقہ سے مشائخ کے ہر طبقے کی مراد کا تجھے علم حاصل ہو جائے۔ و باللہ التوفیق

جمع اور تفرقہ کا بیان

حق تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اپنی ''دعوت'' میں جمع کیا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْ اِلٰى دَارِ السَّلَامِ — اللہ تعالیٰ سب کو جنت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

پھر ہدایت کے معاملے میں ان میں تفریق کر دی اور فرمایا:

وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ — اور وہ جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

یعنی دعوت کے اعتبار سے سب کو بلایا ہے لیکن اظہار مشیت کے طور پر ایک گروہ کو ہدایت نصیب کرتا ہے، گویا حکم دین میں سب کو جمع کیا اور پھر ایک گروہ کو مردود بنا کر اور اپنے بعض بندوں کو اپنی توفیق سے مقبول بنا کر ان میں تفریق کر دی۔ نیز اسی طرح برائیوں سے بچنے کیلئے نہی کرنے میں سب کو جمع کیا لیکن پھر ایک گروہ کو عصمت عطا کی اور دوسرے کو گناہوں کی طرف میلان دے کر تفریق کر دی۔ پس اس معنی کے لحاظ سے جمع ایک حقیقت اور خاص راز اور حق تعالیٰ کی مراد ہوگا جب کہ اس کے حکم اور نہی کا اظہار تفرقہ ہوگا۔ جیسا کہ اس نے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو حکم دیا کہ اسماعیل کا گلا کاٹ دو لیکن خود یہ چاہا کہ نہ کاٹے، اور ابلیس کو حکم دیا کہ حضرت آدمؑ کو سجدہ کر لیکن خود یہ چاہا کہ وہ سجدہ نہ کرے اور حضرت آدمؑ سے کہا کہ گندم نہ کھانا لیکن خود چاہا کہ وہ کھا لے، اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں......
پس ''جمع وہ ہے جو اس کے اوصاف سے جمع ہو اور تفرقہ وہ ہے جو اس کے افعال کی بدولت جدا ہو'' اور یہ سب کچھ حق تعالیٰ کے ارادے کے اثبات میں مخلوق کے ارادے کا منقطع ہونا اور مخلوق کے تصرف کا ختم ہو جانا ہے...... جمع اور تفرقہ کے متعلق جتنا کچھ میں نے بیان کیا ہے مشائخ طریقت کے ساتھ اس میں معتزلہ کے علاوہ تمام اہل سنت کا اتفاق ہے تاہم بعدازیں ان عبارتوں کے استعمال میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ ان کو توحید پر استعمال کرتا ہے اس گروہ کے حضرات کہتے ہیں کہ جمع کے دو درجے ہیں ایک حق تعالیٰ کے اوصاف اور دوسرا بندے کے اوصاف ہیں۔ جو درجہ اوصاف حق تعالیٰ میں ہے وہ توحید کا راز ہے اور بندے کا کسب اس سے منقطع ہے اور جو درجہ بندہ کے اوصاف میں ہے وہ توحید کے مسئلہ پر سچے عقیدے اور صحیح ارادے سے عبارت ہے اور یہ قول حضرت ابوعلی رودباریؒ کا ہے......
اور دوسرا گروہ وہ ہے جو ان کو صفات باری تعالیٰ پر استعمال کرتا ہے یہ حضرات کہتے ہیں کہ جمع حق تعالیٰ کی صفت ہے اور تفرقہ حق تعالیٰ کا فعل ہے اور اس کے ساتھ بندے کے کسب کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے ساتھ خدائی میں کوئی بھی تنازع کرنے والا نہیں۔ پس ذات اور صفات کا جمع اسی کی ذات کے لئے ہے اس لئے کہ:

الجمع التسویة فی الاصل　　　جمع اصل میں برابر کرنے کا نام ہے۔

اور اس کی ذات وصفات کے علاوہ کوئی چیز بھی اس کے ساتھ مساوی نہیں اور ان کے افتراق میں مخلوق کی تفصیل اور عبارت جمع نہیں ہو سکتی۔ اس بات کا معنی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات قدیم ہیں اور وہ ان کے ساتھ موصوف ہے اور ان کا قیام اس کی ذات کے ساتھ ہے اور ان کا وجود اس کے ساتھ مخصوص ہے، اور وہ اور اس کی صفات دو مختلف چیزیں نہیں کیونکہ اس کی

وحدانیت میں فرق اور تعداد جائز نہیں ہے۔اس حکم کے اعتبار سے جمع کا اطلاق اس معنی کے بغیر درست نہیں ہوگا۔

احکام میں تفرقہ

یہ خداوند جل جلالہ کے افعال ہیں جو سب حکم میں متفرق ہیں۔ایک کیلئے وجود کا حکم ہے تو دوسرے کیلئے عدم کا...... باقی جو عدم ممکن الوجود ہو اس میں ایک کیلئے فنا کا اور دوسرے کیلئے بقا کا حکم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور گروہ ان الفاظ کا علم پر اطلاق کرتا ہے وہ حضرات کہتے ہیں کہ

الجمع علم التوحید و التفرقة علم الاحکام	جمع، اللہ کی توحید کا علم اور تفرقہ اللہ کے احکام کا علم ہے۔

پس علم عقائد جمع ہوگا اور علم احکام تفرقہ...... مشائخ میں سے ایک بزرگ نے بھی اسی طرح کی بات کی ہے کہ:

الجمع ما اجتمع علیه اهل العلم والتفرقة ما اختلفوا فیه	جمع وہ ہے جس پر اہل علم متفق ہوں اور تفرقہ وہ ہے جس میں اہل علم کا اختلاف ہو۔

پھر جمہور محققین صوفیہ (اللہ تعالیٰ ان کے چہروں کو تر و تازہ رکھے) عبارات اور رموز میں لفظ تفرقہ سے مراد بندے کے اعمال اور کسب ہے اور جمع سے مراد حق تعالیٰ کے مواہب و عطیات ہیں۔یعنی مجاہدہ اور مشاہدہ مراد ہیں...... پس بندہ اپنے مجاہدے اور محنت سے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ سب تفرقہ ہیں اور جو چیزیں بندہ کو محض حق تعالیٰ کی عنایت اور ہدایت سے حاصل ہوتی ہیں وہ سب جمع ہیں...... اور بندے کی عزت اس میں ہے کہ وہ اپنے افعال کے وجود اور مجاہدات کے امکان میں حق تعالیٰ کے فضل و کرم میں مستغرق پائے اور مشاہدہ کو ہدایت الٰہی کے پہلو میں معدوم پائے۔پس اس طرح اس کا پورا قیام حق تعالیٰ کے ساتھ ہوگا

اور حق تعالیٰ اس کے اوصاف کا وکیل و کارساز ہوگا اور اس کے تمام افعال کی اضافت اسی کی طرف ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے فعل کی نسبت سے بھی چھوٹ جائے گا۔ جیسا کہ پیغمبر ﷺ نے ہمیں جبرئیلؑ سے اور جبرئیلؑ نے خداوند تعالیٰ سے خبر دی کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

لاَ یـزال عبـدی یتقـربُ اِلـیَّ بـالنوافل حتی احببته' فاذا احببتُه' کنـت سمعًا وبصرًا ویدًا وَلِسَانًا فَبِیَ یَسْمَعُ وَبِیَ یبصِرُوبی ینطق وَبِیَ یبطشُ	میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعہ میرا اقرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس کو دوست بنا لیتا ہوں، پس جب میں اس کو دوست بنا لیتا ہوں تو میں اس کیلئے کان، آنکھ، ہاتھ اور زبان بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے ہی سنتا مجھ سے ہی دیکھتا میرے ساتھ ہی بولتا اور میرے ذریعے ہی پکڑتا ہے۔

یعنی جب ہمارا بندہ مجاہدہ کے ذریعے ہم سے قریب ہوتا ہے تو ہم اس کو اپنی دوستی کی منزل تک پہنچا کر اس کی ہستی کو اس میں فنا کر دیتے اور اس کے افعال کی نسبت اس کی طرف سے اٹھا دیتے ہیں تا کہ وہ جو کچھ سنے ہمارے ذریعے سنے، جو کچھ کہے ہمارے ذریعے سے کہے، جو کچھ دیکھے ہمارے سبب سے دیکھے اور جو کچھ پکڑے ہمارے سبب سے ہی پکڑے۔ یعنی ہمارے ذکر میں ہمارے ذکر سے مغلوب ہو کر اس کا کسب اس کے ذکر سے فنا ہو جاتا ہے اور ہماری یاد اس کے ذکر پر اس طرح غالب آ جاتی ہے کہ اس کے ذکر سے آدمیت کی نسبت منقطع ہو جاتی ہے۔ پس اس کا ذکر ہمارا ذکر ہو جاتا ہے حتیٰ کہ غلبہ کی حالت میں اس طرح ہو جاتا ہے کہ حضرت بایزیدؒ نے کہا:

سبحانِی مَا اَعْظَمُ شانِی	میری ذات پاک ہے، میری شان کتنی بلند ہے۔

اور آپ جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا نشانہ ویسے تو ان کی اپنی زبان ہی تھی لیکن کہنے والی حق تعالیٰ کی ذات تھی، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

الحق ینطق علی لِسان عُمَرُ — عمر فاروقؓ کی زبان پر حق بولتا ہے۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کا اقتدار، آدمیت پر اپنا غلبہ ظاہر کرتا ہے تو اس کی ہستی کو اس سے چھین لیتا ہے حتیٰ کہ اس کا بولنا اس کا بولنا ہو جاتا ہے۔ وہ محال لازم آئے بغیر کہ حق تعالیٰ مخلوقات کے ساتھ امتزاج پائے یا متحد ہو جائے یا تمام چیزوں میں حلول کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے پاک اور بہت بلند ہے جو ملحد اور بے دین لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں...... پس یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کی دوستی بندے کے دل پر غالب ہو جائے اور اس کے غلبہ اور دوستی کی زیادتی کو برداشت کرنے سے عقل اور طبیعت عاجز آ جائے اور اس کا معاملہ اپنے اکتساب سے ساقط ہو جائے اس وقت اس مرتبہ ومقام کو جمع کہتے ہیں...... چنانچہ رسول اللہ ﷺ حق تعالیٰ کی یاد میں مستغرق اور حق تعالیٰ کی دوستی میں مغلوب تھے تو ان سے ایک فعل صادر ہوا لیکن خدا تعالیٰ نے اس کی نسبت ان کی طرف سے اٹھا دی اور فرمایا کہ وہ فعل تو میرا فعل تھا نہ کہ تمہارا باوجودیکہ اس فعل کا محل اور نشانہ حضور ﷺ کی ذات تھی۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی — اے محمدؐ! وہ مٹھی بھر خاک دشمنوں کے چہروں پر تم نے نہیں ہم نے پھینکی تھی۔

اور جب اس طرح کا ایک فعل حضرت داؤد علیہ السلام سے حاصل ہوا تو حق تعالیٰ نے کہا:

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ — اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا۔

کیونکہ داؤد علیہ السلام اس وقت حالت تفرقہ میں تھے...... اور ان دو آدمیوں کے درمیان بڑا فرق ہے جن میں سے ایک کے فعل کی اضافت تو حق تعالیٰ اس بندے کی طرف ہی کریں اور وہ محل آفت وحوادث بھی ہے اور دوسرے آدمی کے فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف کریں جب کہ حق تعالیٰ خود قدیم اور آفات وحوادث سے پاک ذات ہے پس جب کسی

آدمی سے ایسا فعل ظاہر ہو جو انسانوں کے افعال کی جنس میں سے نہ ہو تو لامحالہ اس کا فاعل حق جل جلالہ خود ہوگا۔ معجزے اور کرامتیں سب اسی کے ساتھ مقرون ہیں...... پس جو افعال عام عادت کے مطابق ہوں وہ سب تفرقہ ہوں گے اور جو افعال خلاف عادت ہوں وہ سب جمع ہوں گے۔ اس لئے ایک رات میں ''قاب قوسین'' کے مقام تک پہنچ جانا عادت کے مطابق نہیں ہے اور یہ حق تعالیٰ کے فعل کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کسی پوشیدہ چیز کے بارے میں صحیح خبر دے دینا بھی عادت کے مطابق نہیں اور یہ بھی فعل خداوندی کے بغیر نہیں ہوسکتا اور آگ سے نہ جلنا بھی خلاف عادت ہے یہ بھی فعل خداوندی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پس حق تعالیٰ اپنے انبیاء اور اولیاء کو معجزے اور کرامتیں عطا کرتا ہے اور اپنے فعل کو ان سے اور ان کے فعل کو اپنے سے منسوب کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے دوستوں کا فعل خود اس کا اپنا فعل ہوتا ہے اور ان کی بیعت اس کی بیعت اور ان کی اطاعت خود اس کی اطاعت ہوتی ہے جیسا کہ اس نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ — بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں۔

نیز ارشاد فرمایا کہ:

وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ — جس نے رسول کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

پس اولیاء اللہ اسرار و باطن میں تو حق تعالیٰ کے ساتھ حالت جمع میں ہوتے ہیں لیکن اپنے اعمال میں اور ظاہری طور پر حالت تفرقہ میں ہوتے ہیں تاکہ باطن کے حق تعالیٰ کے ساتھ جمع ہونے سے ان کی دوستی مستحکم ہو اور ظاہری طور پر افتراق میں بندگی کو قائم رکھنا صحیح ہو۔ جیسا کہ حالت جمع میں مشائخ میں سے ایک بڑے بزرگ نے فرمایا کہ شعر

تو میرے باطن میں ثابت ہوگیا تو میری زبان نے تیرے ساتھ سرگوشی کی، پس ہم

بعض معانی کے اعتبار سے تو جمع میں اور بعض معانی کے اعتبار سے تفرقہ میں ہیں.....پس تیری بلند شان نے اگر تجھ کو میری آنکھ سے غائب بھی کر دیا تو میرے جذبہ محبت نے پھر بھی تجھے میرے لئے پناہ بنا دیا......

اس میں اس بزرگ نے باطن کے حق تعالیٰ کے ساتھ ملنے کو جمع اور زبان کی مناجات کو تفرقہ کہا ہے، اور پھر جمع اور تفرقہ دونوں کو اپنے اندر علامت بنایا ہے اور اس کی اصل اپنے آپ کو قرار دیا ہے......اور یہ کلام بڑا ہی لطیف ہے۔ وباللہ التوفیق۔

فصل

جمع اور تفرقہ میں اختلاف

یہاں اسی طرح کا ایک اور اختلاف ہمارے اور اس گروہ کے درمیان ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جمع کا اظہار تفرقہ کی نفی کو لازم ہے کیونکہ یہ دونوں متضاد ہیں لہذا جب ہدایت خداوندی کی حکومت حاوی ہو جائے گی تو کسب اور مجاہدہ کی ولایت ختم ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ تعطیل محض ہے جو ہرگز جائز نہیں...... میں کہتا ہوں کہ یہ تو تمہارے عقیدہ کے خلاف ہے کیونکہ جب تک ایک انسان میں عمل کرنے کی قوت اور امکان موجود ہو اس سے کسب اور مجاہدہ ساقط نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جس طرح سورج سے روشنی، جوہر سے عرض اور موصوف سے صفت جدا نہیں اسی طرح جمع بھی تفرقہ سے جدا نہیں ہے۔ پس مجاہدہ ہدایت سے شریعت، حقیقت سے اور مقصود کا حاصل کر دینا اس کی جستجو سے نیز جدا نہیں ہوگا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مجاہدہ حق تعالیٰ کی ہدایت کے حصول سے مقدم ہو یا موخر ہو، لیکن جس انسان کو مجاہدہ پہلے کرنا پڑے اسے مشقت زیادہ درپیش ہوگی کیونکہ وہ حق تعالیٰ سے غیبت میں ہے اور جس آدمی کو مجاہدہ ہدایت الٰہی کے حصول کے بعد کرنا پڑے اسے رنج اور کلفت نہ ہوگی کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے حضور میں ہے اور جس آدمی کو حضور حق میں ہونے کی وجہ سے اعمال کی

مشقت محسوس نہ ہوتی ہو وہ اگر اس کو عین اعمال کی نفی میں سمجھنے لگے تو یہ بہت بڑی غلطی پر ہے..... اور یہ جائز ہے کہ بندہ مجاہدہ و ریاضت کے سبب ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ اپنے تمام اوصاف کو معیوب اور ناقص سمجھنے لگے کیونکہ جب وہ اپنے اچھے اوصاف کو بھی عیب کی نگاہ سے اور ناقص دیکھے گا تو اسے اپنے بڑے اوصاف تو اور بھی زیادہ بڑے اور ناقص نظر آئیں گے..... میں نے یہ بات یہاں اس لئے بیان کر دی ہے کہ جاہلوں کا ایک طبقہ اس معاملے میں غلطی میں پڑ گیا ہے جو حقیقت سے بیگانگی کی دلیل ہے وہ کہتے ہیں کہ ''جب مقصود کا حصول ہماری کسی بھی کوشش اور جدوجہد کا نتیجہ نہیں کہ ہمارے افعال اور اطاعات سب عیب دار ہیں تو پھر ناقص مجاہدے کا اختیار نہ کرنا ہی اسے اختیار کرنے سے زیادہ بہتر ہو گا..... میں ان سے کہتا ہوں کہ ''انسان کیلئے عمل کو ہم اور تم فعل کہنے پر متفق ہیں اور افعال کو محل عیب اور شر و آفت کا سرچشمہ کہتے ہیں تو لامحالہ فعل کا نہ کرنا بھی ایک فعل ہو گا جب کرنا اور نہ کرنا دونوں فعل ہوئے اور فعل محل عیب ہوتا ہے تو پھر تم نہ کرنے کو کرنے سے کس طرح زیادہ بہتر جانتے ہو؟ یہ تو ظاہر خسارہ اور واضح نقصان ہے پس مومن اور کافر کے درمیان یہ بڑا ہی اچھا فرق ہے اس لئے کہ مومن اور کافر سب متفق ہیں کہ بندوں کے افعال محل عیب ہوتے ہیں پس مومن تو حق تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کرنے کو نہ کرنے سے بہتر جانتا ہے اور کافر تعطل کی وجہ سے نہ کرنے کو کرنے سے بہتر جانتا ہے..... پس جمع یہ ہے کہ رویت و مشاہدہ کی حالت میں تفرقہ کی آفت کیلئے اس سے تفرقہ کا حکم ساقط نہ ہو جائے اور تفرقہ یہ ہے کہ جمع کے حجاب میں بھی تفرقہ کو جمع ہی سمجھے..... حضرت مزین کبیر اس معنی میں فرماتے ہیں کہ **الجمع الخصوصية والتفرقة العبودية موصول اَحَدِ هما بالاٰخِر غير معقول عنه**

(حق تعالیٰ کے مشاہدہ سے خاص ہونا بندے کیلئے جمع ہے اور اس کی عبودیت بندہ کیلئے تفرقہ ہے اور یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ایک دوسرے سے جدا نہیں) کیونکہ مشاہدہ سے

مخصوص ہونے کی علامت خود عبودیت کی حفاظت ہے، جب معاملات کا دعویٰ کرنے والا اپنے معاملات میں قائم نہ ہو تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوتا ہے۔ پس یہ تو جائز ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو پورا کرنے میں مجاہدے کا بوجھ اور تکلیف کا رنج اس سے اٹھ جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی واضح عذر کے جو شریعت کے حکم میں عام ہو احکام کا بجالانا اس کے ساتھ جمع ہی رہے گا......اور میں اس کی ذرا وضاحت کرتا ہوں تاکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے چنانچہ جان لو کہ جمع دو قسم کی ہوتی ہے......پہلی جمع سلامت اور دوسری جمع تکسیر! جمع سلامت تو یہ ہے کہ احوال کے غلبہ، وجد کی قوت اور عشق کے اضطراب میں حق تعالیٰ سامنے آئیں اور ان حالتوں میں اپنے بندے کے نگہبان بن جائیں اور اس بندے کے ظاہر پر اپنے احکام کو جاری کر کے اسے ان پر عمل کرنے میں اپنی پناہ میں لئے رکھیں اور اس کو مجاہدہ کے ساتھ آراستہ کر دیں۔

جیسا کہ حضرات سہل بن عبداللہؒ، ابو حفص حدادؒ، ابو العباس سیاری مرزویؒ صاحب مذہب بایزید بسطامیؒ، ابوبکر شبلیؒ، ابوالحسن حصریؒ اور کبار مشائخ کی ایک جماعت جو ہمیشہ مغلوب الحال رہتے تھے لیکن جب نماز کا وقت آجاتا تو یہ اپنی اصل حالت پر لوٹ آتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پھر مغلوب الحال ہو جاتے اس لئے کہ جب تک تم محل تفرقہ میں رہو گے تم، تم ہی ہو گے اور احکام بجالاؤ گے لیکن جب حق تعالیٰ تمہیں جذب کر کے مغلوب بنا دے گا تو وہ اپنے احکام کی زیادہ بہتر طریقے سے تجھ پر نگاہ رکھے گا اور دونوں جہت محفوظ کرے گا ایک یہ کہ بندگی کی علامت تجھ سے نہ اٹھے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے اس وعدے کو بھی قائم رکھے کہ میں محمد ﷺ کی شریعت کو کبھی بھی منسوخ نہیں کروں گا......اور جمع تکسیر یہ ہے کہ بندہ احکام کے معاملہ میں دیوانہ اور بے ہوش ہو جائے اور اس کا حکم پاگلوں کی طرح ہو جائے۔ پس یہ تو اس معاملہ میں معذور قرار پائے گا لیکن پہلا بندہ مشکور ہو گا اور ظاہر ہے کہ مشکور کا معاملہ معذور سے زیادہ مضبوط ہی ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ تم جان لو

جمع کیلئے کوئی مخصوص مقام نہیں ہے اور نہ ہی کوئی الگ حال ہے کیونکہ جمع نام ہے اپنے مطلوب کے حصول کیلئے ہمت کو جمع کرنے کا۔ چنانچہ کسی جماعت کو تو اس معنی کا کشف مقامات میں ہوتا ہے اور کسی کو احوال میں۔ اور ان دونوں اوقات میں صاحب جمع کی مراد مراد کی نفی سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ ''تفرقہ جدائی ہے اور جمع ملاپ ہے''، اور یہ جملہ تمام چیزوں میں درست آتا ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ارادہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جمع تھا کہ ان کے ارادے کے علاوہ آپ کو کوئی ارادہ نہ سوجھتا تھا اور مجنوں کے ارادہ کا جمع لیلیٰ کے ساتھ تھا کہ پوری دنیا میں وہ اس کے علاوہ کسی کو نہ دیکھتا تھا اور اس کیلئے تو تمام موجودات لیلیٰ کی ہی صورت تھیں، اس طرح کی مثالیں بہت سی ہیں جیسا کہ حضرت بایزیدؒ ایک دن اپنے عبادت خانے میں تھے کہ ایک آدمی آیا اور پوچھا کہ ''**ھل بویزید فی البیت** ''(کیا بایزید گھر میں ہیں؟) تو آپ نے جواب دیا کہ''**ھل فی البیت الا اللہ**'' (گھر میں تو اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے) یعنی حضرت بایزیدؒ کمرے میں ہی موجود تھے لیکن جواب یہ دیا کہ میرے گھر میں حق تعالیٰ کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے......

مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ ایک درویش مکہ مکرمہ میں آیا اور خانہ کعبہ کے سامنے ایک سال تک اس طرح بیٹھا رہا کہ نہ اس نے کھانا کھایا، نہ پانی پیا، نہ نیند کی اور نہ رفع حاجت کی اس نے اپنی جس ہمت وارادہ کو خانہ کعبہ کی رویت کی طرف منسوب کیا تھا وہی گویا اسی کیلئے جسم کی غذا اور جان کا پانی ہو گیا......

ان تمام باتوں کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے خمیر کو جو کہ ایک جوہر ہے، ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرتے ہیں اور اپنے دوستوں میں سے ہر ایک کیلئے اس کی محبت میں گرفتاری کی مقدار ان ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا مخصوص کر دیتے ہیں، اس وقت انسانیت کا جوش، طبیعت کا لباس، مزاج کا پردہ اور روح کا حجاب اس سے اٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ محبت کا وہ ایک ٹکڑا اپنے ساتھ ملنے والی قوتوں کے اجزاء کو اپنی صفت میں ڈھال لیتا ہے

حتیٰ کہ وہ مجسم محبت بن جاتا ہے اور اس کی تمام حرکتیں اسی کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ حالت ہے جس کو ارباب تصوف اور اہل زبان جمع کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس معنی میں حضرت حسین بن منصورؒ کہتے ہیں کہ

''میں حاضر ہوں اے میرے آقا و مولا میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں اے میرے مقصد و معنی میں حاضر ہو...... اے میری ذات اور وجود کی اصل اور اے میری ہمتوں کے منتہی۔ اور اے میری کلام اور میرے اشارے اور کنایے...... اے میرے کل کے کل اور اے میر کان اور میری آنکھ...... اور اے میرے تمام جسم اور میرے اعضا و اجزا...... میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔

پس جو کوئی اپنے اوصاف میں مستعار اور عارضی ہوتا ہے اس کا اپنے وجود کو ثابت کرنا بھی اس کیلئے باعث ننگ و عار ہوتا ہے کہ دونوں جہاں کی طرف اس کی توجہ کفر ہوتی ہے اور موجودات اس کی ہمت میں ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔ پھر اہل زبان حضرات کا ایک گروہ کلام کرتے وقت عبادت کو تعجب انگیز بنانے کیلئے یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ جمع الجمع ہے یہ کلمہ عبارت کے اعتبار سے تو اچھا ہے تاہم معنی کے اعتبار سے بہتر یہی ہے کہ جمع کی جمع نہ کہا جائے۔ کیونکہ پہلے تفرقہ ہوگا تو پھر ہی اس پر جمع کا وارد جائز ہوگا اور جب جمع کی جمع ہو گی تو وہ تو تفرقہ بن جائے گا اور جمع کو اپنے حال سے گرا دے گا اور یہ عبارت محل تہمت بن جائے گی کیونکہ جو شخص حالت جمع میں ہو اس کو اپنے اوپر نیچے یا ادھر ادھر کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ معراج کی رات پیغمبر ﷺ کو دونوں جہان اور پوری کائنات دکھائے گئے لیکن آپ نے کسی چیز کی طرف بھی توجہ نہ کی کیونکہ آپ جمع کے ساتھ جمع تھے اور جمع ہونے والے کیلئے تفرقہ، مشاہدہ نہیں بن سکتا یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی'' (پیغمبر ﷺ کی آنکھ نہ بھٹکی اور نہ حد سے گزری)

میں نے ابتداء ہی میں اس مضمون پر ایک کتاب تصنیف کر کے اس کا نام

''کتاب البیان لاہل الصیان'' رکھ دیا تھا اور اپنی کتاب ''بحر القلوب'' میں بھی جمع کے باب میں چند واضح فصلیں لکھ دی تھیں۔اب میں نے ضرورت کے مطابق اتنی مقدار لکھ دی ہے۔

صوفیہ کے مذہب بیارسیاں کا یہی طریق تھا جو میں نے بیان کر دیا جو کہ صوفیہ کے مقبول اور محقق فرقوں میں سے ایک ہے.....اب میں بے دینوں کے اس گروہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو صوفیہ کے ساتھ اپنی وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے اور ان کی عبارتوں کو اپنے الحاد و بے دینی کیلئے استعمال کرتا ہے اور ان کی عزت میں اپنی ذات کا چھپائے ہوئے ہے تا کہ اس گروہ کی غلطیاں ظاہر ہو جائیں اور مرید حضرات ان کے مکر و فریب اور ان کے دعوؤں سے محفوظ ہو جائیں اور اگر اللہ چاہیں تو اپنے آپ کو ان سے بچالیں۔اور معاملہ تو تمام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

فرقہ حلولیہ

حلولہ فرقہ کے لوگوں کے اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرتے''**فَمَا ذَابَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ** ''(حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کیا ہے؟ پس تم کہاں بھٹک رہے ہو) دو مردود گروہ ہیں جو اہل تصوف کے ساتھ اپنی نسبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ اپنی گمراہی میں ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے ہیں.....ان میں سے ایک گروہ تو حضرت ابو حلمان دمشقی کے ساتھ اپنی عقیدت ظاہر کرتا ہے اور ان سے ایسی روایتیں منسوب کرتا ہے جو ان روایات کے خلاف ہیں جنہیں مشائخ نے اپنی کتابوں میں ان سے نقل کیا ہے اہل تصوف نے تو اس بزرگ کو ارباب ولایت میں شمار کیا ہے لیکن یہ بے دین لوگ، حلول، امتزاج اور نسخ ارواح کے عقائد ان کی طرف منسوب کرتے ہیں اور میں نے متقدمین کی کتابوں میں دیکھا ہے کہ انہوں نے اس عقیدے میں ان پر طعن کیا ہے اور علماء اصولین سے بھی اسی طرح کی صورت سامنے آئی ہے، اس معاملے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے

ہیں...... اور دوسرا گروہ اپنے مقولوں کی نسبت فارس کے ساتھ کرتا ہے اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ مذہب حضرت حسین بن منصور کا ہے، حالانکہ اس بے دین گروہ کے علاوہ حضرت حسین بن منصور کے ساتھیوں میں سے کسی کا یہ مذہب نہیں اور میں نے ابوجعفر حیدلانی کو عراق میں دیکھا کہ وہ اپنے چار ہزار حلاجی ساتھیوں کے ہمراہ پریشان حال موجود تھا اور وہ سب ان مقولوں کی وجہ سے فارس پر لعنت کر رہے تھے اور اس کی اپنی لکھی ہوئی کتابوں میں بھی جو کچھ ہے وہ تحقیق پر مبنی ہے...... اور میں علی بن عثمان ہجویریؒ کہتا ہوں کہ ''میں یہ نہیں جانتا کہ فارس اور ابوحلمان کون تھے اور کیا کہتے تھے؟ لیکن جو کوئی بھی کسی ایسے قول کا قائل ہو جو توحید کے منافی اور تحقیق شرعی کے خلاف ہو اس کیلئے دین میں کوئی حصہ نہیں ہے اور جب دین ہی جو کہ اصل اور بنیاد ہے'' مستحکم نہ ہو تو تصوف میں جو کہ اس کا ثمرہ اور فرع ہے تو اس سے بھی زیادہ خلل ہوگا اس لئے کہ کرامتوں کے اظہار اور دلائل کے کشف کا اہل دین اور توحید پرستوں کے علاوہ کسی پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان عقائد کے قائل لوگوں کو تمام غلطیاں روح کے بارے میں لاحق ہوتی ہیں۔ اب میں ان سب کو بیان کرتا ہوں اور قانون سنت کے مطابق اس کے احکام بیان کرتا ہوں اور اسی بیان میں ملحدوں کے مقالات مغالطے اور شبہے بھی پیش کروں گا تا کہ تمہیں ''اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے'' اس سے قوت حاصل ہو کیونکہ اس میں فساد بہت زیادہ ہے، وباللہ التوفیق۔

روح کا بیان

جان لو کہ روح کے وجود کے بارے میں جاننا ضروری ہے حالانکہ اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے سے عقل عاجز ہے امت کے علما و حکما میں سے ہر شخص نے اپنے علم و قیاس کے مطابق اس بارے میں کچھ نہ کچھ کہا ہے، نیز کافر گروہوں نے بھی اس میں گفتگو کی ہے اور جب یہود کے سکھانے پر کفار قریش نے نضر بن حارث کو رسول اللہ ﷺ کے پاس

بھیجا تا کہ وہ آپ سے روح کی کیفیت اور ماھیت سے متعلق سوال کرے تو خداوند تعالیٰ نے اولاً تو اس کے وجود کو ثابت کرتے ہوئے فرمایا کہ وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ "(اور وہ مشرک آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں) اور پھر اس کے قدیم ہونے کی نفی کی اور فرمایا "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی "(آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امور میں سے ایک امر ہے) اسی طرح حضور ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا کہ "اَلَا واحُ جُنود مجندۃً لَمَا تعارف منھا ائتلفَ وَمَا تناکَرَ منھا اختَلفَ "(روحیں جمع کیا گیا لشکر ہیں پس جنہوں نے عالم ارواح میں ایک دوسرے کو پہچانا ان میں الفت پیدا ہوگئی اور جن کی آپس میں وہ شناسائی نہ ہوسکی وہ مختلف رہے) اسی طرح کی بہت سی دلیلیں روح کے وجود پر موجود ہیں لیکن اس کی کیفیت اور حقیقت کا کہیں بیان نہیں پس ایک گروہ کا کہنا ہے" الروحُ ھُوَ الحیوۃ التی یحیی بہِ الجسد "(روح وہ زندگی ہے کہ جس کے سبب جسم زندہ رہتا ہے) متکلمین کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے اس حصر کے اعتبار سے روح ایک ایسا عرض ہے کہ جس کے ذریعہ حق تعالیٰ کے حکم سے جاندار زندہ رہتا ہے اور اس جاندار میں تالیف حرکت اور مختلف اجزاء کا باہم اجتماع اسی روح کی وجہ سے ہے اسی طرح وہ اعراض بھی اسی کی وجہ سے ہیں جن کے ساتھ وہ جسم ایک حالت سے دوسری کی طرف لوٹتا ہے......

اور ایک دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ "روح زندگی کے علاوہ کوئی چیز ہے لیکن زندگی اس کے بغیر پائی نہیں جاتی۔ جس طرح کہ روح بغیر جسم کے نہیں پائی جاتی اور یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر نہیں پایا جا سکتا جس طرح کہ درد اور اس کا علم ہے اس لیے کہ یہ دونوں مختلف چیز ہیں لیکن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ اس معنی کے اعتبار سے بھی روح ایک عرض ہوگی جس طرح کہ زندگی ایک عرض ہے۔ پھر جمہور مشائخ اور اہل سنت و جماعت کی اکثریت کا کہنا یہ ہے کہ "روح ایک ذات ہے صفت نہیں کہ جب تک وہ جسم کے ساتھ پیوست رہے اس وقت تک حق تعالیٰ اپنی عادت کے مطابق اس میں زندگی کر

دیتے ہیں اور انسان کی زندگی بھی ایک صفت ہے اور انسان اس سے زندہ ہے لیکن روح انسان کے جسم میں ایک امانت ہے اور یہ ہوسکتا ہے کہ وہ آدمی سے الگ ہو جائے اور آدمی زندگی کی وجہ سے زندہ رہے جیسا کہ نیند کی حالت میں روح تو چلی جاتی ہے لیکن زندگی باقی رہتی ہے تاہم یہ نہیں ہوسکتا کہ روح کے چلے جانے کے بعد علم اور عقل سلامت رہے اس لئے کہ پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے کہ ''شہداء کی روحیں ایک جوہر ہیں جو قائم بذاتہ ہیں اور پیغمبر ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''الارواح جنـد مـجندة ''(ارواح جمع کئے گئے لشکر ہیں) لامحالہ لشکر تو باقی رہتے ہیں لیکن عرض پر نہ بقا درست ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے پس روح اس لطیف جسم کا نام ہوگا جو خدا تعالیٰ کے حکم سے آتا ہے اور اسی کے حکم سے جاتا ہے اور پیغمبر ﷺ نے بیان کیا ہے کہ میں نے معراج کی رات حضرت آدم صفی اللہ، یوسف صدیق، موسیٰ کلیم اللہ، ہارون حلیم اللہ، عیسیٰ روح اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین کو آسمانوں میں دیکھا ہے تو لامحالہ وہ ان حضرات کی ارواح ہوں گی اور اگر روح عرض ہوتی تو اپنی ذات کے ساتھ قائم نہ ہوتی تاکہ اس کے وجود کی حالت میں پیغمبر ﷺ اس کو دیکھ سکتے کیونکہ اگر عرض ہوتی تو اس کے وجود کیلئے ایک محل ہونا چاہئے تھا جس محل کے ساتھ وہ عارض ہوتی اور اس کا محل جوہر ہوتا کیونکہ جواہر مرکب اور کثیف ہوتے ہیں (حالانکہ پیغمبر ﷺ نے انبیاء کی روحوں کو جسموں کے ہمراہ نہیں دیکھا) پس معلوم ہوگیا کہ روح ایک لطیف شی ہے اور اس کا جسم بھی ہے جب وہ جسم ہے تو اس کو دیکھنا درست ہوا خواہ یہ دیکھنا دل کی آنکھ کے ساتھ ہی ہو اور یہ بھی درست ہوا کہ وہ پرندوں کے قالب میں ہوں اور یہ بھی درست ہوا کہ وہ ایسا لشکر ہوں جن کا آنا اور جانا ثابت ہو۔ جیسا کہ احادیث اس پر ناطق ہیں چنانچہ فرمایا کہ ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ''(کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کا ایک امر ہے) گویا اس کا جسم میں آنا اور اس سے نکلنا سب حق تعالیٰ کے حکم سے ہے۔

باقی یہاں رہا اختلاف ملحدین کا کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اس کی پرستش کرتے

ہیں اور اس کے علاوہ اشیا کا فاعل اور مدبر کسی اور کو نہیں مانتے اور وہ ارواح کو معبود ازلی مدبر کہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ روح ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف پلٹ بھی جاتی ہے...... اس شبہے کے علاوہ مخلوق کو پیش آنے والے شبہات میں سے کسی شبہے پر اتنا اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ تمام نصاریٰ اگرچہ بیان اس کے خلاف کرتے ہیں لیکن درحقیقت ان کا عقیدہ یہی ہے نیز تمام ہندو، اہل تبت، اہل چین اور چین سے ادھر رہنے والے بھی اسی پر متفق ہیں۔ اسی طرح شیعوں، قرامطیوں اور باطنی فرقہ کے لوگوں کا بھی اسی عقیدے پر اجماع ہے اور وہ دونوں باطل فرقے بھی اسی قول کے قائل ہیں...... ہمارے بیان کردہ گروہوں میں سے ہر گروہ اسی قول کو زیادہ مقدم سمجھتا ہے اور دلائل کے ساتھ اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہم ان تمام فرقوں سے پوچھتے ہیں کہ تمہاری اس لفظ قدیم سے کیا مراد ہے؟ کیا ایسا حادث مراد ہے جو صرف اپنے وجود میں قدیم ہو یا ایسا قدیم جو ہمیشہ سے اور ہر اعتبار سے قدیم ہو؟ اگر وہ کہیں کہ ہماری مراد اس سے ایسا حادث ہے جو صرف اپنے وجود میں قدیم ہو تو اس صورت میں تو ہمارے درمیان سے اختلاف ختم ہو جائے گا کیونکہ ہم بھی روح کو ایسا حادث کہتے ہیں جو اپنے وجود کے اعتبار سے جسم کے وجود سے قدیم ہے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ خلق الارواح قبل الاجساد بماتی الفِ '' (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو جسموں سے کئی ہزار سال پہلے پیدا کر دیا تھا) اور جب اس کا حادث ہونا درست ہو گیا تو جب لامحالہ ہر حادث کسی پیدا کرنے والے کے پیدا کرنے کا محتاج ہوتا ہے تو یہ روح بھی خدائے عزوجل کی مخلوق میں سے ایک جنس ہوگی جو دوسری جنس کے ساتھ پیوست ہوتی ہے اور ان دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہونے میں حق تعالیٰ اپنی تقدیر سے زندگی پیدا کر دیتے ہیں...... بعض ارواح مخلوق میں سے ایک جنس اور جسم دوسری جنس ہیں۔ جب کسی جاندار کی زندگی مقدر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ روح کو حکم دیتے ہیں تو وہ جسم کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے اور اس طرح اس میں زندگی حاصل ہو جاتی ہے......

باقی روح کا ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف منتقل ہو جانا بھی درست نہیں کیونکہ جس طرح ایک شخص کیلئے دو زندگیاں درست نہیں اسی طرح ایک روح کیلئے بھی دو شخصیتیں درست نہیں ہیں...... اگر اس بات پر احادیث ناطق نہ ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سچی خبروں میں ہمیں اس کی اطلاع نہ بھی دیتے تو محض عقل کی رو سے بھی روح کا مفہوم سوائے زندگی کے اور کچھ نہ ہوتا اور یہ صفت یہی ہوتی نہ کہ جوہر جو قائم بذاتہ ہوتا ہے...... اور اگر وہ کہیں کہ اس قول سے ہماری مراد ایسا ازلی قدیم ہے جو ہر اعتبار سے قدیم ہو۔ تو ہم ان سے دریافت کریں گے کہ اچھا یہ قدیم بذاتہ قائم ہے یا اپنے قیام میں کسی کا محتاج ہے؟ اگر وہ کہیں کہ روح ایسا قدیم ہے جو قائم بذاتہ ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ پھر کیا وہی خداوند عالم ہے یا کوئی اور؟ اگر وہ کہیں کہ خداوند عالم تو وہ نہیں ہے تو اس صورت میں حق تعالیٰ کے علاوہ ایک دوسرے قدیم کا اثبات لازم آئے گا جو عقل کے مطابق نہیں ہے کیونکہ قدیم محدود نہیں ہوتا (یعنی اس کی ابتدا و انتہا نہیں ہوتی) لیکن یہاں تو ایک ذات کا وجود دوسرے کیلئے ضد بن رہا ہے یعنی ان کی ابتدا اور انتہا کی حد موجود ہے) اور یہ امر محال ہے کہ قدیم تو ہو لیکن خداوند عالم نہ ہو، اور اگر وہ کہیں کہ وہ خداوند عالم ہے، تو ہم کہیں گے کہ اس طرح وہ روح تو قدیم ہوئی تاہم مخلوق تو حادث ہے اور ایک حادث کا قدیم کے ساتھ امتزاج بالکل محال ہے اسی طرح حادث کا قدیم کے ساتھ اتحاد، حادث کا قدیم میں حلول یا حادث کا قدیم کیلئے مکان ہونا یا قدیم کا حادث کیلئے حامل ہونا بھی محال ہے کیونکہ جو چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ پیوست ہوتی ہے اور اس طرح جس چیز کیلئے ملنے اور جدا ہونے کی صفت موجود ہو وہ حادث ہی ہوتی ہے کیونکہ حادث اشیا ایک دوسرے کی جنس ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس چیز سے بہت ہی زیادہ ہے...... اور اگر وہ کہیں کہ وہ قدیم تو ہے لیکن بذاتہ قائم نہیں ہے بلکہ اس کا قیام غیر کے ساتھ ہے...... تو یہ دعویٰ بھی دو صورتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ صفت ہوگی یا عرض! اگر اس کو عرض کہیں تو لامحالہ یا اسے کسی محل میں ماننا پڑے گا یا لامحل میں اگر وہ محل میں کہیں تو وہ محل بھی تو

اس کی طرح اپنے قیام میں کسی دوسرے کا محتاج ہوگا۔ اس صورت میں ان دونوں میں سے کسی پر بھی قدیم کا اطلاق کرنا باطل ہوگا اور اگر وہ کہیں کہ وہ عرض لامحل میں ہے تو یہ بھی محال ہے کیونکہ جب عرض اپنی ذات میں قائم ہی نہیں رہ سکتا تو لامحل میں اس کا قیام کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا...... اور اگر وہ یوں کہیں کہ روح ایک قدیم صفت ہے جیسا کہ حلولیہ اور تناسخیہ فرقہ کے لوگ کہتے ہیں۔ تو یہ بھی محال ہے کہ حق تعالیٰ کی ایک صفت قدیم مخلوق کیلئے صفت بن جائے۔ اور اگر یہ درست مان لیا جائے کہ حق تعالیٰ کی حیات مخلوق کی صفت بن جاتی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ کی قدرت مخلوق کی قدرت بن جائے (حالانکہ یہ محال ہے تو وہ بھی محال ہی ہوگی) اور جب کہ صفت موصوف کے ساتھ قائم ہوتی ہے تو یہ کس طرح جائز ہوگا کہ صفت قدیم کا موصوف حادث ہو۔ پس لامحالہ قدیم کو حادث کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوگا اور ملحدین کا قول اس بارے میں باطل ہے اور روح حق تعالیٰ کے فرمان سے ایک مخلوق ہے اور جو کوئی اس کے علاوہ کسی اور عقیدے کا قائل ہو اس کا مکابرہ واضح ہے اور وہ حادث کو قدیم سے ممتاز ہی نہیں کر سکتا اور یہ ہرگز جائز نہیں کہ کوئی ولی اپنی ولایت کے درست ہوتے ہوئے حق تعالیٰ کے اوصاف سے جاہل ہو...... اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ اس نے ہمیں بدعت اور نفسانی خطرہ سے محفوظ رکھا ہے اور ہمیں عقل نصیب فرمائی کہ اس کے ساتھ ہم اس کی ذات میں غور اور اس کی وحدانیت پر استدلال کرتے ہیں اور ایمان عطا فرمایا تاکہ ہم اسے پہچان سکیں۔ وہ ایسی حمد و ثنا کے لائق ہے جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔ کیونکہ ہمارا تعریف کرنا متناہی ہے لیکن اس کے انعام و اکرام لامتناہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ متناہی حمد۔ اس کے لامتناہی انعامات کے مقابلے میں مقبول نہیں ہوتی...... جب اہل ظاہر نے اہل اصول سے یہ حکایات سن لیں تو انہوں نے سمجھا کہ شاید تمام ارباب تصوف کے یہی عقائد ہیں یہاں تک کہ وہ اس سنگین غلطی اور واضح نقصان کی بدولت ان باتوں کے جمال سے ہی حجاب میں ہو گئے اور ولایت حق کی لطافت اور تجلیات ربانی کی روشنی ان پر پوشیدہ ہو گئی

کیونکہ اس راہ طریقت کے بزرگوں اور سرداروں کیلئے لوگوں کا انہیں رد کر دینا یا قبول کر لینا دونوں برابر ہیں کہ انہیں اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

مشائخ میں سے ایک بزرگؒ کہتے ہیں کہ "**الروح فی الجسد کالنار فی الحطب فالنار مخلوقة والضحم مصنوعة**" (روح جسم میں اس طرح ہے جیسے لکڑی میں آگ کہ آگ مخلوق ہے اور کوئلہ مصنوع) اور قدیم ہونا خداوند تعالیٰ کی ذات اور صفات کے علاوہ کسی کے لئے جائز نہیں...... اور مشائخ میں سے حضرت ابوبکر واسطیؒ نے ہی روح کے بارے میں زیادہ تفصیلی کلام کیا ہے ان کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا "**الارواح علی عشر مقامات**" (روحوں کے دس مقام ہیں)

اول:۔ مفسدوں اور خطا کاروں کی روحیں جو تاریکی میں قید کی گئیں ہیں اور انہیں کچھ علم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

دوم:۔ پرہیزگار انسانوں کی روحیں جو اپنے اچھے اعمال کے نتیجہ میں پہلے آسمان میں خوش و شادمان ہیں اور اپنی اطاعت گذاری کی بدولت خوش ہیں اور اعمال کی قوت سے سیر کرتی ہیں۔

سوم:۔ مریدان حق کی روحیں جو چوتھے آسمان میں ہیں اور اپنے صدق معاملہ اور اچھے اعمال کے سائے میں فرشتوں کے ساتھ رہتی ہیں۔

چہارم:۔ دوسروں پر احسان کرنے والوں کی روحیں جو نور کی قندیلوں میں عرش الٰہی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔ ان کی غذا رحمت الٰہی اور ان کا شربت لطف و قرب الٰہی ہے۔

پنجم:۔ اہل وفا کی روحیں جو صفا کے پردوں میں اور برگزیدگی کے مقام پر خوش ہیں۔

ششم:۔ شہیدوں کی روحیں جو جنت میں جنتی پرندوں کے قالب میں رہتی ہیں اور جنت کے باغوں میں جہاں اور جس وقت چاہیں چلی جاتی ہیں۔

ہفتم:۔ خدا تعالیٰ کے عاشقوں کی روحیں جو صفات حق تعالیٰ کے نوری پردوں میں ہیں اور ادب کے بچھونے پر قیام پذیر ہیں۔

ہشتم:۔ حق تعالیٰ کے عارفوں کی روحیں جو بارگاہ الٰہی میں رہتی ہیں اور صبح شام کلام الٰہی سنتی اور دنیا و جنت میں اپنے مکانوں کو دیکھتی رہتی ہیں۔

نہم:۔ حق تعالیٰ کے اولیاء کی روحیں جو جمال الٰہی کے مشاہدہ اور مقام کشف میں مستغرق ہیں نہ اس کے علاوہ کسی کو جانتی ہیں اور نہ اس کے علاوہ کسی چیز میں انہیں آرام نظر آتا ہے۔

دہم:۔ درویشوں کی روحیں جو محل فنا میں قرب الٰہی سے مشرف ہیں ان کے اوصاف واحوال تبدیل کئے جا چکے ہیں اور وہ حق تعالیٰ کے قرب سے لطف اندوز ہو رہی ہیں۔

مشائخ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ارواح کو اپنے اپنے مقام پر دیکھا ہے اور یہ درست ہے کیونکہ ہم نے بیان کر دیا ہے کہ روح کا وجود ہے اور وہ ایک لطیف جسم ہے جسے دیکھا جا سکتا ہے اور جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کسی بندے کو دکھا دیتے ہیں...... اور میں علی بن عثمان ہجویری کہتا ہوں کہ ہماری زندگی کا وجود خداوند تعالیٰ کے ساتھ ہے اور باقی رہنا بھی اسی کے سبب ہے۔ ہمیش زندہ رکھنا بھی اسی کا فعل ہے اور ہم اسی کے حکم سے زندہ ہیں نہ کہ اس کی ذات یا صفات کے ساتھ اور روحی فرقہ کے تمام اقوال باطل ہیں اور لوگوں کے درمیان ایک عظیم گمراہی یہ ہے کہ وہ روح کو قدیم کہتے ہیں اگرچہ انہوں نے عبارتوں کو تبدیل کر دیا ہے تاہم ایک گروہ اسے نفس اور ہیولیٰ کا نام دیتا ہے اور دوسرا گروہ نور اور ظلمت کہتا ہے اور راہ تصوف کے جھوٹے دعوے دار اس کو فنا و بقا یا جمع و تفرقہ یا اسی طرح کی اور ملمع کی ہوئی عبارتوں سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے اس کفر کی تحسین کرتے ہیں حالانکہ صوفیاء کرام اس گروہ سے بیزار ہیں کیونکہ ولایت کا اثبات اور خداوند تعالیٰ کی محبت کی حقیقت اس کی معرفت کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ اور جب کوئی آدمی قدیم اور حادث کے درمیان فرق ہی نہ کر سکتا ہو تو وہ جو کچھ بھی کہے گا اپنے قول میں جاہل ہی ہوگا اور

عقلمند لوگ جاہلوں کی باتوں پر توجہ نہیں دیا کرتے۔

ان دونوں باطل فرقوں کا جو کچھ مقصود تھا پہلی دو فصلوں میں بیان ہو چکا ہے اگر اس سے زیادہ کی تلاش ہو تو میری دوسری تصنیفات میں اس کو ڈھونڈنا چاہئے کہ یہاں طوالت کا میرا ارادہ نہیں ہے...... اب میں پردوں کے کھلنے۔ طریقت و معاملات کے ابواب اور اہل تصوف کے حقائق کا اس کتاب میں واضح دلائل کے ساتھ بیان کروں گا تا کہ مقصود کو جاننے کا راستہ تم پر آسان ہو جائے اور اس کے منکروں میں سے جس کو کچھ بصیرت حاصل ہو وہ اس کی طرف لوٹ آئے اور یہ کام میرے لئے دُعائے خیر اور ثواب کا باعث بن جائے، (اگر اللہ تعالیٰ چاہیں)

پہلا کشف حجاب

معرفت الٰہی

اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ ''وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ'' (انہوں نے حق تعالیٰ کی قدر نہیں پہچانی جیسا کہ اس کا حق تھا) اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''لَوْ عرفتمُ اللّٰہ حَق معرفتہٖ لمشیتم عَلَی الجور وَلَزَ الت بدعائکم الجبال'' (اگر تم اللہ تعالیٰ کو اس طرح پہچان لیتے جس طرح اس کی معرفت کا حق ہے تو تم سمندروں کی سطح پر پیدل چلتے اور تمہارے بلانے پر پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جاتے)

حق تعالیٰ کی معرفت دو طرح کی ہے، ایک علمی اور دوسری حالی۔ معرفت علمی دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کی بنیاد ہے اور بندے کیلئے تمام اوقات و احوال میں اپنے خداوند تعالیٰ کی معرفت ہی تمام چیزوں سے اہم اور ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ'' (میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت یعنی اپنی معرفت کیلئے پیدا کیا ہے) حالانکہ مخلوق کی اکثریت اس سے روگردان ہے سوائے ان حضرات کے جنہیں خداوند تعالیٰ نے چن لیا اور انہیں دنیا کی تاریکیوں سے رہائی نصیب کر دی ہے اور ان کے قلوب کو اپنی معرفت سے زندہ کر دیا ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ تمہیں حضرت عمر بن الخطابؓ کے حال سے متعلق خبر دیتا ہے کہ ''وَجَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ'' (ہم نے اس کیلئے ایک روشنی پیدا کر دی ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں میں چلتا ہے) اور ابوجہل ملعون کے بارے میں خبر دی ہے کہ ''کَمَنْ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْھَا'' (اس کی حالت اس شخص کی طرح ہے جو ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے کہ ان سے نکل نہیں سکتا) پس معرفت الٰہی دل کی زندگی ہے اور حق تعالیٰ سے اعراض اس کی موت! اور ہر شخص کی قدر و قیمت معرفت حق کے باعث ہی ہے کیونکہ جس کو یہ معرفت

حاصل نہیں اس کی کوئی قیمت نہیں...... پس علماء فقہا اور دوسرے بزرگ حضرات خداوند تعالیٰ کے متعلق صحیح علم کو معرفت کہتے ہیں اور مشائخ طریقت خداوند تعالیٰ کے ساتھ حال کے صحیح ہونے کو معرفت کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ معرفت کو علم پر فضیلت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحبت حال صحبت علم کے بغیر نہیں ہوسکتا جب کہ صحبت علم کو صحبت حال کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا کوئی عارف نہیں ہوتا جو حق تعالیٰ کا صحیح علم نہ رکھتا ہو لیکن ایسا عالم ہوسکتا ہے جو ابھی تک حق تعالیٰ کا عارف نہ ہوا ہو...... صوفیاء اور اہل علم دونوں طبقوں میں سے جو لوگ پوری طرح اس حقیقت سے واقف نہ تھے انہوں نے اس مسئلہ میں لا حاصل مناظرے کئے ہیں اور علماء کے گروہ نے صوفیہ پر اور صوفیہ کے گروہ نے علما پر اعتراضات کئے ہیں۔ میں اب اس مسئلہ کا راز کھول کر بیان کرتا ہوں تاکہ اللہ چاہیں تو دونوں طبقوں کو فائدہ حاصل ہو۔

فصل

اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت مند کرے جان لو کہ لوگوں کا حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کے صحیح علم میں بہت سا اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی معرفت عقلی ہے اور عقلمند کے علاوہ کسی کو اس کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ قول باطل ہے اس لئے کہ دارالاسلام میں رہنے والے دیوانے معرفت کے حکم میں داخل ہیں نیز جو بچے ابھی عاقل نہیں ہوئے ان کا حکم بھی ایمان کا حکم ہوتا ہے کیونکہ معرفت کا حکم اگر عقلی ہوتا تو جن کو عقل نہیں انہیں معرفت کا حکم نہ ہوتا اور ان کافروں پر جو عقل رکھتے ہیں کفر کا حکم نافذ نہ ہوتا نیز اگر عقل معرفت کیلئے علت ہوتی تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر عقلمند، عارف ہوتا اور تمام بے عقل جاہل ہوتے حالانکہ یہ کھلا مکابرہ ہے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کی علت استدلال ہے اور جس آدمی کے سامنے حق تعالیٰ کے دلائل نہ ہوں اسے معرفت حاصل نہیں ہوسکتی لیکن ابلیس کے واقعہ کی بنا پر یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ اس نے تو دلائل بہت دیکھے

ہیں لیکن جب اس نے جنت دوزخ، عرش اور کرسی کو دیکھا تو ان تمام دلائل کی رویت بھی اس کیلئے معرفت کی علت نہ بن سکی۔ خداوند تعالیٰ نے بھی کہا ہے کہ ''وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَیْهِمُ الْمَلٰئِکَةَ وَ کَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰی وَ حَشَرْنَا عَلَیْهِمْ کُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوْا لِیُؤمِنُو اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ''(اور اگر ہم ان کافروں پر فرشتوں کو نازل کرتے اور مردے ان کے ساتھ باتیں کرتے اور ہم ہر چیز کو ان کے سامنے جمع کر دیتے تو بھی یہ ایمان نہ لاتے سوائے اس کے کہ اللہ چاہے، اگر دلائل کی رویت اور ان کا استدلال معرفت کی علت ہوتا تو حق تعالیٰ اسی کو معرفت کی علت قرار دیتے نہ کہ اپنی مشیت کو...... اور اہل سنت و جماعت کے نزدیک عقل کا صحیح ہونا اور کسی دلیل کا دیکھنا معرفت کیلئے سبب ہوتا ہے علت نہیں۔ جان لو کہ معرفت کی علت حق تعالیٰ کی مشیت اور عنایت کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں بن سکتی اس کی عنایت کے بغیر عقل تو نابینا ہوتی ہے اس لئے کہ عقل تو خود اپنے بارے میں بھی جاہل ہے تو اپنے علاوہ کسی چیز کو کیسے پہچان سکتی ہے نیز حق تعالیٰ کی عنایت کے بغیر دلائل کی رویت میں تفکر اور استدلال بھی غلط ہے کیونکہ اہل ہوا اور ملحدوں کے سب گروہ بھی استدلال ہی تو کیا کرتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر عارف نہیں ہوتے...... پھر جس شخص پر حق تعالیٰ کی عنایت ہے اس کی تمام حرکات معرفت کی علامت ہیں...... اور استدلال ایک طلب ہے جب کہ ترک استدلال تسلیم ہے اور معرفت کے صحیح ہونے میں تعلیم طلب سے بہتر نہیں ہوتی کیونکہ طلب ایک ایسی اصل ہے جس کا ترک جائز نہیں اور تسلیم ایک دوسری اصل ہے جس میں اضطراب کا گزر جائز نہیں اور ان دونوں کی حقیقت معرفت نہیں ہے درحقیقت یہ جاننا چاہئے کہ بندہ کیلئے رہنما اور دل کو کھولنے والا خدا تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں اور عقل و دلائل کے وجود کیلئے ہدایت کا امکان نہیں اس کی دلیل اس سے زیادہ واضح اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ خداوند تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ''وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ''(اور اگر کفار قیامت سے دنیا کی طرف لوٹا دئے جائیں تو پھر بھی وہی کام کریں جن سے انہیں روکا گیا

تھا) اسی طرح جب امیر المومنین حضرت علیؓ سے لوگوں نے معرفت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "عَرَفْتَ اللّٰه باللّٰه وَعرفتُ مَاذُون الله بنور الله "(میں نے اللہ تعالیٰ کو اس کی عنایت سے اور غیر اللہ کو اللہ کے نور سے پہچانا ہے) پس حق تعالیٰ نے جسم کو پیدا کیا اور اس کی زندگی روح کے سپرد کر دی اور دل کو پیدا کیا تو اس کی زندگی کو اپنی ذات کے ساتھ متعلق کر دیا۔ پس جب عقل اور دلیل میں جسم کو زندہ کرنے کی قدرت موجود نہیں تو محال ہے کہ وہ دل کو زندہ کر سکیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ "(کیا وہ آدمی مردہ نہ تھا کہ پھر ہم نے اس کو زندہ کیا) یعنی حق تعالیٰ نے زندگی کو اپنی ذات سے متعلق کیا اور اسی جگہ فرمایا "وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ "(اور ہم نے اس کیلئے ایک روشنی پیدا کی جس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے) نور کو پیدا کرنا جو مومنوں کے دل میں روشنی ہے وہ بھی اپنی ذات سے متعلق کیا نیز فرمایا "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "(وہ شخص جس کا سینہ حق تعالیٰ نے اسلام کیلئے کھول دیا ہے پس اپنے رب سے روشنی پر ہے) یعنی دلوں کو کھولنے کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ اور ان کو بند کرنے کو بھی اپنا فعل قرار دیا اور فرمایا "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِم غِشَاوَةٌ" "(اور مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے) نیز فرمایا "وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا "(اور اس کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے) پس جب دل کا قبض کرنا۔ کشادہ کرنا، کھولنا اور مہر لگانا سب کچھ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تو یہ محال ہے کہ اس کے علاوہ کسی کو رہنما سمجھا جائے۔ کیونکہ جو کچھ بھی اس کے علاوہ ہے وہ سب علت اور سبب کے درجے میں ہی ہے جب کہ کوئی علت اور سبب، مسبب کی عنایت کے بغیر راہ نہیں دکھا سکتا کیونکہ حجاب راہزن ہوتا ہے نہ کہ رہنما! نیز خدا تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ "(لیکن

ٹدتعالیٰ تمہارے لئے ایمان کومحبوب بنادیا اور اس کوتمہارے دلوں میں آراستہ کردیا) اس
بت میں ایمان کومحبوب بنانے اور اس کودلوں میں آراستہ کرنے کی نسبت بھی اپنی ذات کی
ف کی ہے اور تقویٰ کالازم کرنا جوعین معرفت حق ہے وہ بھی حق تعالیٰ کی طرف سے ہی
ہے اور جس پر تقویٰ لازم ہوا ہو اس کو اپنے اوپر لازم کرنے یا اس کو دور کرنے کا اختیار نہیں
ہوتا۔ پس حق تعالیٰ کی توفیق کے بغیر مخلوق اس کی معرفت سے عاجز ہی رہے گی۔

حضرت ابوالحسن نوریؒ کا قول ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی معرفت پر اس کے فضل کے علاوہ کوئی دلیل نہیں ہے ہم علم تو اس لئے حاصل کرتے ہیں تا کہ اس کی عبادت کے آداب ہمیں معلوم ہو جائیں''...... اور مخلوقات میں سے کسی کو اس چیز کی قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی کو خدا تعالیٰ تک پہنچا دے ورنہ استدلال میں کوئی ابوطالب سے زیادہ عقلمند نہیں ہوسکتا اور محمد ﷺ کے وجود سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوسکتی لیکن ابوطالب کیلئے نفع بخش ثابت نہ ہو سکی...... اور یہ یاد رکھو کہ استدلال کا درجہ حق تعالیٰ سے اعراض کرنے کا ہے اس لئے کہ استدلال نام ہی غیر میں سوچ و بچار کرنے کا ہے جب کہ معرفت کی حقیقت غیر اللہ سے اعراض کرنا ہے...... عادت کے مطابق دوسرے تمام مطلوبات کا وجود استدلال سے ہوتا ہے لیکن حق تعالیٰ کی معرفت عادت کے برعکس ہے۔ پس جب اس کی معرفت عقل کے ہمیشہ حیرت میں رہنے کا نام ہے اور اس کی عنایت بھی بندہ کے اپنے اختیار میں نہیں ہے تو بندہ کے کسب کا اس کی معرفت میں کیا دخل ہوسکتا ہے اور بندہ کیلئے اس کے فضل کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوسکتی، اور وہ حق تعالیٰ دلوں کو کھولنے والا اور ایک چھپا ہوا خزانہ ہے اس لئے کہ جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ سب حادث ہے اور ایک حادث کا اپنے جیسے حادث تک خود بخود پہنچ جانا تو جائز ہے لیکن یہ جائز نہیں کہ کوئی حادث اپنے پیدا کرنے والے تک خود بخود پہنچ جائے، ورنہ وہ پیدا کرنے والا اس حادث کے کسب کا نتیجہ ہو جائے گا اور جو کوئی کسی کے کسب کے تحت آجائے کسب کرنے والے کا کسب اس پر غالب اور اس کا کسب کیا ہوا

مغلوب ہوتا ہے اور یہ حقِ تعالیٰ کے بارے میں جائز نہیں)......پس کرامت یہ نہیں کہ عقل، کسی فعل کی دلیل سے فاعل کے وجود کو ثابت کرے بلکہ کرامت یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے نور سے اپنے وجود کی نفی کر دے، اس طرح اس پہلے کو (جو فعل کی دلیل سے فاعل کا اثبات کرنا ہے) محض معرفت قولی حاصل ہو گی لیکن جو نورِ حق سے اپنا وجود نفی کر دے اس کو معرفت حال یعنی اصل معرفت حاصل ہو جائے گی اور جو گروہ عقل کو معرفت کی علت سمجھتا ہے اس سے دریافت کرو کہ ''عقل دل میں حقیقی معرفت میں سے کسی چیز کو ثابت کرتی ہے؟ کیونکہ عقل جس چیز کو ثابت کرتی ہے معرفت الٰہی تو اس کی نفی کا تقاضہ کرتی ہے، یعنی عقل کی دلالت سے جو کچھ دل میں صورت پیدا ہوتی ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ ہے درحقیقت اس کی ذات کے خلاف ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی اور صورت دل میں پیدا ہو تو حق تعالیٰ اس صورت کے بھی خلاف ہے پس اس مقام پر عقل کی کیا مجال ہے کہ وہ استدلال کے ذریعہ معرفت حاصل کر سکے اس لئے کہ عقل اور وہم دونوں کی جنس ایک ہی ہے اور جس جگہ جنس ثابت ہو جائے وہاں معرفت منتفی ہو جاتی ہے پس عقل سے استدلال کے ذریعہ اثبات، تشبیہ ہو گی اور اس کی نفی تعطیل ہو گی اور عقل کی مجال ان دو اصلوں کے علاوہ کچھ نہیں جب کہ یہ دونوں اصلیں فکر و معرفت میں ناکام ہیں کیونکہ مشتبہ اور معطلہ میں سے کوئی بھی موحد نہیں ہوسکتا۔ پس جب عقل اپنی امکانی حد تک پہنچ کر بھی اپنے وہم کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کر سکتی تو دوستانِ حق کے دلوں کو طلب عنایت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ عاجزی کی چوکھٹ پر بغیر کسی سبب کے آرام پذیر ہو گئے بلکہ اپنے آرام میں بھی بے آرام ہو گئے اور اپنے دلوں کیلئے مرہم تلاش کر لیا اور اپنی راہ کو طلب عنایت کی ''اقسام اور اپنی قدرت کے درمیان پوشیدہ کر لیا تو حق تعالیٰ کی قدرت اس جگہ ان کی اپنی قدرت بن گئی۔ یعنی انہوں نے قدرتِ حق کے ذریعہ راہ معرفت حق کو پا لیا اور اس طرح وہ غیبت کی تکلیف سے آسودہ ہو گئے اور محبت کے باغیچہ میں جگہ پا کر اس میں آرام پذیر ہو گئے اور راحت و سرور میں قرار

حاصل کرلیا...... یوں جب عقل نے دلوں کو منزل مراد تک پہنچا ہوا دیکھا تو اس نے بھی اپنا تصرف شروع کیا لیکن وہ معرفت کے حصول سے عاجز رہی، جب عاجز رہی تو حیران ہوگئی اور جب حیران ہوئی تو معزول ہوگئی اور جب معزول ہوگئی تو اب حق تعالیٰ نے اس کے اندر اطاعت کا لباس پہن لیا اور کہا ''اے عقل! جب تک تو اپنی خودی میں رہی اپنے اسباب و تصرفات کی بنا پر حجاب میں رہی اور جب تصرف کے آلات خالی ہوگئے تو باقی صرف تو رہ گئی۔ جب صرف تو باقی رہ گئی تو تجھے رسائی حاصل ہوگئی۔ پس دل کے حصے میں حق تعالیٰ کا قرب آیا اور عقل کے حصے میں خدمت و اطاعت، باقی رہی معرفت وہ تو خود معرفت ہے پس اللہ تعالیٰ نے بندے کو اپنی تعریف اور معرفت سے شناسا کیا تاکہ اس کو اسی کے ذریعہ پہچانیں۔ ایسی پہچان نہیں جو کسی سبب اور آلے کے واسطے سے ہو بلکہ ایسی پہچان جس میں خود بندے کا وجود عارضی ہوتا کہ عارف کو انانیت اور غرور ہر اعتبار سے ایک خیانت نظر آئے یہاں تک کہ اس کا ذکر اس طرح ہو کہ اس میں نسیان نہ ہو اور معاملہ ایسا ہو کہ اس میں کوتاہی نہ ہو۔ یعنی اس کی معرفت واقعی اور یقینی ہو صرف زبانی دعویٰ نہ ہو...... نیز ایک اور گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ''حق تعالیٰ کی معرفت ایک الہامی چیز ہے لیکن یہ بھی محال ہے اس لئے کہ معرفت کے صحیح یا غلط ہونے کیلئے ایک دلیل ہے جب کہ اہل الہام کیلئے صحیح اور خطا پر کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ جب ایک شخص دعویٰ کرے کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ کیلئے مکان ہے اور دوسرا یہ دعویٰ کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ اس کیلئے مکان نہیں تو لامحالہ ان دو متضاد دعوؤں میں حق تو ایک کی طرف ہی ہوگا۔ حالانکہ یہ دونوں اپنے اپنے الہام کی بنیاد پر دعویٰ کر رہے ہیں چنانچہ ان دونوں مدعیوں کے درمیان صدق اور کذب کا فیصلہ کرنے کیلئے ایک دلیل کی ضرورت ہوگی۔ اس صورت میں فیصلہ تو دلیل پر ہوگا۔ اور الہام کا حکم باطل ہو جائے گا......

یہ برہمنوں اور الہامی لوگوں کا قول تھا...... میں نے اس دور میں ایک قوم کو دیکھا ہے جو اس بارے میں بڑا غلو کرتی ہے اور اپنے طریق کار کی نسبت نیک و پارسا بزرگوں کی طرف کرتی

ہے حالانکہ یہ سب لوگ گمراہی پر قائم ہیں اور اس کا قول اہل کفر اور اہل اسلام کے تمام عقلمندوں کے خلاف ہے اس لئے کہ الہام کے دس مدعی ایک ہی معاملے میں دس باہم متضاد اقوال کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ سب باطل ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی حق پر نہیں ہوتا...... اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ جو کچھ شریعت کے خلاف ہو وہ تو الہام ہی نہیں ہوتا تو میں کہتا ہوں کہ تم اپنے اصل میں خطا کار اور غلطی پر ہو کہ شریعت کو اپنے الہام پر قیاس کرتے اور کہتے ہو کہ الہام کا اثبات شریعت کی وجہ سے ہے پس معرفت ایک شرعی، ثبوتی اور ہدایتی شی ہوگی۔ نہ کہ الہامی اور معرفت کے معاملہ میں الہام کا فیصلہ ہر اعتبار سے باطل ہے...... ایک اور گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ''معرفت حق سب کیلئے ضروری ہے'' لیکن یہ بھی محال ہے اس لئے کہ ہر وہ چیز جس کا علم بندے کیلئے ضروری ہو اس میں تمام عقلمندوں کو مشترک ہونا چاہئے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عقلمندوں کا ایک گروہ معرفت کا انکار کرتا اور تشبیہ و تعطیل کو روا سمجھتا ہے تو یہ ثابت ہو گیا کہ معرفت ضروری امر نہیں نیز اگر حق تعالیٰ کی معرفت ضروری ہوتی تو اس کے ساتھ مکلّف کرنا درست نہ ہوتا کیونکہ ایسی معرفت کا مکلّف قرار دینا جس کا علم ضروری ہو محال ہے، جیسا کہ بندے کیلئے خود اپنی معرفت اور آسمان و زمین، دن و رات اور درد و لذت وغیرہ کی معرفت کہ کوئی عقلمند اپنے آپ کو ان چیزوں کے وجود میں شک میں نہیں ڈال سکتا کہ ان چیزوں کے بارے میں بیقرار ہو جائے اور اگر ان کو پہچاننا نہ بھی چاہے تو ایسا نہیں کر سکتا کہ ان کو نہ پہچانے تاہم صوفیہ کا ایک گروہ جو اپنے یقین کی صحت میں نگاہ ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم اس کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ہم اپنے دل میں کوئی شک و شبہہ نہیں پاتے اور وہ یقین کو ضرورت کا نام دیتے ہیں تو وہ اس معنی میں تو سچے ہیں لیکن عبارت میں وہ خطا کار ہیں کیونکہ ضروری علم میں صحیح کی تخصیص درست نہیں اس لئے کہ سب عقلمند لوگ یکساں ہوتے ہیں۔ نیز علم ضروری ایک ایسا علم ہوتا ہے جو دل میں کسی سبب اور دلیل کے بغیر پیدا ہو جائے۔ جب کہ خداوند تعالیٰ کے متعلق علم اور اس کی معرفت

کیلئے سبب ہوتا ہے۔ البتہ حضرت استاد ابو علیؒ دقاق، شیخ ابو سہل صعلوکی اور بدر بن ابی سہلؒ جو کہ نیشاپور کے امام اور سردار ہیں۔ یہ سب حضرات اہلسنت و جماعت کے اس ایک قول پر متفق ہیں کہ معرفت کی ابتدا استدلال ہے جب کہ انتہا ضرورت اور وہ کہتے ہیں کہ بہشت کے اندر خداوند تعالیٰ کے متعلق ضروری ہوگا تو جب وہاں اس کا ضروری ہونا روا ہے تو یہاں بھی ضروری ہونا روا ہوگا۔ نیز یہاں دنیا میں انبیاء علیہم السلام اس حال میں کہ حق تعالیٰ کا کلام کسی واسطہ کے بغیر یا کسی فرشتہ یا وحی کے ذریعہ سے سنتے ہیں تا کہ اس کو ضروری طور پر پہچان لیں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ جنتی لوگ جنت میں حق تعالیٰ کو ضروری طور پر پہچان لیں گے کیونکہ جنت دار تکلیف نہیں اور پیغمبران خدا مامون العاقبت اور حق تعالیٰ کی جدائی سے حفاظت میں ہوتے ہیں اور جو کوئی حق تعالیٰ کو ضروری پہچان لیتا ہے اس کو بھی گمراہی کا کوئی خوف یا جدائی کا اندیشہ نہیں رہتا۔ ایمان اور معرفت کو حق تعالیٰ کا فضل ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ ایک پوشیدہ حقیقت ہے، جب یہ ظاہر ہو جائے تو پھر ایمان ایک خبر بن جائیگا اور اس کے وجود میں اختیار اٹھ جائے گا اور شریعت کے اصول مضطرب ہو جائیں گے اور ارتداد کا حکم باطل ہو جائے گا اس طرح بلعم باعور ابلیس اور برصیصا پر کفر کا حکم لگانا درست نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ عارف حق تعالیٰ تھے جیسا کہ حق تعالیٰ نے ابلیس کے بارے میں ہمیں اطلاع دی ہے کہ اس نے کہا "فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ" (مجھے آپ کی عزت کی قسم میں اولاد آدم کو گمراہ کر کے رہوں گا) درحقیقت حق تعالیٰ سے بات کرنا اور جواب سننا معرفت کا تقاضہ کرتا ہے اور عارف جب تک عارف رہتا ہے حق تعالیٰ کی جدائی سے امن میں رہتا ہے۔ اور حق تعالیٰ سے کٹنا معرفت کے زوال سے ہی حاصل ہوتا ہے اور علم ضروری زوال پذیر نہیں ہوا کرتا۔ یہ مسئلہ لوگوں کے درمیان بڑا ہی مشکل اور پر آفت ہے لہذا اس میں الجھنے کی بجائے اتنا جان لینا شرط ہے کہ حق تعالیٰ کے بارے میں بندے کا علم اور معرفت حق تعالیٰ کے ازلی فضل اور اس کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ تاہم

یہ جائز ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت میں بندوں کا یقین کبھی زیادہ ہو اور کبھی کم لیکن اصل معرفت میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی کیونکہ اس کی زیادتی اور کمی دونوں ہی نقصان دہ ہیں اور حق تعالیٰ کی پہچان میں کسی کی تقلید کرنے کی بجائے اس کو اس کی صفات کمالیہ کے ذریعہ پہچاننا چاہئے اور یہ چیز حق تعالیٰ کی حسین حفاظت اور اس کی عنایت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ تمام دلائل اور تمام عقلیں اسی کی ملکیت ہیں اور اسی کے تصرف میں ہیں وہ چاہے تو اپنے افعال میں سے کسی ایک فعل کو دلیل بنا کر اس کے ذریعہ بندے کو اپنی طرف رہنمائی کر دے تا کہ وہ اس فعل کے ذریعہ اس تک پہنچنے سے محروم رہے۔ جس طرح کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کیلئے تو معرفت حق کی دلیل بن گئے لیکن دوسری قوم کیلئے معرفت سے حجاب کا سبب بن گئے یہاں تک کہ ایک گروہ نے تو آپ کو حق تعالیٰ کا بندہ کہا لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ آپ حق تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اسی طرح بت، سورج اور چاند ایک گروہ کیلئے حق کی دلیل بن گئے لیکن دوسرے گروہ کیلئے حق سے محروم رہنے کا ذریعہ بن گئے۔ لہذا اگر دلائل معرفت حق کی علت ہوتے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ہر استدلال کرنے والا عارف ہوتا اور یہ کھلا مکابرہ ہے...... پس اللہ تعالیٰ کسی ایک کو اپنی معرفت کیلئے چن لیتے ہیں اور پھر تمام چیزوں کو اس کیلئے دلیل و رہبر بنا دیتے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ سے وہ حق تعالیٰ تک رسائی حاصل کرے اور حق تعالیٰ کو جان لے...... پس دلیل اس کیلئے سبب ہوتی ہے علت نہیں ہوتی اور کوئی سبب، کسی دوسرے سبب سے زیادہ اولیٰ نہیں ہوتا کہ وہ سبب کے حق میں دوسرے سبب سے زیادہ مفید ہو...... مجھے اپنی زندگی کی قسم ہے کہ معرفت میں عارف کیلئے سبب کا ثابت کرنا زنار ہوتا ہے اور غیر حق کی طرف التفات کرنا شرک ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دیں اس کیلئے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ جب لوح محفوظ میں بلکہ حق تعالیٰ کے علم وارادہ میں کسی کے حصے میں شقاوت ہو تو دلیل استدلال اس کیلئے کس طرح ہادی بن سکتے ہیں کیونکہ جو شخص قہر خداوندی میں مستغرق اور سرگرداں ہے حق تعالیٰ کے علاوہ کون ہے جو

اس کا گریبان پکڑ کر اسے وہاں سے نکال لے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب غار سے باہر تشریف لائے تو دن کا وقت تھا لیکن آپ نے کچھ بھی نہ دیکھا حالانکہ دن کے وقت میں دلائل زیادہ اور عجائب قدرت واضح ہوتے ہیں لیکن جب رات ہوئی تو آپ نے "رائی کو کہا" (ستارہ دیکھا) اگر دلیل آپ کیلئے معرفت حق کی علت ہوتی تو یہ دن کو حاصل ہوتی کیونکہ دن کے وقت دلائل زیادہ واضح اور عجائب قدرت زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ پس حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں اور جس ذریعہ سے چاہتے ہیں بندے کو اپنی طرف راہ دکھا دیتے ہیں اور اپنی معرفت کا دروازہ اس کیلئے یہاں تک کھول دیتے ہیں کہ وہ عین معرفت میں اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ عین معرفت بھی اس کو غیر نظر آتی ہے اور معرفت حق اس کی اپنی صفت بن جاتی ہے اور معرفت حق کے ذریعہ تمام چیزوں سے حجاب میں ہو کر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کی معرفت اس کا دعویٰ ہو جاتی ہے..... حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ "ایّاک اَنْ لَاتکون بالمعرفة مدعیا" (اپنے آپ کو بچا کہ کہیں تو معرفت کے مدعیوں میں سے نہ ہو جائے) شعر

یدعی العارفون معرفته اقر بالجهلِ ذالک معرفتی

عارف لوگ تو اس کی معرفت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن میری معرفت یہ ہی ہے کہ میں اپنی جہالت کا اقرار کرتا ہوں۔

غرضیکہ تیرے لئے ضروری ہے کہ تو معرفت کا دعویٰ نہ کرے کیونکہ اس میں ہلاکت ہے ہاں اس کے معنی سے تعلق پیدا کرنا کہ تجھے نجات حاصل ہو۔ پس جو کوئی حق تعالیٰ کے کشف اور جلال سے مشرف ہو جائے یہ اس کیلئے آزمائش بن جاتی ہے اور اس کی تمام صفات امتحان گاہ بن جاتی ہیں اور جو آدمی حق تعالیٰ کا ہو رہے اور حق تعالیٰ اس کے ہو جائیں پھر کوئی چیز ایسی نہیں رہتی کہ جس کی طرف اس کی نسبت درست ہو......اور معرفت کی حقیقت خدا تعالیٰ کی ملکیت کو جاننا ہے جب کوئی آدمی تمام جہان میں اسی کا تصرف جان

لے اس کو مخلوق کے ساتھ کیا تعلق رہ جاتا ہے کہ اپنے یا مخلوق کی وجہ سے وہ حجاب میں رہے کیونکہ حجاب تو جہالت میں سے ہے جب جہالت فانی ہو جائے تو حجاب لاشی ہو جاتا ہے اور دنیا بھی اس کیلئے بمنزلہ آخرت کے ہو جاتی ہے۔

فصل

مشائخ کے رموز

معرفت الٰہی کے متعلق مشائخ رحمہم اللہ کے رموز بہت زیادہ ہیں میں انشاء اللہ ان میں سے بعض اقوال، حصول فائدہ کی غرض سے بیان کرتا ہوں..... حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کہتے ہیں کہ **''المعرفة اَن لاتتعجب من شیٔ''** (معرفت یہ ہے کہ کسی چیز سے تو تعجب میں مبتلا نہ ہو) اس لئے کہ تعجب اس فعل سے ہونا چاہئے جو کوئی اپنی طاقت سے اس میں اضافہ کر لے۔ لیکن جب حق تعالیٰ ہی ہر کمال پر قادر ہیں تو عارف کیلئے اس کے افعال پر تعجب کرنا محال ہوتا ہے اور اگر تعجب کی صورت پیدا بھی ہو تو وہاں ہونی چاہئے کہ حق تعالیٰ نے ایک مٹھی خاک کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ وہ اس کی فرمانبردار بن گئی اور خون کے دو قطروں کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ وہ اس کی دوستی اور معرفت کی بات کرتا اور اس کے دیدار کی خواہش اور اس کے قرب کا ارادہ کرتا ہے..... اور حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ''معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ لطیف انوار کے ساتھ دلوں پر اپنا جلوہ طلوع فرمائیں'' یعنی حق تعالیٰ جب تک بندے کے دل کو اپنے نور سے آراستہ نہ کر دیں اس وقت تک اس کا دل تمام برائیوں سے رہائی نہیں پا سکتا، چنانچہ جب بندہ کے دل میں دنیا کی موجودات اور مخلوقات کا وزن ایک رائی کے دانے کے برابر بھی موجود ہو تو ظاہری اور باطنی اسرار کا مشاہدہ اس پر غلبہ نہیں کرتا اور جب تمام موجودات کا اس کے دل پر کوئی وزن نہ رہے تو اس کا دیکھنا مشاہدہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے..... حضرت شبلیؒ کہتے ہیں کہ ''**المعرفة**

دوام الحیرۃ "(معرفت ہمیشہ کی حیرانی ہے)اور حیرانی دو طرح کی ہوتی ہے ایک وجود کے اندر اور دوسری اس کی کیفیت کے اندر...... حق تعالیٰ کے وجود میں حیرانگی کفروشرک ہے لیکن اس کی کیفیت میں حیرانی معرفت ہے اس لئے کہ عارف کو اس کے وجود میں کبھی شک نہیں ہوتا اور اس کی کیفیت کو سمجھنے میں عقل کی کوئی مجال نہیں۔ لہذا اب یہی چیز باقی رہ گئی کہ حق تعالیٰ کے وجود کے بارے میں یقین ہو اور اس کی کیفیت کے بارے میں حیرانی ہو۔ اسی طرح کی وہ بات ہے جو ایک عارف نے کہی ہے کہ "یا دلیل المتحرین زونی تحیراً "(اے متحیروں کے رہنما! میری حیرانی میں اضافہ کر) پہلے تو اس کے وجود کی معرفت اور اوصاف کے کمال کو ثابت کیا اور یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ ہی کائنات کا مقصود اور لوگوں کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے اور متحیروں کو اس کے کیفیت کے سوا کسی چیز میں تحیر نہیں اور پھر حیرت کی زیادتی کی دُعا مانگی اور یہ جان لیا کہ اس مطلوب کو حاصل کرنے میں عقل کو حیرت و سرگردانی کے سوا کسی چیز کی شرکت اور وقعت حاصل نہیں ہے اور یہ بات بڑی لطیف ہے...... نیز یہ احتمال بھی موجود ہے کہ حق تعالیٰ کے وجود کی معرفت خود اپنی ذات کے بارے میں حیرانی کا تقاضہ کرے کیونکہ بندہ جب حق تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے تو اپنے پورے وجود کو اس کے اقتدار کے جال میں دیکھتا ہے جب بندہ کا وجود بھی اس کے سبب سے ہے اور عدم بھی اسی کے حکم سے ہے اور بندہ کا حرکت کرنا اور ساکن ہونا بھی اسی کی قدرت سے ہے تو بندہ متحیر ہو جاتا ہے کہ جب میرے پورے وجود و نظام کا قیام اس کے ساتھ ہے تو میں خود کیا ہوں اور میری حقیقت کیا ہے؟ اسی معنی میں پیغمبر علیہ السلام ﷺ نے فرمایا ہے کہ "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ' فَقَد عَرَفَ رَبَّہ' "(جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا) یعنی جو کوئی اپنے آپ کو فنا کے ساتھ پہچان لیتا ہے وہ اپنے رب کو بقا کے ساتھ پہچان لیتا ہے اور فنا سے عقل اور صفت باطل ہو جاتی ہے اور جب کسی چیز کی ذات عقل میں نہ آتی ہو تو اس کی معرفت حیرانی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی...... اور حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ "اَنْ تصرفَ اَنَّ حرکات الخلق و

سکنا تھم باللہ ''(معرفت یہ ہے کہ تو جان لے کہ مخلوق کی حرکات اور ان کا سکون سب حق تعالیٰ کی وجہ سے ہے)اور اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں، کوئی ذات اسی کی وجہ سے ذات ہے اور اثر اسی کی بدولت اثر، صفت اسی کی وجہ سے صفت، متحرک اسی کے حکم سے متحرک اور ساکن اسی کی مرضی سے ساکن ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی جسم میں طاقت پیدا نہ کریں اور اس کے دل میں ارادہ نہ رکھیں تو بندہ کوئی فعل بھی نہیں کر سکتا۔ اور بندے کا فعل پھر بھی مجازی ہے اور فعل حقیقی خدا تعالیٰ کیلئے ہی ہے اور حضرت محمد بن واسعؒ عارف کی صفت میں کہتے ہیں کہ ''مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ قل کلامُہ ودامَ تحیرہ ''(جس نے حق تعالیٰ کو پہچان لیا اس کی کلام کم اور حیرت دائمی ہوگئی)اس لئے کہ کلام تو اس کے بارے میں کی جاتی ہے جو عبارت کے تحت بیان کیا جا سکتا ہو اور اصولاً عبارت کیلئے ایک حد بھی ہوتی ہے چنانچہ جب معبر(عبارت سے مقصود)محدود نہ ہو کہ اس پر عباوت کی بنیاد رکھی جائے اور عبارت کیلئے ایک متعین حد ہو تو اس غیر محدود معبر کو عبارت کے ذریعہ کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟! اور جب مقصود عبارت سے واضح نہ کیا جا سکے اور بندے کو اس میں کوئی چارہ نہ ہو تو دائمی حیرت کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے...... حضرت شبلیؒ کہتے ہیں کہ ''العجز عن المعرفۃ ''معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس کی معرفت سے عاجز رہے)جس چیز کے بارے میں بندہ اپنی عاجزی کے علاوہ کچھ نہ کر سکے اس کے ادراک کے متعلق زیادہ دعویٰ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ عاجزی اس کیلئے جستجو ہوتی ہے اور طالب جب تک اپنے اوصاف اور اسباب کے اندر قائم رہتا ہے اس پر عجز کا اطلاق درست نہیں ہوتا اور جب ان اسباب و اوصاف سے گزر جاتا ہے اس پر فنا طاری ہو جاتی ہے نہ کہ عاجزی...... اور مدعیوں کا ایک گروہ ''باوجودیکہ ان کی آدمیت کی صفات ثابت ہیں احکام شریعت کی تکلیف کا خطاب ان پر درست ہے اور حق تعالیٰ کی صحبت بھی ان پر قائم ہے'' کہتا ہے کہ معرفت عجز کا نام ہے اور ہم عاجز ہیں اور تمام چیزوں سے باز آ چکے ہیں...... لیکن یہ

بھی گمراہی اور نقصان ہے کیونکہ میں کہتا ہوں کہ تم کس چیز کی طلب سے عاجز آ چکے ہو؟ جب کہ عجز کی دو علامتیں ہیں اور ان میں سے کوئی علامت بھی تمہارے اندر نہیں پائی جاتی۔ ایک علامت طلب کے اسباب کا فنا ہو جانا اور دوسری علامت تجلی الٰہی کا ظہور ہے جس جگہ اسباب کا فنا ہو وہاں عبارت لاشیٔ ہو جاتی ہے اور اگر اپنے عجز کو عبارت میں بیان کریں تو بھی عجز کا لفظ عجز کے بغیر عبارت میں بیان نہیں کیا جا سکتا...... اور جہاں تجلی ربانی کا ظہور ہو وہاں علامتیں ختم ہو جاتی ہیں اور تمیز کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی حتیٰ کہ عاجز وہاں یہ بھی نہیں جان سکتا کہ وہ عاجز ہے یا جس چیز کو اس کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے اس کو عجز کہتے ہیں...... اس لئے کہ عجز حق تعالیٰ کا غیر ہے اور غیر کی معرفت کا اثبات معرفت حق نہیں ہوتا۔ اور جب تک دل میں غیر حق کیلئے بھی گنجائش ہے یا عارف کیلئے غیر حق کو بیان کرنے کی قوت ہے معرفت درست نہیں ہو سکتی اور جب تک عارف غیر حق سے کنارہ کش نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ عارف نہیں ہو سکتا...... اور حضرت ابوحفص حدادؒ فرماتے ہیں کہ ''مُذ عرفتُ اللّٰہَ مَادَخلَ فِی قَلْبِی حَق و لا باطِل ''(میں نے جب سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہے میرے دل میں نہ حق کا خیال گزرا ہے نہ باطل کا اس لئے کہ جب لوگوں کو کوئی کام یا خواہش در پیش ہوتی ہے تو وہ دل کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دل اس کو نفس کے حوالہ کر دیتا ہے جو کہ باطل کا محل ہے اور اگر ان کا عزم پختہ ہو تو وہ دل کی طرف لوٹ آتے ہیں اور دل ان کو روح کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے جو حق اور حقیقت کا سرچشمہ ہے اور جب دل میں غیر حق کا تصور موجود ہو تو عارف کیلئے اس کی طرف رجوع کرنا معیوب محسوس ہوتا ہے۔ پس دوسرے تمام لوگ تو معرفت کی دلیل بھی دل سے طلب کرتے ہیں اور کام و خواہشات کی طلب بھی دل سے ہی کرتے ہیں لیکن جن اہل اللہ کی کوئی ذاتی خواہش ہی نہیں ہوتی وہ دل کی طرف رجوع نہیں کیا کرتے۔ انہیں حق تعالیٰ کے سوا آرام ہی نہیں ملتا کہ وہ حق کو دل سے طلب کریں جب انہیں کسی برہان کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں

نہ کہ دل کی طرف پس جس بندے کا رجوع دل کی طرف ہو اور جس بندے کا رجوع حق تعالیٰ کی طرف ہو ان دونوں میں بڑا واضح فرق ہے...... اور حضرت ابوبکر واسطیؒ کہتے ہیں کہ ''جس آدمی نے حق تعالیٰ کو پہچان لیا وہ ہر چیز سے منقطع ہو گیا بلکہ وہ گونگا اور تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گیا......

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''لا اُحصی ثناءً عَلَیکَ '' (تیری حمد وثنا کرنا میرے بس کی بات نہیں) یعنی جو آدمی خدا کو پہچان لیتا ہے وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے بلکہ تمام عبارتوں سے گنگ اور تمام اوصاف سے خود فنا ہو جاتا ہے جیسا کہ پیغمبر ﷺ کہ جب تک آپ مقام غیبت میں تھے تمام عرب میں زیادہ فصیح تھے کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ ''انا افصح العرب و العجم '' (میں عرب وعجم میں سب سے زیادہ فصاحت والا ہوں) لیکن جب آپ کو غیبت سے حضور حق میں لے جایا گیا تو آپ کہہ اٹھے کہ میری زبان کیلئے تیری حمد وثنا کے کمال کا احاطہ کرنا ممکن نہیں، میں کیا کہوں کہ اپنے قال سے بے قال اور اپنے حال سے بے حال ہو گیا ہوں، تو وہی ہے جو خود ہے میری گفتار تو یا مجھ سے ہو گی یا تجھ سے اگر اپنی ذات کی وجہ سے کچھ کہوں تو اپنی گفتار کی بدولت محجوب ہو جاؤں گا اور اگر تیری ذات کی وجہ سے کہوں تو اپنے کسب کی بدولت تیرے قرب کی تحقیق میں معیوب ہوں گا۔ اس لئے میں کچھ بھی نہیں کہتا'' تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے محمد ﷺ اگر تم کچھ نہیں کہتے تو پھر ہم کہتے ہیں کہ ''لَعمرکَ اِذا مَکتَ عَنْ ثنائی فالکل مِنکَ شائِی '' (مجھے تیری زندگی کی قسم! جب تم اپنے آپ کو میری حمد وثنا کرنے والوں میں سے نہ جانو گے تو میں جہان کے تمام اجزاء کو تیرا نائب کر دیتا ہوں تا کہ وہ سب میری ثنا کریں اور پھر تیرے حوالہ کر دیں تو یوں تمام کائنات کی ثنا دراصل آپ کی طرف سے ہی میری ثنا ہو گی......

توحید کا بیان

خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''وَالٰھُکُمْ اِلٰہ'' وَاحِد'' ''(اور تمہارا معبود ایک ہی ہے) اور نیز فرمایا کہ ''قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَد'' (تم کہہ دو کہ وہ اللہ اکیلا ہے) نیز حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''لا تَتَّخِذُوْ اِلٰھَیْنِ اثْنَیْنِ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہ'' وَّاحِد'' ''(تم دو معبود نہ بناؤ بیشک وہ معبود برحق اکیلا ہی ہے)...... اور پیغمبر علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے کہ ''تم سے پہلے ایک شخص گزرا ہے جس نے عقیدہ توحید کو درست کرنے کے علاوہ کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا، جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا اور میری راکھ کو باریک کر لینا، اور پھر جس دن تیز ہوا چلے میری نصف راکھ کو دریا میں اور نصف کو بیابان میں اُڑا دینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا کہ جو کچھ تمہارے اندر پھیلایا گیا ہے اس کی حفاظت کرنا اور اسے جمع کر رکھنا ہوا اور پانی قیامت تک اسے سنبھالے رکھیں گے۔ پھر حق تعالیٰ اس کو قیامت کے دن پیدا کریں گے اور کہیں گے کہ تجھے کس خیال نے اپنے آپ کو اس طرح جلوانے پر آمادہ کیا تھا۔ وہ عرض کرے گا بار خدایا میں بڑا سخت گنہگار تھا اور مجھے تیری بارگاہ سے شرم آتی تھی...... حق تعالیٰ ''صرف توحید کے عقیدے کی بنا پر اس کی بخشش فرما دیں گے''

توحید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے اکیلا ہونے کا حکم لگایا جائے اور اس کے اکیلا ہونے کا صحیح علم حاصل ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے کہ اس کی ذات وصفات میں اس کا کوئی ثانی نہیں اور اس کے افعال میں کوئی اس کے برابر اور شریک نہیں اور موحدوں نے اس کو اسی طرح جانا ہے لہٰذا موحدوں کے اس کو اس طرح اکیلا جاننے کو توحید کہتے ہیں...... اور توحید کی تین قسمیں ہیں...... اول حق تعالیٰ کی توحید حق تعالیٰ کیلئے اور یہ حق تعالیٰ کا اپنی

یکتائی کے بارے میں علم ہے..... دوم حق تعالیٰ کی توحید مخلوق کیلئے یہ حق تعالیٰ کا اپنے بندوں کو توحید کا حکم اور بندوں کے دل میں توحید کا جذبہ پیدا کرنا ہے..... سوم مخلوق کا حق تعالیٰ کی توحید کو ماننا اور یہ خداوند تعالیٰ کی توحید کے بارے میں ان کا علم ہے..... پس بندہ جب حق تعالیٰ کا عارف ہو جاتا ہے تو اس کی وحدانیت پر اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہے کہ ''حق تعالیٰ اکیلا ہے جو وصل اور فصل کو قبول نہیں کرتا (یعنی نہ کوئی اس کے ساتھ متصل و پیوست ہو سکتا ہے اور نہ اس سے کوئی ٹکڑا جدا ہو سکتا ہے) اس کی ذات میں دوئی جائز نہیں۔ اس کی یکتائی عددی نہیں کہ دوسرے عدد کے اثبات سے وہ دو ہو جائیں اور اس کی وحدانیت عددی ہو جائے یعنی وہ ان دو کا عدد واحد ہو..... اور وہ محدود نہیں کہ اس کیلئے جہات کا تعین کیا جا سکے..... اس کیلئے مکان نہیں اور نہ وہ مکان کے اندر ہے کہ مکان کے اثبات کی ضرورت ہو۔ کیونکہ اگر وہ مکان کے اندر متمکن ہوتا تو مکان کیلئے بھی تو ایک مکان ہوتا اس صورت میں فعل و فاعل اور قدیم و حادث کا حکم باطل ہو جاتا..... وہ عرض بھی نہیں کہ کسی جوہر کا محتاج ہو اور اس میں حال ہو کر اپنے محل میں باقی رہے وہ جوہر بھی نہیں کہ اس کا وجود اپنے جیسے جواہر کے بغیر درست نہ ہو۔ وہ طبعی نہیں کہ حرکت و سکون کا مبدا اقرار پائے وہ روحی بھی نہیں کہ نیستی (فنا) کا محتاج ہو وہ جسمی بھی نہیں کہ اس کے ساتھ اجزا ملے ہوئے ہوں۔ وہ چیزوں میں قوت اور حال بھی نہیں کہ ان چیزوں کی جنس سے ہو..... وہ کسی چیز کے ساتھ پیوند نہیں کہ اس چیز کو اس کا جز کہا جا سکے..... وہ تمام نقائص سے بری اور تمام عیوب سے پاک بلکہ تمام عیوب سے بہت بلند ہے کوئی اس کا مثل نہیں کہ وہ اپنی مثل کے ساتھ مل کر دو وجود ہو جائیں..... اس کا کوئی فرزند نہیں کہ اس کی نسل اپنے اصل کا تقاضہ کرے۔ اس کی ذات و صفات پر تغیر روا نہیں کہ کسی چیز سے اس کا وجود متغیر ہو جائے اور متغیر کے حکم میں تغیر کی طرح ہو جائے۔ وہ ان تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہے جو مومن اور موحد پوری بصیرت کے ساتھ اس کیلئے ثابت کرتے ہیں کہ اس نے خود اپنے آپ کو ان صفات سے موصوف کیا

ہے۔ وہ ان صفات سے بری ہے جو ملحد و بے دین لوگ اپنی خواہشات کے ساتھ اس کیلئے بیان کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ موصوف نہیں کیا ہے...... وہ ہمیشہ سے زندہ اور سب کچھ جاننے والا ہے...... وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے وہ ارادہ کرنے والا اور ہر شے پر قادر ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو دیکھنے والا ہے وہ کلام کرنے والا اور ہمیشہ کیلئے باقی رہنے والا ہے...... اس کا علم اس کے اندر حال نہیں اور اس کی قدرت اس کے اندر منجمد نہیں...... اس کا دیکھنا اور سننا اس کے اندر متجدد (ہر بار نیا پیدا ہونا) نہیں اور اس کا کلام اس میں ایسا نہیں کہ اس کے اجزاء ہوسکیں اور وہ نو پیدا شدہ ہو...... وہ ہمیشہ سے اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے کائنات کی معلومات اس کے علم سے باہر نہیں...... اور موجودات کیلئے اس کے ارادے کے بغیر چارہ نہیں...... وہ وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے اسے جانتا ہے...... مخلوق کا اس پر کوئی زور نہیں۔ اس کے احکام سب حق ہیں کہ اس کے دوستوں کو سوائے تسلیم چارہ نہیں، اس کا فیصلہ اٹل ہے کہ اس کے دوستوں کو اس پر عمل کئے بغیر مجال نہیں...... خیر اور شر کا مقدر کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی امید اور خوف کے لائق نہیں...... نفع کا پیدا کرنے اور نقصان کا فیصلہ کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں...... اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے اور اس کا پورا ہونا ضروری ہے۔ کسی کو بھی اس کے اصل کی خوشبو نہیں ملی اور اس تک رسائی کی کوئی سبیل نہیں اس کا دیدار بہشتیوں کیلئے جائز ہے اس کیلئے نہ کوئی تشبیہ ہے نہ جہت...... تقابل اور مواجہہ اس کی ذات پر متصور نہیں اور دنیا میں اس کے دوستوں کیلئے اس کا مشاہدہ جائز ہے اور اس کا انکار شرط نہیں...... جو شخص اس کو اس طرح جانتا ہے وہ ملحد اور بے دین لوگوں میں سے نہیں اور جو اس کو اس کے خلاف جانتا ہے اس کا کوئی دین اور ایمان نہیں...... اس معاملے میں اصولی اور وصول طور پر کلام بہت ہے لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی پر اختصار کیا ہے۔

میں نے جو کہ علی بن عثمان ہجویریؒ ہوں اس فصل کے آغاز میں کہہ دیا تھا کہ توحید

کسی چیز پر وحدانیت کا حکم لگانے کو کہتے ہیں اور یہ حکم علم کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ پس اہل سنت بھی حق تعالیٰ کی یکتائی کا حکم کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے لطیف کاریگری اور عجیب افعال کو دیکھا ہے اور ان بے شمار لطائف وعجائب میں غور کیا ہے اور ان کا خود بخود موجود ہونا محال جانا ہے اور انہوں نے ہر چیز میں حادث ہونے کی علامات پائی ہیں لامحالہ ان کیلئے کوئی فاعل ہونا چاہئے جو ان کو عدم سے وجد میں لے آئے۔ یعنی جہان کو زمین و آسمان آفتاب و ماہتاب، خشکی وتری اور پہاڑ وصحرا کے ساتھ اور ان صورتوں اور شکلوں کو حرکت وسکون علم وگویائی اور موت وحیات کے ساتھ پیدا کرے۔ پس ان تمام چیزوں کا صانع کے بغیر چارہ نہیں اور پھر یہ چیزیں دو یا تین کاریگروں سے بھی مستغنی ہوں اور ایک ہی کامل حیی۔ قائم قادر۔ مختار اور دوسرے شرکاء کی شرکت سے بے نیاز صانع ان کو پیدا کرنے والا ہو...... اور جب کسی ایک فعل کیلئے ایک فاعل کے بغیر چارہ کوئی نہیں کیونکہ اگر ایک ہی فعل کیلئے دو فاعل ہوں تو ان میں سے ہر ایک کیلئے دوسرے کا محتاج ہونا ضروری ہے۔ تو لامحالہ بغیر کسی شک وریب کے یقینی علم کے ساتھ یہی ہونا چاہئے کہ فاعل ایک ہی ہو...... اس معاملے میں مثنویوں (دو خدا ماننے والوں) نے نور اور ظلمت کو ثابت کر کے۔ آتش پرستوں نے یزدان واہرمن (خالق خیر اور خلق شر) کو ثابت کر کے طبیعی فلاسفہ نے طبیعت اور قوت کو ثابت کر کے فلکیوں نے سات ستاروں کو ثابت کر کے اور معتزلہ نے بہت سے خالق اور صانع ثابت کر کے ہمارے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ میں نے ایک چھوٹی سی دلیل کے ذریعہ ان سب کو رد کر دیا ہے یہ کتاب ان کے باطل دعوؤں کی تردید کی گنجائش اپنے اندر نہیں پاتی۔ البتہ اس علم کے طالب کو یہ مسئلہ میری دوسری تصنیف میں تلاش کرنا چاہئے جو میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے اور اس کا نام ''الرعایة بحقوق اللّٰه'' رکھا ہے یا پھر متقدمین اہل اصول رحمہم اللہ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

اب میں انشاء اللہ توحید کے بارے میں مشائخ کے بیان کردہ رموز کی طرف

رجوع کرتا ہوں۔......والا مر بیدہ

فصل

حضرت جنیدؒ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا"التوحیدُ اِفراد القدمِ عنِ الحدثِ "(قدیم کو حادث سے جدا کرنے کا نام توحید ہے) یعنی یہ کہ تو قدیم کو حوادث کا اور حوادث کو قدیم کا محل نہ جانے اور یہ بھی جان لے کہ حق تعالیٰ قدیم ہے اور تو حادث اور تیری جنس سے کوئی چیز اس کے ساتھ پیوست نہیں ہو سکتی اور اس کی صفات سے کوئی چیز تیرے اندر مل نہیں سکتی کیونکہ قدیم کیلئے حادث کے ساتھ کوئی مجانست نہیں ہوتی اس لئے کہ قدیم تو حادث چیزوں کے وجود سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ جب حوادث کے وجود سے پہلے بھی قدیم تھا اور ان حوادث کا محتاج نہ تھا تو ان حوادث کے پیدا ہونے کے بعد بھی وہ ان کا محتاج نہ ہوگا۔ یہ ان لوگوں کا اختلاف ہے جو روح کو قدیم کہتے ہیں اور ان کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ جب کوئی شخص قدیم کو حادث میں اترنے یا حلول کرنے والا کہے یا حادث کو قدیم کے ساتھ متعلق مانے تو پھر حق تعالیٰ کے قدیم ہونے اور دنیا کے حادث ہونے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ مذہب دہریوں کا ہے۔ ہم اس طرح کے برے عقائد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں خلاصہ کلام یہ کہ حادث چیزوں کی تمام حرکات حق تعالیٰ کی توحید کے دلائل ہیں اور خداوند عزوجل کی قدرت پر گواہ اور اس کے قدیم ہونے کا ثبوت ہیں۔ لیکن انسان اس سے بڑا غافل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ کو چاہتا ہے اور حق تعالیٰ کی یاد کے بغیر آرام کا متلاشی ہے حالانکہ جب تیرے نیست اور ہست کرنے میں اس کا کوئی شریک نہیں تو یہ بھی محال ہے کہ تیری تربیت میں اس کا کوئی شریک ہو سکے......

حضرت حسین بن منصورؒ کہتے ہیں کہ"اولُ قدمٍ فی التوحید فناء التفرید"(توحید میں پہلا قدم تفرید کا فنا ہے) اس لئے کہ تفرید کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو عیوب و آفات سے

جدا کرنے کا حکم لگایا جائے اور توحید کسی چیز پر وحدانیت کا حکم لگانے کو کہتے ہیں۔ پس تفرید میں غیر کا ثابت کرنا بھی لازم آتا ہے کہ اس کے بغیر ان صفات کو بیان نہیں کیا جاسکتا اور وحدانیت کے ساتھ غیر کا اثبات درست نہیں اور حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کو بھی اس صفت کے ساتھ نہ موصوف کیا جاسکتا ہے نہ جانا جاسکتا ہے۔ پس تفرید ایک مشترک لفظ ہے جو ممکن اور واجب دونوں پر بولا جاسکتا ہے جب کہ توحید شرکت کی نفی کرنے والا لفظ ہے۔ پس توحید کا پہلا قدم ہی شریک کی نفی کرنا اور راستے سے اپنے مزاج کو دفع کرنا ہے کیونکہ راستے میں مزاج کا عمل دخل ایسے ہی ہے جیسے چراغ کے ذریعہ راستے کو تلاش کرنا ہوتا ہے..... حضرت حضریؒ فرماتے ہیں کہ "**اصولنا فی التوحید خمسة اشیا رفع الحدث و اثبات القدم و هجر الامکان و مفارقة الاخوان و نسیان ما علم و جهل**" (توحید میں ہمارے پانچ اصول ہیں۔ حق تعالیٰ سے حادث ہونے کی نفی کرنا..... قدیم ہونا ثابت کرنا..... اپنے لئے وطنوں کا چھوڑ دینا۔ بھائیوں سے جدا ہو جانا..... اور معلوم و نا معلوم کو بھول جانا) رفع حدث کے معنی یہ ہیں کہ توحید کی مکارنت سے محدثات کی نفی کی جائے اور حق تعالیٰ کی ذات سے حادث ہونے کو محال سمجھا جائے اور اثبات قدم سے مراد خدا تعالیٰ کے ہمیشہ سے ہونے کا اعتقاد رکھنا ہے جس کی تشریح اس سے قبل حضرت جنیدؒ کے قول میں میں بیان کر چکا ہوں اور ہجر اوطان سے مراد، نفس کی پسندیدہ چیزوں، دل کی راحتوں اور طبیعت کی قرارگاہوں کو چھوڑ دینا اور راہ حق کا ارادہ کرنے والے کا دنیا کی رسومات، بلند مقامات، بہتر حالات اور بڑی عزتوں سے کنارہ کش ہو جانا ہے..... اور مفارقت اخوان کے معنی مخلوق کی صحبت سے اعراض اور حق تعالیٰ کی صحبت کی طرف متوجہ ہونا ہے کیونکہ موحد کے دل پر غیر حق کے خیالات میں سے جو خیال بھی گزرتا ہے اس کیلئے حجاب ہوتا ہے اور اسی مقدار میں وہ آفت ہوتا ہے جس مقدار میں موحد کا اس کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اس لئے کہ اس پر سب امتوں کا اتفاق ہے کہ توحید حق تعالیٰ پر ارادوں کے جمع ہونے کو کہتے ہیں جب

کہ غیر کے ساتھ آرام پانا ارادوں کے تفرقے کی علامت ہے...... اور نسیان ماعلم و جہل کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کا علم یا تو ماہیت و کیفیت کے بارے میں ہوتا ہے یا پھر جنس و طبیعت کے بارے میں۔ اس طرح مخلوق کا علم توحید کے بارے میں جو کچھ بھی ثابت کرتا ہے خود توحید اس کی نفی کرتی ہے اور جو چیز مخلوق کی جہالت ثابت کرتی ہے خود ان کا اپنا علم اس کے خلاف ہوتا ہے اس لئے کہ جہالت توحید نہیں ہے اور توحید کا تحقیق پر مبنی علم غیر کے تصرف کی نفی کے بغیر درست نہیں ہوتا۔ جب کہ مخلوق کے علم اور جہالت میں تصرف کے سوا کچھ نہیں کہ ایک ان میں سے بصیرت پر مبنی ہوتا ہے اور دوسرا غفلت پر...... مشائخ میں سے ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت خضریؒ کی محفل میں بیٹھا تھا کہ مجھے نیند آ گئی اور میں نے خواب کی حالت میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے زمین پر آئے ہیں اور کچھ دیر وہ حضرت خضریؒ کا بیان سنتے رہے۔ پھر ان میں ایک دوسرے سے کہنے لگا کہ جو کچھ یہ بزرگ کہتا ہے یہ توحید کا علم ہے عین توحید کا علم نہیں۔ جب میں بیدار ہوا تو آپ توحید کا ہی بیان کر رہے تھے۔ آپ نے رُخ میری طرف کر کے فرمایا ''اے فلاں! توحید کے بارے میں علم کے علاوہ کچھ بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

حضرت جنیدؒ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا...... توحید یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے حضور ایک ایسا جسم بن جائے کہ اس میں اپنے نفس کے تصرفات فنا ہو جائیں اور توحید کے سمندر اور حق تعالیٰ کے احکام قدرت کے جاری ہونے میں صرف حق تعالیٰ کا تصرف ہی کارفرما ہو اور وہ حق تعالیٰ کے حقیقی قرب میں اور اس کی توحید سے پوری طرح آگاہ ہو جانے کی وجہ سے اپنے احساس اور ارادے سے اس طرح بے خبر ہو جائے کہ وہ صرف حق تعالیٰ کو پکارے اور صرف اسی کی دعوت کا جواب دے اور یہ اس طرح ہو جائے کہ گویا بندے کی آخری حالت اس کی پہلی حالت کی طرف راجع ہو۔ یعنی یوں ہو جائے جیسے وجود میں آنے سے پہلے تھا'' مراد اس سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اختیار میں موحد کا اپنا

اختیار نہ رہے اور حق تعالیٰ کی وحدانیت میں اپنی ذات کی طرف توجہ ہی نہ رہے کیونکہ قرب حق کے محل میں اس کا اپنا نفس فانی ہو جاتا ہے اور اس کی حس چلی جاتی ہے اور صرف حق تعالیٰ کے احکام ہی اس پر جاری ہوتے ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندہ اپنے تصرف کے فنا میں اس طرح ہو جائے کہ جس طرح ازل میں توحید کا عہد کرتے وقت ایک ذرہ تھا کہ کہنے والے بھی حق تعالیٰ اور اس کی طرف سے جواب دینے والے بھی حق تعالیٰ ہی تھے حالانکہ بظاہر نشانہ وہ ذرہ تھا اور جو بندہ اس طرح ہو جائے اس کے ساتھ مخلوق کو کوئی تعلق نہیں رہتا نہ اس کو کسی کے ساتھ کوئی انس رہتا ہے کہ ان کی دعوت کو قبول کرے اور اس قول میں صفات بشریت کے فنا اور جلال الٰہی کے غلبہ کشف کی حالت میں جذبہ تسلیم و رضا کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بندہ کو اس کے اوصاف سے فانی کر دے۔ تاکہ وہ محض ایک آلہ اور ایک ایسا لطیف جوہر بن جائے کہ اگر اس کے جگر میں نیزہ ماریں تو بلا تمیز پار ہو جائے اور اگر اس کی صحیح و سلامت پیٹھ پر ماریں تو بے تصرف اس کو کاٹ دیئے خلاصہ یہ کہ وہ تمام اوصاف سے فانی ہو جائے اس کا جسم اسرار الٰہی کا مرکز بن جائے حتیٰ کہ اس کا نطق حوالہ حق ہو جائے اور اس کے فعل کی نسبت بھی حق تعالیٰ کی طرف ہو اور اس کی صفت کا قیام بھی حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اور صرف حجت کے اثبات کیلئے شریعت کے احکام اس پر باقی رہیں ورنہ وہ تمام امور کے دیکھنے سے فانی ہو چکا ہو اور یہی صفت پیغمبر علیہ السلام کی تھی کہ جب آپ کو معراج کی رات مقام قرب تک پہنچایا گیا تو مقام کیلئے تو فاصلہ تھا لیکن آپ کے قرب کیلئے کوئی فاصلہ نہ تھا۔ آپ کا حال لوگوں کے عقل میں آنے والے حال سے بہت بلند اور انسانی وہم و گمان سے بھی بہت بعید ہو گیا یہاں تک کہ جہاں نے آپ کو کھو دیا اور آپ نے بھی اپنے آپ کو فنائے صفت میں اس حد تک کھو دیا کہ طبقوں کی ترتیب حیران ہو گئی اور مزاج کا اعتدال پریشان ہو گیا۔ نفس دل کے مقام پر پہنچ گیا اور دل جان کے مقام پر اور جان باطن کے درجہ پر پہنچ گئی اور باطن قرب الٰہی کی صفت سے مکمل طور پر موصوف ہو کر سب احوال

سے جدا ہو گیا آپ نے چاہا کہ وجود معدوم ہو کر جسم کو چھوڑ دے لیکن چونکہ حق تعالیٰ کا مقصد اس سے حجت قائم کرنا تھا اس لئے حکم ہوا اپنے حال پر قائم رہئے" آپ نے اس حکم سے تقویت پائی اور یہ تقویت آپ کیلئے قوت بن گئی اور اپنی ہستی کے فنا سے حق تعالیٰ کی بقا آپ پر ظاہر ہوئی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "اِنّی لستُ کا حدِکُم اِنِی ابیتُ عند ربی فیطعمنی وَیَسْقِنی" (میں تم میں سے کسی ایک جیسا نہیں ہوں میں تو اپنے رب کے ہاں رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے) یعنی میری زندگی اور پائندگی حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور نیز فرمایا کہ "لِی مَعَ اللّٰہ وقت لاَ یسع فیه ملک" مقرب وَلاَ نبی مرسل" "(میرے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت مخصوص ہے کہ اس میں نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہے اور نہ کسی نبی مرسل کی)...... حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کی ذات علم کے ساتھ موصوف ہے۔ نہ تو ادراک کے احاطے میں آ سکتی ہے اور نہ ہی دنیا میں آنکھوں سے اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایمان کی حقیقتوں میں حد اور حلول کے بغیر موجود ہے۔ البتہ آخرت میں آنکھیں اس کو اس کی ملک اور قدرت میں ظاہری و باطنی طور پر دیکھ لیں گی اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی ذات کی حقیقت کی معرفت سے حجاب میں رکھا ہے اور اپنی ذات پر آیات و براہین سے مخلوق کو رہنمائی کی ہے۔ قلوب اس کی معرفت حاصل کر لیتے ہیں لیکن عقلیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، آنکھیں اس کا احاطہ اور اس کی نہایت کا ادرک کئے بغیر قیامت کے دن اس کے دیدار سے مشرف ہونگی...... توحید کے جملہ احکام کیلئے یہ کلام جامع حیثیت رکھتا ہے...... اور حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ "اشرف کلمةٍ فی التوحید قولُ ابی بکر رضیَ اللہ عنه سبحان مَنْ لَمْ یَجْعَل لخلقِهٖ سبیلاً اِلیٰ معرفة الا بالعجز عن معرفتهٖ" (توحید سے متعلق سب سے بہترین اور بزرگ جملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں کیلئے اپنی معرفت میں کوئی راہ نہیں رکھی سوائے معرفت سے اعتراف عجز

کے) کچھ لوگ اس کلمہ کے سمجھنے میں غلطی میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کی معرفت سے عاجز ہونا گویا معرفت کا معدوم ہونا ہے حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ عجز کسی چیز کے موجود ہونے کی صورت میں ہی ہوتا ہے کسی چیز کے معدوم ہونے کی حالت میں تو عجز متصور ہی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مردہ زندگی سے عاجز نہیں ہوتا کیونکہ وہ موت میں موت سے عاجز ہوتا ہے کہ اس کی قوت کیلئے عجز کا اطلاق ہی محال ہے اور اندھا۔ بینائی سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ وہ نابینا ہونے کی حالت میں نابینائی سے عاجز ہوتا ہے اسی طرح اپاہج کھڑا ہونے سے عاجز نہیں ہوتا کہ بیٹھنے میں بیٹھنے سے عاجز ہو۔ جیسا کہ عارف، معرفت کے موجود ہونے کی حالت میں معرفت سے عاجز نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کیلئے گویا ضروری ہوتا ہے پس حصرت صدیق اکبرؓ کے اس قول کو ہم اس بات پر محمول کریں گے جو حضرت ابوسہل معلوکیؒ اور استاد ابوعلی دقاقؒ نے فرمائی ہے کہ معرفت تو ابتداء میں ہوتی ہے انتہا میں جا کر وہ ضروری ہو جاتی ہے، اور علم ضروری وہ ہوتا ہے کہ صاحب علم اس کی موجودگی کی حالت میں ہر قسم کے نفع یا نقصان سے مضطر اور عاجز ہو...... پس اس قول کے مطابق توحید، بندے کے دل میں حق تعالیٰ کا فعل ہوگا۔ پھر حضرت شبلیؒ کہتے ہیں کہ "التوحید حجاب الموجدعن جمال الاحــدیة" (توحید، موحد کیلئے حق تعالیٰ کی احدیت کے جمال سے حجاب ہوتی ہے) اس لئے کہ وہ توحید کو بندے کا فعل کہتے ہیں اور بندے کا فعل مشاہدہ حق کیلئے ہرگز علت نہیں بن سکتا اور جو چیز عین کشف میں کشف کیلئے علت نہ بن سکے وہ حجاب ہی ہوتی ہے اور بندہ اپنے تمام تر اوصاف کے ساتھ غیر حق ہوتا ہے کیونکہ اگر اپنی صفت کو وہ حق شمار کرنے لگے تو لامحالہ اس صفت کا موصوف بھی حق ہی شمار ہوگا۔ جو کہ یہ خود ہے اس وقت موحد، توحید اور احد تینوں ایک دوسرے کے وجود کیلئے علت بن جائیں گے اور یہ تو بعینہ "ثالث ثلاثہ" والا فلسفہ بن جائے گا (جو کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے) اور جو صفت توحید میں طالب کیلئے اپنے آپ کو فنا کرنے میں مانع ہو وہ ابھی تک اس صفت کی بدولت محجوب قرار پائے گی موقد

نہیں ''لِاَنَ ماسواہُ من الموجودات باطل ''(اس لئے کہ موجودات میں حق تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے باطل ہے) جب یہ درست ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ کے علاوہ ہے وہ باطل ہے تو طالب بھی تو حق تعالیٰ کا ماسویٰ ہے لہذا طالب کی صفت حق تعالیٰ کے جمال کے کشف میں باطل ہوگی۔ یہی ''لاَ اِلٰہ' اِلاَّ اللّٰہُ '' کی تفسیر ہے۔ حکایات میں مشہور ہے کہ جب حضرت ابراہیم خواصؒ کوفہ میں حضرت حسین بن منصورؒ کی زیارت کیلئے آئے تو آپ نے دریافت کیا کہ اے ابراہیم تم نے اپنا وقت کس چیز کی تلاش میں گزارا ہے؟ انہوں نے کہا ''اپنے لئے توکل کو درست کرنے میں مصروف رہا ہوں۔ تو حضرت حسین بن منصورؒ نے کہا ''ضیعتَ عُمرکَ فی عمران باطنک فائنِ انت فی انضاء فی التوحید ''(تم نے اپنی تمام عمر اپنے باطن کی تعمیر میں ضائع کردی ہے تو فنا فی التوحید کا مقام تجھے کیسے حاصل ہوسکتا ہے) توحید کے بیان میں مشائخ کے اقوال بہت ہیں۔ ایک گروہ نے تو اس کو فنا سے تعبیر کیا ہے کیونکہ فنا پر معیت درست نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اپنے فنا کے علاوہ کوئی چیز توحید کی صفت نہیں بن سکتی۔ ان تمام اقوال کو جمع اور تفرقہ کے معنوں پر ہی قیاس کرنا چاہئے تاکہ اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

اور میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ توحید حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کیلئے وہ اسرار ہیں جو عبارت سے بیان نہیں کئے جاسکتے کہ کوئی شخص ان کو عبارت سے مزین کر کے بیان کر سکے کیونکہ عبارت اور جس کو اس عبارت میں بیان کیا جارہا ہے آپس میں غیر ہوتے ہیں اور توحید کے معاملے میں غیر کا اثبات بجائے خود شرک کا اثبات ہے اس طرح یہ ایک لہو اور کھیل ہوگا جب کہ موحد اللہ والا ہوتا ہے لہو ولعب میں مشغول ہونے والا نہیں ہوتا..... یہ تھے مختصراً احکام توحید اور اہل معرفت کے اقوال اور مسلک جو میں نے بیان کردئے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا کشف حجاب

ایمان کی حقیقت

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ '' (اے ایمان والو! اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ) نیز دوسرے کئی مقامات پر فرمایا ہے ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' (اور پیغمبر علیہ کا ارشاد ہے کہ ''الایمان اَن تومِن باللّٰہِ و ملئکتہ و کتبہٖ '' (الحدیث) ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لائے) ایمان لغت کے اعتبار سے تصدیق کا نام ہے اور اصطلاح شریعت میں اس کا حکم اور معنی بیان کرنے میں اہل علم کے بہت سے اقوال اور بہت سا اختلاف ہے۔ چنانچہ معتزلہ تمام علمی اور عملی عبادات کو ایمان قرار دیتے ہیں اور اسی لئے وہ انسان کو گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر ایمان سے خارج سمجھتے ہیں۔ خارجیوں کا بھی یہی قول ہے اور وہ بھی انسان کو اس کے گناہ کی وجہ سے جس کا اس نے ارتکاب کیا ہو کافر قرار دیتے ہیں...... ایک دوسرا گروہ محض زبانی قول کو ہی ایمان کہتا ہے اور ایک تیسرا گروہ ہے جو صرف معرفت پر بھی ایمان کا اطلاق کرتا ہے...... متکلمین اہل سنت کی ایک جماعت مطلقاً تصدیق کو ہی ایمان قرار دیتی ہے میں نے اس کے بیان میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی تاہم اس جگہ میری مراد مشائخ صوفیہ کے اعتقاد کو ثابت کرنا ہے چنانچہ ایمان کی تعریف کے مسئلہ پر جمہور مشائخ کے دو گروہ ہیں حضرات فضیلؒ بن عیاض، بشر حافیؒ، خیر النساجؒ سمنون المحبؒ، ابوحمزہ بغدادیؒ، ابو محمد حریریؒ اور اسی ذوق کے دوسرے حضرات پر مشتمل گروہ یہ کہتا ہے کہ قول، تصدیق اور عمل تینوں کے مجموعے کا نام ایمان ہے۔ فقہا اور اہل یقین کی ایک جماعت بھی ان کی تائید کرتی ہے جب کہ حضرات ابراہیم بن ادھمؒ، ذوالنون مصریؒ بایزید بسطامیؒ ابوسلیمان دارائیؒ حارث محاسبیؒ جنید بغدادیؒ، سہل بن عبداللہ تستریؒ، شفیق بلخیؒ، حاتم اصمؒ، محمد بن فضل البلخیؒ کا قول یہ

ہے کہ ایمان، قول اور تصدیق سے عبارت ہے ان کے علاوہ فقہائے امت کی ایک جماعت جو امام مالک، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ پر مشتمل ہے پہلے قول کے مطابق خیال رکھتی ہے۔ جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ حسین بن فضل البلخیؒ اور امام ابوحنیفہ کے اصحاب مثلاً محمد بن الحسن داؤد طائی اور امام ابو یوسفؒ اس دوسرے قول کے مطابق رائے رکھتے ہیں۔ تاہم درحقیقت یہ اختلاف محض لفظی ہے معنی میں کوئی اختلاف نہیں۔ اب میں اختصار کے ساتھ ایمان کے معنی کو انشاء اللہ بیان کرتا ہوں تا کہ حقیقت کا علم ہو جائے اور میں اس اختلاف میں کسی کو ایمان کے بارے میں اصل عقیدے کا مخالف نہیں سمجھتا...... وباللہ التوفیق۔

فصل

جان لو کہ اہل سنت و جماعت اور اہل تحقیق و معرفت کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ ایمان کی ایک اصل ہے اور ایک فرع۔ ایمان کی اصل تو یہ ہے کہ دل کے ساتھ تصدیق کی جائے اور حق تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرنا اور ان کی رعایت رکھنا ایمان کی فرع ہے عرف عام اور عادت میں کسی چیز کی فرع کو ہی استعارہ کے طور پر اصل کے نام کے ساتھ پکارتے ہیں۔ جیسا کہ تمام لغات میں آفتاب کی روشنی کو آفتاب ہی کہتے ہیں اسی معنی کے لحاظ سے وہ گروہ اطاعت کو ہی ایمان کا نام دیتا ہے کہ اس اطاعت کے بغیر بندہ عذاب سے مامون نہیں ہوسکتا، اور محض تصدیق اس وقت تک عذاب سے نہیں بچا سکتی جب تک احکام الٰہی کو بجا نہ لایا جائے پس جو بندہ جتنی زیادہ اطاعت کرے گا وہ اتنا ہی زیادہ عقوبت سے محفوظ قرار پائے گا۔ لہذا جب یہ اطاعت تصدیق اور قول کے ساتھ مل کر عقوبت سے امن کا سبب بنتی ہے تو ان حضرات نے اسی کو ہی ایمان سے تعبیر کر دیا...... ایک دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ عقوبت سے امن کی علت معرفت ہے نہ کہ اطاعت۔ کیونکہ کسی بندے کو اگرچہ اطاعت حاصل ہو لیکن جب تک اسے معرفت حاصل نہ ہو محض اطاعت اس کیلئے قطعاً مفید نہیں لیکن

اگر معرفت حاصل ہو تو اطاعت اگر چہ حاصل نہ بھی ہو تو بالاخر بندہ نجات پالے گا کیونکہ اس کا معاملہ مشیت الٰہی کے سپرد ہے کہ حق تعالیٰ خواہ اس کو اپنے فضل سے معاف کر دیں۔ یا پیغمبر ﷺ کی شفاعت کے نتیجہ میں بخش دیں اور یا پھر اس کو اس کے گناہوں کی مقدار سزا دے کر پھر دوزخ سے نجات دے دیں اور جنت میں منتقل کر دیں پس جب اصحاب معرفت (حق تعالیٰ کے وجود اور توحید کو پہچاننے والے) گنہگار ہونے کے باوجود معرفت کی بنیاد پر دوزخ میں ہمیشہ نہ رہیں گے اور اصحاب عمل معرفت کے بغیر محض عمل کی بنیاد پر بہشت میں داخل نہ ہو سکیں گے تو معلوم ہو گیا کہ اس جگہ عذاب سے محفوظ رہنے کی علت اطاعت نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "لن یخجو احد کم بعملہ قیل ولا انت یا رسول اللہ قال ولا انا الا ان یتغمد فی اللہ برحمتہ" (تم میں سے کوئی بھی محض اپنے عمل کے سبب نجات حاصل نہیں کر سکے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے نجات نہیں پا سکیں گے؟ تو آپ نے فرمایا "ہاں میں بھی محض اپنے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اسی صورت میں خلاصی پا سکوں گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے) پس تحقیق اور حقیقت کے اعتبار سے اور امت کے اتفاق کے ساتھ یہ بات ثابت ہوئی کہ حق تعالیٰ کی معرت کا نام ایمان ہے اور اس کا اقرار یہ ہے کہ عمل کو قبول کیا جائے...... اور جو شخص بھی حق تعالیٰ کو پہچانتا ہے اس کے اوصاف میں سے کسی وصف کی وجہ سے ہی پہچانتا ہے۔ اس کے حسن اوصاف تین طرح کے ہیں ان میں سے بعض کا تعلق اس کے جمال کے ساتھ ہے۔ بعض کا جلال کے ساتھ اور بعض وہ ہیں جن کا تعلق اس کے کمال کے ساتھ ہے پس مخلوق کیلئے اس کے کمال سے متعلق اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس کے کمال کا اثبات کریں اور اس سے ہر قسم کے نقصان کی نفی کریں اسی طرح جلال اور جمال کے متعلق بھی تمام خوبیوں کو اسی کیلئے ثابت کرنے اور تمام نقائص کو اس سے نفی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں...... لہذا جس بندے کا شاہد معرفت میں حق تعالیٰ

کا جمال ہو وہ ہر وقت حق تعالیٰ کے دیدار کا مشتاق رہتا ہے...... اور جس بندے کا شاہد حق تعالیٰ کا جلال ہو وہ ہر وقت اپنے اوصاف سے نفرت کرنے میں مشغول رہتا ہے اور اس کا دل خوف الٰہی میں مبتلا رہتا ہے، پس شوق دیدار، محبت کی تاثیر ہے اور اسی طرح نفرت بشریت کے اوصاف میں سے ہے۔ لہٰذا اوصاف بشریت سے پردہ عین محبت کے علاوہ نہیں اٹھ سکتا...... پس اب ایمان اور معرفت محبت کا نتیجہ ہیں اور محبت کی علامت، اطاعت ہے اس لئے کہ جب دل محل مشاہدہ ہے آنکھ محل دیدار اور جان جسم کیلئے محل عبرت ہے اور دل مشاہدے کا مقام ہے تو جسم کو چاہئے کہ حکم کی خلاف ورزی نہ کرے اور جس آدمی کا جسم حق تعالیٰ کے حکم کا تارک ہو اس کو معرفت الٰہی کی کوئی خبر نہیں ہوتی...... اس دور کے صوفیوں میں یہ مصیبت ظاہر ہو چکی ہے کہ بے دینوں کے ایک گروہ نے ان کے جمال کو دیکھ کر ان کی قدر و منزلت کو معلوم کر لیا ہے اور اپنے آپ کو ان جیسا بنا کر کہنے لگا ہے کہ احکام شرع کی یہ تکلیف تو اسی وقت تک ہے جب تک معرفت حاصل نہ ہو، لیکن جب معرفت حاصل ہو جائے تو پھر اطاعت کی تکلیف جسم سے اٹھ جاتی ہے اور اعمال و اطاعت کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جب تو نے حق تعالیٰ کو پہچان لیا تو تیرا دل شوق کا محل ہو گیا اب اس کے فرمان کی تعظیم اور تعمیل زیادہ ہونی چاہئے البتہ میں یہ جائز سمجھتا ہوں کہ اطاعت کرنے والا اس مقام تک پہنچ جائے کہ حق تعالیٰ اس سے اطاعت کا رنج اٹھالیں اور ان احکام کو بجالانے کی اس کو زیادہ توفیق مرحمت فرمادیں۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگ تو ان احکام کو ذرا رنج کے ساتھ بجالائیں اور اس کو ان میں کوئی رنج محسوس نہ ہو۔ لیکن یہ مقام کمال شوق محبت کی تڑپ اور عشق کے اضطراب کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر ایک جماعت ایمان کو تمام کا تمام حق تعالیٰ کی طرف سے کہتی ہے اور دوسری جماعت تمام کا تمام بندہ کی طرف سے سمجھتی ہے اور ماوراالنہر کے علاقہ میں یہ اختلاف لوگوں کے درمیان بہت طویل ہو چکا ہے پس تمام ایمان کو حق تعالیٰ کی طرف سے کہنا تو جبر محض ہے

کیونکہ بندہ کو اس طرح مجبور اور مضطر ہونا پڑتا ہے اور جملہ ایمان کو بندہ کی طرف سے ماننا قدر محض ہے کیونکہ بندہ تو حق تعالیٰ کی اطلاع کے بغیر اسے نہیں جان سکتا۔ جبکہ طریق توحید تو جبر سے نیچے اور قدر سے اوپر ہے اور درحقیقت ایمان بندے کا ایسا فعل ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ملی ہوئی ہو کیونکہ اس کا گمراہ کیا ہوا انسان راہ راست پر نہیں آ سکتا اور اس کا راہ راست پر لایا ہوا انسان گمراہ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ حق عزوجل کا ارشاد ہے'' **فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَه‘ يَشْرَحْ صَدْرَه‘ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّه‘ يَجْعَلْ صَدْرَه‘ ضَيِّقًا حَرَجًا** ''(اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینے کا ارادہ کر لیتے ہیں اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتے ہیں اور جس کو گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیں اس کا سینہ تنگ اور سخت کر دیتے ہیں) اس اصل کے مطابق چاہئے کہ ایمان کی طرف میلان حق تعالیٰ کی ہدایت سے ہو اور مائل ہونا بندے کا اپنا فعل ہو۔ پس ایمان کی طرف مائل ہونے کی علامت یہ ہوگی کہ دل پر توحید کا اعتقاد ہو، آنکھ منع کی چیزوں کو دیکھنے سے محفوظ رہے اور حق تعالیٰ کی نشانیوں اور آیات کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے، کان اس کے کلام کو غور سے سننے پر لگے رہیں۔ معدہ حرام کھانے سے خالی رہے، زبان پر ہمیشہ سچ جاری رہے اور بدن منع کردہ افعال سے اجتناب کرے تاکہ عمل دعویٰ کے موافق ہو جائے۔ اسی لئے یہ گروہ معرفت ایمان میں کمی اور زیادتی کو جائز سمجھتا ہے۔ حالانکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ معرفت ایمان میں کمی اور اضافہ درست نہیں کیونکہ اگر معرفت میں زیادتی اور نقصان ہوسکتی ہو تو معروف میں بھی کمی اور زیادتی ممکن ہونی چاہئے (اور یہ درست نہیں ہے) لہٰذا جب معروف پر زیادتی اور نقصان روا نہیں ہے تو معرفت پر بھی روا نہیں ہوگا کیونکہ ناقص معرفت، معرفت ہی نہیں ہوتی۔ پس ہونا یہ چاہئے کہ زیادتی اور نقصان، فرع اور عمل میں واقع ہو اور بالاتفاق اطاعت پر کمی اور زیادتی کا واقع ہونا روا ہے...... اور حشوی فرقہ کے لوگ جو مذکورہ بالا دونوں گروہوں کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں ان کے دل پر یہ مسئلہ گردہ ایمان کو قول کے بغیر کچھ

نہیں سمجھتا۔ حالانکہ یہ دونوں اقوال ناانصافی پر مبنی ہیں بہر حال درحقیقت ایمان یہ ہے کہ بندے کے تمام اوصاف حق تعالیٰ کی جستجو میں مستغرق ہو جائیں اور تمام طالبان حق کو اس بات پر اتفاق کر لینا چاہئے کہ معرفت کی بادشاہی کا غلبہ عدم معرفت کے اوصاف کے نقصانات کو مغلوب کرنے والا ہے اور جس جگہ کہ ایمان موجود ہو عدم معرفت کے اسباب وہاں سے دور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ''اذا طَلَعَ الصباحُ عَطَلَ المصباحُ'' (جب صبح طلوع ہوگئی تو چراغ کا جمال گم ہوگیا) اور دن کو کسی بیان یا دلیل سے واضح نہیں کیا جاتا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ روز روشن کے نمودار ہونے کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور حق عزوجل کا ارشاد ہے کہ ''اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا'' آلایہ (بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد کر دیتے ہیں) یعنی جب عارف کے دل میں معرفت کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے تو گمان۔ شک اور عدم معرفت کی حکمرانی فنا ہو جاتی ہے اور معرفت کی بادشاہت اس کے حواس اور خواہشات کو اپنا مسخر کر لیتی ہے تاکہ وہ جس چیز میں دیکھے جو کچھ کرے اور جو کچھ کہے سب حق تعالیٰ کے دائرہ حکم میں ہو......اور میں نے حکایات میں پایا ہے کہ لوگوں نے حضرت ابراہیم خواصؒ سے دریافت کیا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا ''ابھی میرے پاس اس کا جواب نہیں ہے کیونکہ میں اس وقت جو کچھ کہوں گا وہ ایک عبارت ہوگی حالانکہ مجھے اپنے عمل سے اس کا جواب دینا چاہئے! البتہ میں مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ رکھتا ہوں تم بھی اسی ارادے سے سفر میں میرے ساتھ رہو تاکہ تمہیں اپنے سوال کا جواب مل جائے، راوی کہتا ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا چنانچہ میں ان کے ہمراہ جنگل میں پہنچا تو معاملہ یوں ہوا کہ ہر روز دو روٹیاں اور شربت کے دو پیالے نمودار ہوتے حضرت ابراہیم خواصؒ ان میں سے ایک مجھے عنایت فرماتے اور ایک کو خود اٹھا لیتے یہاں تک کہ جنگل میں ہی ایک دن ایک بزرگ گھوڑے پر سوار تشریف لائے جب انہوں نے حضرت ابراہیمؒ کو دیکھا تو اپنے گھوڑے سے اتر آئے

اور دونوں نے ایک دوسرے کا حال پوچھا۔ کچھ دیر دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے اور پھر وہ بزرگ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر واپس تشریف لے گئے...... میں نے عرض کی اے شیخ! مجھے بھی بتایئے وہ بزرگ کون تھے؟ آپ نے فرمایا ''وہ تمہارے اس سوال کا جواب تھا'' میں نے عرض کی ''وہ کس طرح؟'' آپ نے فرمایا ''وہ حضرت خضر علیہ السلام تھے اور میری صحبت و ہمنشینی کے طالب تھے لیکن میں نے قبول نہیں کیا''...... میں نے پوچھا کیوں؟ ''آپ نے کہا'' اس لئے کہ میں اس بات سے ڈرا کہ کہیں ان کی صحبت میں رہتے ہوئے حق تعالیٰ پر اعتماد کرنے کی بجائے ان پر بھروسہ نہ کر بیٹھوں اور اس طرح میرا توکل تباہ ہو جائے، کیونکہ ایمان کی حقیقت توکل کی حفاظت کرتا ہے جیسا کہ حق عزوجل نے فرمایا ہے کہ ''وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ'' (اور اللہ پر ہی بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو)

اور حضرت محمد بن خفیفؒ فرماتے ہیں کہ ''**الایمانُ تصدیق القلب بما علم به الغیوب**'' (ایمان، دل کے اس یقین کا نام ہے جو اس پر غیب سے منکشف ہوا ہے) اور غیب سے اسے سکھایا جائے۔ کیونکہ ایمان ہوتا ہی غیب پر ہے اور خداوند تعالیٰ جو غائب ہے، سر کی آنکھوں سے حق تعالیٰ کی اپنی ہی تائید تقویت کے بغیر بندے کے یقین میں نہیں آ سکتا۔ اور یہ ایمان بالغیب حق تعالیٰ کی اطلاع سے ہی ممکن ہو سکتا ہے جیسا کہ جو معرفت اور علم، عارفوں اور علماء کو حاصل ہوتا ہے وہ حق تعالیٰ کی ہی معرفت ہوتی ہے کہ اس نے ان کے دلوں میں اس معرفت اور علم کو پیدا کیا ہوتا ہے، علم اور معرفت کا تعلق ان کے اپنے کسب سے منقطع ہوتا ہے، پس جو کوئی اپنے دل کو حق تعالیٰ کی معرفت سے یقین آور کر لیتا ہے وہی مومن اور واصل بحق ہوتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی اس معنی کو بیان کرنے میں میرا کلام بہت ہے اس لئے اس جگہ اتنی مقدار ہی پر اکتفا کرتا ہوں تا کہ یہ کتاب طویل نہ ہو جائے اور اہل بصیرت کیلئے یہ مقدار کافی بھی ہے اب میں معاملات کے اسرار کی طرف توجہ کرتا ہوں اور ان کے پردوں کو انشاء اللہ عزوجل کھولتا ہوں۔ وباللہ التوفیق

نجاست سے پاک ہونے کا بیان

ایمان قبول کرنے کے بعد بندہ کیلئے جو اولین فریضہ ہے وہ طہارت ہے جو نماز ادا کرنے کیلئے ضروری ہے اور وہ شریعت کے مطابق بدن کا نجاست اور جنابت سے پاک کرنا اور تین اعضا (منہ، ہاتھ اور پاؤں) کو دھونا اور سر کا مسح کرنا ہے۔ اور یا پھر پانی کے نہ پانے یا سخت بیماری کی صورت میں تیمّم کرنا ہے، اور اس کے احکام اپنی جگہ پر معلوم اور واضح ہیں...... جان لو کہ طہارت دو طرح کی ہوتی ہے ایک طہارت باطن اور دوسری طہارت ظاہر۔ چنانچہ جسم کی طہارت کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی اور دل کی طہارت کے بغیر معرفت درست نہیں ہوتی۔ پس جسم کی پاکی کیلئے خالص پانی کی ضرورت ہے اور یہ ناپاک اور استعمال شدہ پانی سے حاصل نہیں ہو سکتی اور دل کی طہارت کیلئے توحید خالص کا پانی ضروری ہے اور یہ دل کی طہارت مخلوط اور پراگندہ اعتقاد سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس یہ صوفیہ کا گروہ ہر وقت اپنے ظاہر کو طہارت کے ساتھ اور اپنے دل کو توحید کے ساتھ پیوستہ رکھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک صحابیؓ کو فرمایا تھا کہ ''دُمْ عَلَی الوضوء یُحِبُّکَ حافظاک'' (تو ہمیشہ باوضو رہا کر تیرے دونوں محافظ فرشتے تجھ سے محبت کریں گے) اور خداوند عزوجل کا ارشاد ہے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ'' (بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے اور خوب پاک صاف رہنے والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے) پس جو شخص ظاہر میں طہارت پر مداومت کرتا ہے ملائکہ اس کو دوست رکھتے ہیں اور جو کوئی باطن میں ہر وقت حق تعالیٰ کی توحید پر قائم رہتا ہے حق تعالیٰ خود اس کو دوست رکھتے ہیں...... رسول اللہ ﷺ اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ ''اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قلبی مِنَ النفاقِ'' (بار خدایا! میرے دل کو نفاق سے پاک کر دے) حالانکہ آپ

کے قلب مبارک میں کسی حالت میں بھی نفاق کا تصور تک نہیں ہوسکتا تھا تاہم اپنی بزرگیوں کو دیکھنا ہی آپ کو غیر حق کا اثبات محسوس ہوتا تھا اور محل توحید میں غیر حق کا اثبات نفاق ہوتا ہے باوجودیکہ مشائخ نے اپنی کرامات کے ایک ذرے کو بھی مریدوں کی آنکھ کا سرمہ قرار دیا ہے لیکن پھر بھی یہ صورت محل کمال میں بہت بڑا حجاب ہی ہوتی ہے اس لئے کہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ کے علاوہ ہے اس کا دیکھنا آفت ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا" **نفاق العارفین افضل مِن اخلاص المریدین** "(عارفوں کا نفاق مریدوں کے اخلاص سے افضل ہے) یعنی جو کچھ مرید کا مقام ہوتا ہے وہ کامل کیلئے حجاب ہوتا ہے مرید کا ارادہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کرامات حاصل کرے جب کہ کامل کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کرامت عطا کرنے والے خدا تعالیٰ کو حاصل کرے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ کرامات کا ثابت کرنا اہل حق کیلئے نفاق نظر آتا ہے کیونکہ یہ غیر حق کا دیکھنا ہے۔ پس حق تعالیٰ کے دوستوں کی آفت یہ ہے کہ تمام اہل معصیت، معصیت سے خلاصی پالیں اور اہل معصیت کی آفت یہ ہے کہ تمام گمراہ لوگ اپنی گمراہی سے نجات حاصل کرلیں، کیونکہ جس طرح گنہگاروں کو علم ہے اگر اسی طرح کافروں کو بھی علم ہوتا کہ ان کی معصیت خداوند تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے تو وہ کفر سے نجات حاصل کر لیتے اور جس طرح حق تعالیٰ کے دوست جانتے ہیں اگر اسی طرح گنہگاروں کو یہ علم ہوتا کہ ان کے تمام معاملات نقصان کا باعث ہیں تو وہ تمام معصیتوں سے خلاصی پالیتے اور ہر قسم کی آفتوں سے پاک ہوجاتے۔ پس ظاہری طہارت باطنی طہارت کے موافق ہونی چاہئے۔ یعنی انسان جب ہاتھوں کو دھوئے تو اسے چاہئے کہ دل کو بھی دنیا کی محبت سے دھوڈالے اور جب استنجا کرے تو اسے چاہئے کہ جس طرح اس نے ظاہری نجاست سے نجات ڈھونڈ لی ہے اسی طرح باطن کیلئے غیر کی دوستی سے نجات تلاش کرلے اور جب منہ میں پانی ڈالے تو اسے چاہےء کہ اپنے منہ کو غیر اللہ کے ذکر سے بھی پاک کر لے اور جب ناک صاف کرے تو تمام لذات کو اپنے اوپر حرام کرلے اور جب منہ دھوئے تو

اسے چاہئے کہ اپنی تمام پسندیدہ چیزوں سے کنارہ کش ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے اور جب اپنے ہاتھوں کو دھوئے تو اسے چاہئے کہ تمام دنیوی خواہشات سے دستبردار ہو جائے اور جب سر کا مسح کرے تو اسے اپنے تمام امور کو حق تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہئے اور جب پاؤں دھوئے تو اسے چاہئے کہ فرمان خداوندی کے بغیر کہیں کھڑے ہونے کی نیت نہ کرے۔ تاکہ اس طرح اسے دونوں طہارتیں حاصل ہو جائیں۔ کیونکہ شریعت کے تمام ظاہری معاملات باطن کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ جیسا کہ ایمان کے معاملہ میں زبان کا ظاہری قول۔ دل کی تصدیق کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح شریعت میں اطاعت کے احکام جسم پر اور دل کی نیت کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ پس دل کی طہارت کا طریق یہ ہے کہ بندہ دنیا کی آفتوں میں تدبر اور تفکر کرے اور یہ دیکھے کہ دنیا ایک بے وفا مقام اور فنا ہونے والی جگہ ہے دل کو اس سے خالی کر لے..... اور یہ چیز بہت سے مجاہدے کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی اور مجاہدات میں سے سخت ترین مجاہدہ یہ ہے کہ ظاہری آداب کی حفاظت کرے اور تمام احوال میں اس پر مداومت اختیار کرے..... حضرت ابراہیم خواصؒ کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے فرمایا "حق تعالیٰ کے حقوق پورے کرنے کیلئے ہمیشہ کی زندگی درکار ہے تاکہ جب تمام لوگ دنیا کی نعمتوں میں مشغول ہو کر حق تعالیٰ کو فراموش کریں۔ تو میں دنیا کی مصیبتوں میں مبتلا رہ کر شریعت کے آداب کی حفاظت پر قائم رہوں اور حق تعالیٰ کو ہمیشہ یاد رکھوں..... حکایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر طاہرؒ چالیس سال تک مکہ مکرمہ میں مجاور رہے اور اس عرصہ میں کبھی بھی مکہ مکرمہ کے اندر طہارت نہیں کی بلکہ طہارت کیلئے ہر مرتبہ حرم کی حدود سے باہر آ جاتے اور کہتے کہ جس زمین کی حق تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کی ہے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ طہارت میں استعمال شدہ پانی اس پر گراؤں اور حضرت ابراہیم خواصؒ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپ رے کی جامع مسجد میں پیٹ کی بیماری میں مبتلا تھے تو آپ نے ایک دن رات میں ساٹھ مرتبہ غسل کیا حتی کہ آپ کی وفات بھی پانی میں ہوئی..... حضرت ابوعلی رودباری

ایک عرصہ تک طہارت کے بارے میں وسوسہ میں مبتلا ہو گئے تھے چنانچہ آپ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سحری کے وقت میں دریا پر چلا گیا اور سورج کے طلوع ہونے کے وقت تک وہیں رہا۔اس حالت میں میرا دل سخت رنجیدہ ہو گیا اور میں نے عرض کی! بارخدایا ''العافیہ العافیة '' (مجھے آرام دے مجھے عافیت نصیب کر) تو دریا میں سے ہاتف نے آواز دی کہ ''العافیة فی العلم '' (عافیت تو علم میں ہے۔حضرت سفیان ثوریؒ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے اپنی وفات کے دن سخت بیماری کے باوجود ہر نماز کیلئے ساٹھ ساٹھ مرتبہ طہارت کی اور فرمایا یہ اس لئے ہے تا کہ جس وقت بھی موت کیلئے پیغام الٰہی آئے میں اس وقت طہارت کے ساتھ تیار ہوں۔ کہتے ہیں کہ حضرت شبلیؒ نے ایک دن مسجد میں داخل ہونے کے ارادے سے وضو کیا تو ایک غیبی آواز آئی کہ ''تم نے ظاہر کو تو طہارت سے آراستہ کرلیا ہے باطن کی صفائی کہاں ہے؟'' آپ فوراً لوٹ آئے اور تمام مال و میراث راہ خدا میں بانٹ دیا اور ایک سال تک صرف اتنا ہی لباس اپنے جسم پر پہنا جس سے نماز درست ہو جائے اس وقت آپ حضرت جنیدؒ کے پاس حاضر ہوئے تو حضرت جنیدؒ نے فرمایا ''اے ابوبکر! بڑی ہی نفع بخش طہارت تھی جو تو نے کی، اللہ تمہیں ہمیشہ طہارت کے ساتھ رکھے کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ کبھی بھی بے وضو نہیں رہے یہاں تک کہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو آپ کا وضو ٹوٹ گیا اور آپ نے ایک مرید کو اشارہ کیا کہ مجھے طہارت کرا دو! چنانچہ مرید نے آپ کا وضو کرایا لیکن داڑھی کا خلال کرنا بھول گیا۔ حضرت شبلیؒ کی اس حالت میں زبان بند ہو چکی تھی تاہم آپ نے مرید کا ہاتھ پکڑ کر داڑھی کے خلال کی طرف اشارہ کیا تو مرید نے داڑھی کا خلال بھی کر دیا...... آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے کسی وقت بھی وضو کے آداب میں سے کوئی ادب ترک نہیں کیا۔سوائے اس کے کہ جب میرے دل میں ذرا سا غرور پیدا ہو گیا ہو...... حضرت بایزیدؒ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب کبھی بھی میرے دل پر دنیا کا خیال گزرتا ہے میں

طہارت کرتا ہوں اور جب آخرت کا خیال گزرتا ہے میں غسل کرتا ہوں کیونکہ دنیا پلید ہے اور اس کا اندیشہ حدث (بے وضو ہونے) کا باعث ہے اور عقبیٰ غیبت اور آرام کا محل ہے اور اس کا اندیشہ جنابت (ایسی ناپاکی جس سے غسل واجب ہوتا ہے)

کے حکم میں ہے لہذا حدث سے وضو اور جنابت سے غسل واجب ہو جاتا ہے......

اور حضرت شبلیؒ کے متعلق آتا ہے کہ ایک دن جب آپ وضو کر کے مسجد میں داخل ہوئے تو ان کے دل سے ندا آئی۔ کہ اے ابوبکر کیا تم نے اتنی اچھی طہارت کر لی ہے کہ اس بیباکی سے ہمارے گھر میں چلے آئے؟ آپ یہ ندا سن کر لوٹ کر جانے لگے تو ندا آئی "ہماری درگاہ سے لوٹ کر کہاں جانا چاہتے ہو؟ یہ سن کر آپ نے نعرہ بلند کیا تو آواز آئی ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہو؟ یہ آواز سن کر آپ بالکل خاموش رہے اسی جگہ کھڑے ہو گئے تو ندا آئی "کیا ہماری آزمائشوں کو برداشت کرنے کا دعویٰ کر دیتے ہو؟ حضرت شبلیؒ پکار اٹھے "**المستغاث منک الیک**" (مولا! تیری آزمائشوں سے تیری ہی بارگاہ میں فریاد ہے)

مشائخ صوفیہ رحمہم اللہ اجمعین کے طہارت کی تحقیق میں بہت سے اقوال ہیں اور وہ اپنے مریدوں کو ظاہری و باطنی طہارت پر مداومت کا حکم فرمایا کرتے تھے، جب کوئی شخص ظاہری احکام پر عمل کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ اپنے ظاہر کو پاک کر لے اور جب باطن میں قرب الٰہی کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ اپنے باطن کو پاک کرے۔ ظاہر کی طہارت پانی سے اور اس باطن کی طہارت، توبہ اور حق تعالیٰ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنے سے عمل میں آتی ہے...... اب میں انشاء اللہ توبہ اور اس کے متعلقات کو تفصیل سے بیان کروں گا تا کہ اس کی حقیقت تمہیں معلوم ہو جائے۔

باب

توبہ اور اس کے متعلقات

جان لو کہ جس طرح احکام پر عمل پیرا ہونے والوں کا پہلا درجہ طہارت ہے اسی طرح راہ حق کے سالکوں کا پہلا مقام توبہ ہے اسی لئے خداوند عزاجل کا ارشاد ہے کہ ''یَـــاَیُّهَـــا الَّـذِیْنَ اٰمَنُو تُوْبُوْ اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا'' (اے ایمان والو! حق تعالیٰ کی بارگاہ میں سچی توبہ کرو) نیز فرمایا ہے کہ ''تُـوْبُـوْ اِلَی اللّٰـهِ جَـمِیْعًا اَیُّـهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُـفْـلِـحُـوْنَ'' (اے مومنو! تم سب اللہ کی طرف توبہ کرو تا کہ تمہیں فلاں نصیب ہو) پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مـامِن شئٍ اَحَبَّ اِلَی اللّٰهِ مِن شابٍ تائب'' (اللہ تعالیٰ کے نزدیک توبہ کرنے والے نوجوان سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''التـائـب مِنَ الذنب کمن لَا ذنبَ لَه‘ ثم قال اِذا اَحبَّ اللّٰه عبـداً لَـن یـغُره ذنب ثم قلاَ اِنَّ اللّٰه‘ یُحِبُّ التَّوَابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِرِّیْنَ'' (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس پر کوئی گناہ نہیں تھا پھر آپؐ نے فرمایا ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب بنا لیتے ہیں تو کوئی گناہ اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ پھر آپ نے آیت کا یہ ٹکڑا تلاوت کیا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے اور طہارت کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں) صحابہؓ نے عرض کیا ''یارسول اللہ ﷺ توبہ کی علامت کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا'' اپنے گناہوں پر ندامت محسوس کرنا۔ باقی آپ نے جو یہ فرمایا کہ گناہ حق تعالیٰ کے دوستوں کیلئے نقصان دہ نہیں ہوتا تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بندہ گناہ کی بدولت کافر نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کے ایمان میں گناہ سے خلل واقع ہوتا ہے...... جب گناہ ایمان کو نقصان نہیں پہنچاتا تو جس گناہ کا نقصان انجام کار باعث نجات بن جائے حقیقت میں وہ نقصان ہوتا ہی نہیں......اور جان لو کہ، توبہ کے لغوی معنی رجوع کرنے کے ہیں، جیسا کہ اہل لغت کہتے

ہیں کہ "قَابَ اَیْ رَجَعَ "پس حکم الٰہی کے خوف سے حق تعالیٰ کے منع کردہ کاموں سے باز آ جانا ہی توبہ کی حقیقت ہے...... پیغمبر علیہ کا ارشاد ہے کہ "اَلنَّدمُ التوبہ " (ندامت و پشیمانی ہی توبہ ہے) یہ ایک ایسا قول ہے جس میں توبہ کی تمام شرائط موجود ہیں اس لئے کہ توبہ کی ایک شرط تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی مخالفت پر افسوس ہو۔ دوسری یہ کہ لغزش کو فوراً ترک کر دے اور تیسری اس بات کا عزم کہ آئندہ معصیت کا ارتکاب نہیں کروں گا اور یہ تینوں شرطیں ندامت کے ساتھ پیوستہ ہیں کیونکہ جب اپنے کئے ہوئے گناہ پر ندامت و شرمندگی حاصل ہو جاتی ہے تو یہ دونوں باقی شرطیں دل میں خود بخود آ جاتی ہیں۔ جس طرح توبہ کی تین شرطیں ہیں اسی طرح ندامت کے تین اسباب ہوتے ہیں۔ پہلا سبب یہ کہ جب دل پر سزا کا خوف غالب ہو جائے اور اپنی بداعمالیوں کا غم دل پر متصور ہو جائے تو ندامت حاصل ہو جاتی ہے دوسرا یہ کہ کسی نعمت کی خواہش دل میں پیدا ہو اور یہ بھی یقین ہو جائے کہ برے افعال اور حق تعالیٰ کی نافرمانی کی حالت میں یہ نعمت حاصل نہ ہو سکے گی تو اس وجہ سے پشیمانی پیدا ہو جاتی ہے اور تیسرا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی شرم اس کے سامنے آ جاتی ہے اور وہ مخالفت حق سے پشیمان ہو اٹھتا ہے۔ پس ان تینوں میں سے ایک تو تائب (توبہ کرنے والا) کہلائے گا۔ دوسرا منیب (اللہ کی طرف رجوع کرنے والا) ہوگا اور تیسرا تواب (بہت رجوع کرنے والا) ہوگا۔ پس توبہ کے بھی تین ہی مقام ہوں گے، پہلی توبہ، دوسرا انابت اور تیسرا اوابت...... پھر توبہ تو سزا کے خوف سے ہوگی اور انابت ثواب کی جستجو پر ہوگی جب کہ اوابت حق تعالیٰ کے فرمان کی رعایت کرنے پر حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ توبہ عام مومنوں کا مقام ہے اور وہ گناہ کبیرہ پر ہوتی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا " اور انابت اولیاء مقربین کا مقام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ " (جو شخص خدائے رحمان سے ڈرتے ہوئے رجوع کرنے والا دل لے کر آیا) اور اوابت انبیاء و مرسلین کا مقام ہے

جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّہٗ اَوَّابٌ'' (سلیمانؑ بہت ہی اچھا بندہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی طرف خوب رجوع کرنے والا ہے) پس حق تعالیٰ کی اطاعت کے ذریعہ کبیرہ گناہوں سے رجوع کا نام توبہ ہوگا اور اس کی محبت میں صغیرہ گناہوں سے بھی رجوع انابت ہوگا جب کہ اپنے آپ سے بالکل ہی رجوع کر کے حق تعالیٰ کی طرف توجہ کا نام اوابت ہوگا۔ پس اگر کوئی حق تعالیٰ کے حکم سے فواحش سے رجوع کرتا ہے اور دوسرا اس کی محبت میں فاسد سوچوں سے بھی رجوع کر لیتا ہے جب کہ تیسرا اپنی خودی سے بھی حق تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کر لیتا ہے تو ان تینوں میں بڑا واضح فرق ہے..... توبہ کی اصل تو حق تعالیٰ کی زجر و تنبیہہ، خواب غفلت سے دل کی بیداری اور اپنے چھپے ہوئے حال پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور جب بندہ اپنے برے احوال اور ناپسندیدہ افعال پر تفکر کرتا ہے تو ان سے چھٹکارے کی راہیں تلاش کرتا ہے اب حق تعالیٰ اس پر توبہ کے اسباب آسان فرما دیتے ہیں اور اس کو اس کے گناہوں کی بدبختی سے رہائی دیتے ہیں اور اس طرح اپنی اطاعت کی حلاوت تک اسے رسائی نصیب کر دیتے ہیں۔

علماء اہلسنت و جماعت اور جملہ مشائخ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے کہ کوئی شخص کسی ایک گناہ سے توبہ کر لے جب کہ دوسرے کئی گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہو جن گناہ سے وہ باز آ چکا ہے خداوند تعالیٰ اس کا اسے ثواب نصیب کریں گے اور ہوسکتا ہے کہ اس کی برکت سے ہی وہ دوسرے گناہوں سے بھی باز آ جائے۔ مثلاً اگر ایک آدمی اگر شراب خور بھی ہے اور زنا کار بھی اور وہ زنا سے تو توبہ کرتا ہے لیکن شراب خوری پر ابھی مصر ہے تو اس کی اس ایک گناہ سے توبہ درست ہوگی باوجود اس دوسرے گناہ کے ارتکاب کے معتزلہ میں سے بہشمی لوگ کہتے ہیں کہ جب تک کوئی آدمی تمام کبیرہ گناہوں سے اجتناب نہ کرے اس پر توبہ کا اسم درست نہیں ہوگا۔ لیکن یہ قول محال ہے کیونکہ بندہ جتنے بھی گناہ کرتا ہے اس کو ان کی وجہ سے حق تعالیٰ سزا دیں گے اور جب وہ ایک قسم کے گناہوں سے رک جائے تو اس قسم

کے گناہوں کی سزا سے تو وہ محفوظ ہو جائے تو لامحالہ وہ ان گناہوں سے تائب ہی قرار پائے گا۔ نیز اگر کوئی بندہ بعض فرائض تو بجالاتا ہے اور بعض سے دستبردار رہتا ہے تو لامحالہ جو کچھ وہ بجالا رہا ہے اس کا اسے ثواب ملے گا جیسا کہ جو وہ بجا نہیں لاتا ان پر سزا کا مستحق ہوگا...... اور اگر کسی بندہ کو معصیت کی طاقت اور اس کے اسباب میسر نہ بھی ہوں تو بھی وہ ان سے توبہ کرے تو وہ تائب کہلائے گا اس لئے کہ توبہ کا ایک رکن ندامت بھی ہے اور اس بندہ کو اپنی اس توبہ سے گزشتہ پر ندامت حاصل ہو جائے گی اور باوجودیکہ وہ موجودہ حالت میں جنس معصیت کے ارتکاب کی ہمت ہی نہیں پاتا لیکن وہ گویا اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ اگر کبھی معصیت کے اسباب میسر بھی ہو جائیں تو میں پھر بھی اس معصیت کی طرف قدم نہیں بڑھاؤں گا...... پھر توبہ کے وصف اور اس کی صحت میں مشائخ کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ حضرت سہل بن عبداللہؒ اور ایک جماعت کا موقف یہ ہے کہ "التوبة انُ لاتنسی ذنبک" (توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہ کو فراموش نہ کرے) اور ہمیشہ اس کی تشویش میں مبتلا رہے تاکہ اگرچہ تمہارے اعمال زیادہ بھی ہو جائیں تو بھی تو ان پر مغرور نہ ہو جائے کیونکہ برے کردار پر ندامت اعمال صالحہ سے مقدم ہوتی ہے اور جو آدمی اپنے گناہ کو یاد رکھتا ہے وہ اپنی نیکیوں پر ہرگز مغرور نہیں ہوتا...... اور حضرت جنیدؒ کے ہمراہ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ "التوبة اَن تنس ذنبکَ" (توبہ یہ ہے کہ تو اپنے گناہ کو بھول جائے) اس لئے کہ توبہ کرنے والا حق تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہوتا ہے اور محب مقام مشاہدہ میں ہوتا اور مشاہدہ کی حالت میں گناہ کا یاد رکھنا ظلم ہے، کچھ وقت تو شقاوت کے ساتھ ہوگا اور پھر کچھ وقت وفا کی حالت میں جفا کے ساتھ ہوگا جب کہ وفا کی حالت میں جفا کا ذکر بھی حجاب کا باعث ہوتا ہے، یہ اختلاف دراصل مجاہدہ اور مشاہدہ کے اختلاف کی طرف راجع ہے اور اس کا ذکر سہلی فرقہ کے مذہب میں تلاش کرنا چاہیئے جو حضرات توبہ کرنے والے کو قائم بذاتہ جانتے ہیں وہ اس کے گناہ کو بھول جانے کو غفلت جانتے ہیں اور جو حضرات اس کو قائم بحق کہتے ہیں وہ اس

کیلئے گناہ کی یاد کو شرک سمجھتے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ توبہ کرنے والا اگر باقی الصفت ہو تو اس کے اسرار کی گرہ کھلتی نہیں اور جب فانی الصفت ہو تو صفت کا ذکر اس کے حق میں درست نہیں ہوتا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی صفت کے بقا کی حالت میں "تُبتُ الیک" (میں نے تیری طرف رجوع کیا) کہا جب کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی صفت کے فنا کی حالت میں فرمایا "لا اُحصِی ثناءً علیک" (میں تیری ثنا بیان نہیں کرسکتا) غرضیکہ قربت کے محل میں وحشت کا ذکر وحشت ہی ہوتا ہے۔ توبہ کرنے والے کو تو چاہئے کہ اس کو اپنی ذات بھی یاد نہ آئے تو اس کو اپنا گناہ کس طرح یاد آئے گا۔ درحقیقت گناہ کی یاد بذات خود ایک گناہ ہے کیونکہ یہ محل اعراض ہے جس طرح گناہ محل اعراض ہے اسی طرح گناہ کی یاد بھی محل اعراض ہی ہے بلکہ اس کے غیر کا ذکر بھی اسی طرح گناہ ہے اور جیسا کہ جرم کا ذکر خود ایک جرم ہے اس جرم کا بھول جانا بھی ایک جرم ہی ہے اس لئے کہ ذکر اور نسیان دونوں کا تعلق توبہ کے ساتھ ہے..... حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مجھے ان میں سے کسی چیز نے اتنا فائدہ نہیں دیا جتنا کہ اس شعر نے دیا ہے۔

اِذا قُلتُ مَا اَذنبتُ قَالَتْ مُجیبة"

حَیَائکَ ذنب" لا یُقاسُ بِہ ذنب"

(جب میں نے کہا کہ میں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا تو میرا محبوب کہنے لگا۔ تمہاری زندگی خود ایک ایسا گناہ ہے کہ کوئی دوسرا گناہ اس کے برابر نہیں ہوسکتا)

گویا جب محبوب کی نگاہ میں دوست کا وجود خود ایک جرم ہے تو اس کے وصف کی کیا قیمت باقی رہ جاتی ہے بہرحال توبہ حق تعالیٰ کی تائید ہے اور گناہ جسمانی فعل ہیں جب دل پر ندامت ظاہر ہو جائے تو جسم پر کوئی ایسا آلہ موجود نہیں جو دل کی ندامت کو دور کر سکے اور اگر فعل کی ابتدا میں ہی اس کی ندامت توبہ کو واقع نہ کرے تو پھر یہ آ بھی جائے تو انجام کار توبہ کی حفاظت کرنے والی نہ ہوگی..... حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "فتابَ علَیہِ اِنہ" ھُوَ التوابُ

الــرحیم ‘‘ (پس اللہ تعالیٰ نے اس پر توجہ کی بلا شبہ وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے)
اور اس امر کیلئے حق تعالیٰ کی کتاب میں اس قدر مثالیں موجود ہیں کہ اس معاملے کو ثابت
کرنے کی ضرورت ہی نہیں...... پس توبہ تین قسم کی ہوتی ہے ایک گناہ سے نیکی کی طرف
رجوع دوسری نیکی سے نیکی طرف میلان اور تیسری اپنی ذات اور وجود سے حق تعالیٰ کی
طرف جھک جانا...... گناہ سے نیکی کی طرف رجوع تو اس طرح ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد
ہے کہ ’’وَالَّذِیْنَ اِذا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُو اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُا
لِذُنُوْبِهِمْ ‘‘ (الایہ) (اور وہ لوگ کہ جب انہوں نے کوئی برا کام کرلیا یا اپنے آپ پر ظلم کر
لیا تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے لگے پس اپنے گناہوں کیلئے مغفرت کے طلب گار ہوئے) اور نیکی
سے نیکی کی طرف میلان اس طرح کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا ’’تُبْتُ
اِلَیکَ ‘‘ اور اپنی ذات سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ یوں کہ جیسے پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ’’
وَاِنَـه لیغَانُ علی قَلبِی واِنی کنت لَا ستغفِرا اللّٰهَ فی کل یوم سبعین مَرةً ‘‘ (اور
وہ توبہ میرے دل پر آسان کردی گئی۔ چنانچہ میں اپنے اللہ سے روزانہ ستر مرتبہ بخشش مانگتا
ہوں) معصیت اور غلطی کا ارتکاب برا اور قابل مذمت ہے جب کہ غلطی سے درستی کی طرف
رجوع اچھا اور قابل تعریف ہے اور اس طرح کی توبہ عام ہے اور اس کا حکم بھی بڑا واضح ہے
اور جب تک زیادہ نیکی ہو عام نیکی کے ساتھ اس کا قرار پکڑنا، راستہ میں ٹھہر جانا اور حجاب
ہے اور عام نیکی سے بڑی نیکی کی طرف رجوع کرنا اہل ہمت کے درجہ میں قابل تعریف ہے
اور یہ توبہ خاص ہے اور یہ محال ہے کہ اللہ کے نیک بندے معصیت سے توبہ کریں کیونکہ وہ
معصیت کا تو ارتکاب ہی نہیں کرتے تم نے غور نہیں کیا کہ تمام مخلوقات تو حق تعالیٰ کی
زیارت کی خواہشمند ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام س سے توبہ کرتے ہیں اس لئے کہ وہ
اپنے اختیار سے یہ رویت حاصل کرلیا کرتے تھے جبکہ دوستی میں اپنا اختیار چلانا ایک آفت
ہے اور ان کے اختیار کی آفت کا ترک کرنا مخلوق کیلئے رویت کا ترک نظر آئے گا اور اپنے

آپ سے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا یہ محبت کے درجہ میں ہے جیسا کہ بلند مقام کی آزمائشوں کی وجہ سے بلند مقام پر ٹھہرنے سے توبہ کرے، اور بلند مقامات اور احوال کو دیکھنے سے بھی توبہ کرے جیسا کہ پیغمبر ﷺ کے مقامات ہر لمحہ ترقی کی راہ پر گامزن تھے چنانچہ جب آپ پہلے سے زیادہ بلند مقام پر پہنچتے تو نچلے درجے کے مقام سے استغفار کرتے اور دوبارہ اس مقام کے دیکھنے سے بھی توبہ بجالایا کرتے تھے...... واللہ اعلم بالصواب

فصل

جان لو کہ معصیت کا ارتکاب نہ کرنے کا پختہ ارادہ صحیح ہونے کے بعد توبہ پر ہمیشہ قائم رہنا آئندہ توبہ کیلئے شرط نہیں چنانچہ اگر توبہ کرنے والے کی توبہ میں کوئی فتور واقع ہو جائے کہ پھر معصیت کا ارتکاب کر بیٹھے تو گزشتہ دنوں میں گناہ نہ کرنے کا جو اس نے پختہ ارادہ کیا تھا اس کا اسے ثواب ضرور ملے گا۔ گروہ صوفیہ کے مبتدی حضرات اور توبہ کرنے والوں میں سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جنہوں نے توبہ کی لیکن پھر کسی فتور کے واقع ہو جانے کی وجہ سے برائی کی طرف لوٹ گئے لیکن پھر کسی تنبیہ کی وجہ سے دوبارہ درگاہ خداوندی میں حاضر ہو گئے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ میں نے ستر مرتبہ توبہ کی اور پھر گناہ کی طرف رجوع کیا یہاں تک کہ اکہترویں مرتبہ کی توبہ پر مجھے استقامت نصیب ہوئی۔ حضرت ابوعمرو نے حضرت جنیدؒ کے سامنے بیان کیا کہ میں نے ابتدا میں حضرت ابو عثمان حیریؒ کی مجلس میں توبہ کی اور کچھ عرصہ تک اس پر قائم رہا پھر میرے دل میں گناہ کا شدید تقاضہ پیدا ہو گیا اور میں نے اس تقاضے کی متابعت کر لی اور اس بزرگ کی صحبت سے اعراض کرنے لگا اور جہاں کہیں میں شیخ کو دیکھتا تو ندامت محسوس کرتے ہوئے بھاگ جاتا، تا کہ وہ مجھے دیکھ نہ پائیں ایک دن اچانک میری ان سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے مجھے فرمایا "بیٹے! اپنے دشمنوں کے ساتھ اس وقت صحبت اختیار کر جب تو گناہوں سے بالکل پاک ہو

اس لئے کہ دشمن تیرے عیب نہ دیکھیں اور اگر تو عیب دار ہوا تو تیرے دشمن خوش ہوں گے اور جب تو گناہوں سے پاک ہوگا تو دشمن غمگین ہوں گے اور اگر تو گناہ کرنا چاہتا ہے تو میرے پاس آ جاتا کہ تیری مصیبت میں خود برداشت کرلوں اور تیرا دشمن خوش نہ ہو سکے، ابو عمر کہتے ہیں کہ میرا دل گناہ سے بھر چکا تھا چنانچہ میں نے توبہ کی اور میری توبہ درست ہوگئی۔ نیز میں نے سنا ہے کہ ایک شخص نے گناہوں سے توبہ کی لیکن پھر اس نے توبہ کو توڑ ڈالا اور گناہ کا ارتکاب کرلیا اس وقت اسے پشیمانی ہوئی اور ایک دن اپنے دل سے کہنے لگا اگر اب میں پھر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں جاؤں تو میرا کیا حال ہوگا؟ ہاتف نے اسے آواز دی کہ "اَطَعْتَنَا فشکرناک ثم ترکتنا فامھلناک فاِن عدت الینا قبلناک" (تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم نے تجھے قبول کیا پھر تو نے ہمیں چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں مہلت دی۔ اب اگر تو لوٹ کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم تمہیں پھر قبول کرلیں گے)

اب میں پھر مشائخ کے اقوال کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

فصل

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ "توبة العوام من الذنوب وتوبة الخواصِ مِن الغفلة" (عوام کی توبہ، گناہوں سے ہوتی ہے لیکن خواص کی توبہ غفلت سے ہوتی ہے) اس لئے کہ عوام سے تو ان کے ظاہری حال کی باز پرس ہوگی اور خواص سے ان کے دلی معاملہ کی تحقیق! کیونکہ غفلت عوام کیلئے تو نعمت ہے لیکن خواص کیلئے حجاب ہے...... حضرت ابو حفص حدادؒ کہتے ہیں کہ "لَیس للعبد فی التوبةِ شئُ لِاَنَّ التوبة الیه لاَمِنهُ" (بندہ کو توبہ کے معاملے میں کوئی دخل حاصل نہیں کیونکہ توبہ کی توفیق حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو نصیب ہوتی ہے نہ کہ بندہ کو اپنی ذات کی طرف سے) اس قول کے مطابق توبہ بندے کے اکتساب سے نہ ہوگی بلکہ وہ حق تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک وہبی

انعام ہوگی اور یہ قول حضرت جنیدؒ کے مذہب کے مطابق ہوگا...... حضرت ابوالحسن بوشنجہؒ کہتے ہیں کہ "التوبة اذا ذكرت الذنب ثم لا تجد حلاوة عند ذكره فهوا لتوبة" (صحیح توبہ یہ ہے کہ جب تو گناہ کو یاد کرے تو اس کے ذکر سے تجھے کوئی لذت حاصل نہ ہو) کیونکہ گناہ کا ذکر یا تو افسوس کے طور پر ہوگا یا دلی ارادے کے طور پر۔ اور جو شخص افسوس اور ندامت کے ساتھ اپنے گناہ کو یاد کرتا ہے تو وہ توبہ کرنے والا ہوتا ہے اور جو کوئی دلی خواہش کے ساتھ گناہ کو یاد کرتا ہے وہ گنہگار ہوتا ہے اس لئے کہ گناہ کے ارتکاب میں اتنی آزمائش نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے ارادے اور دلی خواہش میں ہوتی ہے کیونکہ گناہ کا فعل تو ایک ہی وقت میں ہوتا ہے لیکن اس کا ارادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے پس جو کوئی وقتی طور پر جسم کے ہمراہ گناہ کے ساتھ صحبت کرتا ہے وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو روز وشب دلی طور پر گناہ کے ساتھ صحبت کرتا رہتا ہے...... حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ "التوبة توبتان توبة الانابة وتوبة الاستحياء فتوبة الانابة ان يتوب العبد خوفاً من عقوبة وتوبة الاستحياء اَن يتوب حياءً من كرمِهٖ" (توبہ دو طرح کی ہوتی ہے، توبۂ انابت اور توبۂ استحیاء توبۂ انابت یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کی سزا کے خوف سے توبہ کرے اور توبۂ استحیاء یہ ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے کرم سے شرم کرتے ہوئے توبہ کرے) پس خوف والی توبہ تو جلال خداوندی کے کشف کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن وہ توبہ حیاء جمال الٰہی کے نظارہ سے ہوتی ہے۔ پس ایک جلال خداوندی میں خوف کی آگ سے جلتا ہے اور دوسرا جمال الٰہی میں حیاء کے نور سے روشن ہو رہا ہوتا ہے گویا ان دونوں میں سے ایک تو حق تعالیٰ کی محبت کے نشہ سے سرشار ہوتا ہے اور دوسرا خشیت الٰہی سے مدہوش چنانچہ اہل حیاء اصحاب سکر ہوتے ہیں جب کہ اہل خوف اصحاب صحو...... اس مضمون میں گفتگو تو بہت طویل ہے لیکن میں نے اس کو مختصراً انداز میں پیش کر دیا ہے...... وباللہ التوفیق...... واللہ اعلم

پانچواں کشف حجاب

نماز کا بیان

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (اور نماز قائم کرو) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" (نماز اور اپنے زیر دست ماتحتوں کا خیال رکھو) لغت کے اعتبار سے صلوۃ۔ ذکر اور اطاعت کے معنی میں ہے اور فقہاء کے درمیان رائج فقہی اصطلاح میں یہ مخصوص احکام کے ساتھ ادا کی جانے والی ایک مخصوص عبادت کا نام ہے اور وہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ پانچ اوقات میں پانچ نمازیں ادا کرو! اور اس سے قبل اس میں داخل ہونے کیلئے کچھ شرائط ہیں ایک ان میں سے طہارت ہے کہ ظاہری جسم کو نجاست سے اور دل کو خواہشات سے پاک کرے، دوسری یہ کہ لباس ظاہری طور پر ناپاکی سے اور باطنی طور پر حرام مال سے پاک ہو۔ تیسری یہ کہ نماز کی جگہ ظاہر میں ناپاکی اور مصیبت سے اور باطن میں فساد اور معصیت سے پاک ہو۔ چوتھی شرط استقبال قبلہ ہے کہ ظاہر کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اور باطن کا قبلہ عرش الٰہی ہے اور اس کا باطنی مقصود مشاہدہ ہے، پانچویں شرط۔ ظاہر شریعت میں وقت کے داخل ہونے کے ساتھ قدرت ہونے کی صورت میں ظاہری قیام اور باطنی حقیقت کے درجہ میں وقت کے دوام کے ساتھ باطنی طور پر قرب الٰہی کے باغیچہ میں قیام۔ چھٹی حق تعالیٰ کی طرف پوری توجہ کے ساتھ اخلاص نیت، ساتویں مقام ہیبت اور مقام فنا میں تکبیر کہنا "وصل کے محل میں قیام کرنا صحت لفظی اور تعظیم کے ساتھ قرات کرنا۔ خشوع کے ساتھ رکوع اور عاجزی کے ساتھ سجدہ کرنا، دلجمعی کے ساتھ تشہد پڑھنا اور فنا صفت کے ساتھ سلام کہنا...... احادیث میں آیا ہے کہ "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُصَلی و فی جوفہ زیر کا زیر المرجل" (رسول اللہ ﷺ جب نماز ادا کرتے تو آپ کے دل میں اس طرح جوش ہوتا جس طرح اس دیگ میں

ہوتا ہے جس کے نیچے آگ جل رہی ہو) اور جب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نماز ادا کرنے کا قصد کرتے تو آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا، اور آپ کہتے "اس امانت کی ادائیگی کا وقت آ گیا ہے جس کو اٹھانے سے زمین واسمان عاجز آ گئے تھے۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حاتم اصمؒ سے دریافت کیا کہ آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا جب نماز کا وقت شروع ہوتا ہے میں ایک ظاہری وضو کرتا ہوں اور ایک باطنی ظاہری وضو تو پانی سے کرتا ہوں اور باطنی توبہ سے۔ اب میں مسجد میں داخل ہوتا ہوں اور مسجد حرام کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ مقام ابراہیمؑ کو اپنے دونوں ابروؤں کے درمیان رکھتا ہوں۔ بہشت کو اپنے دائیں طرف جانتا اور دوزخ کو اپنے بائیں طرف دیکھتا ہوں اور صراط کو اپنے پاؤں کے نیچے لاتا ہوں اور ملک الموت کو اپنی پشت کے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ اس طرح میں پوری تعظیم کے ساتھ تکبیر کہتا ہوں۔ حرمت کے ساتھ قیام کرتا ہوں ہیبت کے ساتھ قرات کرتا ہوں۔ رکوع تواضع کے ساتھ، سجدہ عاجزی کے ساتھ، قعدہ پورے حلم و وقار کے ساتھ اور اس طرح آخر میں حق تعالیٰ کے شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

فصل

جان لو کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں ابتداء سے انتہا تک مریدان حق اللہ تعالیٰ کی طرف راہ پاتے ہیں اور طریقت کے مقامات ان پر منکشف ہوتے ہیں چنانچہ مریدان حق کیلئے طہارت بمنزلہ توبہ کے ہے قبلہ کی طرف رخ کرنا اپنے مرشد کے ساتھ تعلق کے قائم مقام ہے۔ نماز میں قیام کرنا مجاہدہ نفس کے، قرات، دوام ذکر کے، رکوع، تواضع کے، سجدہ، نفس کی معرفت کے تشہد، مقام امن کے...... اور سلام پھیرنا، دنیا سے کنارہ کشی اور مقامات کی پابندی سے باہر آنے کے قائم مقام ہے اور یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ

جب کھانے پینے سے فارغ ہو جاتے تو کمال حیرت کے محل میں محبت الٰہی کے طالب ہو جاتے اور کھلانے، پلانے والے کے ساتھ تعلق جوڑ لیتے اس وقت آپ فرماتے "ارحنا یا بلال بالصلوۃ" (اے بلال نماز کی اذان سے ہمیں خوش کر) اس معاملے میں مشائخ کے بہت سے اقوال ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام ہے چنانچہ ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ نماز بارگاہ الٰہی میں حاضری کا ذریعہ ہے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ غیبت کا ذریعہ ہے اور ایک جماعت جو غائب ہوتی ہے نماز میں حاضر ہو جاتی ہے اور کچھ لوگ جو حاضر ہوتے ہیں نماز میں غائب ہوتے ہیں جیسا کہ اس دنیا میں مقام مشاہدہ حق کے اندر جو جماعت کہ حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرتی ہے پہلے غائب ہوتی ہے تو اس وقت حاضر ہو جاتی ہے اور جو لوگ پہلے حاضر ہوتے ہیں اس وقت غائب ہو جاتے ہیں..... میں علی بن عثمان ہجویریؒ کہتا ہوں کہ نماز ایک حکم ہے نہ کہ ذریعہ حضور یا آلہ غیبت، کیونکہ حکم کسی چیز کیلئے ذریعہ قرار نہیں پاتا کیونکہ حضور کا آلہ عین حضور ہے اور غیبت کا ذریعہ عین غیبت۔ جبکہ امر الٰہی کو کسی چیز کے سبب کے ساتھ تعلق نہیں۔ اس لئے کہ اگر نماز ہی حضور کا سبب ہوتی تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ نماز کے علاوہ کسی طرح بھی بارگاہ خداوندی کی حاضری نصیب نہ ہوتی اور اگر غیبت کا آلہ ہوتی تو چاہئے تھا کہ ایک غائب شخص نماز کو ترک کرنے سے قاصر ہو جاتا۔ لیکن جب حاضر اور غائب کو نماز کے ادا کرنے یا اس کو ترک کرنے سے کوئی عذر نہیں تو معلوم ہوا کہ نماز کو نفس کے اندر خود ایک غلبہ حاصل ہے اور یہ غیبت اور حضور دونوں کے اندر موجود ہے پس اہل مجاہدہ اور ارباب استقامت نماز بہت زیادہ ادا کرتے ہیں اور کثرت سے نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ اپنے مریدوں کے جسم کو عبادت کا عادی بنانے کیلئے دن رات میں چار سو رکعت نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نیز ارباب استقامت خود بھی کثرت سے نماز ادا کرتے ہیں تا کہ بارگاہ الٰہی میں قبولیت کا شکر ادا کر سکیں۔ باقی اس جگہ ارباب احوال کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے کہ ان کی نماز طریقت کے کمال میں مقام جمع میں ہوتی

ہے اور وہ اپنی نمازوں میں مجتمع ہوتے ہیں اور دوسرا گروہ وہ ہے جن کی نمازیں مشرب سے انقطاع کی وجہ سے مقام تفرقہ میں ہوتی ہیں اور وہ نمازوں سے تفرقہ کا مقام حاصل کرتے ہیں۔ جو حضرات اپنی نمازوں میں مجتمع ہوتے ہیں وہ دن رات نمازوں میں مصروف رہتے ہیں اور فرائض و سنن کے علاوہ نوافل کی ادائیگی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو حضرات مقام تفرقہ میں ہوتے ہیں وہ فرض اور سنت نماز کے علاوہ بہت کم نفلی نماز پڑھتے ہیں...... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جُعِلَتْ قرة عينى فى الصَّلوٰة" (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) یعنی میری تمام تر راحت نماز میں ہے اس لئے کہ اہل استقامت کی طریقت ہی نماز میں ہے اور یہ اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب معراج پر لے جایا گیا اور مقام قرب تک پہنچا دیا گیا تو آپ کا نفس مبارک دنیا کے تعلقات سے منقطع ہو گیا اور آپ اس درجہ پر پہنچ گئے کہ آپ کا نفس دل کے درجہ پر اور دل جان کے درجہ پر اور جان باطن کے درجہ پر پہنچ گیا اور یہ باطن تمام درجات سے فانی اور مقامات سے محو ہو گیا اور تمام نشانیوں سے بے علامت اور مجاہدہ میں مشاہدہ سے غائب اور معائنہ کی حالت میں معائنہ سے الگ ہو گیا آپ کے انسانی خواص معدوم ہو گئے اور نفسانی مادہ جل کر ختم ہو گیا آپ کے طبعی قویٰ فنا ہو گئے اور آپ کے ولایت میں حق تعالیٰ کے شواہد ظاہر ہو گئے۔ یوں آپ اپنے آپ سے رہ گئے اپنے معنی سے دوسرے معنی تک پہنچ گئے اور خدائے لم یزل کے مشاہدے میں محو ہو گئے چنانچہ محبت الٰہی میں اپنے آپ سے بے اختیار ہو کر پکار اٹھے کہ "بار خدایا! مجھے پھر اس آزمائش کے سرخانے (دنیا) میں نہ لے جانا اور خواہشات وطبیعت کے قید خانے میں نہ ڈال دینا" حق تعالیٰ کی طرف سے فرمان آیا کہ "میرا حکم اسی طرح ہے کہ شریعت کو قائم کرنے کیلئے تم دنیا کی طرف لوٹ کر جاؤ تاکہ جو کچھ ہم نے یہاں آپ کو عطا کیا ہے وہ وہاں دنیا میں بھی عطا کریں" چنانچہ جب آپ دنیا میں واپس تشریف لے آئے تو جب کبھی آپ کا دل اس مقام بلند کا مشتاق ہوتا آپ فرماتے "اِرحنا یا بلال

بالصلوۃ ''(بلال ہمیں نماز سے راحت پہنچاؤ) پس ہر نماز آپ کیلئے معراج قرب الٰہی کا ذریعہ ہوتی۔لوگ آپ کو نماز میں مشغول دیکھتے حالانکہ آپ کے جسم نماز میں ہوتا لیکن آپ کا دل نیازمندی میں مبتلا ہوتا آپ کا باطن راز میں اور آپ کا جسم مبارک سوز و گداز میں مشغول ہوتا یہاں تک نماز آپ کیلئے آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی آپ کا جسم تو دنیا میں ہوتا لیکن آپ کی جان ملکوت میں ہوتی اسی طرح آپ کا جسم تو انسانوں کے ہمراہ ہوتا۔لیکن آپ کی جان حق تعالیٰ کی محبت کے مقام ارفع پر موجود ہوتی۔

حضرت سہل بن عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ ''الصدق اَن یکون لہ تابع من الحق اِذا دَخَل وقت الصلوۃ بعثہ علیھا ربنبھہ ان کان نائِمًا ''(صدق کی علامت یہ ہے کہ صاحب صدق کیلئے حق تعالیٰ کی طرف سے ایک تابع فرمان فرشتہ مقرر ہو جو نماز کا وقت داخل ہونے پر اسے نماز پر آمادہ کرے اور اگر وہ نیند میں ہو تو اسے بیدار کر دے) اور یہ چیز خود حضرت سہل بن عبداللہؒ میں ظاہر تھی اس لئے کہ آپ بوڑھے اور ضعیف ہو چکے تھے لیکن جب نماز کا وقت آتا تو آپ تندرست ہو جاتے اور جب نماز ادا کر چکتے تو پہلے کی طرح اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتے......مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ'' یحتاجُ المصلی الی اربعۃِ اشیاء فنا النفس وذھابُ الطبع وصفا السِرِ وکمال المشاھدۃ ''(نمازی کو چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے نفس کا فناء ہونا طبیعت کا معدوم ہو جانا باطن کا پاک ہونا اور مشاہدہ کا کامل ہونا) نماز ادا کرنے والے کیلئے فناء نفس کے بغیر چارہ نہیں اور یہ ارادے کو ایک پہلو پر مجتمع کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔جب ارادہ مجتمع ہو جائے تو نفس کا غلبہ ختم ہو جاتا ہے۔کیونکہ نفس کا وجود تفرقہ میں سے ہے جو عبادت کے تحت نہیں آتا......اور طبیعت کا معدوم ہونا۔جلال الٰہی کے اثبات کے بغیر حاصل نہیں ہوتا کیونکہ جلال حق غیر کیلئے باعث زوال ہوتا ہے اور باطن کی صفائی محبت خداوندی کے بغیر نہیں ہو سکتی اور مشاہدہ کا کمال باطن کی صفائی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا......اور روایت میں یہ بھی

آتا ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ نے دن رات میں چار سو رکعت نماز اپنے اوپر لازم کر رکھی تھی لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو بلند درجہ پر پہنچے ہوئے ہیں پھر یہ سب تکلیفیں کیوں برداشت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''یہ تمام تکلیفیں اور راحتیں تو تمہارے اپنے حال میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اولیاء اللہ جو فانی الصفت ہوتے ہیں نہ ان پر کوئی تکلیف اثر کرتی ہے اور نہ راحت دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سستی کا نام پہنچا ہوا ہونا اور لالچ کا نام طلب حق نہ رکھ لو'' ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ذوالنونؒ کے پیچھے ایک نماز ادا کی جب آپ نے تکبیر اولیٰ کہتے ہوئے ''اللہ اکبر'' کہا تو یوں بیہوش ہو کر گر پڑے کہ گویا آپ کے جسم میں احساس تک باقی نہیں رہا...... حضرت جنیدؒ نے بڑھاپے میں بھی اپنی جوانی کے وظائف واوراد میں سے کوئی ورد، وظیفہ چھوڑا نہیں لوگوں نے عرض کی اے شیخ آپ ضعیف ہو گئے ہیں ان نوافل میں سے کچھ سے دستبردار ہو جائیں آپ نے فرمایا یہ وہ چیزیں ہیں کہ ابتدائے طریقت میں میں نے جو کچھ پایا ہے انہی کی بدولت پایا ہے تو اب انتہائے تصوف میں ان سے دستبردار ہو جاؤں یہ محال ہے...... مشہور ہے کہ فرشتے ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے ہیں اطاعت الٰہی ان کا پانی اور عبادت ان کا کھانا ہے اس لئے کہ وہ روحانی ہیں ان میں نفس سرکش موجود نہیں۔ جب کہ بندے کو اطاعت سے یہ نفس امارہ ہی روکتا ہے یہ نفس جتنا مغلوب ہوتا ہے بندگی اتنی ہی زیادہ آسان ہو جاتی ہے اور جب نفس بالکل فنا ہو جاتا ہے فرشتوں کی طرح عبادت ہی اس بندے کی غذا اور پانی بن جاتی ہے بشرطیکہ یہ فنائے نفس صحیح طریقہ سے ہو''...... حضرت عبداللہ بن مبارکؒ بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں میں نے ایک عبادت گزار خاتون کو دیکھا مجھے اب بھی یاد ہے کہ نماز کی حالت میں ایک بچھو نے اسے چالیس جگہ پر زخم کیا لیکن اس عابدہ عورت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے کہا ''اے اماں! آپ نے اس بچھو کو اپنے آپ سے دور کیوں نہ کیا؟ تو اس نے کہا ''بیٹے تم ابھی بچے ہو میرے لئے یہ کس طرح درست تھا کہ حق

تعالیٰ کے کام کے دوران میں اپنا کوئی کام کرتی ''...... حضرت ابوالخیر اقطعؒ کے پاؤں میں گوشت خورہ کی بیماری لگ گئی۔ طبیبوں نے کہا کہ اس پاؤں کو کاٹ دینا چاہئے لیکن آپ کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ مریدوں نے کہا ''نماز کی حالت میں ان کا یہ پاؤں کاٹ دیا جائے کیونکہ نماز میں انہیں بھی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پاؤں کٹا ہوا پایا......

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آپ رات کی نماز میں قرات دھیمی آواز سے کرتے تھے جب کہ حضرت عمر بن خطابؓ بلند آواز سے قرات کرتے تھے، پیغمبر ﷺ نے پوچھا اے ابوبکرؓ نرم آواز سے تلاوت کیوں کرتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا ''السمیع مَن انا جی '' (جس سے میں مناجات کرتا ہوں وہ تو سنتا ہے) یعنی جو کچھ میں کہتا ہوں وہ آہستہ کہوں یا بلند۔ وہ تو ہر حالت میں سنتا ہے پھر پیغمبر ﷺ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا ''تم بلند آواز سے کیوں قرات کرتے ہو؟ تو انہوں نے عرض کی ''اوقظ الوسنا الحرو الشیطان '' (میں سوئے ہوؤں کو جگاتا اور شیطان کو بھگاتا ہوں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اے ابوبکر! تم ذرا بلند پڑھا کرو اور اے عمر تم ذرا آہستہ تلاوت کیا کرو تا کہ عادت ترک ہو جائے۔

پس بعض صوفیہ تو فرائض کھلے عام ادا کرتے ہیں لیکن نوافل خلوت میں ادا کرتے ہیں اور اس طریقہ سے ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ریا کاری سے چھوٹے رہیں کیونکہ جب کوئی شخص معاملات میں ریا کاری سے کام لیتا ہے اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے تو وہ ریا کار بن جاتا ہے، چنانچہ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر چہ معاملات کو ہم نہیں دیکھتے لیکن لوگ تو دیکھتے ہیں اور یہ بھی دکھلاوا ہی ہے اور صوفیہ کا ایک دوسرا طبقہ فرائض کے علاوہ نوافل بھی کھلے طور پر ادا کرتا ہے اور وہ حضرات کہتے ہیں کہ ریا تو باطل ہے اور عبادت حق ہے۔ ہم ایک باطل کیلئے حق کو چھپائیں یہ نہیں ہوسکتا، پس ریا کو دل سے نکال دینا

چاہئے پھر جہاں تم چاہو عبادت کرلو..... مشائخ صوفیہ رحمہم اللہ نے خود بھی نماز کے حقوق اور آداب کو ملحوظ رکھا اور مریدوں کو بھی اس کا حکم دیا۔ چنانچہ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں چالیس سال تک سفر میں رہا۔ اور اس دوران میں نے ایک نماز بھی جماعت کے بغیر نہیں پڑھی اور ہر جمعہ کو میں ایک دوسرے گاؤں میں ہوتا تھا..... نماز کے تمام احکام اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ان تمام کو بیان کیا جائے تاہم مقامات میں سے جو چیز نماز سے وابستہ ہے وہ محبت الٰہی ہے۔ اب ہم انشاءاللہ اس کے جملہ احکام کو بیان کریں گے۔

باب

محبت اور اس کے متعلقات

اللہ عزوجل فرماتے ہیں ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُو مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَه'' (اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے (تو) پس عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کریں گے جس سے وہ محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے) اور نیز فرمایا ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُمِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَ ادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ '' (اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کا شریک بناتے ہوئے ان سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے کرنی چاہئے اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے ساتھ محبت میں بڑے سخت ہیں) اور پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیلؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''مَنْ اَھَانَ لِی وَلِیًا فقد بارزنی بالمحاربَةِ مَا ترودتُ فی شئٍ کتودودی فی قبضِ نفس عبدالمومن مَن یکون الموت وَاکره مساته' وَلاَ بدلَه' مِنه وَمَا یتقرب الیٰ عبدی بشئٍ احب اِلَی بالنوافِلِ حتی احبه' فاذا احببتُه' کنت لَه' سمعًا وبصراً وَّیداً وَرِجلاً ولِسَانًا '' (الحدیث) جس نے میرے ولی کی توہین کی اس نے میرے ساتھ جنگ کا اعلان کیا، مجھے کسی چیز میں اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک بندہ مومن کی روح قبض کرنے میں وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا حالانکہ موت سے اسے چارہ نہیں میرا کوئی بندہ جن اعمال سے میرا قرب حاصل کرتا ہے ان میں سے زیادہ پسندیدہ وہ احکام ہیں جو میں نے اس پر فرض کئے ہیں اور میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرے قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں پھر جب میں اس سے محبت

کر لیتا ہوں تو میں خود ہی اس کے کان، آنکھ، پاؤں اور زبان ہو جاتا ہوں) نیز حضور ﷺ نے فرمایا ''وَمَنْ اَحَبَّ لِقاء الله احب اللّٰه لقائه وَمَن كرة لقاء الله كره اللّٰهُ لقاء ه'' (جو شخص اللہ سے ملاقات کرنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتے ہیں اور جو شخص اللہ سے ملنا ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتے' نیز فرمایا '' اِذا حبَ اللّٰهُ عبداً قال بجبريل يا جبريل اِنى اُحِبُّ فلاناً فاحِبَّه' فيحِبُّه' جبرائيل ثُمَّ يقولُ جبرائيل لِاَهل السماء اِنَّ اللّٰه تعالىٰ قَدْا حَبَّ فلانا فاحبو فيحبه اهلُ السماء ثم يضع له القبول فى الارض فيحبهُ اهلُ الارضِ وفى بعض الروايات مثل ذالِک '' (اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو دوست بنا لیتے ہیں تو جبرئیلؑ سے فرماتے ہیں اے جبرئیل میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تو اس کو دوست رکھ۔ پس جبرئیلؑ بھی اس سے دوستی کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبرئیلؑ آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتے ہیں۔ سو آسمان والے بھی اسے دوست بنا لیتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کیلئے قبولیت رکھ دی جاتی ہے چنانچہ زمین والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ زمین والے بھی آسمان والوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں)

اور جان لو کہ حق تعالیٰ کی محبت بندے کے ساتھ اور بندہ کی محبت حق تعالیٰ کے ساتھ دونوں درست ہیں کتاب وسنت میں اس کا بیان ہے اور پوری امت کا اس پر اجماع ہے۔ اور خداوند تعالیٰ ایسے اوصاف کے مالک ہیں کہ اولیاء اس کو دوست رکھتے ہیں اور وہ اپنے دوستوں کو دوست رکھتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ محبت ''حبۃ'' (حا کی زیر) سے ماخوذ ہے اور یہ اس بیج کو کہتے ہیں جو صحرا میں زمین پر پڑتا ہے پس محبت کا نام حب رکھ دیا گیا کیونکہ زندگی کی اصل یہی ہے جس طرح کہ نباتات کی اصل بیج ہیں جس طرح بیج صحرا میں بکھرتے ہیں پھر وہ مٹی میں چھپ جاتے ہیں اس پر بارشیں ہوتی ہیں

سورج اس پر چمکتا رہتا ہے سردی اور گرمی کے موسم اس پر گزرتے ہیں اور وہ زمانوں کے بدلنے سے متغیر نہیں ہوتا لیکن جب اس کا وقت آ جاتا ہے تو وہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھول اور پھل لاتا ہے اسی طرح جب محبت کسی دل میں ٹھکانہ بنالیتی ہے تو حضور و غیبت آزمائش و محنت راحت ولذت اور فراق وصل کسی حالت میں متغیر نہیں ہوتی ایک شاعر نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

یَامَنْ سَقَامَ جنونہٖ لِسقامِ عاشقہ طبیب

حارث المودة فاستویٰ عندی حضورک والمغیب

اے وہ شخص جس کی پلکوں کی بیماری اپنے عاشق کی بیماریوں کیلئے طبیب ہے اس نے میرے دل میں محبت کا بیج بودیا ہے۔ پس میرے لئے تیرا حاضر ہونا یا غائب ہونا برابر ہے۔

اہل لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت اس حب سے ماخوذ ہے جو اس گڑھے کے معنی میں ہے جس میں پانی بہت زیادہ ہو، اور وہ پھیلا ہوا ہو کہ نگاہ کو اس میں گزر نہ ہو اور وہ اس کیلئے روکنے والا ہو کہ اسی طرح محبت جب کسی طالب کے دل میں جمع ہو جاتی اور اس کے دل کو اپنے وجود سے بھر دیتی ہے تو پھر دوست کی بات کے علاوہ اس کے دل میں کسی چیز کیلئے گنجائش نہیں رہتی۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دوستی کی خلقت سے نوازا اور وہ حق تعالیٰ کی بات کے سوا ہر چیز سے کنارہ کش ہو گئے تو یہ جہان اور جہان والے ان کیلئے حجاب بن گئے اور وہ حق تعالیٰ کی دوستی میں ان حجابوں کے دشمن بن گئے۔ ان کی اس حالت اور گفتگو کو حق تعالیٰ نے ہمارے لئے بیان کیا کہ انہوں نے کہا ''فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ اِلَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ '' (رب العالمین کے علاوہ وہ سب میرے دشمن ہیں) اور اسی معنی میں حضرت شبلیؒ نے کہا ''سُمیتِ المحبة لانها من القلب ماسوی المحبوب '' (اس کا نام محبت رکھا گیا ہے کیونکہ یہ دل سے محبوب کے سوا ہر چیز کو مٹا دیتی ہے) نیز اہل لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ جب اس چار چوبہ کو کہتے ہیں جو چار لکڑیاں جوڑ کر کوزہ رکھنے کیلئے

بنایا جاتا ہے اس لئے محبت کو حب کہتے ہیں کہ محب، عزت وذلت، خوش وغم، آزمائش ومحنت اور دوست کی جفاو وفا ہر چیز کو برداشت کرتا ہے اور یہ چیزیں اس پر گراں نہیں گزرتیں کیونکہ جس طرح اس چارچوبہ کا کام ہی بوجھ اٹھانا ہے اسی طرح اس محبّ کا کام بھی ان چیزوں کو برداشت کرنا ہے۔ پس محبّ کی تخلیق اور ترکیب ہی دوست کا بوجھ برداشت کرنے کیلئے کی گئی ہے اس معنی میں شاعر کہتا ہے۔

اِنْ شئتِ جُودی وَان شئت فامتنِعی

کلا هُمَا منکِ منسوب'' اِلیٰ الکرُمِ

(اے محبوبہ چاہے تو سخاوت کر اور چاہے روک لے۔ تیری یہ دونوں ادائیں تیرے کرم کی طرف ہی منسوب ہوں گی)

نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ حب سے ماخوذ ہے جو حبہ کی جمع ہے اور یہ دل کے درمیانی نقطہ کو کہتے ہیں حبہ دل۔ محل لطیف ہے اور دل کا تمام انتظام اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ نیز محبت کا محل بھی یہی جگہ ہے پس محبت کو اس کے محل کے نام سے موسوم کر دیا کیونکہ اس کا قرار اسی حبہ دل میں ہوتا ہے اور عرب والے کسی چیز کو اس کے محل کے نام سے موسوم کرتے رہتے ہیں۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت، **حباب الماء وغليانه عندالمطر الشديد** سے ماخوذ ہے اور وہ اس گہرے پانی کو کہتے ہیں جو شدید بارش کے وقت جوش کرتا ہے پس محبت کا نام حب رکھ دیا کیونکہ محبت بھی دل کے اس جوش کا ہی نام ہے جو محبوب کی ملاقات کے اشتیاق کے وقت پیدا ہوتا ہے دوست کا دل اپنے دوست کے شوق دیدار میں مضطرب اور بیقرار رہتا ہے جس طرح کہ جسم اور روح کے مشتاق ہوتے ہیں اور جس طرح جسموں کا قیام روح کے ساتھ وابستہ ہے اسی طرح نقطہ دل کا قیام بھی محبت کے ساتھ وابستہ ہے اور محبت کا قیام محبوب کے وصل اور دیدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی معنی میں شاعر کہتا ہے کہ

اِذَا تمنی الناس روحًا وَّراحة

نمینتُ ان القاک تصرف حالیا

جب لوگ آرام اور راحت کی آرزو کرتے ہیں تو میں تیری ملاقات کی تمنا کرتا ہوں تا کہ میری حالت تجھ پر واضح ہو۔

اور بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ جب نام ہے محبت کی صفائی کا۔ کیونکہ عرب لوگ انسانی آنکھ کی سفیدی کے خوب اُجلے پن کو "حبتہ الانسان" کہتے ہیں۔ جس طرح کہ دل کے سیاہ درمیانی نقطے کی صفائی کو حبت القلب کہتے ہیں۔ پس یہ ایک (دل) محبت کا محل ہے اور وہ دوسرا (آنکھ) محل دیدار۔ اسی لئے تو دل و دیدہ۔ دوستی میں متصل ہی ہوتے ہیں، اس معنی میں شاعر کہتا ہے کہ ؎

القلب یحسدُ عینی لذت النظر

والعین یحسد قلبی لذة الفکر

میرا دل، میری آنکھ سے حسد کرتا ہے کہ اس نے دیدارِ محبوب کی لذت پائی ہے اور میری آنکھ میرے دل سے حسد کرتی ہے کہ اسے محبوب کے بارے میں فکر کی لذت حاصل ہے۔

فصل

جان لو کہ محبت کا لفظ علماء کے ہاں تین طرح استعمال ہوا ہے۔ ایک اس معنی میں کہ نفس کے اضطراب، میلان، خواہش اور دل کی تمنا و طلب اس کے ساتھ محبوب کی طرف ارادہ کرے، لیکن ان تمام امور کو حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ تمام باتیں مخلوقات کے ایک دوسرے کے ساتھ اور ایک جنس کے دوسرے جنس کے ساتھ تعلق میں درست ہوتی ہیں جب کہ خداوند تعالیٰ ان سب سے مستغنی اور بہت زیادہ بلند و برتر ہے، محبت کا دوسرا معنی، احسان اور بندہ کو اپنی عنایات کیلئے خاص کر لینے کا ہے کہ حق تعالیٰ اس کو برگزیدہ کر کے ولایت کے درجہ کمال تک پہنچا دیتے ہیں اور اس کو طرح طرح کی عزتوں سے مخصوص کر دیتے ہیں اور محبت کا تیسرا استعمال بندے پر اچھی حمد و ثنا کرنے کے معنی میں

ہوتا ہے۔ متکلمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کی جس محبت کی ہمیں خبر دی گئی ہے وہ حق تعالیٰ کی سماعی صفات میں سے ایک صفت ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کیلئے آنکھ، چہرہ اور سیدھے ہو کر بیٹھنے کی صفات ہیں کہ اگر کتاب وسنت نے ہمارے سامنے بیان نہ کی ہوتیں تو حق تعالیٰ کی ذات کیلئے ان کا اثبات از روئے عقل محال ہوتا پس ہم اسی طرح کی محبت کا اثبات کرتے ہیں اور اسی کو بیان کرتے ہیں لیکن اس کے استعمال میں توقف کرتے ہیں اور گروہ صوفیہ کی مراد یہ ہے کہ اس لفظ محبت کا حق تعالیٰ کیلئے اطلاق کرنا درست نہیں سمجھتے اور انہی کے یہ تمام اقوال تھے جو میں نے ابھی بیان کر دیئے اور میں انشاء اللہ تیرے لئے اس کی حقیقت کو بیان کروں گا۔

جان لو کہ بندہ کیلئے حق تعالیٰ کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندے کیلئے بھلائی کا ارادہ کرے اور اس پر اپنی رحمت کا اظہار کرے، اور جس طرح رضا وسخط رحمت ورافت اور دوسرے نام حق تعالیٰ کے ارادے سے متعلق ہیں اسی طرح محبت بھی ارادے کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ان ناموں کو حق تعالیٰ کے ارادے کے علاوہ کسی چیز پر محمول نہیں کرنا چاہئے اور یہ ارادہ حق تعالیٰ کی ایک قدیم صفت ہے کہ وہ اس کے ذریعے اپنے افعال کو پورا کرتا ہے پس مبالغے اور فعل کے اظہار میں ان صفات میں سے بعض صفتیں بعض سے زیادہ خاص ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بندہ کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت اس چیز کا نام ہے کہ وہ اس پر بہت زیادہ نعمتیں نازل کرے، اس کو دنیا وآخرت میں ثواب مرحمت کرے اس کو سزا کے محل سے بچائے رکھے گناہوں سے اسے محفوظ رکھے، اس کو بلند احوال اور اعلیٰ مقامات سے مشرف کرے اس کے باطن کو غیروں کی توجہ سے ہٹادے اور اپنی ازلی عنائتوں کو اس کے ساتھ وابستہ کر دے تاکہ وہ سب سے کنارہ کش ہو جائے اور صرف حق تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے تنہا رہ جائے چنانچہ حق تعالیٰ جب بندے کو ان معانی کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں تو ان کے ارادے کی اس تخصیص کا نام محبت رکھتے ہیں۔ یہ مذہب حضرات

حارث محاسبی۔ جنید بغدادی اور مشائخ رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا ہے جب کہ فقہا کی دونوں جماعتوں اور متکلمین اہل سنت کی اکثریت کا مسلک بھی یہی ہے...... اور جو یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی محبت بندہ پر اس کی ثناء جمیل کا نام ہے تو یہ درست نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کی تعریف تو اس کا کلام ہی ہوگی اور اس کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے تو پھر غیر مخلوق کا مخلوق کے ساتھ تعلق کس طرح صحیح ہو سکے گا۔ اور جو کہتے ہیں کہ محبت بمعنی احسان ہے تو اس کا احسان خود اس کا اپنا ہی فعل ہوگا اور یہ معنی کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے باقی بندہ کی محبت حق تعالیٰ کے ساتھ تو یہ ایک صفت ہے جو تعظیم اور تکبیر کے طور پر ایک فرمانبردار بندے کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تا کہ وہ اپنے محبوب کی خوشنودی طلب کرے اور خواہش دیدار میں ہر چیز سے بے خبر ہو جائے اور اس کی قربت کی آرزو میں بیقرار ہو جائے کہ محبوب کے علاوہ کسی چیز سے اسے قرار نصیب نہ ہو اور اس کی یاد کو اپنی عادت بنا لے اس طرح کہ اس کے علاوہ ہر کسی کے ذکر سے بیزار ہو جائے آرام اس پر حرام ہو جائے اور قرار اس سے بھاگ جائے اور دنیا کی تمام دلچسپیوں اور مرغوبات سے منقطع ہو جائے اور خواہشات سے اعراض کرے اور غلبہ دوستی کی طرف متوجہ ہو جائے اور محبوب کے حکم کے سامنے اپنی گردن جھکا دے اور حق تعالیٰ کو اس کی صفات کمالیہ سے پہچانے اور یہ جائز نہیں کہ اس کیلئے خالق کی محبت اس طرح ہو جس طرح مخلوق کی ایک دوسرے کے ساتھ محبت ہوتی ہے کیونکہ یہ تو محبوب کو پا لینے اور اس کا احاطہ کر لینے کی رغبت کا نام ہے اور یہ اجسام کی صفت ہے۔ پس محبان حق تعالیٰ اس کے قرب میں ہلاکت کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ اس کی کیفیت کے طلب گار کیونکہ طالب اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے جب کہ ہلاکت چاہنے والا اپنے محبوب کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور معرکہ گاہ محبت میں سب سے زیادہ پسندیدہ محب وہ ہوتے ہیں جو کشتہ تیغ محبت اور محبت کے ہاتھوں مغلوب ہوں کیونکہ کسی حادث کیلئے ذات قدیم کے ساتھ توصل۔ قدیم کے غلبہ کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص محبت کی اصل حقیقت کو معلوم کرے اس

کیلئے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا، مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور تمام شبہات دور ہو جاتے ہیں...... پس محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ جنس کی ہم جنس کے ساتھ محبت ہو اور یہ نفس کا جھکاؤ اور خواہش ہے اور محبوب کے ساتھ جسمانی طور پر ملنے اور چمٹ جانے کا نام ہے اور دوسری محبت کسی جنس کی اپنی غیر جنس کے ساتھ اور یہ محبت بڑی جدوجہد کا تقاضہ کرتی ہے تاکہ محب اپنے محبوب کی صفات میں سے کسی صفت کے ساتھ آرام پائے اور اس سے انس کرے مثلاً کانوں کو محبوب کے کلام سے اور آنکھوں کو محبوب کے دیدار سے ہی آرام نصیب ہوتا ہو۔ پھر محبت کرنے والے جو حق تعالیٰ کی محبت کے گرویدہ ہوں وہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پہلے وہ لوگ جو حق تعالیٰ کے احسان و انعام کو اپنے اوپر دیکھتے ہیں اور یوں انعام و احسان کا دیکھنا ان کیلئے منعم اور محسن کے ساتھ محبت کا تقاضہ کرتا ہے اور دوسرے وہ حضرات جو تمام انعامات کو غلبہ دوستی کی وجہ سے محل حجاب میں رکھتے ہیں اور ان کی راہ انعامات کی رویت سے منعم حقیقی کی طرف ہوتی ہے اور یہ راہ پہلے قسم کے لوگوں کے طریق سے بہت عالی اور بلند مرتبہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

غرضیکہ محبت ایک ایسا لفظ ہے جو مخلوق کی تمام اصناف میں مصروف تمام زبانوں میں مشہور اور تمام لغات میں مروج ہے اور عقلمند لوگوں کی کسی صنف نے بھی اس کو اپنے آپ سے مخفی رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مشائخ صوفیہ میں سے حضرت سمنون المحبؒ محبت کے معاملے میں ایک خاص مشرب رکھتے ہیں کہ راہ حق تعالیٰ کی اصل اور بنیاد محبت ہے اور احوال و مقامات اس کی منزلیں ہیں اور طالب جس منزل اور مقام میں بھی ہو اس پر زوال ممکن ہے لیکن خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ محبت ایک ایسی نعمت ہے کہ جب تک یہ قائم رہے کسی حال میں بھی اس پر زوال روا نہیں اور دوسرے مشائخ اس معنی میں تو آپ کے

ساتھ موافقت کرتے ہیں لیکن اس وجہ سے کہ یہ ایک عام ہے اور ظاہر اسم ہے وہ چاہتے ہیں کہ اس معنی کا حکم مخلوق کے درمیان پوشیدہ رکھیں اور اس کے معنی کو اپنے مقام پر قائم رکھتے ہوئے اس کے نام کو بدل دیں پس انہوں نے خالص محبت کا نام صفت رکھ دیا اور محبّ کو صوفی کا نام دے دیا اور ایک گروہ نے محبوب کے اختیار کو ثابت کرنے اور محبت کے اپنے اختیار کو ترک کر دینے کا نام فقر رکھ دیا اور محبّ الٰہی کو فقیر کا نام دے دیا کیونکہ محبت میں کم سے کم درجہ محبوب کے ساتھ موافقت ہوتا ہے اور محبوب کی موافقت اور اس کی محبت محبوب کی مخالفت کا غیر ہوتی ہے میں کتاب کی ابتدا میں فقر وصفوت کا حکم کھول کر بیان کر چکا ہوں اور اس معنی میں وہ بزرگ پیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ''**الحُبُّ عندالزهاد اظهر من الاجتهاد**'' (زاہدوں کے ہاں محبت، اجتہاد سے زیادہ ظاہر چیز ہے) ''**وعند التائبين اجد من انين وحنين**'' (اور اہل توبہ کے ہاں نالہ وفغاں سے زیادہ پائی جاتی ہے) ''**وعند الاتراك اشهرُ من الفراك**'' (اور ترکوں کے نزدیک ان کی سواری کے اسباب سے زیادہ مشہور ہے) ''**وصبتي الحب عندا لهنود اظهر من حبي المحمود**'' (اور ہندوؤں کے نزدیک محبت کا غلام بننا محمود کا غلام بننے سے زیادہ ظاہر ہے) ''**وقصة الحبِ والحبيب عندالروم الشهرُ من الصليب**'' (اور رومی عیسائیوں کے ہاں محبت اور محبوب کا قصہ صلیب سے بھی زیادہ مشہور ہے) ''**وقصة الحب في العرب ادب في كل حيي منه لحرب اوويل وهربُ اوحزن**'' (اور محبت کا قصہ عرب کے ہر جاندار میں ایک ادب ہے خوشی کی حالت ہو یا غم کی اور جنگ کی صورت ہو یا کچھ پانے اور کھونے کی ان تمام اقوال سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کی کوئی جنس ایسی نہیں جس کو محبت کے ساتھ واسطہ نہ پڑا ہو کہ وہ اپنے دل میں محبت سے کشادگی اور خوشی میں محسوس نہ کرے یا اس کا دل شراب محبت سے مست اور یا غلبہ محبت سے مخمور ہی نہ ہوا ہو اس لئے کہ دل کی ترکیب ہی بیقراری اور اضطراب سے ہے اور دوستی میں عقل ایک شراب کا سمندر ہے اور

دل کی زندگی کیلئے محبت بمنزلہ کھانے اور پینے کے ہے اور جو دل بھی محبت سے خالی ہے وہ خراب ہے اور اس محبت کو ہٹانے اور دور کرنے میں تکلف کا کوئی اختیار نہیں اور محبت کے جو لطائف دل پر گزرتے ہیں نفس ان سے ہرگز آگاہ نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ اپنی کتاب "محبت" میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے دلوں کو جسموں سے سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور ان کو اپنے مقام قرب میں رکھا اور روحوں کو دلوں سے بھی سات ہزار سال قبل پیدا کیا اور ان کو اپنے درجہ انس میں رکھا اور باطنوں کو روحوں سے بھی سات ہزار سال پہلے پیدا کیا اور ان کو اپنے درجہ وصل میں رکھا اور روزانہ تین سو ساٹھ مرتبہ اپنے جمال کو کھول کر باطنوں پر تجلی فرمائی اور تین سو ساٹھ مرتبہ کرامت کی نظر فرمائی اور روحوں کو محبت کا کلمہ سنوایا اور دلوں پر تین سو ساٹھ لطیفہ ہائے محبت ظاہر کئے حتی کہ ان سب نے جہان میں نگاہ کی تو کسی کو بھی اپنے آپ سے زیادہ باعزت نہ دیکھا یوں ان کے اندر فخر اور غرور پیدا ہو گیا تو حق جل جلالہ نے اس وجہ سے ان کو آزمائش میں مبتلا کیا اور باطن کو روح میں گرفتار کر دیا اور روح کو دل میں محبوس کر دیا اور دل کو جسم کے اندر قیدی بنا دیا پھر عقل کو ان کے اندر ترکیب عطا کی اور انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیج کر اپنے احکام ان کو دیئے اس وقت ان میں سے ہر ایک اپنے اس مقام کا متلاشی ہو گیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا تو جسم نماز میں مشغول ہو گیا، دل محبت کے ساتھ پیوست ہو گیا۔ روح قرب الٰہی میں پہنچ گئی اور باطن نے وصل الٰہی میں قرار پکڑ لیا، خلاصہ کلام یہ ہے کہ محبت جیسی لطیف کیفیت کو الفاظ و عبارات میں بیان نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ محبت ایک حال ہے اور حال ہرگز قال نہیں بن سکتا۔ اگر جہان والے محبت کو کھینچ کر اپنے اندر پیدا کرنا چاہئیں تو ہرگز ایسا نہیں کر سکتے اور اگر بتکلف اس کو اپنے آپ سے دور کرنا چاہیں تو دور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ "حال" خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک وہبی کیفیت ہوتی ہے نہ کہ کسبی اور اگر تمام اہل جہان اکٹھے ہو کر کسی محبت کے طلب گار شخص کیلئے محبت حاصل کرنا چاہیں تو وہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

اسی طرح اگر وہ سب مل کر کسی ایسے شخص سے اسے دور کرنا چاہئیں جو محبت کا اہل ہے تو وہ عاجز آ جائیں گے کیونکہ محبت عطیہ خداوندی ہے اور انسان لہو ولعب کا مرتکب ہونے والا اور لہو ولعب والا عطیہ الٰہی کا ادراک نہیں کرسکتا۔ (واللہ اعلم)

فصل

تاہم عشق کے بارے میں مشائخ کا کلام طویل ہے چنانچہ صوفیہ میں سے ایک جماعت بندہ کی طرف سے حق تعالیٰ کے ساتھ عشق کو تو جائز سمجھتی ہے لیکن حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ عشق کو روا نہیں سمجھتی ان کا کہنا ہے کہ عشق اپنے محبوب سے رکنے کی صفت ہے اور بندہ تو حق تعالیٰ سے روکا گیا ہے لیکن حق تعالیٰ بندہ سے منع نہیں کیے گئے، پس بندہ پر تو عشق کا اطلاق جائز ہے لیکن حق تعالیٰ پر درست نہیں۔ پھر ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ بندہ کیلئے حق تعالیٰ پر عشق بھی جائز نہیں۔ کیونکہ عشق نام ہے حد سے تجاوز کر جانے کا، جب کہ حق تعالیٰ لامحدود ہیں پھر متاخرین صوفیہ کہتے ہیں کہ عشق دونوں جہان میں ذات حق تعالیٰ کے ادراک کی طلب کے سوا کسی پر درست نہیں آتا اور حق تعالیٰ کی ذات تو احاطہ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی لہذا محبت کا اطلاق تو اس جگہ درست ہوسکتا ہے لیکن بندہ کیلئے حق تعالیٰ کے ساتھ عشق کا اطلاق درست نہیں ہونا چاہئے نیز یہ حضرات کہتے ہیں کہ رویت اور دیدار کے بغیر عشق متصور نہیں ہوسکتا جب کہ محبت صرف سننے سے ہی ہو جانا درست ہے۔ لہذا جب عشق کا تعلق نظر کے ساتھ ہے تو یہ ذات باری تعالیٰ پر درست نہیں ہوسکتا کیونکہ دنیا میں کسی نے بھی حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا اور چونکہ حق تعالیٰ کے متعلق یہ خبر تھی کہ وہ ایسا ہے اس لئے ہر ایک نے اس کا دعویٰ کر لیا کیونکہ خطاب میں تو سب برابر ہیں۔ پس حق تعالیٰ اپنی ذات میں مدرک اور محسوس نہیں ہیں کہ مخلوق کا ان کے ساتھ عشق درست ہو سکے، البتہ جب وہ اپنے افعال وصفات کی وجہ سے اولیاء کرام کا محسن اور کرم فرما ہے تو اس کی صفات کے ساتھ محبت

درست ہوگی، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی محبت میں مستغرق کر دیا گیا تو ان کے فراق کی حالت میں ہی جب آپ نے ان کے پیراہن کی بو محسوس کی تو آپ کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور بینائی لوٹ آئی لیکن زلیخا کو جب حضرت یوسف علیہ السلام کے عشق نے ہلاکت کی طلب گار بنا دیا تو جب تک اسے وصل نصیب نہ ہوا سے انکھیں دوبارہ نہ مل سکیں۔ یہ طریق بڑا ہی عجیب ہے کہ ایک تو خواہشات کی پرورش کرتا ہے اور دوسرا خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے...... نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق کی بھی کوئی ضد نہیں اور حق تعالیٰ کی بھی کوئی ضد نہیں اس لئے اس کا طلاق ذات باری پر روا ہونا چاہئے اس مضمون میں لطائف بہت ہیں لیکن میں نے طوالت کے خوف سے اسی مقدار پر اکتفا کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فصل

محبت کی تحقیق میں مشائخ صوفیہ کے رموز شمار سے زیادہ ہیں۔ میں انشاء اللہ ان کے اقوال میں سے اس کتاب میں تبرک کے طور پر چند اقوال پیش کرتا ہوں...... استاد ابو القاسم قشیریؒ کہتے ہیں کہ "**المحبه محو المحبِ بصفاقِه و اثبات المحبوب بذاتِه**" (محبّ کے اپنی تمام صفات کو محو کرنے اور محبوب کی ذات کو ثابت کرنے کا نام محبت ہے) یعنی محبت وہ ہوتی ہے کہ محبّ اپنے محبوب حقیقی کی طلب میں اپنے جملہ اوصاف کی نفی کر دے اور ذات حق تعالیٰ کا اثبات کرے۔ کیونکہ جب محبوب باقی اور محبّ فانی ہوگا تو دوستی کی غیرت کو محبوب کے بقاء کے ساتھ نفی کرے گا۔ تاکہ اس کو مطلق غلبہ حاصل ہو جائے اور محبت کی صفت کا فنا ذات محبوب کے اثبات کے بغیر نہیں ہوسکتا اور یہ جائز نہیں کہ محبّ اپنی صفات کے ساتھ قائم ہو کیونکہ اگر وہ اپنی صفت کے ساتھ قائم ہوگا تو جمال محبوب سے بے نیاز ہو گا۔ البتہ جب وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کی زندگی جمال محبوب کے ساتھ وابستہ ہے تو اپنے

اوصاف کے اثبات کی نفی کا ضرور طالب ہوگا کیونکہ اسے معلوم ہوگا کہ وہ ایسی صفت کی وجہ سے محبوب سے حجاب میں ہے۔ پس دوست کی وجہ سے اپنے آپ کا دشمن ہو جائے گا...... مشہور ہے کہ حضرت حسین بن منصورؒ کو تختہ دار پر لٹکایا گیا تو ان کا آخری جملہ یہ تھا کہ "حُبُّ الواجد اقرار الواحد" (اللہ کی توحید کا اقرار ہی صاحب حال کی محبت ہے) محبت کیلئے یہی کافی ہے کہ اس کا وجود راہ محبت میں قربان ہو جائے اور ولایت نفس محبوب کے پانے اور اس کی جستجو میں فنا ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کہتے ہیں کہ "المحبة استقلال الكثير من نفسک و استكثار القليل من حبيبک" (محبت یہ ہے کہ اپنے بہت سے کو تھوڑا سمجھے اور محبوب کے تھوڑے سے کو بھی بہت زیادہ سمجھے) اور اللہ تعالیٰ کا بندے کے ساتھ معاملہ یوں ہی ہے کہ دنیا کی تمام نعمتوں اور دنیا میں جو کچھ بندے کو دے رکھا ہے اسے بہت تھوڑا کہا ہے چنانچہ فرمایا "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْل" (اے محمد ﷺ آپ کہہ دیں کہ دنیا کا متاع بہت تھوڑا ہے جو کچھ میں نے تمہیں دے رکھا ہے) لیکن اس تھوڑی عمر۔ تھوڑی سی جگہ اور قلیل سامان کی موجودگی میں ان کے تھوڑے سے ذکر کو بہت کیا ہے کہ "وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ" (اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں) تاکہ جہاں کی تمام مخلوق میں درست نہیں آتی۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بندہ کو نصیب ہوتا ہے اس میں کوئی چیز بھی تھوڑی نہیں لیکن مخلوق کی طرف سے جتنا بھی ہے وہ تھوڑا ہی ہے۔

حضرت سہیل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں کہ "المحبة معانقه الطاعات و مباينة المخالفات" (محبت یہ ہے کہ محبوب کی اطاعتوں کے ساتھ تو بغلگیر ہو جائے اور اس کی مخالفتوں سے اعراض کرے) اور نافرمانیوں سے الگ ہو جائے کیونکہ جس آدمی کے دل میں محبت جتنی زیادہ مضبوط ہوتی ہے دوست کا حکم بجالانا اتنا ہی دوست پر آسان ہوتا ہے اور یہ ملحدین کے اس گروہ کا امر ہے جو کہتے ہیں کہ بندہ دوستی میں اس درجے پر پہنچ

جاتا ہے کہ اطاعت اس سے اٹھالی جاتی ہے حالانکہ یہ محض زندیقیت (بے دینی) ہے کیونکہ یہ بالکل محال امر ہے کہ عقل کے صحیح ہوتے ہوئے کسی بندہ سے احکام کے مکلّف ہونے کا حکم ساقط ہو جائے۔ اس لئے کہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت ہرگز منسوخ نہ ہوگی۔ اگر عقل کے درست ہوتے ہوئے کسی ایک شخص سے احکام کی تکلیف کا اٹھ جانا درست اور جائز مان لیا جائے تو پھر تمام لوگوں سے اٹھ جانا بھی جائز ہوگا جب کہ یہ محض زندقہ (بے دینی) ہے البتہ مغلوب الحال اور بے ہوش آدمی کا حکم مختلف ہے اور اس کا عذر بھی دوسرا ہے تاہم یہ روا ہے کہ حق تعالیٰ کسی بندے کو اپنی محبت میں اس مقام پر پہنچا دیں کہ اطاعت وفرمانبرداری کرنے میں جو رنج ہوتا ہے وہ اس سے اٹھالیں کیونکہ کسی چیز کا رنج اس چیز کی محبت کی مقدار کے مطابق صورت اختیار کرتا ہے چنانچہ جس قدر محبت قوی ہوتی جائے گی فرمانبرداری کرنے کا رنج اس پر آسان ہوتا چلا جائے گا۔ اور پیغمبر ﷺ کے حال میں بھی یہ معنی ظاہر ہے کہ جب حق تعالیٰ نے آپ کی زندگی کی قسم اٹھاتے ہوئے ''لَعَمْرُکَ'' کے الفاظ کہے تو آپ نے روز وشب اس قدر عبادت کرنا شروع کر دی کہ آپ تمام کاموں سے رک گئے اور آپ کے پاؤں مبارک پر ورم آ گیا یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ''طٰهٰ مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی'' (اے رسول ﷺ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے تو نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں) نیز یہ بھی جائز ہے کہ حکم بجالانے کی حالت میں کام کرنے کی فکر بندے سے اٹھالی جائے۔ جیسا کہ سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ ''اِنَّہٗ لیغانُ علی قلبی وَاِنّی لَاستغفر اللّٰہَ فی کل یومٍ سبعین مرۃ'' (بے شک میرے دل پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور میں اپنے اللہ سے روزانہ ستر مرتبہ اپنے کردار پر استغفار کرتا ہوں) اس لئے کہ آنحضرت ﷺ اپنے آپ کو اور اپنے کردار کو نہیں دیکھتے تھے کہ اپنی اطاعت پر مغرور ہو جائیں بلکہ حق تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کو دیکھتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''میرا یہ عمل بارگاہ الٰہی کے سزاوار ہی نہیں...... حضرت سمنون محبؒ کہتے ہیں کہ

''ذھب المحبُون للہِ بشرفِ الدنیا و الاخرۃ لِاَنّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المرءُ مَعَ مَنْ اَحبَّ ''(اللہ عزوجل کے محبّ تو دنیاوآخرت کا شرف لے گئے کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہرانسان اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ وہ محبت کرتا ہے)پس محبان حق دنیااور آخرت میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں اس سے غلطی نہیں ہوتی۔پس دنیا کی بزرگی تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور آخرت کا شرف یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہوں گے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ الرازیؒ کہتے ہیں کہ''حقیقۃ المحبۃ لاینقُص بالجفاء وَلا یزید بالبر والعطاء ''(سچی محبت نہ جفا سے کم ہوتی ہے اور نہ ہی احسان وعطا سے زیادہ ہوتی ہے) کیونکہ یہ دونوں محبت میں سبب کی حیثیت رکھتے ہیں اور چیزوں کی ذات کی موجودگی میں اسباب معدوم ہوتے ہیں،اور دوست اپنے دوست کی آزمائش سے خوش ہوتے ہیں اور جفاوفا دوستی کی راہ میں برابر ہوتے ہیں،جب محبت حاصل ہو تو وفا مثل جفا کے ہوتی ہے اور جفا مثل وفا کے ہوتی ہے......اور حکایات میں مشہور ہے کہ جب حضرت شبلیؒ کو پاگل پنے کی تہمت میں پاگل خانے لے جایا گیا اور وہاں بند کردیا گیا تو کچھ لوگ آپ کی زیارت کیلئے وہاں آئے آپ نے دریافت کیا''مَنْ اَنْتُم ''(تم لوگ کون ہو؟)انہوں نے جواب دیا''احباؤک(ہم آپ کے دوست ہیں)''فَرَمَا ھُمَ بالحجارۃِ فضرِوا ''(آپ نے ان کو پتھر مارنے شروع کردئے تو وہ بھاگ اٹھے)تب آپ نے فرمایا''لَو کُنتم احبائی لَمَا فروتُم مِن بلائی فاصبُروا مَن بلائی ''(اگر تم لوگ میرے دوست ہوتے تو میری اس مصیبت سے ہرگز نہ بھاگتے کیونکہ دوست تو دوستوں کی مصیبت سے بھاگا نہیں کرتے)اس معاملہ میں گفتگو بہت زیادہ ہے تاہم میں اسی مقدار پر اکتفا کرتا ہوں۔(واللہ اعلم بالصواب)

چھٹا کشف حجاب

زکوٰۃ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ'' (اورنماز قائم کرو اور زکوۃ دو) اسی طرح زکوۃ کے متعلق آیات اور احادیث بہت ہیں۔ اور ایمان کے فرض احکام میں زکوۃ ایک ہے اور یہ جس پر واجب ہوتی ہے اس کیلئے اس سے اعراض ہرگز جائز نہیں۔ تاہم زکوۃ نعمت کے اتمام پر واجب ہوتی ہے مثلاً دوسو شرعی درہم کو یہ ان پر نعمت پوری ہوتی ہے اگر مالکانہ حیثیت میں کسی کے تصرف میں ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے) تو اس پر پانچ درہم بطور زکوۃ واجب ہو جاتے ہیں اور بیس دینار پر بھی نعمت پوری ہو جاتی ہے لہذا ان میں سے نصف دینار واجب ہو جاتا ہے نیز پانچ اونٹ بھی پوری نعمت ہیں لہذا ان پر ایک بکری بطور زکوۃ واجب ہو جاتی ہے، اسی طرح دوسرے اموال پر بھی زکوۃ ہوتی ہے پھر جس طرح مال پر زکوۃ ہے۔ اسی طرح جاہ عزت پر بھی زکوۃ ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی تو ایک مکمل نعمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ فرض علیکم زکوۃ جاھِکُم کَمَا فرض علیکم زکوٰۃ مَالِکُمْ'' (اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے مرتبے کی زکوۃ اسی طرح فرض کی ہے جس طرح تم پر تمہارے مال کی زکوۃ فرض ہے) اور نیز فرمایا ہے کہ ''اِنَّ لِکُلّ شیٔ زکوٰۃ'' وزکوۃ الدار بیت الفیافة'' (بے شک ہر چیز کی ایک زکوۃ ہے اور گھر کی زکوۃ مہمان خانہ ہے) اور زکوۃ کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے۔ نعمت کی جنس میں سے تندرستی بھی بہت بڑی نعمت ہے اس لئے ہر عضو کی ایک زکوۃ ہوگی اور وہ یہ ہے کہ اپنے تمام اعضا کو عبادت میں مشغول رکھیں اور کسی طرح کے لہو ولعب میں ان کو نہ لگائیں تاکہ نعمت کی زکوٰۃ کا حق ادا کرسکیں پھر باطنی نعمتوں کی بھی زکوٰۃ ہے لیکن ان کی کثرت کی وجہ سے ان کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اس

میں بھی زکوٰۃ ہے لیکن ان کی کثرت کی وجہ سے ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس میں بھی اپنی ذات میں ایک زکوۃ ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہری و باطنی نعمتوں کا پہچان لینا ہے...... بندہ جب یہ جان لیتا ہے کہ اس پر حق تعالیٰ کی نعمتیں بیکراں ہیں۔ تو وہ شکر بھی بے حساب ہی کرتا ہے اور یہ بے حساب شکر ادا کرنا ہی بے حساب نعمتوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔ بہرحال صوفیائے کرام کے نزدیک دنیا کی نعمت کی زکوۃ کوئی پسندیدہ چیز نہیں کیونکہ انسان کیلئے بخل ایک ناپسندیدہ چیز ہے اور یہ کامل درجے کا بخل ہی تو ہے کہ کوئی شخص دوصد درہم اپنے قبضے میں جمع رکھے اور ان کو ایک سال تک اپنے تصرف میں محبوس رکھے اور پھر ان میں سے پانچ درہم کسی کو دے دے۔ پس جب مال کا خرچ کرنا اور سخاوت کا اپنانا ہی اہل کرم کا طریق اور سیرت ہے تو پھر زکوۃ واجب ہی کس طرح ہو سکتی ہے...... میں نے حکایات میں پایا ہے کہ علمائے ظاہر میں سے ایک نے آزمائش کے طور پر حضرت شبلیؒ سے زکوۃ کے متعلق دریافت کیا کہ کتنی ادا کرنی چاہئے؟ آپ نے فرمایا جب بخل موجود ہو اور مال حاصل ہو تو ہر دوسو درہم میں سے پانچ درہم اور ہر بیس دینار میں سے نصف دینار زکوۃ ادا کرنا تمہارا مذہب ہے لیکن میرا مذہب یہ ہے کہ کوئی چیز بھی ملکیت میں نہیں ہونی چاہئے تاکہ زکوۃ کے مشغلہ چھٹکارا ملا رہے اس نے کہا ''اس مسئلہ میں آپ کا امام کون ہے؟'' آپ نے جواب دیا ''حضرت ابوبکر صدیقؓ کہ جو کچھ آپ کے پاس تھا راہ خدا میں دے دیا اور جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ''ما خَلَفْتَ بعيالِك'' (گھر والوں کیلئے کیا چھوڑ آئے ہو؟) تو انہوں نے عرض کی ''الله و رسوله'' (اللہ اور اس کا رسولؐ) اور حضرت علیؓ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ایک قصیدے میں کہا۔

فَمَا وَجَبَت عَلَّى زكوة مالٍ

وَهَل تجِبُ الزكوٰة على الجواد

مجھ پر تو مال کی زکوۃ واجب ہی نہیں۔ اور کیا سخی آدمی پر زکوۃ واجب بھی ہوتی

ہے؟ پس اہل کرم کا مال راہ خدا میں خرچ ہو جاتا ہے اور وہ نہ تو مال میں بخیلی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی پر کوئی دعویٰ کیونکہ ان کی ملکیت ہی نہیں ہوتی...... باقی اگر کوئی جہالت کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ کہے کہ جب میرے پاس مال ہی نہیں تو میں زکوۃ کے علم سے ہی مستغنی ہوں تو یہ محال ہے علم کا سیکھنا فرض ہے اور اپنے آپ کو علم سے مستغنی دکھانا کفر محض ہے اور اس دور کے فتنوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صلاح وفقر کے مدعی لوگ جہالت کی وجہ سے علم کو ترک کر دیتے ہیں (مصنف کہتے ہیں) کہ ایک وقت میں میں صوفیہ کی ایک متبدی جماعت کے سامنے مسائل زکوۃ بیان کر رہا تھا کہ وہاں ایک جاہل شخص بھی آ گیا جب کہ میں اس وقت اونٹوں کی زکوۃ کا باب بیان کر رہا تھا اور بنت لبون (اونٹ کا تین سالہ بچہ) اور بنت مخاض (دو سالہ اونٹ) اور حقہ (چار سالہ اونٹ) کا حکم ظاہر کر رہا تھا۔ اس جہالت کے مرتکب کا دل ان باتوں کے سننے سے تنگ آ گیا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ میرے پاس تو کوئی اونٹ ہی نہیں کہ بنت لبون وغیرہ کا علم میرے کسی کام آئے۔ میں نے کہا "اے فلانے جتنا کہ زکوۃ کے ادا کرنے کا علم ہونا چاہئے اتنا ہی زکوٰۃ لینے کا علم بھی ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص تجھے بنت لبون دینا چاہے تو اس وقت علم کے ترک کی وجہ سے بنت لبون بھی تجھے نہیں لینا چاہئے! اور اگر کسی کے پاس مال نہ ہو بلکہ اسے مال کی ضرورت بھی نہ ہو پھر بھی اس سے علم کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی پس ہم جہالت سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

فصل

اور مشائخ صوفیہ میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے زکوۃ وصول کی ہے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے زکوۃ نہیں لی۔ جن حضرات کا فقر ان کا اپنا اختیار کردہ ہے انہوں نے زکوۃ نہیں لی کہ ہم مال جمع نہیں کرتے تاکہ زکوۃ نہ دینی پڑے اور ارباب دنیا سے بھی نہیں لیتے تاکہ ان کا ہاتھ اونچا اور ہمارا ان سے نیچے نہ ہو...... اور وہ حضرات جن کا فقر اضطراری ہے

انہوں نے زکوٰۃ لی ہے لیکن اپنے فائدے کیلئے نہیں بلکہ انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ اس طرح ایک مسلمان بھائی کی گردن کا بوجھ خود اٹھالیں اور جب ان حضرات کی نیت یہ ہوئی تو اوپر والا ہاتھ بھی ان کا ہی ہوگا نہ کہ اہل دنیا کا۔ کیونکہ اگر دینے والے کا ہاتھ ید علیا اور لینے والے کا ہاتھ ید سفلی ہی ہو تو حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا معنی باطل ہو جائے گا کہ "وَیَاخذ الصدقات" (وہ صدقات وصول کرتا ہے) اور پھر یہ ہونا چاہئے تھا کہ زکوۃ دینے والا زکوۃ لینے والے سے زیادہ افضل قرار پاتا۔ حالانکہ یہ اعتقاد بالکل گمراہی ہے۔ پس اوپر والا ہاتھ وہ ہوگا جو کسی چیز کے واجبی حکم کو اپنے مسلمان بھائی سے لے لے تاکہ اس کا بوجھ اپنی گردن پر اٹھالے۔ اور درویش لوگ اہل دنیا کی گردن سے بوجھ خود نہ اٹھالیں تو فرض حکم اس پر لازم موجود رہے اور وہ اس کی وجہ سے قیامت میں پکڑا جائے گا۔ پس حق تعالیٰ نے اہل عقبیٰ کا آسان طریقے سے امتحان لیا ہے تاکہ دنیا والے اس فریضہ کا بوجھ اپنی گردن سے اتار سکیں۔ اور لامحالہ اوپر والا ہاتھ تو فقراء کا ہاتھ ہی ہوگا کہ وہ حق شریعت کے مطابق اپنا حق اس شخص سے وصول کرتے ہیں جس پر حق تعالیٰ نے واجب کر رکھا ہے اور اگر حشویہ فرقہ کے لوگوں کے بقول لینے والا ہاتھ ید سفلیٰ ہو جائے تو پیغمبروں کا ہاتھ بھی ید سفلی ہونا چاہئے۔ کیونکہ انہوں نے بھی حق تعالیٰ کا حق بندوں سے وصول کیا ہے اور شرائط کے مطابق صحیح جگہ پر اسے خرچ کیا ہے۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں اور وہ جانتے نہیں کہ پیغمبروں نے حکم الہٰی سے زکوۃ وصول کی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد دین کے پیشوا بھی اسی طریق پر رہے ہیں کہ انہوں نے بیت المال کا حق وصول کیا ہے۔ لہذا وہ شخص سخت غلطی پر ہے جو لینے والے ہاتھ کو ید سفلی کہتا ہے اور زکوۃ دینے والے کو ید علیا جانتا ہے اور تصوف میں یہ دونوں چیزیں بڑی اہم اور بنیادی ہیں۔ چونکہ اس جگہ یہ مضمون باب الجود والسخا کے ساتھ گہرا وابستہ ہے اس لئے میں ساتھ ہی اس کو بیان کئے دیتا ہوں۔ (وباللہ التوفیق العصمۃ)

باب

جود وسخاوت کا بیان

حضرت پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''السخی قریب'' مِنَ الجنۃِ وَبعید من النارِ والبخیلُ قریبٌ'' من النار وبعید'' من الجنۃ ''(سخی آدمی جنت کے قریب اور دوزخ سے دور ہے اور بخیل آدمی دوزخ کے قریب اور جنت سے دور ہے) علماء کے نزدیک مخلوق کی صفات میں تو جود اور سخا دونوں کا ایک ہی معنی ہے لیکن ذات باری تعالیٰ کو جواد تو کہتے ہیں سخی نہیں کہتے اور اس کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اپنے مقدس ناموں کو وحی کے ذریعہ متعین کیا ہے اور اپنا نام سخی بیان نہیں کیا۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے بھی حق تعالیٰ کیلئے اس نام کی خبر نہیں دی۔ جب پوری امت اور خصوصاً اہل سنت کا اجماع ہے کہ جب تک کتاب وسنت نے حق تعالیٰ کا کوئی نام نہ بتایا ہو۔ عقل اور لغت کی بنیاد پر حق تعالیٰ کا کوئی نام رکھنا کسی کیلئے بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ حق تعالیٰ کا ایک نام ''عالم'' ہے اور اجماع امت کے ساتھ اس کو عالم تو کہنا چاہئے لیکن ''عاقل اور فقیہہ'' نہیں کہنا چاہئے۔ حالانکہ یہ تینوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں، عالم کے اسم کا ذات باری تعالیٰ پر اطلاق اس لئے کرتے ہیں کہ یہ توقیفی (وحی کے تعین) طور پر ثابت ہے اور بعض حضرات نے جود اور سخا کے درمیان فرق کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سخی وہ ہوتا ہے جو عطا کرنے میں اپنے اور پرائے کی تمیز کرے اور اس کی بخشش کسی غرض اور سبب کے ساتھ متعلق ہو اور سخاوت میں یہ ابتدائی مقام ہے جب کہ ''جواد'' وہ ہوتا ہے جو اپنے اور غیر میں کوئی امتیاز روانہ رکھے اس کی عطا بے غرض اور اس کا فعل بغیر کسی سبب کے ہو یہی حال اللہ تعالیٰ کے دو پیغمبروں صلوات اللہ علیہما والسلام یعنی حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام اور حبیب خدا حضرت محمد ﷺ کا تھا کہ صحیح روایات میں موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت کھانا نہ کھاتے جب تک کوئی

مہمان نہ آ جائے ایک دفعہ تین دن گزر گئے اور کوئی مہمان نہ آیا پھر ایک آتش پرست آپ کی رہائش کے دروازے پر سے گزرا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا ''تیرا مذہب کیا ہے؟'' اس نے کہا 'میں آتش پرست ہوں' آپ نے فرمایا پھر تو تو میری مہمانی اور عزت کے قابل نہیں ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب ہوا کہ جس شخص کی میں ستر سال سے پرورش کر رہا ہوں تجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ ایک روٹی ہی اسے دے دے۔ لیکن جب حاتم طائی کا بیٹا سید عالم ﷺ کے ہاں حاضر ہوا تو آپ نے اپنی چادر اٹھائی اور اس کیلئے زمین پر بچھادی اور فرمایا ''اذا اتکم کریم قوم فاکرموہ'' (جب تمہارے پاس کسی قوم کا صاحب عزت شخص آئے تو اس کی عزت کرو) جس نبی نے اپنے اور غیر میں تمیز کی اس نے ایک روٹی بھی کافر کو دینے سے دریغ کیا لیکن جس نے امتیاز نہ برتا اس نے نبوت کی چادر ایک کافر کیلئے بچھونا بنا دی کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام، مقام سخاوت تھا لیکن ہمارے پیغمبر ﷺ کا مقام مقام جود تھا...... اس بارے میں سب سے بہتر مذہب وہ جو کہا گیا ہے کہ دل میں پیدا ہونے والے پہلے خیال کی متابعت کرنا جود ہے لیکن جب پہلے خیال پر دوسرا خیال غالب آ جائے تو یہ بخل کی علامت ہے اور نیکی حاصل کرنے والوں نے اسی پہلے خیال کو ترجیح دی ہے کیونکہ لامحالہ پہلا خیال حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا...... میں نے نیشاپور میں ایک سوداگر کو پایا جو شیخ ابوسعید کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ ایک دن شیخ نے کسی درویش کیلئے کچھ طلب کیا اس شخص نے کہا میرے پاس ایک دینار تھا اور ایک قراضہ (چاندی کا ایک سکہ) پہلے میرے دل میں آیا کہ دینار اس درویش کو دے دوں لیکن دوبارہ خیال آیا کہ قراضہ دینا چاہئے چنانچہ میں نے قراضہ دے دیا شیخ جب باتوں میں مصروف ہوئے تو میں نے پوچھا ''کیا کسی کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ حق تعالیٰ سے تنازعہ کرے؟ شیخ نے کہا تو نے تو خود حق تعالیٰ کے ساتھ تنازعہ کیا ہے کہ اس نے تجھے کہا دینار دو لیکن تم نے قراضہ دیا...... اور میں نے حکایات میں یہ بھی پایا ہے کہ شیخ ابوعبداللہ رودباری

ایک مرید کے گھر میں تشریف لے گئے لیکن وہ گھر میں موجود نہ تھا۔ آپ نے اس کے گھر کا تمام سامان بازار میں لے جا کر فروخت کرنے اور راہ خدا میں خرچ کر دینے کا حکم دیا۔ جب مرید گھر آیا تو اس بات پر بڑا خوش ہوا۔ تاہم شیخ کی خوشنودی کی خاطر منہ سے کچھ بھی نہ کہا اور جب اس کی بیوی گھر میں آئی تو یہ کیفیت دیکھ کر گھر کے اندر گئیں اور اپنے تمام کپڑے بھی لا کر سامان میں ڈال دیئے اور کہا کہ ''یہ سب کچھ گھر کے سامان میں ہی شامل ہے اور اس کا بھی وہی حکم ہے۔ شوہر نے پکار کر اسے کہا ''جو کچھ تو نے کہا ہے یہ تکلف ہے اور اپنے اختیار سے تو نے کیا ہے۔ عورت نے جواب دیا ''اے میرے خاوند! جو کچھ شیخ نے کہا وہ ان کا جود تھا اس لئے ہمیں بھی اپنے نفس کی ملکیت میں تکلف کرنا چاہیئے تا کہ ہمارا جود بھی ظاہر ہو جائے خاوند نے کہا ''ہاں یہ تو درست ہے لیکن جب ہم نے اپنے لئے شیخ کو تسلیم کر لیا ہے تو ان کا یہ کام خود ہمارے لئے جود ہی ہے...... اور جود آدمی کی صفت میں تکلف سے اور مجازاً ہی ہوتا ہے اور مرید کو چاہیئے کہ وہ اپنی ملک اور اپنا نفس امر الٰہی کی موافقت میں خرچ کر ڈالے...... اسی لئے تو حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا ہے کہ ''**الصوفی دمه' هدر وملكه' مباح**'' ''(صوفی کا خون معاف اور اس کی ملک مباح ہوتی ہے) اور میں نے شیخ ابو مسلم فارسیؒ سے سنا ہے کہ انہوں نے بیان کیا ایک دفعہ میں نے ایک جماعت کے ہمراہ حجاز مقدس کا سفر اختیار کیا۔ حلوان کے نواحی علاقہ میں کردوں نے ہماری راہ روک لی اور جو گدڑیاں ہمارے پاس تھیں ہم سے چھین لیں۔ لیکن ہم نے ان کے ساتھ کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ ان کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہے، البتہ ہمارے اندر ایک شخص تھا جو اضطراب کا مظاہرہ کر رہا تھا ایک کرد نے تلوار کھینچ لی اور اس کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ہم سب نے اس کرد کے سامنے اس کی سفارش کی۔ وہ کہنے لگا میں اس جھوٹے شخص کو زندہ چھوڑ دوں یہ درست نہیں میں اس کو ضرور قتل کروں گا۔ ہم نے اس کو قتل کرنے کا سبب اس سے دریافت کیا تو وہ کہنے لگا میں اس لئے اس کو قتل کرنا چاہتا ہوں کہ یہ صوفی نہیں اور اولیاء کی صحبت میں خیا۔۔ کا

ارتکاب کرتا ہے اس طرح کے شخص کا دنیا سے نابود ہو جانا ہی بہتر ہے میں نے پوچھا یہ کیسے؟ تو اس نے کہا "یہ اس لئے کہ صوفیہ کا کم از کم درجہ جود ہے جب کہ اس کی گدڑی میں اتنے ٹکڑے بندھے ہوئے ہیں یہ کس طرح صوفی ہو سکتا ہے جو اپنے یاروں کے ساتھ اتنا جھگڑا کر رہا ہے کیونکہ ہم تو کئی سال سے تمہارا ہی کام کر رہے ہیں کہ تمہاری راہ لوٹتے ہیں اور تم کو دنیا کی آلائشوں سے منقطع کرتے ہیں...... کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن جعفر ایک نخلستان میں کچھ لوگوں پر سے گزرے تو ایک حبشی غلام کو دیکھا جو بکریوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ایک کتا آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا اس نے ایک روٹی نکالی اور کتے کے آگے ڈال دی۔ پھر دوسری اور اس کے بعد تیسری روٹی بھی اس کے سامنے ڈال دی۔ حضرت عبداللہ اس غلام کے سامنے چلے گئے اور کہا "اے غلام تمہاری روزانہ خوراک کتنی ہے؟ اس نے کہا "بس جتنی آپ نے ابھی دیکھی ہے" آپ نے پوچھا وہ ساری تو نے کتے کو کیوں دے دی؟ کہنے لگا اس لئے کہ یہ کتوں کی جگہ نہیں اور یہ کتا کہیں دور سے اسی امید پر آیا ہے اس لئے میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ اس کی تکلیف کو ضائع کروں۔ حضرت عبداللہ کو اس کی یہ بات بڑی اچھی لگی اور اس غلام کو بکریوں اور نخلستان سمیت خرید کر غلام کو آزاد کر دیا اور اسے کہا کہ یہ بکریاں اور کھجوروں کا باغ میں نے تجھے بخش دیا۔ غلام نے آپ کو بڑی دُعا دی اور تمام بکریوں کو صدقہ اور سارے مال کو راہ خدا میں خیرات کر دیا اور وہاں سے چلا گیا...... ایک شخص حضرت حسن بن علیؓ کے درِ دولت پر آیا اور کہنے لگا "اے پیغمبر زادے! میرے ذمہ چار سو درہم قرض ہے حضرت حسنؓ نے چار سو درہم اس کو دینے کا حکم دیا اور خود روتے ہوئے گھر کے اندر تشریف لے گئے لوگوں نے پوچھا "اے پیغمبر ﷺ کے نواسے آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا "اس لئے کہ میں نے اس شخص کا حال جاننے میں کوتاہی کی ہے حتیٰ کہ اسے سوال کرنے کی ذلت اٹھانی پڑی ہے حضرت ابو سہل صعلوکی، صدقہ کسی درویش کے ہاتھ پر ہرگز نہ رکھا کرتے بلکہ جب کوئی چیز کسی کو دینا ہوتی تو اس کے ہاتھ پر رکھنے کی بجائے

زمین پر رکھ دیتے تا کہ وہ وہاں سے اٹھا لے۔ آپ سے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا" دنیا کی اتنی قدر و قیمت نہیں کہ اس کو کسی مسلمان کے ہاتھ میں دیا جائے تا کہ میرا ہاتھ ید علیا اور اس کا ید سفلی ہو جائے۔

پیغمبر علیہ السلام کے بارے میں روایت ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نے دو من مشک آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے تمام کا تمام ایک بار ہی پانی میں ڈال دیا اور اپنے دوستوں کے جسموں پر مل دیا۔ اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت پیغمبر علیہ السلام کے پاس آیا تو سید عالم علیہ السلام نے دو پہاڑوں کے درمیان کی بکریوں سے بھری ہوئی پوری وادی اسے بخش دی۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس گیا تو کہنے لگا" اے میری قوم! مسلمان ہو جاؤ کہ محمد علیہ السلام اتنی بخشش کرتے ہیں کہ انہیں اپنی مفلسی کی کوئی پرواہ نہیں...... نیز حضرت انسؓ ہی بیان کرتے ہیں کہ سید عالم علیہ السلام کے پاس ایک دفعہ اسی ہزار درہم لائے گئے آپ نے وہ سب اپنی چادر پر ڈال دیئے اور جب تک وہ سب راہ خدا میں خرچ نہ کر دئے اس جگہ سے نہ اٹھے...... اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ نے بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا۔

اور میں نے متاخرین میں سے ایک درویش کو دیکھا ہے کہ بادشاہ نے تین سو درہم کی مقدار خالص سونا ان کو بھیجا کہ اسے قبول کر لیجئے وہ اسے لے کر حمام میں تشریف لے گئے اور سب کا سب حمام والوں کو دے دیا اور وہاں سے چلے گئے...... اور قبل ازیں نوری فرقہ کے بیان میں ایثار کا بیان کرتے ہوئے اس مضمون کی کچھ باتیں بیان کی تھیں لہٰذا اس جگہ اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں...... واللہ اعلم بالصواب

روزے کا بیان

حق عزوجل فرماتے ہیں ''یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ کُتِبَ عَلَیْکُم الصِّیَامُ'' (الایہ) (اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے) پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھے بتایا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ''الصَّومُ لِی وَانا اَجزِی بِہ'' (یعنی روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی بہتر جزا دوں گا) اس لئے کہ روزہ ایک باطنی عبادت ہے جو ظاہر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی اور اس میں غیر کا کوئی حصہ اور دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جزا بہت زیادہ ہوگی۔ کہا گیا ہے کہ لوگ جنت میں داخل تو خدا کی رحمت سے ہوں گے جب کہ درجات ان کی عبادت کی بدولت اور جنت میں ہیشگی روزے کی جزا کے طور پر ہوگی کیونکہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ''انا اجزی بہ'' حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ ''الصومُ نصف الطریقة'' (روزہ آدھی طریقت ہے) اور میں نے مشائخ میں سے بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ مسلسل روزہ رکھا کرتے تھے جب کہ بعض حضرات کو دیکھا ہے کہ رمضان کے علاوہ کوئی روزہ نہ رکھتے تھے ان کا رمضان میں روزے رکھنا اجروثواب کی طلب کے طور پر تھا اور غیر رمضان میں روزے نہ رکھنا اپنے اختیار اور ریاکاری کو ترک کرنے کی وجہ سے تھا اور میں نے بعض بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ روزہ رکھتے تھے لیکن کسی کو علم نہیں ہوتا تھا اور جب ان کے سامنے کھانا لایا جاتا تو تناول کرلیا کرتے تھے اور یہ عمل سنت کے زیادہ موافق ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کی ''اِنَّا قَدْ خبرنَا لک حیساً قال علیہ السلام اما انی کُنتُ ارید الصومَ ولکن قربنیہ ساصوم یومًا مکانہ'' (ہم نے آپ کیلئے حریسہ (کھجور کا حلوہ) پکایا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

میں نے تو روزے کا ارادہ کرلیا تھا تاہم اسے میرے پاس لے آؤ عنقریب میں اس کی جگہ کسی اور دن روزہ رکھ لوں گا) اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض صوفیہ کو دیکھا کہ وہ ہر ماہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کو اور ماہ محرم کے عشرے کے روزے رکھا کرتے تھے اسی طرح رجب، شعبان اور رمضان کے مہینوں میں روزہ رکھتے اور بعض حضرات کو میں نے دیکھا کہ وہ صوم داؤدؑ بھی رکھا کرتے تھے کہ پیغمبر علیہ ﷺ نے اس کو سب روزوں سے بہتر قرار دیا ہے اور یہ ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن افطار کرنا ہے...... دوسرے ایک وقت میں میں شیخ احمد بخاریؒ کے ہاں حاضر ہوا تو ان کے سامنے مٹھائی کا ایک طباخ پڑا ہوا تھا آپ خود بھی اس میں سے کھا رہے تھے اور مجھے بھی کھانے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنے بچپنے کی وجہ سے کہہ دیا کہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے آپ نے پوچھا ''کیوں؟'' میں نے عرض کی ''فلاں بزرگ کی موافقت میں آپ نے فرمایا'' دیکھو مخلوق کیلئے مخلوق کی موافقت کرنا درست نہیں۔ چنانچہ میں نے روزہ کھول دینے کا ارادہ کرلیا۔ تو آپ نے فرمایا'' جب تم اس بزرگ کی موافقت چھوڑنے لگے ہو تو پھر میری موافقت بھی نہ کرو کیونکہ میں بھی تو ایک مخلوق ہی ہوں اور یہ دونوں مخلوق ہونے میں یکساں ہیں...... روزہ کی حقیقت اپنے نفس کو روکنا ہے اور پوری کی پوری طریقت اسی حقیقت میں مضمر ہے اور روزہ میں سب سے کم درجہ بھوکا رہنا ہے کہ ''الجوع طعامُ اللہ فی الارض'' (بھوک تو زمین میں اللہ کا کھانا ہے) اور بھوکا رہنا تمام زبانوں کے لوگوں میں ایک قابل تعریف عمل ہے شریعت کے اعتبار سے بھی اور عقلی طور پر بھی...... پھر ہر عاقل، بالغ، صحت مند اور مقیم مسلمان پر ایک ماہ کیلئے روزہ واجب ہے اور اس کی ابتدا ماہ رمضان کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے اور اختتام ماہ شوال کا چاند دیکھنے پر ہوتا ہے اور ہر روزے کیلئے صحیح نیت اور سچی شرط ضروری ہے تاہم نفس کو روکنے کی شرائط بہت سی ہیں چنانچہ کوئی شخص اسی وقت حقیقی طور پر روزہ دار ہوگا جب وہ اپنے پیٹ کو کھانے پینے سے بچائے اور اپنی آنکھ کو شہوت کی نظر سے، کان کو غیبت کی گفتگو سننے سے زبان کو

بیہودہ اور فضول گفتگو کرنے سے اور جسم کو دنیا کی متابعت اور شریعت کی مخالفت سے محفوظ رکھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا تھا کہ ''اذا صمتَ فلیھم سمعک وبصرُک و لسانک ویدُکَ وَکُل عضوِمنک '' (جب تو روزہ رکھے تو ضروری ہے کہ تیرا کان، تیری آنکھ، تیری زبان، تیری ہاتھ اور تیرا ہر عضو روزہ رکھے) اور نیز فرمایا کہ ''رُبّ صائم لَیسَ لَہ من صومِہ الا الجوع و العطشَ '' (بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزے سے بھوکا اور پیاسا رہنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا) اور میں یعنی علی بن عثمان الجلابی نے خواب میں سید عالم ﷺ کی زیارت کی تو میں نے عرض کی ''اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے کوئی وصیت فرمایئے آپؐ نے فرمایا ''اِحْبِسْ حواسک'' (اپنے حواس کو قابو میں رکھ) کیونکہ اپنے حواس کو بند رکھنا ہی مکمل مجاہدہ ہے اس لئے کہ تمام کے تمام علوم انہی پانچ دروازوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ پہلا، دیکھنا، دوسرا سننا، تیسرا چکھنا، چوتھا سونگھنا اور پانچواں چھونا، اور یہ پانچوں حواس علم اور عقل کے سپہ سالار ہیں ان میں سے چار حواس کا مقام تو مخصوص ہے لیکن ایک ایسا ہے جو تمام اعضا کے ساتھ تعلق رکھتا ہے آنکھ مقام نظر ہے کہ وہ جہان اور اس کے رنگوں کو دیکھتی ہے کان محل سماعت ہے کہ وہ خبر اور آواز سنتا ہے زبان محل ذوق ہے کہ مزہ اور بدمزہ کو جانتی ہے اور ناک سونگھنے کا محل ہے کہ وہ خوشبو اور بدبو کو محسوس کرتا ہے البتہ چھونے کیلئے کوئی عضو مخصوص نہیں اور یہ تمام اعضا میں پایا جاتا ہے کہ وہ گرمی، سردی اور سختی و نرمی کو جانتے ہیں اور کوئی ایسی چیز نہیں جو آدمی کے احاطہ علم میں نہ آسکے اسی طرح بدیہی اور الہامی علوم کے علاوہ کوئی ایسا علم نہیں جو پانچ دروازوں کے علاوہ کسی طرح حاصل ہو سکے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کے الہام میں کوئی نقص نہیں جب کہ ان حواس میں سے ہر حاسہ میں صفائی بھی ہے اور کدورت بھی کہ جس طرح ان میں علم و عقل اور روح کا عمل دخل ہے اسی طرح نفس اور خواہشات کا عمل دخل بھی ہے کیونکہ اطاعت و معصیت اور سعادت و شقاوت تمام امور میں یہ حواس آلہ مشترک ہیں۔ پس آنکھ

اور کان میں صحیح دیکھنا اور سچی خبر سننا تو حق تعالیٰ کی ولایت ہے جب کہ جھوٹ سننا اور بری نگاہ سے دیکھنا یہ نفس کی ولایت ہے اسی طرح چھونے چکھنے اور سونگھنے میں حکم خداوندی کی متابعت اور سنت کی پیروی ولایت حق ہے جب کہ فرمان الٰہی کی نافرمانی اور شریعت کی مخالفت یہ نفس کی ولایت ہے پس روزہ دار کو چاہئے کہ وہ ان تمام دروازوں کو بند کرے تا کہ مخالفت حق سے موافقت کی طرف آ جائے اور یوں حقیقی روزہ دار ہو جائے ورنہ صرف کھانے اور پینے سے رکے رہنا تو بچوں اور بوڑھی عورتوں کا روزہ ہے جب کہ روزہ دراصل خواہشات، لہو ولعب اور غیبت سے بچنے کا نام ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ '' (ہم نے ان کے جسم اس طرح نہیں بنائے کہ وہ کھانا ہی دکھائیں) اور یہ بھی ارشاد فرمایا ''اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا '' (کیا تم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے) یعنی ہم نے ہر شخص کو کھانے کا ضرورت مند بنایا ہے اور مخلوق کو کھیل کود کیلئے پیدا نہیں کیا۔ پس فضول اور حرام کاموں کے ارتکاب سے رکنا چاہئے نہ کہ حلال خوری سے مجھے اس شخص پر بڑا تعجب ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نے نفلی روزہ رکھا ہوا ہے اور فرض کی ادائیگی بجا نہیں لاتا کیونکہ معصیت کا ارتکاب نہ کرنا ایک فرض ہے اور ہمیشہ نفلی روزہ سے رہنا ایک سنت! پس ہم دل کی سختی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں البتہ جو کوئی اپنے آپ کو معصیت سے بچائے رکھتا ہے اس کے تمام احوال روزہ ہی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ جس دن پیدا ہوئے اس دن بھی روزہ دار تھے اور جس دن دنیا سے رخصت ہوئے اس دن بھی روزہ سے تھے۔ لوگوں نے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو انہوں نے بیان کیا کہ جس دن آپ کی ولادت ہوئی وہ صبح کا وقت تھا اور انہوں نے شام کی نماز تک ذرہ بھی دودھ نہیں پیا اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اس دن بھی روزہ دار تھے یہ روایت حضرت ابوطلحہ المالکیؒ نے نقل کی ہے...... لیکن بغیر افطار کے مسلسل روزہ رکھے چلے جانا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منع کیا گیا ہے کہ جب آپ صوم

وصال (بغیر افطار کے مسلسل روزے) رکھا کرتے تھے اور صحابہ کرامؓ نے بھی آپ کی موافقت کی تو آپ نے انہیں فرمایا کہ تم صوم وصال نہ رکھا کرو کہ "اِنی لَسۡتُ کَاَحَدِکُمۡ اِنّی اَبِیتُ عندربخم لطعمنی ویسقینی" (میں تم میں سے کسی ایک جیسا نہیں ہوں میں تم تمہارے رب کے پاس رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی) پس ارباب مجاہدہ کہتے ہیں کہ یہ نہی شفقت کے طور پر ہے نہ کہ حرمت کے طور پر، اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ روزوں میں وصال خلاف سنت ہے باقی درحقیقت وصال کرنا خود محال ہے کیونکہ جب دن گزرتا ہے تو رات کو روزہ نہیں ہوتا اور جب کسی نے رات کو روزے کا ارادہ کرلیا تو وصال نہیں ہوگا..... حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے بارے میں حکایت بیان کرتے ہیں کہ وہ ہر پندرہ دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے اور جب رمضان کا مہینہ آتا تو عید تک کوئی خوراک نہ کھاتے تھے اور ہر رات چار سو رکعت نفل نماز ادا کرتے تھے۔ پس یہ بات انسانی طاقت سے تو باہر ہے اور توفیق الٰہی کے بغیر ایسا نہیں کرسکتے۔ درحقیقت یہ بات تائید خداوندی ہوتی ہے کہ جو خود ہی کسی شخص کی غذا بن جاتی ہے اور کسی کی غذا تو دنیا کا طعام ہے جب کہ کسی کی غذا حق تعالیٰ کی تائید ہوتا ہے..... صاحب لمع طاؤس الفقرا شیخ ابونصر سراجؒ نے ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ بغداد میں گزارا۔ مسجد شونیزیہ میں آپ کیلئے ایک حجرہ مخصوص کردیا گیا اور وہاں کے درویشوں کی امامت بھی آپ کے سپرد کردی گئی چنانچہ عید تک ان حضرات کی امامت کرتے رہے اور تراویح میں آپ نے پانچ قرآن مکمل کئے خادم روزانہ ایک روٹی لے کر آپ کے حجرے میں آتا اور آپ کو پیش کرتا۔ جب عید کا دن آیا اور آپ اس حجرہ سے تشریف لے گئے اور خادم نے آپ کے خلوت کدے کو دیکھا تو وہ تمام تیں روٹیاں اندر موجود تھیں..... حضرت علی بن بکارؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت حفص مصیصیؒ کو میں نے خود دیکھا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں پندرہ دن تک کوئی خوراک نہ کھاتے تھے..... اور حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے بارے میں حکایت بیان کرتے ہیں کہ آپ نے ماہ رمضان

میں ابتدا سے انتہا تک کوئی چیز نہ کھائی جب کہ وہ گرمیوں کا مہینہ تھا اور آپ روزانہ گندم کاٹنے کی مزدوری کرتے تھے۔ اس میں سے جو کچھ کماتے درویشوں میں تقسیم کر دیتے اور خود پوری رات صبح ہونے تک نماز میں مشغول رہتے ان کو مجبور بھی کیا گیا لیکن پھر بھی آپ نے کچھ نہ کھایا اور نہ ہی نیند کی۔ حضرت شیخ ابو عبداللہ خفیفؒ کے متعلق آتا ہے کہ جب آپ سے مدخصت ہوئے لگاتار چالیس چلے آپ کاٹ چکے تھے...... میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا ہے جو بیابان میں ہی رہتا تھا اور ہر سال دو چلے ضرور کرتا تھا...... حضرت ابو محمد دانشمند بالفریؒ جب اللہ کو پیارے ہونے لگے تو میں خود وہاں موجود تھا اسی دن گزر چکے تھے کہ آپ نے کچھ نہیں کھایا تھا اور کوئی نماز بھی جماعت سے نہ چھوٹی تھی...... متاخرین میں سے بھی ایک درویش تھے کہ اسی دن تک روز وشب اس نے کچھ نہیں کھایا تھا اور کوئی نماز باجماعت اس سے ضائع نہ ہوئی تھی...... مرو میں دو بزرگ تھے ایک کا نام مسعود اور دوسرے کا شیخ ابوعلی سیاہ تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت مسعودؒ نے ایک آدمی شیخ ابوعلی سیاہؒ کے پاس بھیجا کہ یہ تصوف کا دعویٰ کب تک رہے گا آؤ تا کہ ہم چالیس روز تک کچھ کھائے پیئے بغیر بیٹھیں (تا کہ فیصلہ ہو جائے کہ صوفی کون ہے) شیخ ابوعلی نے جواب میں کہلا بھیجا (یہ بھی کوئی کمال ہے) آؤ کہ ہم ہر روز تین مرتبہ کھانا کھائیں اور اس کے باوجود چالیس دن تک ایک ہی وضو میں رہیں۔

اس مسئلہ میں پیدا ہونے والا اشکال ابھی تک اپنی جگہ پر موجود ہے کہ جاہل لوگ اس سے صوم وصال کے جائز ہونے کی دلیل پکڑیں گے حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے اور طبیب بھی اس کے اصل کا انکار کرتے ہیں اس لئے میں اس کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہوں تا کہ اشکال رفع ہو جائے اور اصل مسئلہ واضح ہو جائے۔

چنانچہ جان لو کہ یہ کرامت ہے کہ کوئی شخص روزوں میں وصال کرے اور کسی فرمان الٰہی میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور کرامت مخصوص لوگوں کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ عوام کو۔ جب اس کا حکم عام نہیں ہے تو کسی کو اس کا امر کرنا بھی درست نہیں ہوگا کیونکہ اگر کرامت کا اظہار عام

ہوتا تو ایمان قبول کرنا ایک جبر ہوتا اور عارفوں کی معرفت کا انہیں کوئی ثواب نہ ملتا۔ پس چونکہ رسول اللہ ﷺ صاحب معجزہ تھے اس لئے آپ نے اپنا وصال ظاہر کر دیا اور اہل کرامت کیلئے اس کے اظہار کو منع کر دیا کیونکہ چھپانا کرامت کی شرط ہے جب کہ معجزہ کی شرط یہ ہے کہ اسے کھول کر بیان کیا جائے معجزے اور کرامت کے درمیان یہ فرق بڑا واضح ہے اور جس کیلئے ہدایت مقدر ہے اس کیلئے اتنا بیان ہی کافی ہے اور صوفیہ کے چلہ کی اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے متعلق ہے اور مقام کی حالت میں مکالمہ درست ہوتا ہے اور جب ان کی خواہش ہو کہ حق تعالیٰ کا کلام روحانی طور پر سنیں تو چالیس روز بھوکے رہتے ہیں اور جب تیس روز گزرتے ہیں تو مسواک کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد دس دن مزید بھوکے رہتے ہیں تو حق تعالیٰ ضرور ان کے ساتھ باطنی طور پر گفتگو کرتے ہیں کیونکہ جو کچھ انبیاء کرام کیلئے ظاہری طور پر درست ہے وہی کچھ باطنی طور پر اولیاء کرام کیلئے جائز ہے...... پس طبیعت کے اپنے حال پر رہتے ہوئے حق تعالیٰ کا کلام سننا جائز نہیں اس لئے طبقوں کیلئے چالیس روز تک کھانے اور پینے کی نفی کرنی چاہئے تاکہ وہ مغلوب ہو جائیں اور محبت کی صفائی کو پوری ولایت اور روح کو پوری طرح لطافت حاصل ہو جائے...... چونکہ بھوک کی حقیقت اسی مضمون کے ساتھ متعلق ہے اس لئے اب میں انشاء اللہ اس کو کھول کر بیان کرتا ہوں۔

باب

بھوک اور اس کے متعلقات

اللہ عزوجل فرماتے ہیں کہ" وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ "(اور ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک اور مال۔ جان اور پھلوں کا نقصان دے کر آزمائیں گے) اور پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے" بَطْن" جائعٌ احبُّ اِلَی اللّٰہِ تعالیٰ من سبعین عابدٍ اکلٍ "(ایک بھوکا پیٹ اللہ تعالیٰ کو خوب کھانے والے ستر عابدوں سے زیادہ محبوب ہے) جان لو کہ تمام امتوں اور ملتوں کے ہاں بھوکا رہنا بڑے شرف کا اور قابل تعریف فعل ہے کیونکہ ظاہری اعتبار سے بھوکے انسان کا دل زیادہ تیز اور طبیعت زیادہ تہذیب یافتہ اور تندرست ہوتی ہے خصوصاً ایسے آدمی کیلئے جس میں شر کا مادہ زیادہ نہ ہو اور اس نے ریاضت کے ذریعہ اپنے آپ کو مہذب بنالیا ہو"لِاَنَّ الجوعَ للنفس خضوع وللقلب خشوع "(کیونکہ بھوک نفس کیلئے انکساری اور دل کیلئے عاجزی کا باعث ہے) کیونکہ بھوک کی وجہ سے نفسانی قوت ختم ہو جاتی ہے اور رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا"اجیعوا بطونکم والجمو اکبادکم واغذو اجسادکم لَعَل قلوبکم تری اللّٰہَ عیافا فی الدنیا "(اپنے پیٹوں کو بھوکا، جگروں کو پیاسا اور جسموں کو برہنہ رکھو شاید تمہارے دل دنیا میں ہی اللہ کو سامنے دیکھ سکیں) اگرچہ بھوک سے جسم کو تکلیف ہو گی لیکن اس سے دل کو روشنی ملے گی روح کو صفائی اور باطن کو بقائے حق نصیب ہو گا تو جب باطن کو بقائے حق نصیب ہو اور روح کو صفائی حاصل ہو اور دل کو روشنی مل جائے تو جسم کو اگر کچھ تکلیف بھی برداشت کرنا پڑی ہو تو کیا نقصان ہے؟ کیونکہ پیٹ بھر کر کھانا کوئی قیمتی بات نہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو جانوروں کو پیٹ بھر کر نہ کھلائے۔ اس لئے کہ سیر ہو کر کھانا جانوروں کا کام ہے جب کہ بھوکا رہنا بیماروں کیلئے علاج ہے نیز بھوک

روح کیلئے تعمیر کا کام دیتی ہے جب کہ سیر خوری محض پیٹ کی تعمیر کا ذریعہ ہے کوئی شخص تو اپنے پیٹ کی پرورش میں ہی اپنی زندگی خرچ کر دیتا ہے اور اپنے جسم کی خواہش پوری کرتا رہتا ہے اور کوئی روح کی پرورش میں عمر گزارتا ہے تاکہ دنیا کے تمام علائق سے مجرد ہو کر حق تعالیٰ کیلئے تنہا ہو جائے یہ دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ کہ ایک کیلئے تو جہان کھانے پینے کیلئے ہے اور دوسرے کیلئے کھانا صرف عبادت کرنے کیلئے قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے ان دونوں کے درمیان بڑا ہی فرق ہے "لِاَنَّ المتقدمین یا کلونَ لیعیشوا وَانتم تعیشون لتا کلون" (پہلے لوگ تو صرف اس لئے کھاتے تھے تاکہ زندہ رہیں اور تم کھانے پینے کیلئے ہی زندہ ہو) "الجوعُ طعامُ الصدیقین ومسلک المریدین وقید الشیاطین" (بھوک صدیقوں کا کھانا، مریدان حق کا مسلک اور شیطانوں کیلئے قید ہے) حق تعالیٰ کی قضا اور تقدیر سے حضرت آدم علیہ السلام کے بہشت سے باہر گرنے اور حق تعالیٰ کے پڑوس سے دور ہونے کی وجہ بھی ایک لقمہ کھانا ہی تھا۔ درحقیقت جو آدمی بھوک میں پریشان ہو وہ بھوکا نہیں ہوتا اس لئے کہ کھانے کا طلب گار خود کھانے والا ہوتا ہے۔ پس جس شخص کو بھوک میں درجہ حاصل ہو وہ کھانے کو ترک کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ کھانے سے روکا گیا اور جو شخص کھانے کی موجودگی میں اس کو ترک کر دے اور بھوک کی تکلیف برداشت کرے وہ بھوکا ہوتا ہے اور بھوکار ہے بغیر شیطان کو قید اور خواہشات نفس کو پابند نہیں کیا جا سکتا...... کتانیؒ فرماتے ہیں کہ "وَمن حُکمُ المرید اَنْ یکون فیه ثلثةُ اشیاء نومُه غلبةٌ وَکلامُه ضرورةٌ واکله فاقة" (مرید کی شرط یہ ہے کہ اس میں تین چیزیں موجود ہوں اس کی نیند شدید غلبہ کی وجہ سے، اس کی گفتگو ضرورت کے مطابق اور اس کا کھانا فاقہ کی وجہ سے ہو) فاقہ بعض حضرات کے نزدیک دو رات دن بھوکا رہنا ہے بعض کے نزدیک تین رات، دن بعض کے نزدیک ایک ہفتہ اور بعض کے نزدیک چالیس دن تک بھوکا رہنا ہے کیونکہ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چالیس دن رات میں ایک دفعہ سچی بھوک ہوتی ہے اور وہ محض جان بچانے

کیلئے ہوتی ہے اور اس کے دوران جو کچھ بھی ظاہر ہو وہ طبیعت کا شر اور غرور ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بچائے رکھے..... جان لو کہ اہل معرفت کی تمام رگوں پر حق تعالیٰ کے اسرار ہوتے ہیں۔ ان کے دل حق تعالیٰ کی نگاہ میں ہوتے ہیں اور ان کے دلوں سے ان کے سینوں میں دروازے کھلے ہوتے ہیں اور ان کی بارگاہ میں عقل اور خواہشات بیٹھی ہوتی ہیں پس روح تو عقل کی امداد کرتی ہے اور نفس خواہشات کی مدد کرتا ہے۔ اور طبیعتیں جس قدر غذاؤں سے پرورش پاتی ہیں اور اس کا دبدبہ سارے اعضا میں زیادہ پراگندہ ہو جاتا ہے اور ہر رگ میں اس کے انتشار سے ایک اور حجاب ظہور پذیر ہوتا ہے اور جب غذاؤں کا طلب گار نفس سے اپنا ہاتھ اٹھالیتا ہے اور نفس بہت ضعیف اور عقل زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے اور نفس کی قوت رگوں سے چھوٹ جاتی اور اسرار و دلائل قدرت اس پر خوب واضح ہو جاتے ہیں اور جب نفس اپنی حرکتوں سے عاجز آ جاتا ہے اور اپنے وجود سے فانی ہو جاتا ہے تو باطل کا ارادہ بھی حق کے ظاہر کرنے میں محو ہو جاتا ہے۔ اس وقت مرید کی تمام مراد حاصل ہو جاتی ہے..... اور حضرت ابوالعباس قصابؒ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "میری عبادت اور معصیت کا ارتکاب دو نکتوں سے وابستہ ہے کہ جب میں کچھ کھاتا ہوں تو تمام گناہوں کا مادہ اپنے اندر پاتا ہوں اور جب کھانے سے دست کش رہوں تو تمام اطاعات کی اصل اپنے اندر دیکھتا ہوں..... باقی بھوک کا ثمرہ مشاہدہ الٰہی ہے کیونکہ مجاہدہ تو خود مشاہدہ کی طرف رہنما ہے پس ایسی شکم پری جس کے ساتھ مشاہدہ حاصل ہو وہ اس بھوک سے بہتر ہے جس میں محض مجاہدہ ہی ہو کیونکہ مشاہدہ حق تو مردوں کا معرکہ گاہ ہے جب کہ مجاہدہ بچوں کے کھیلنے کی جگہ "فالشبع بشاهدِ الحق خیر" مِنَ الجوع بشاهدِ الخلق" (پس سیر خوری مشاہدہ حق کے ساتھ اس بھوک سے بہتر ہے جس میں مخلوق کا مشاہدہ ہو) اس بارے میں کلام تو بہت سا ہے لیکن کتاب کی طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کر رہا ہوں اور توفیق اللہ تعالیٰ کے ہی قبضہ میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آٹھواں کشف حجاب

حج کے بیان میں

خداوند جل جلالہ ارشاد فرماتے ہیں ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً'' (اور اللہ کیلئے بندوں پر بیت اللہ کا حج ضروری ہے جس میں اس کی طرف جانے کی طاقت موجود ہو) بندے پر عاقل، بالغ، مسلمان اور طاقت ہونے کی صورت میں دوسرے فرائض کی طرح حج بھی ایک فرض ہے۔ تمام علماء کا اتفاق ہے کہ میقات میں پہنچ کر احرام باندھنا۔ میدان عرفات میں ٹھہرنا اور خانہ کعبہ کا طواف زیارت کرنا۔ اس کا نام حج ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا بھی بنیادی ارکان میں شامل ہے یا نہیں؟ تاہم احرام باندھے بغیر حرم کعبہ میں داخل نہ ہونا چاہئے...... اور حرم کو حرم اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقام ابراہیم علیہ السلام ہے اور یہ محل امن وسلامتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقام ہیں ایک آپ کے جسم کا مقام اور دوسرا آپ کے دل کا مقام! آپ کے جسم کا مقام تو حرم مکہ ہے جب کہ آپ کے دل کا مقام خلت (دوستی حق) ہے جو کوئی آپ کے جسمانی مقام کا ارادہ کرر ہا ہوا سے چاہئے کہ ہر قسم کی شہوتوں اور لذتوں سے اعراض کر کے احرام باندھ لے گویا کفن سا پہن کر حلال شکار سے بھی ہاتھ کھینچ لے اور تمام حواس کو بند کر لے اور میدان عرفات میں حاضر ہو جائے اور وہاں سے مزدلفہ اور مشعر حرام کی طرف روانہ ہو، حجر اسود سے آغاز کر کے مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کا طواف کرے منیٰ میں آئے اور وہاں تین روز قیام کرے۔ شرط کے مطابق کنکریاں مارے اور اسی جگہ سر کے بالوں کا حلق کرے، قربانی کرے اور صحیح لباس پہن لے۔ لیکن جو شخص آپ کے مقام دل کا ارادہ کرے اسے چاہئے کہ پسندیدہ چیزوں سے اعراض کرے، لذتوں اور راحتوں کو ترک کردے اور غیروں کی یاد سے کنارہ کش ہو جائے کیونکہ اس صورت میں اس کا

دنیا کی طرف توجہ کرنا ممنوع ہے اب اسے چاہئے کہ وہ معرفت حق کے عرفات میں قیام کرے وہاں سے محبت الٰہی کے مزدلفہ کی طرف سفر کرے، وہاں سے اپنے باطن کو تنزیہہ حق تعالیٰ کے حرم کا طواف کرنے کیلئے روانہ کرے خواہشات کے سنگریزوں اور فاسد وسوسوں کو منیٰ میں پھینک آئے نفس کو مجاہدہ کے تسخیر کدہ میں قربان کر دے اور یوں مقام خلت تک رسائی حاصل کر لے۔ پس اس مقام امن میں داخل ہونا دشمنوں اور ان کی تلواروں سے مامون ہونے کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام دل میں داخل ہونا خدا سے دوری اور اس طرح کی دوسری برائیوں سے مامون ومحفوظ ہونے کا باعث ہے...... رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ ''الحاج وفدُ اللّٰہِ یُعطِیھم ماسالُواوَ یستجیبُ لَھُم مادعوا '' (حاجی حضرات اللہ کا اپنا قافلہ ہیں۔ وہ جو مانگتے ہیں اللہ انہیں عطا کرتا ہے اور جو دعا کرتے ہیں اسے قبول کرتا ہے) اور جو کچھ وہ چاہتے اور آرزو کرتے ہیں وہ پوری کرتا ہے۔ کچھ لوگ تو اللہ تعالیٰ سے پناہ کا سوال کرتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو نہ تو کسی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی کچھ مانگتے ہیں بلکہ اللہ کے ہر حکم کے سامنے ہر تسلیم جھکا دیتے ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے کہا کہ ''اِذْ قَالَ لَہ' رَبُّہ' اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ '' (اور جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ فرمانبردار ہو جا تو اس نے کہا میں جہانوں کے رب کیلئے تابع فرمان ہوتا ہوں) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جب مقام خلت تک پہنچ کر دنیا کے تمام بندھنوں سے آزاد ہو گئے اور دل کو غیر اللہ سے الگ کر لیا تو حق تعالیٰ نے تمام مخلوق کے سامنے آپ کا جلوہ ظاہر کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نمرود کو آپ پر مقرر کیا یہاں تک کہ اس نے آپ کے اور آپ کے والدین کے درمیان جدائی ڈال دی اور آگ جلائی۔ ابلیس نے آ کر ایک منجنیق تیار کی اور لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گائے کے چمڑے میں سی کر منجنیق کے ایک پلڑے میں رکھ دیا۔ جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور منجنیق کا پلڑا پکڑ کر کہنے لگے ''ھَلْ لکَ اِلَی مِنْ

حَاجَةِ ''(آپ کو میری ضرورت ہے؟) آپ نے جواب دیا ''اما الَیکَ فلاً'' (تمہاری طرف تو کوئی حاجت نہیں) انہوں نے پوچھا ''کیا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی آپ کوئی حاجت نہیں رکھتے؟'' تو فرمایا ''حَسبی من سُوالی علمهٗ بِحَالی'' (میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کو میری حالت کا علم ہے کہ یہ لوگ مجھے اسی کی خاطر آگ میں ڈال رہے ہیں) اللہ تعالیٰ کو میری حالت کا جو علم ہے اس نے زبان سے سوال کرنے سے مجھے منقطع کر دیا ہے......

محمد بن الفضلؒ کہتے ہیں کہ مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہے کہ لوگ دنیا میں تو اس کا گھر بیت اللہ تلاش کرتے ہیں لیکن اپنے دل میں اس کے مشاہدے کی جستجو کیوں نہیں کرتے حالانکہ بیت اللہ کبھی تو زمین پر موجود ہوتا ہے اور کبھی معدوم ہوتا ہے کہ اس کی عمارت گر چکی ہوئی ہے جب کہ اس کا مشاہدہ ہر حال میں موجود ہوتا ہے اگر اس عمارت کے پتھروں کی زیارت فرض ہے جس پر سال میں ایک دفعہ اس کی نظر ہوتی ہے تو دل جو دن رات میں تین سو ساٹھ مرتبہ اس کی نگاہ رحمت کا مرکز بنتا ہے اس کی زیارت تو زیادہ بہتر ہوگی...... تاہم مکہ مکرمہ کے راستہ میں اہل تحقیق کیلئے ہر قدم پر قدرت کی ایک نشانی موجود ہے اور جب وہ حرم پاک میں پہنچ جاتے ہیں تو ہر ایک سے خلعت پاتے ہیں...... اور حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ جس کسی کی عبادت کی جزا اور ثواب کل پر موقوف ہو اسے کہہ دو کہ تم نے تو آج کوئی عبادت ہی نہیں کی کیونکہ ہر شخص کو عبادت اور مجاہدے کا ثواب زمانہ حال میں ہی حاصل ہوتا ہے نیز آپ ہی کہتے ہیں کہ میں نے پہلی دفعہ حج کے موقعہ پر خانہ کعبہ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا دوسری مرتبہ گھر بھی دیکھا اور گھر والے کو بھی دیکھا اور تیسری مرتبہ گھر کے مالک کو ہی دیکھا۔ گھر کو ہرگز نہیں دیکھا...... خلاصہ یہ کہ حرم وہاں نہیں ہوتا جہاں صرف مجاہدہ ہو بلکہ وہاں ہوتا ہے جہاں پر عظمت مشاہدہ ہوتا ہے اور جس شخص کیلئے سارا جہان قرب الٰہی کی جلوہ گاہ اور محبت خداوندی کا خلوت کدہ نہ ہو وہ دوستی کے مفہوم سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور جب بندہ پر تمام بھید کھل جائیں تو سارا جہان ہی اس کیلئے بمنزلہ حرم ہوتا ہے لیکن اگر وہ

حجاب میں ہوتو ہرم بھی اس کیلئے تمام جہان سے زیادہ تاریک مقام ہوتا ہے۔

؎ اَظْلَم الاَشْیَاءِ دارا الحبیب بلا حبیب

(عاشق کیلئے محبوب کے بغیر محبوب کا گھر سب سے زیادہ ظلمت کدہ ہوتا ہے) پس خلت کے محل میں مشاہدے کی قیمت اپنی ذات کو فنا کرنے سے ہی ادا ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے دیدار کعبہ کو اس کا سبب قرار دیا ہے نہ کہ یہ قیمت محض کعبہ کی ہے تاہم سبب کے ساتھ سبب کی حد تک ہی تعلق ہونا چاہئے تا کہ یہ پتہ چلے کہ حق تعالیٰ کی عنایت کون سی کمین گاہ سے ظہور پذیر ہوئی ہے اور طالب کی مراد کہاں سے بر آتی ہے پس جنگلوں اور بیابانوں کا سفر کرنے سے مردان خدا کی مراد محض حرم نہیں ہوتا کہ حق تعالیٰ کے دوست کیلئے محض حرم کو ہی دیکھنا تو حرام ہے بلکہ ان کا مقصود تو وہ مجاہدہ ہوتا ہے جس میں بیقرار کر دینے والا شوق اور حق تعالیٰ کی محبت میں ہمیشہ حاصل ہونے والا ایک سرور موجود ہو...... ایک شخص حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا ''میں حج پر گیا ہوا تھا''...... حضرت جنیدؒ نے پوچھا ''کیا تو نے حج کیا ہے؟ اس نے کہا ''جی ہاں'' آپ نے پوچھا ''ابتداء میں جب تو گھر سے روانہ ہوا اور وطن سے تو نے رحلت کی تو کیا اس وقت تمام گناہوں سے بھی تو نے رحلت اختیار کر لی تھی؟ اس نے کہا ''ایسا تو نہیں ہوا'' آپ نے فرمایا ''گویا تو نے سفر ہی اختیار نہیں کیا پھر آپ نے پوچھا گھر سے روانہ ہونے کے بعد جس جس منزل پر تو نے رات گزاری ہے کیا ہر مقام پر تو نے طریق حق کا بھی ایک مقام طے کیا ہے؟ اس نے جواب دیا ''ایسا تو نہیں ہوسکا'' آپ نے فرمایا ''تو گویا تو نے منزلیں ہی طے نہیں کیں'' پھر آپ نے دریافت کیا ''جب تو نے میقات سے احرام کی حالت اختیار کی تو کیا صفات بشریت سے اسی طرح تو جدا ہو گیا تھا جس طرح تو پہلے لباس اور پہلی عادات سے جدا ہوا تھا؟ اس نے کہا ایسا نہیں ہوا آپ نے کہا ''تو گویا تو محرم ہی نہیں ہوا'' آپ نے سوال کیا ''جب تو نے وقوف عرفات کیا تو کیا تمہیں مشاہدہ حق میں بھی کھڑا ہونا نصیب

ہوا یا نہیں؟'' اس نے جواب دیا ''نہیں'' آپ نے فرمایا ''تو پھر تو نے وقوف عرفات ہی نہیں کیا'' پھر آپ نے پوچھا ''جب تو مزدلفہ میں تھا اور تیری مراد تجھے حاصل ہو رہی تھی تو کیا تو نے نفس کی تمام خواہشات کو ترک کر دیا تھا؟ اس نے کہا ''نہیں'' آپ نے فرمایا ''پھر تو مزدلفہ میں بھی نہیں پہنچا'' پھر آپ نے دریافت کیا جب تو نے خانہ کعبہ کا طواف کیا تو کیا دل کی آنکھ سے مقام تنزیہہ و تقدیس مین جمال خداوندی کے لطائف کا نظارہ بھی کیا؟ اس نے کہا ''نہیں'' تو آپ نے فرمایا ''پھر تو نے گویا طواف ہی نہیں کیا'' پھر آپ نے سوال کیا ''جب تو نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تو کیا مقام صفا اور درجہ مزہ کا ادراک بھی کیا؟ اس نے کہا ''نہیں'' آپ نے فرمایا تو گویا تو نے ابھی تک سعی نہیں کی'' آپ نے پوچھا ''جب تو منیٰ میں پہنچا تو کیا تیری ہستی تجھ سے ساقط ہو گئی تھی؟ کہنے لگا ''نہیں'' آپ نے کہا تو ابھی تک تو منیٰ میں نہیں پہنچا'' پھر آپ نے پوچھا ''جب تو نے قربان گاہ میں پہنچ کر جانور کی قربانی پیش کی تو کیا نفسانی خواہشات کو بھی وہاں قربان کر دیا تھا؟ اس نے کہا ''نہیں'' آپ نے فرمایا ''پس تو نے قربانی ہی نہیں کی'' آپ نے دریافت کیا ''اور جب تو کنکریاں مار رہا تھا تو کیا تو نے اپنے تمام نفسانی معاملات کو بھی وہاں پھینک دیا تھا؟ اس نے کہا ''نہیں'' تو آپ نے فرمایا ''پس ابھی تک تو نے کنکریاں نہیں پھینکیں اور حج ادا نہیں کیا۔ لہٰذا لوٹ جا اور ان صفات کے ساتھ حج ادا کرتا کہ تو مقام ابراہیم تک رسائی حاصل کر سکے۔

میں نے سنا ہے کہ بزرگوں میں سے ایک شخص کعبہ اللہ کے سامنے بیٹھے رو رہے تھے اور یہ اشعار پڑھ رہے تھے..... اشعار

وَاصبحتُ یوم النحر والصیس ترحل

وَکان حدیسے الحادی بنا و معجل

اور قربانی کے دن جب سفید اونٹ کوچ کر رہے تھے اور حدی خوان نے آواز لگادی تھی اور وہ جلدی کر رہا تھا۔

رُسائل عن سلمیٰ فَهل من مخبر
بـانَّ لـهُ علـماً بها اَین تنـزل

میں اپنی محبوبہ سلمیٰ کے بارے میں دریافت کرنے لگا کہ ہے کوئی جس کو اس کے بارے میں علم ہو کہ وہ کہاں اترے گی؟

لَـقَـدْ اَفْـسَـدَتْ حَـجـي وَنُـسُـكِـي وَعُـمْـرَتِـي
وَفِـي الـبـيـن لِـي شـغـل'' من الحج اشغل

محبوبہ نے تو میرا حج، میری قربانی اور میرا عمرہ سب فاسد کر دیئے اور میں حج سے بھی زیادہ اس کے فراق کے شغل میں مشغول ہوں۔

سَارجع من معامِتی لحجة قابلِ
فـانّ الـذی قـد کـان لایتقبلُ

عنقریب میں اپنے گناہوں سے ایک قبول ہونے والے حج کی طرف لوٹ جاؤں گا کیونکہ جو حج ہو چکا وہ تو قبول نہیں ہوا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا جو موقف حج میں سر جھکائے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ تمام لوگ تو دُعاؤں میں مشغول تھے لیکن وہ چپ چاپ کھڑا تھا میں نے کہا ''اے جوان! تو بھی دُعا اور خوشی میں کیوں مشغول نہیں ہو جاتا؟ وہ کہنے لگا ''مجھ پر وحشت سی طاری ہو گئی ہے اور دُعا و انبساط کا جو وقت تھا وہ مجھ سے فوت ہو چکا ہے اب میرے لئے دُعا کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی'' میں نے کہا ''تم دُعا کرو تاکہ اللہ تعالیٰ اس مجمع حج کی برکت سے تمہیں تمہاری مراد تک پہنچا دے حضرت فضیلؒ کہتے ہیں کہ اس نے چاہا کہ ہاتھ اٹھائے اور دُعا کرے لیکن اس کے اندر سے ایک نعرہ بلند ہوا اور اس نعرہ کے ساتھ ہی اس کی جان نکل گئی...... اور حضرت ذوالنون مصریؒ بیان کرتے ہیں کہ ''میں نے منیٰ میں ایک جوان کو دیکھا جو سکون کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جب کہ تمام لوگ اپنی

اپنی قربانیوں میں مصروف تھے میں نے اس پر نگاہ رکھی کہ وہ کیا کرتا ہے اور وہ ہے کون؟ (تھوڑی دیر کے بعد) وہ کہنے لگا ''بار خدایا! اس وقت تمام لوگ اپنی قربانیوں میں مشغول ہیں لہذا میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے آپ کو تیری بارگاہ میں قربان کر دوں تو میری قربانی قبول کرنا'' یہ کہا اور اپنی انگشت شہادت کے ساتھ اپنی گردن کے درمیان ایک اشارہ کیا اور گر پڑا میں نے جو غور سے دیکھا تو حق تعالیٰ اس پر رحم نازل کرے وہ مر چکا تھا۔

پس حج دو طرح کے ہوتے ہیں ایک غیبت میں اور دوسرا حضور میں، جو کوئی مکہ مکرمہ میں پہنچ کر بھی غیبت میں ہو وہ ایسا ہی ہے جیسے اپنے گھر میں وہ غیبت میں تھا۔ کیونکہ ایک غیبت دوسری غیبت سے بہتر نہیں ہوتی۔ اور جو کوئی اپنے گھر میں ہوتے ہوئے بھی بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو وہ ایسے ہی ہے جیسے مکہ مکرمہ میں حاضر ہے کیونکہ کوئی حضور دوسرے حضور سے مختلف نہیں ہوتا۔ پس حج مجاہدات کے کشف کیلئے ایک مجاہدہ ہے اور کوئی مجاہدہ مشاہدہ کیلئے علت نہیں بن سکتا۔ کیونکہ یہ ایک سبب ہے اور کسی سبب کو معانی حقیقت میں کوئی زیادہ تاثیر نہیں ہوتی۔ پس حج سے مقصود خانہ کعبہ کی زیارت نہیں ہوتا بلکہ مقصود مشاہدہ حق کا ظہور ہے...... انشاء اللہ اب میں مشاہدہ حق کے متعلق ایک باب بیان کرتا ہوں جو انہی معانی کے ساتھ متضمن ہے تا کہ تیرے مقصد کا حصول قریب تر ہو جائے۔......

واللہ اعلم بالصواب

باب

مشاہدہ کا بیان

پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اجیعو ابطونکم دعوالحرص واعروا جیارکم قصروا الامل واظمَا واکبارکُم عوالدنیا لعلکم تورون اللہ بقلوبِکُم" (اپنے شکموں کو بھوکا رکھو، حرص کو چھوڑ دو، اور اپنے جسموں کو ننگا رکھو، امیدیں کم کرلو اور اپنے جگروں کو پیاسا رکھو، دنیا چھوڑ دو تاکہ تم اللہ کو اپنے دل سے دیکھ سکو) نیز آپ نے جبرئیلؑ کی طرف سے احسان کے بارے میں سوال پر فرمایا "اَن تعبد اللہ' کانک تراہُ فاِن لَمْ تکن تراہُ فانَّہٗ یراک" (یہ کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تو تمہیں یقیناً دیکھ رہا ہے) اور حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی تھی کہ "یا داؤد اتدلاری ما معرفتی قال لاقال ھی حیاۃ لقلب فی شاھدتی" (اے داؤدؑ کیا تم جانتے ہو کہ میری معرفت کیا ہے؟ انہوں نے کہا "نہیں تو ارشاد ہوا" میرے مشاہدہ میں دل کا زندہ رہنا میری معرفت ہے) اور صوفیہ کے ہاں عبادت سے مراد دل کی آنکھوں سے مشاہدہ حق ہے۔ یعنی خلاء فضا میں ہر وقت دل سے حق تعالیٰ کو ہی دیکھیں...... اور حضرت ابو العباس بن عطاؒ حق تعالیٰ کے اس ارشاد "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْ رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "اِنَّ الذین قالوا ربنا اللہ بالمجاھدۃ ثم استقاموعلی بساط المشاھدۃ" (جن لوگوں نے مجاہدہ کی حالت میں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر مشاہدہ کے بچھونے پر مضبوطی سے قائم رہے)...... حقیقت مشاہدہ دو طرح پر ہے...... ایک یقین کی صحت...... اور دوسرے یہ کہ غلبہ محبت میں یہاں تک پہنچ جائے کہ اس کا پورا وجود حدیث یار بن کر رہ جائے اور دوست کے علاوہ اسے کچھ نظر نہ آئے۔

حضرت محمد بن واسعؒ کہتے ہیں کہ "ما رایتُ شیا قطّ الا ورایتُ الله فِیه ای بصحة الیقین" (میں نے جس چیز کو بھی دیکھا اسی میں مجھے صحت یقین کے ساتھ حق تعالیٰ جلوہ گر نظر آیا)......مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ "ما رایتُ شیا الا ورایتُ اللـه قَبلَه" (میں نے ہر چیز کے سامنے حق تعالیٰ کو دیکھا) اور یہ مخلوق میں حق تعالیٰ کے دیدار کی کیفیت ہے......اور حضرت شبلیؒ کہتے ہیں کہ "ما رایتُ شیا قط الا الله یعنی بغلبات المحبة وغلیانِ المشاهدة" (محبت الٰہی کے غلبہ اور جوش مشاہدہ میں میں نے اللہ کے سوا کسی چیز کو دیکھا ہی نہیں) گویا ایک شخص تو کسی فعل کو دیکھتا ہے اور وہ اس فعل کی دید میں اپنے سر کی آنکھوں سے فاعل کو دیکھتا ہے اور دوسرا سر کی آنکھ کے ساتھ فعل کو دیکھتا ہے لیکن فاعل کی محبت اس کو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتی ہے اور وہ صرف فاعل کو ہی دیکھتا ہے پس اس پہلے شخص کا طریقہ تو استدلالی ہے۔

لیکن اس دوسرے کا جذبی ہے یعنی ایک تو مستدل ہے دلائل کے اثبات سے حق اس پر عیاں ہوتا ہے جب کہ دوسرا مجذوب ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت میں بیخود ہوتا ہے یعنی دلائل اور حقائق اس کے نزدیک سب حجاب ہوتے ہیں "لانَّ مَن عرفَ شیا لا یطمئن بغیره وَمَن احب شیاً لا یطالِع غیرہ' فیتوک المنازعة مَعَه' والا عتراض علیه فی احکامه وافعالِه" (کیونکہ جو شخص کسی چیز کی معرفت حاصل کر لیتا ہے وہ اس کے بغیر مطمئن ہی نہیں ہوتا اور جو کسی چیز کے ساتھ محبت رکھتا ہے وہ اس کے سوا کسی کو دیکھتا تک نہیں پھر وہ اس کے کام پر اس سے تنازع نہیں کرتا اور اس کے کردار پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا) تاکہ اس کے حکم کو رد کرنے والا نہ بنے اور حق تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی معراج کے متعلق ہمیں خبر دی ہے کہ "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" (آپ کی نگاہ نہ تو تجلیات الٰہی سے پلٹی اور نہ حد سے آگے بڑھی) یعنی دیدار الٰہی کے شدت شوق میں آپ نے نگاہ کسی چیز سے ہٹائی نہیں حتیٰ کہ جو کچھ بھی تجلیات ربانی سے سامنے آیا

آپ نے اسے دل کی آنکھوں سے دیکھا۔ کیونکہ جب کبھی بھی انسان آنکھ کی محبت موجودات سے ہٹالیتا ہے لامحالہ اپنے دل سے اپنے خدا کا دیدار کر لیتا ہے......اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" لَقَدْ رَاٰی مِنْ آیاتِ رَبِّهِ الْکُبْریٰ "(یقیناً آپ نے اپنے پروردگار کی بڑی نشانیوں کو دیکھا) اور نیز ارشاد ربانی ہے کہ" قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ای ابصار العیون من الشهوت و ابصار القلوب عن المخلوقات "(اے پیغمبر ﷺ مومنوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی آنکھیں نیچی رکھا کریں یعنی آنکھوں کی بصارت کو شہوات کے دیکھنے سے اور دل کی بصارت کو پوری مخلوقات کو دیکھنے سے) پس جو کوئی سر کی آنکھوں کو خواہشات کے دیکھنے سے روک لیتا ہے لامحالہ وہ سر کی آنکھوں سے ہی حق تعالیٰ کو دیکھ لیتا ہے" من کان اخلص مجاهدة کان اصدق مشاهدة "(جو کوئی مجاہدے میں جتنا مخلص ہوگا وہ مشاہدہ حق میں اتنا ہی زیادہ سچا ہوگا) پس باطنی مشاہدہ ظاہری مجاہدے کے ساتھ ہوا کرتا ہے......حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ فرماتے ہیں" مَنْ غض بصره عن اللهِ طرفة عین لا لهید طول عمره "(جو کوئی ایک لمحے کیلئے بھی حق تعالیٰ کو دیکھنے سے غافل ہو گیا وہ اپنی طویل زندگی میں راہ راست پر نہیں آسکتا) اس لئے کہ غیر کی طرف التفات کرنا حق تعالیٰ سے غیر کی طرف لوٹنا ہے اور حق تعالیٰ جس کو بھی غیر کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ پس ارباب مشاہدہ کے نزدیک زندگی وہ ہوتی ہے جس میں وہ مشاہدہ حق میں رہیں اور جو وقت غیبت میں بسر ہوا سے وہ زندگی میں شمار ہی نہیں کرتے کہ وہ وقت ان کیلئے درحقیقت بمنزلہ موت کے ہوتا ہے چنانچہ حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے؟ آپ نے جواب دیا" چار سال" وہ کہنے لگے" یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آپ نے فرمایا" ستر سال تو ایسے ہیں کہ زندگی حجاب میں گزری ہے تاہم چار سال اب اس طرح ہیں کہ میں اس کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اور حجاب کا زمانہ عمر میں شمار نہیں ہوتا......حضرت شبلیؒ دعا کی حالت میں کہا کرتے تھے کہ" اللّٰهُمَّ اخبارُ الجنة

والنار فی خبا باغیبک حتی نعبدک بغیر واسطة ''(اے اللہ جنت اور دوزخ کو اپنے غیب کے پردوں میں چھپا دے تا کہ ہم بغیر کسی واسطے کے تیری عبادت کریں) یعنی جنت و دوزخ کی یاد لوگوں کے دل سے بھلا دے تا کہ وہ ان کی وجہ سے تیری پرستش نہ کریں کیونکہ جب بہشت میں طبیعت کیلئے ایک کشش ہے تو آج عقلمند آدمی یقیناً اسی کے حصول کیلئے عبادت کرتا ہے اور اگر دل کو محبت خداوندی کا کوئی حصہ حاصل نہیں ہے تو لامحالہ غافل انسان مشاہدہ حق سے حجاب میں رہے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج کے متعلق حضرت سیدہ عائشہ صدیقہؓ کو بتلایا کہ ''میں نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا...... جب کہ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ ''میں نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے...... پس لوگ اس معاملے میں اختلاف کرنے لگے حالانکہ بہتر طریق وہ تھا جو درمیانہ ہے کہ آپ نے جو فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے تو اس سے باطن کی آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے اور جو یہ فرمایا کہ نہیں دیکھا تو یہ ظاہری آنکھ سے نہ دیکھنے کو بیان فرمایا ہے چونکہ ان دونوں میں سے ایک اہل باطن میں سے تھے اور ایک اہل ظاہر میں سے، اس لئے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبے کے مطابق گفتگو فرمائی...... پس جب آپ نے باطن کی آنکھ سے دیکھ لیا تو یہ اگر ظاہری آنکھوں کے واسطہ سے نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے...... حضرت جنیدؒ نے فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہا کہ ''مجھے دیکھو تو میں عرض کروں گا کہ میں نہیں دیکھتا کیونکہ محبت میں آنکھیں بھی غیر اور بیگانہ ہیں جب کہ غیریت کی غیرت مجھے دیدار سے باز رکھتی ہے کیونکہ دنیا میں بھی میں حق تعالیٰ آنکھوں کے واسطے کے بغیر دیکھتا رہا ہوں تو آخرت میں اس واسطے کو میں کیا کروں گا۔ واللہ الہادی واللہ اعلم بالصواب...... شعر

وَ اِنّی لَاَحْسِدُ نـاظرین الیک

وَاغضُ طرفی اذا نظرتُ الیک

(میں تیری طرف دیکھنے والوں سے حسد کرتا ہوں اور جب خود تجھے دیکھتا ہوں تو آنکھیں بند کر لیتا ہوں)

کہ دوست کو اپنی نگاہوں سے دیکھنا بھی مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ آنکھ بھی بیگانہ ہوتی ہے اس بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ "کیا آپ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں" لوگوں نے پوچھا "آخر کیوں؟" تو انہوں نے فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھنا چاہا تو دیکھ نہ سکے اور حضرت محمد ﷺ نے دیدار کی درخواست نہ کی۔ تو دیدار سے مشرف ہوئے، پس ہمارا چاہنا ہمارے لئے دیدار خداوندی سے حجاب اعظم ہے اس لئے کہ محبت میں اپنے ارادے کا وجود بھی ایک طرح کی مخالفت ہوتی ہے اور مخالفت حجاب ہوتی ہے، جب دنیا میں اپنا ارادہ ختم ہو جاتا ہے تو مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور جب مشاہدہ ثابت ہو جاتا ہے تو دنیا آخرت کی طرح اور آخرت دنیا کی طرح ہو جاتی ہے...... حضرت بایزیدؒ کہتے ہیں کہ "**اِنَّ للّٰہ عبادا لو حجبو عن اللہ فی الدنیا و الاخرہ لارتدُ**" (بلاشبہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ دنیا و آخرت میں دیدار الٰہی سے حجاب میں رکھے جائیں تو وہ مرتد ہو جائیں) یعنی حق تعالیٰ ہر وقت اپنے مشاہدہ سے ان کی پرورش کرتا رہتا ہے اور محبت کی زندگی سے ان کو زندہ رکھتا ہے پس لامحالہ صاحب مشاہدہ اگر محجوب ہو کر مشاہدہ سے محروم ہو جائے تو وہ راندہ درگاہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں مصر میں جا رہا تھا کہ بچوں کو دیکھا کہ ایک نوجوان پر پتھر برسا رہے ہیں میں نے ان لڑکوں سے کہا "تم اس سے کیا چاہتے ہو؟ وہ کہنے لگے یہ ایک دیوانہ ہے میں نے پوچھا "آخر دیوانگی کی کونسی علامت اس سے ظاہر ہو رہی ہے؟" انہوں نے کہا "یہ کہتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہوں"...... میں نے اس نوجوان سے پوچھا "اے جوانمرد کیا تو یہ کہتا ہے یا یہ تجھ پر الزام لگاتے ہیں؟ اس نے جواب دیا "نہیں بلکہ میں یہی یہ کہتا ہوں کیونکہ اگر ایک لمحہ کیلئے بھی میں حق تعالیٰ کو نہ

دیکھوں تو میں محجوب ہو جاؤں اور اس کی فرمانبرداری نہ کر سکوں...... باقی اہل طریقت کے ہی ایک گروہ کو اس معاملے میں غلطی واقع ہوئی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ دلوں کے دیکھنے اور اس کے مشاہدے کی کوئی صورت ہوتی ہے کہ ذکر وفکر کی حالت میں "وہم" دل کے اندر اس کو ثابت کرتا ہے حالانکہ یہ تشبیہہ محض اور کھلی گمراہی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی کوئی مقدار یا اندازہ نہیں ہے کہ دل میں وہم کے ذریعہ اندازہ کیا جا سکے یا عقل اس کی کیفیت سے مطلع ہو سکے جو کچھ موہوم ہوگا وہ بھی وہم کی جنس سے ہی ہوگا اور جو کچھ عقل میں آئے گا وہ عقل کی ہی جنس سے ہوگا اور حق تعالیٰ جنسوں کا ہم جنس نہیں ہے اور تمام لطیف وکثیف چیزیں ایک دوسرے کی جنس ہوتی ہیں اور یہ محل ضد میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم جنس ہوتی ہیں، اس لئے کہ توحید کی تحقیق میں قدیم کے مقابلے میں ضد بھی ایک جنس ہوگی۔ کیونکہ اضداد حادث ہوتے ہیں اور تمام حادث ایک جنس ہیں ملحدین جن چیزوں کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں حق تعالیٰ ان سے بہت زیادہ بلند ہے پس دنیا میں مشاہدہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے آخرت میں رویت باری تعالیٰ جب تمام اصحاب طریقت ومعرفت کے اجماع واتفاق سے آخرت میں رویت حق روا ہے تو پھر دنیا میں مشاہدہ بھی جائز ہوگا۔ پس اس مخبر میں جو آخرت کے مشاہدہ کی خبر دیتا ہے اور اس مخبر میں جو مشاہدہ دنیا کی خبر دیتا ہے کوئی فرق نہیں ہوگا وہ ان دونوں باتوں کی خبر دیتا ہے۔ دعویٰ نہیں کرتا یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ دیدار اور مشاہدہ جائز ہے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ مجھے دیدار حاصل ہوا ہے یا اس وقت حاصل نہیں ہے اس لئے کہ مشاہدہ تو باطن کی صفت ہے جب کہ خبر دینا زبان کی عبادت ہے اور اگر زبان کو باطن کی خبر ہو کہ وہ اس کو بیان کر سکے تو یہ مشاہدہ نہ ہوگا بلکہ ایک دعویٰ ہوگا۔ کیونکہ جس چیز کی حقیقت عقول کے اندر ثبات نہیں پاتی زبان اس کو عبارت میں کس طرح بیان کرنے کی تاب رکھتی ہے سوائے مجاز کے "لِاَنَّ المشاهدة قصر اللسان بحضور الجنان "پس ان معاملے میں سکوت کا درجہ نطق سے زیادہ برتر ہے کیونکہ سکوت مشاہدہ کی علامت ہے جب کہ نطق شہادت کا

نشان ہے اور کسی چیز پر شہادت دینے اور کسی چیز کے مشاہدے کے درمیان بڑا واضح فرق ہے...... یہی وجہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام چونکہ مقام قرب میں اور اس بلند محل میں تھے جو حق تعالیٰ نے آپ کیلئے مخصوص کر دیا ہے اس لئے آپ نے کہا ''لا اُحصی ثناءً علیکَ'' (میں تیری تعریفوں کا احاطہ نہیں کر سکتا) کیونکہ آپ مشاہدہ میں تھے اور مشاہدہ مقام محبت میں کمال درجے کی یگانگی ہوتا ہے اور یگانگی میں عبارت سے بیان کرنا بھی ایک بیگانگی ہوتا ہے چنانچہ اس جگہ آپؐ نے کہا ''اَنتَ کَمَا اثنیتَ عَلیٰ نفسکَ '' (تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی ثناء بیان کی ہے) یعنی اس مقام پر تیرا کہا ہوا میرا کہا ہوا ہو گیا ہے اور تیری ثناء میری ثناء ہوگئی ہے کہ میں زبان کیلئے اس بات کی اہلیت نہیں سمجھتا کہ میری حالت کی تعبیر کر سکے نیز میں بیان کو اس بات کا مستحق بھی نہیں سمجھتا کہ وہ میرا حال ظاہر کرے...... اور اس معنی میں ایک کہنے والے نے کہا ہے۔

تمینتُ من اھوی فلما راتیہ'

بِھتُّ فَلَمْ املک لِسَانًا وَلاَ طرفاً

میں اپنے محبوب سے ملاقات کی تمنا کرتا تھا لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ پھر میری زبان اور میری آنکھ میرے قابو میں نہ رہے۔

اختصار کے طور پر یہ تھے مشاہدہ کے تمام احکام جو بیان کر دیئے گئے۔

وباللہ التوفیق۔

صحبت اس کے آداب اور احکام

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے کہ ''یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا. اَیْ اَدِبُوْھُمْ ''(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچاؤ۔ یعنی ان کو ادب سکھاؤ) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ''حسن الاداب مِن الایمان '' (اچھے اداب، ایمان کا حصہ ہیں) نیز یہ بھی فرمایا ''ادبَنِی رَبِّی فاحسن تادینی'' (مجھے میرے رب نے ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا پس جان لو کہ دین اور دنیا کے تمام امور کا حسن ادب کے ساتھ ہی متعلق ہے اور اصناف خلق کے مقامات میں سے ہر مقام کیلئے ایک ادب ہے اور کافر و مسلمان ملحد و توحید پرست اور سنی و بدعتی سب اس بات پر متفق ہیں کہ تمام معاملات میں حسن اداب ایک پسندیدہ امر ہے اور جہان میں ادب کے استعمال کے بغیر کوئی رسم بھی ثابت نہیں ہوسکتی۔ لوگوں میں مروت کی حفاظت دین میں سنت کے تحفظ اور دنیا میں حرمت وعزت کی حفاظت کا نام ادب ہے اور یہ تینوں امور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں اس لئے کہ جس کسی میں مروت نہیں اس میں سنت کا اتباع نہیں ہوسکتا اور جس کسی میں سنت کا جذبہ نہیں اس میں حرمت و ناموس کا بھی کوئی لحاظ نہیں، اور معاملات میں ادب کی حفاظت دل میں مطلوب کی تعظیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور حق تعالیٰ اور اس کے شعائر کی تعظیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور حق تعالیٰ اور اس کے شعائر کی تعظیم راہ تصوف میں تقویٰ سے ہے اور جو کوئی بے حرمتی سے شواہد حق کی تعظیم کو پامال کرتا ہے اس کو صوفیہ کے طریق سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور طالب حق اور سکر اور غلبہ میں سے کوئی حالت بھی آداب کا لحاظ رکھنے سے نہیں روکتی اس لئے کہ ادب کرنا ان کی عادت ہوتی ہے اور عادت طبیعت کا قرینہ ہوتی ہے اور جان دار چیز سے طبیعتوں کا ساقط ہوجانا کسی حالت

میں بھی متصور نہیں ہوسکتا کہ جب تک زندگی موجود ہے طبیعت کا سقوط محال ہے پس جب تک انسانی تشخص موجود ہے اس وقت تک کبھی تکلف کے ساتھ اور کبھی تکلف کے بغیر تمام احوال میں آداب کی متابعت انسانوں میں جاری رہے گی۔ جب ان کی حالت صحو کی ہوگی وہ بتکلف آداب کی حفاظت کریں گے اور جب ان کا حال سُکر کا ہوگا حق تعالیٰ خود ان پر ادب کی نگہداشت کریں گے اور ادب کو ترک کرنے والا کسی طرح بھی ولی نہیں ہوسکتا۔''

لان المودة عند الاداب وحُسن الاداب صفة الاحباب ''(اس لئے کہ آداب کی موجودگی میں ہی محبت ہوتی ہے اور حسن ادب دوستوں کی صفت ہے) اور اللہ تعالیٰ جس شخص کو عزت وکرامت عطا فرماتے ہیں اس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ احکام دین کے آداب سے متعلق اس کی نگہداری کرتے ہیں بخلاف بے دینوں کے گروہ کے اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے جو یہ کہتے ہیں کہ جب بندہ صحبت میں مغلوب ہوجاتا ہے تو اتباع شریعت کا حکم اس سے ساقط ہوجاتا ہے...... انشاء اللہ اس مسئلے کو دوسری جگہ پوری وضاحت کے ساتھ میں بیان کروں گا تاہم آداب تین طرح کے ہیں ایک یہ کہ حق تعالیٰ کے ساتھ توحید کے معاملہ میں ادب کا لحاظ رکھے اور وہ اس طرح ہے کہ خلوت وجلوت میں اپنے آپ کو بے ادبی سے بچائے رکھے اور معاملہ ایسا اختیار کرے جیسا بادشاہوں کے سامنے اختیار کیا جاتا ہے صحیح احادیث میں موجود ہے پیغمبر ﷺ ایک دن پاؤں پھیلائے تشریف فرما تھے کہ جبرئیلؑ حاضر ہوئے اور کہا یا محمد ﷺ ''**اجلس جلسة العبيد**'' (اے محمد ﷺ خداوند تعالیٰ کے حضور غلاموں کی طرح بیٹھئے۔

بیان کرتے ہیں کہ حضرت حارث محاسبیؒ نے چالیس سال تک دن رات میں کسی وقت بھی اپنی پشت دیوار کے ساتھ نہیں لگائی اور دو زانوں ہی بیٹھے رہے لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ اس طرح آپ اپنے کو تکلیف میں کیوں رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، مجھے شرم آتی ہے کہ بارگاہ خداوندی میں غلاموں کے علاوہ کسی اور حالت میں بیٹھوں''...... میں (علی

بن عثمان ہجویریؒ) دیار خراسان کے ایک گاؤں میں گیا جو بلند کے نام سے مشہور تھا وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا جسے لوگ مرد ملندی کہتے تھے اور اس میں تمام فضیلتیں موجود تھیں، یہ شخص بیس سال پاؤں پر ہی کھڑا رہا تھا اور نماز میں تشہد کی حالت کے علاوہ بالکل نہ بیٹھا تھا میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا میں ابھی اس درجہ پر نہیں پہنچا کہ حق تعالیٰ کے سامنے بیٹھ جاؤں۔

حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے دریافت کیا ''بم وجدتَ ما وجدت'' (آپ نے جو مقام پایا ہے وہ کس طرح حاصل کیا ہے؟)''قال بحسن الصحبة مَعَ اللّٰهِ عزوجل''(جواب دیا حق تعالیٰ کے ساتھ اچھی ہم نشینی اختیار کرنے کی وجہ سے) یعنی با ادب اور اچھی صحبت سے کہ میں خلوت میں بھی اسی طرح رہا جس طرح جلوت میں'' اور جہان والوں کو چاہئے کہ اپنے معبود کے مشاہدے میں آداب کی حفاظت کا سبق زلیخا سے سیکھیں کہ جب وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت میں ہوئی اور حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش پوری کرنے کی درخواست کی تو پہلے اپنے بت کا چہرہ کسی کپڑے سے ڈھانپ دیا'' حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا تم یہ کیا کرتی ہو؟'' کہنے لگی اپنے معبود کا منہ ڈھانپ رہی ہوں تا کہ وہ مجھے تمہارے ساتھ اس بے حرمتی کی حالت میں نہ دیکھے کیونکہ یہ ادب کے خلاف ہے اور پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام سے مشرف کیا تو زلیخا کو جوان کر کے اسے اسلام کی توفیق نصیب فرمائی اور اسے حضرت یوسف علیہ السلام کی زوجیت و نکاح میں دے دیا پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے قریب جانے کا ارادہ کیا تو وہ پیچھے ہٹ گئی حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا'' زلیخا میں تیرا وہی دلربا نہیں ہوں تو مجھ سے گریز کیوں کر رہی ہے کیا تمہارے دل سے میری محبت ختم ہو چکی ہے'' اس نے عرض کی نہیں اللہ کی قسم! محبت اپنی جگہ موجود ہے بلکہ اس میں اضافہ ہو چکا ہے لیکن میں نے ہمیشہ اپنے معبود کے آداب کا خیال رکھا ہے اس روز کہ جب میں تمہارے ساتھ خلوت

میں تھی میرا معبود ایک بت تھا جس کی دو بے دیدار آنکھیں تو تھیں لیکن وہ ان سے دیکھ نہ سکتا تھا پھر بھی میں نے اس پر کوئی چیز ڈال دی تھی تا کہ بے ادبی کی تہمت مجھ سے اٹھ جائے اور اب...... میں ایک ایسا معبود رکھتی ہوں آلات واسباب کے بغیر سب کچھ جانتا اور دیکھتا ہے اور میں جس حالت میں ہوں" مجھے دیکھتا ہے میں ہرگز نہیں چاہتی کہ تارک ادب بنوں......

اور جب حق تعالیٰ اپنے رسول اللہ ﷺ کو معراج پر لے گئے تو آپ نے محض ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کونین کی کسی چیز کو نہ دیکھا یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی "مَازَاغَ الْبَصَرُ" اَیْ بِنُوِیتِ الدُنیا وَمَا طَغی اَی برویۃِ العقبی "

(آپ کی نگاہ نہ ہٹی اور نہ بڑھی یعنی نہ تو دنیا کو دیکھنے کیلئے نظارہ حق سے ہٹی اور نہ ہی عقبیٰ کو دیکھنے کیلئے حد سے متجاوز ہوئی)

اور ادب کی دوسری قسم اعمال میں اپنے ساتھ ادب کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام احوال میں اپنے نفس کے ساتھ مروت کی رعایت رکھے حتی کہ جو چیز لوگوں کی صحبت اور حق تعالیٰ کے سامنے بے ادبی ہے اسے اپنی صحبت (تنہائی) میں بھی استعمال نہ کرے اور اس کا بیان اس طرح ہوسکتا ہے کہ سچائی کے علاوہ کچھ نہ بولے اور اس طرح رہے کہ جس چیز کو اپنے لئے خلاف سمجھتا ہو اس کو اپنی زبان پر بھی نہ لائے کیونکہ یہ بھی بے مروتی ہے دوسری بات یہ کہ کم کھائے تا کہ اسے طہارت خانے میں کم جانا پڑے...... تیسری بات یہ ہے کہ اپنے جسم کے جس حصے کو دوسروں کے سامنے دکھانا جائز نہیں اس حصے کو خود بھی نہ دیکھے کیونکہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق آتا ہے کہ آپ نے اپنی شرم گاہ کو ہرگز نہیں دیکھا تھا جب لوگوں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے کہ میں وہ چیز دیکھوں جس کا دیکھنا دوسروں کیلئے حرام ہے اور ادب کی تیسری قسم مخلوق کے ساتھ صحبت میں ادب کا لحاظ رکھنا ہے اور مشکل ترین آداب، لوگوں کی صحبت کے ساتھ متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں کہ سفر وحضر میں ان کے ساتھ حسن سلوک اور اچھا معاملہ ہو اور سنت کا اتباع بھی پیش

نظر رہے، آداب کی ان تینوں اقسام کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اب میں انشاء اللہ امکانی حد تک اس کو ترتیب دیتا ہوں تا کہ تجھ پر اور اس طریق کو پڑھنے والوں پر یہ بہت زیادہ آسان ہو جائے...... واللہ اعلم بالصواب۔

صحبت اور اس کے متعلقات

اللہ عزوجل فرماتے ہیں ''اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُو الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا...... اَیْ بحسنِ وعامیتھم الاخوان '' (بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے تو عنقریب خدائے رحمٰن ان کیلئے محبت پیدا کر دے گا...... یعنی اس لئے کہ انہوں نے اپنے دوستوں سے حسن معاملہ) یعنی جن مومنوں کا کردار اچھا ہوتا ہے حق تعالیٰ ان کو دوست بنا لیتے ہیں اور ان کو دوستی کے قابل بنا دیتے ہیں اس لئے کہ وہ دلوں کا پاس کرتے ہیں اپنے بھائیوں کے حق پورے کرتے ہیں اور ان کو اپنے اوپر فضیلت دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''ثلث لک وداحیک تسلم علیه ان لقتیه وتوسع له فی المجلس وتدعوه باحب اسمله '' (تین صفتیں تیرے لئے تیرے بھائی کی محبت کا باعث ہیں یہ کہ جب اس سے ملاقات کرے تو اس پر سلام کہہ اور مجلس میں اس کیلئے جگہ وسیع کر دے اور اس کو پسندیدہ اور خوبصورت ناموں کے ساتھ بلائے) جو کچھ آپ ؐ نے فرمایا یہ حسن رعایت اور حفظ ناموس کی وجہ سے ہے کہ مسلمان بھائیوں کی دوستی ان تین صفات سے مصفی اور پاکیزہ ہو جاتی ہے...... اور حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوا بَیْنَ اَخَوَیْکُم '' (بے شک تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں پس بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ) گویا تمام مسلمانوں کو دو بھائیوں میں مہربانی اور نرمی پیدا کرنے کا حکم دیا تا کہ آپس میں ان کے دل رنجیدہ نہ ہوں'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اکثر وامن الاخوان فَاِنَّ ربکم حیی کریم لیستحیی ان یعذب عهده بینَ اخوتِه یَوْمَ القیمة ''

(اپنے بھائی زیادہ بناؤ کیونکہ تمہارا رب حیادار اور سخی ہے وہ قیامت کے دن اپنے بندے کو اس کے بھائیوں کے درمیان عذاب دینے سے حیا کرے گا) تاہم یہ ضروری ہے کہ کسی کے ساتھ محبت محض حق تعالیٰ کیلئے ہو نہ کہ نفسانی خواہش اور کسی غرض اور مراد کے حصول کیلئے ہو تا کہ اس ادب کی حفاظت سے بندہ مشکور رہے۔

اور حضرت مالک بن دینارؒ نے اپنے داماد مقیرہ سے فرمایا تھا ''یا مقیرة کُلُّ اخ وصاحب لَمْ تستفدمنه فی دینکَ خیراً فانبذ عن صحبَته حتی تسلیم ''(اے مقیرہ! اپنے جس بھائی اور دوست سے تجھے تیرے دین میں بہتر فائدہ نہ ہو اس کی صحبت سے کنارہ کش ہو جا تا کہ تو سلامت رہے) یعنی جس بھائی یا دوست کی صحبت سے تجھے آخرت کا فائدہ نہ ہو اس کے ساتھ صحبت نہ کر کہ ایسے آدمی کی ہمنشینی تجھ پر حرام ہے اس کا معنی یہ ہے کہ صحبت یا تو اپنے سے بہتر کے ساتھ اختیار کر یا اپنے سے کمتر کے ساتھ۔ کہ اگر اپنے سے بہتر کے ساتھ صحبت رکھے گا تو تجھے اس سے فائدہ حاصل ہوگا اور اگر اپنے سے کمتر کے ساتھ رکھے گا تو اس کو تجھ سے فائدہ حاصل ہوگا۔

اس طرح دونوں صورتوں میں فائدہ ہی ہوگا کہ اگر وہ تجھ سے کوئی چیز سیکھے گا تو تجھے بھی اور اسے بھی دینی فائدہ ہوگا اسی طرح اگر تو اس سے کوئی چیز سیکھے گا تو بھی تم دونوں کو دینی فائدہ ہوگا۔ یہی توجہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''ان من لمام التقوی تعلم من لا یعلم ''(کمال تقویٰ یہ ہے کہ تو اسے دین کا علم سکھائے جو کچھ نہیں جانتا حضرت یحییٰ بن معاذؒ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ''بئسَ الصدیق صدیق تحتاج ان تقولُ لَه' اذکر نی فی دعائکَ وبئسَ الصدیق صدیق تحتاج ان تعیش معه بالمدارات وبیس الصدیق صدیق یلجک الی الاعتذار فی زلّة کانت مِنکَ'' ''(وہ شخص برا دوست ہے جس کو دُعا کرنے کی تجھے درخواست کرنی پڑے اور برا ہے وہ دوست جس کے ساتھ تجھے خاطر و مدارات سے زندگی گزارنا پڑے اور برا ہے

وہ دوست جس کے سامنے تجھے اپنی کسی لغزش پر معذرت کرنی پڑے) کیونکہ ایک لمحے کی صحبت کا حق یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تیرے لئے خود ہی دُعا کرتا رہے اور صحبت کا اصل سرمایہ انبساط وشادمانی ہے نہ کہ خاطر و مدارات اور معذرت کرنا بیگانوں کا کام ہوتا ہے جبکہ سچی محبت و صحبت میں بیگانگی ایک جفا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "**المر علی دین خلیله فلیتطر اَحَد کم من یخالل**" (ہر شخص اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے) کیونکہ انسان وہی دین اور راستہ اختیار کرتا ہے جس پر اس کے دوست گامزن ہوتے ہیں لوگ دیکھتے ہیں کہ فلاں دوستی اور صحبت کن کے ساتھ رکھتا ہے اگر نیک لوگوں سے صحبت رکھتا ہو، خود اگرچہ برا ہو نیک ہی شمار ہوتا ہے اس لئے کہ وہ صحبت اس کو نیک کر دے گی اور اگر برے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھتا ہے خود اگرچہ نیک ہی ہوگا اس لئے کہ وہ ان کے بُرے اعمال پر راضی ہے لہذا جب بُرائی پر راضی ہے تو اگرچہ ابھی خود نیک ہے بالآخر خود بھی برا ہو جائے گا۔ حکایات میں آتا ہے کہ ایک شخص کعبہ کے اندر طواف کر رہا تھا اور یوں دُعا کر رہا تھا "**الهم اصلح اخوانی فقیل لَهٗ لم لم تدعُ لک فی هذا المقام**" (اے اللہ میرے بھائیوں کی اصلاح فرما! اس سے پوچھا گیا اس مقدس مقام پر پہنچ کر تو خود اپنے لئے کیوں دُعا نہیں کر رہا؟) اس نے جواب دیا "**ان لی اخواناً ارجع الیهم فان صلحوا صلحت معهم وان فسدو افسلت معهم**" (میرے کچھ بھائی ہیں جن کی طرف میں لوٹ کر جاؤں گا اگر وہ درست ہوں گے تو میں بھی ان کے ساتھ درست ہو جاؤں گا) جب میری اصلاح کا دارومدار مصلح لوگوں کی صحبت پر ہے تو میں اپنے بھائیوں کیلئے یہی دُعا کرتا ہوں تا کہ میرا مقصود ان سے حاصل ہو جائے ...... اس تمام گفتگو کی بنیاد یہ ہے کہ نفس کو اپنے یاروں کی عادتوں سے سکون ملتا ہے اور انسان جس گروہ کے درمیان رہتا ہے ان کی عادات اور افعال کو اپنا لیتا ہے کیونکہ تمام معاملات اور ارادے جو حق اور باطل سے

ہیں وہ دوسروں کے معاملات و ارادوں سے ہی پرورش پاتے ہیں اور انسان کے ارادے پر دوسرے کے ارادے کا غلبہ ہو ہی جاتا ہے اور دوسروں کی صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے اور عادات کو بڑا غلبہ حاصل ہوتا ہے یہاں تک کہ ایک باز آدمی کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ جان جاتا ہے اور طوطا انسان کے سکھلانے پر بولنے لگتا ہے اور گھوڑا بھی ریاضت اور مشق کے ذریعہ جانوروں کی عادت سے نکل کر انسان کی عادت اختیار کر لیتا ہے اس طرح کی تمام چیزوں میں صحبت کی تاثیر موجود ہوتی ہے کہ ان کی پوری عادت ہی تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔اور اہل طریقت کے مشائخ پہلے ایک دوسرے سے صحبت کا حق ہی مانگتے ہیں اور مریدوں کو بھی اس کی ترغیب دلاتے ہیں یہاں تک ان کے درمیان صحبت ایک فریضہ کا درجہ حاصل کر گئی ہے اس سے پہلے مشائخ نے اس گروہ کے آداب صحبت میں بڑی تفصیلی کتابیں لکھی ہیں چنانچہ حضرت جنیدؒ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تصحیح الارادت تھا ایک کتاب حضرت احمد بن خضرویہ البلخیؒ نے تصنیف کی جس کا نام الرعایہ بحقوق اللہ تھا حضرت محمد علی ترمذیؒ نے بھی ایک کتاب لکھی اس کا نام ''آداب المریدین رکھا تھا۔ حضرت ابوالقاسم الحکیم، ابوبکر وراق، سہل بن عبداللہ، ابوعبدالرحمٰن السلمی اور ابوالقاسم قشیری رحمھم اللہ اجمعین نے بھی اس عنوان پر بڑی کافی کتابیں لکھی ہیں اور یہ تمام حضرات اس فن کے امام ہوئے ہیں میرا مقصود اس کتاب میں یہ ہے کہ جس کسی کے پاس یہ کتاب موجود ہو وہ دوسری کتابوں کی ضرورت محسوس نہ کرے اور قبل ازیں کتاب کے مقدمہ میں اور تیرے پوچھنے پر میں کہہ چکا ہوں کہ یہ کتاب تیرے لئے اور دیگر طالبان راہ حق کیلئے ایک غنیمت ہے۔۔۔۔۔اب میں انشاء اللہ تعالیٰ صوفیہ کے آداب معاملات کی اقسام کو ترتیب وار بیان کرتا ہوں۔۔۔۔۔واللہ اعلم بالصواب۔

صحبت کے آداب

جب تو نے جان لیا کہ مرید کیلئے اہم ترین چیز صحبت ہے تو لامحالہ صحبت کے حقوق

کی رعایت بھی ایک فریضہ ہو گیا کیونکہ تنہائی مرید کیلئے ہلاکت کا باعث ہوتی ہے اسی لئے پیغمبر علیہ ﷺ نے فرمایا ہے ''الشیطان مع الواحد وھوا من الاثنین الابعد '' (شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے جو تنہا ہو اور وہ دو سے بہت دور ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ '' مَایَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّاھُوَ رَابِعُھُمْ '' (کوئی تین آدمی بھی سرگوشی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے چوتھے ہوتے ہیں) پس تنہا رہنے جیسی کوئی مصیبت مرید کیلئے نہیں) اور میں نے حکایات میں دیکھا ہے، حضرت جنیدؒ کے مریدوں میں سے ایک کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میں درجہ کمال تک پہنچ چکا ہوں لہذا میرے لئے تنہا رہنا صحبت سے زیادہ بہتر ہے چنانچہ وہ گوشہ نشین ہو گیا اور دل کو جماعت صوفیہ کی صحبت سے کنارہ کش کر لیا ہے جب رات ہوتی تو کچھ لوگ اس کے پاس اونٹ لے کر آتے اور اس سے کہتے کہ آپ کو تو بہشت میں ہونا چاہئے تھا وہ اس اونٹ پر بیٹھ جاتا اور چل پڑتا یہاں تک کہ ایک ایسا مقام نمودار ہوتا جس میں خوبصورت کھانے اور نہریں جاری ہوتیں، وہ اس کو صبح ہونے تک اس جگہ رکھتے اور سحری کے قریب وہ سو جاتا اور جب بیدار ہوتا تو اپنے آپ کو خلوت کرنے کے دروازے پر پاتا یہاں تک کہ آدمیت کی رعونت اور غرور اس میں پیدا ہو گیا اور جوانی کی نخوت نے اس کے دل میں اپنی تاثیر ظاہر کی اور اس نے دعویٰ کی زبان کھولی اور کہنے لگا کہ مجھے اس طرح کی حالت پیش آتی ہے لوگوں نے یہ خبر حضرت جنیدؒ تک پہنچائی تو وہ اٹھے اور اس کی عبادت گاہ کے دروازے پر تشریف لائے تو اس کو خواہشات میں مست اور غرور و تکبر میں مبتلا پایا آپ نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے سب کچھ حضرت جنیدؒ سے بیان کر دیا حضرت جنیدؒ نے فرمایا دیکھ جب آج رات تو وہاں پہنچے تو یاد رکھ اور تین مرتبہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہِ العلی العظیم '' پڑھنا چنانچہ رات ہوئی اور وہ اسے لے گئے تو وہ دل میں حضرت جنیدؒ کا انکار کر رہا تھا تاہم جب کچھ وقت گذرا تو اس نے تجربہ کے طور پر تین مرتبہ لاحول پڑھ لیا جونہی اس نے یہ پڑھا وہ سب چیخنے لگے اور بھاگ گئے اور اس نے اپنے آپ کو ایک کوڑے کے

ڈھیر میں بیٹھا ہوا پایا کہ چند مردار جانوروں کی ہڈیاں اس کے گرد پڑی ہوئی تھیں وہ اپنی خطا پر واقف ہو گیا اور توبہ کی طرف متوجہ ہوا اور دوبارہ صحبت اختیار کر لی"...... مرید کیلئے تنہائی سے زیادہ کوئی بڑی آفت نہیں اور صوفیہ کی صحبت کیلئے شرط یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا درجہ پہچانے یعنی بوڑھوں کے ساتھ عزت وادب کا معاملہ کرے ہم جنسوں کے ساتھ عشرت کی زندگی گزارے اور بچوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے...... چنانچہ بوڑھوں کو اپنے باپ کے درجہ میں رکھے، ہم جنسوں کو اپنے بھائی کے درجہ میں اور بچوں کو اپنے بیٹوں کے درجہ میں رکھے اور برائی سے برات کریں حسد سے پرہیز کریں کینہ سے اعراض کریں اور کسی کو بھی نصیحت کرنے سے دریغ نہ کرے، صحبت میں ایک دوسرے کی غیبت کرنا، خیانت کا ارتکاب کرنا اور ایک دوسرے کی بات ماننے سے انکار کرنا ہرگز جائز نہیں کیونکہ جب شروع سے ہی یہ صحبت حق تعالیٰ کیلئے ہے تو ہونا یہ چاہئے کہ بندے سے جو بھی قول اور فعل ظاہر ہوا اس کو رد نہ کریں اور مصنف (شیخ ہجویری) کہتے ہیں کہ میں نے شیخ المشائخ حضرت ابو القاسم گورگانیؒ سے دریافت کیا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا "یہ کہ صحبت کے اندر تو اپنا حصہ نہ مانگے کیونکہ صحبت کی تمام آفات یہی ہیں کہ ہر شخص اس سے اپنا حصہ طلب کرتا ہے اور حصہ مانگنے والے کیلئے صحبت کی بجائے تنہائی زیادہ بہتر ہے اور جب اپنے حصے کو چھوڑ کر اپنے ساتھی کے حصے کی رعایت کرے تو صحبت میں یہی راہ صواب پر ہے......

ایک درویش بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ لے کر کوفہ سے روانہ ہوا تو راستہ میں حضرت ابراہیم خواصؒ کو پایا۔ میں نے ان سے صحبت میں قبول کرنے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے فرمایا دیکھو! صحبت کیلئے ایک امیر ہونا چاہئے اور ایک فرمانبردار! تم کیا چاہتے ہو امیر تم ہو گے یا میں؟ میں نے عرض کیا امیر آپ ہو جائیں تو آپ نے فرمایا تو اب تم میرے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا میں نے کہا ٹھیک ہے' درویش کہتے ہیں کہ جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے مجھے کہا "یہاں بیٹھ جاؤ" میں نے ایسا ہی کیا۔ تو آپ نے کنویں

سے پانی کھینچا وہ ٹھنڈا تھا چنانچہ آپ نے ایندھن فراہم کیا اور آگ جلائی اور مجھے تپش پہنچائی اور میں جس کام کے کرنے کا ارادہ کرتا آپ مجھے بیٹھ جانے کا حکم دے دیتے اور کہتے میری فرمانبرداری کرو! جب رات ہوئی تو بڑی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آپ نے اپنی گدڑی نکالی اور اپنے بازوؤں پر ڈالے صبح تک میرے سر پر کھڑے رہے اور میں شرمندہ ہوتا رہا لیکن اپنی شرط کے مطابق کچھ بھی نہ کر سکتا تھا چنانچہ جب صبح ہوئی تو میں نے کہا شیخ آج امیر میں ہوں گا''

آپ نے کہا درست ہے'' جب ہم منزل پر پہنچے تو آپ نے وہی کام اور خدمت سرانجام دینا شروع کر دی میں نے کہا دیکھئے آپ میرے حکم سے باہر نہ نکلیں آپ نے جواب دیا'' فرمان سے تو وہ شخص باہر نکلتا ہے جو اپنی خدمت اپنے امیر کے سپرد کر دے یہاں تک کہ مکہ مکرمہ پہنچتے تک آپ نے اسی طرح میرے ساتھ صحبت قائم رکھی مکہ پہنچ کر میں شرم کے مارے آپ سے بھاگ گیا حتی کہ منیٰ میں مجھے دیکھ لیا اور فرمایا'' اے بیٹے تیرے لئے یہ ضروری ہے کہ درویشوں کے ساتھ اس طرح صحبت اختیار کرو جس طرح میں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ'' صحبت رسول الله صلی الله علیه وسلم مشومنین و خدمته فوالله ما قال لی اف قط وما قال لی بشئ فعلتُ لم فعلت کذا ولا بشئ لَمْ افعله لم لا فعلت کذا '' (میں دس سال رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا اور آپ کی خدمت کی اللہ کی قسم آپ نے کبھی مجھے اف تک نہیں کی اور نہ میرے کسی کام پر آپؐ نے کہا کہ یہ تم نے کیوں کیا اور نہ کوئی کام سرانجام نہ دینے پر آپ نے یہ کہا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا) پس تمام درویش دو طرح کے ہیں ایک مقیم اور دوسرے مسافر! مشائخ کا طریقہ یہ ہے کہ مسافر حضرات کو چاہئے کہ وہ مقیم حضرات کو اپنے اوپر فضیلت دیں کیونکہ یہ تو اپنے حصہ کو حاصل کرنے جا رہے ہیں اور مقیم حضرات خدمت خلق

میں بیٹھے ہوئے ہیں اس لئے کہ مسافروں میں طلب کی علامت ہوتی ہے جب کہ مقیم حضرات میں پا چکنے کی نشانی پس جولوگ حاصل کر چکے اور بیٹھ گئے انہیں ان پر فضیلت ہے جو ابھی طلب و جستجو میں ہیں اور مقیم حضرات کو بھی چاہئے کہ مسافروں کو اپنے اوپر ترجیح دیں اس لئے کہ وہ خود علائق دنیا والے ہیں کہ مسافران علائق سے منفرد اور مجرد ہیں اور مسافر حضرات تلاش میں مصروف ہیں جب کہ مقیم دنیا میں توقف کئے ہوئے ہیں اور بوڑھوں کو چاہئے کہ جوانوں کو اپنے اوپر فضیلت دیں کیونکہ وہ زمانہ قریب میں ہی دنیا میں وارد ہوئے ہیں اور ان کے گناہ بھی ابھی کم ہیں اور نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ بوڑھوں کو اپنے اوپر ترجیح دیں کیونکہ وہ عبادت میں سبقت لے جانے والے اور خدمت میں مقدم ہیں اگر ایسا ہو گیا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے تو دونوں گروہ ایک دوسرے کی وجہ سے نجات پا جائیں گے ورنہ ہلاک ہو جائیں گے۔

فصل

آداب کی حقیقت، نیک خصائل کا جمع ہو جانا ہے دستر خوان کو اسی لئے ''مادبہ'' کہتے ہیں کہ اس پر جو چیز آتی ہے سب خیر ہی ہوتی ہے ''فالذی اجتمع فیه خصالُ الخیر فهو ادیب '' (پس جس آدمی میں بھلائی کی خصلتیں جمع ہو جائیں وہ ادیب (ادب والا) ہے لوگوں کے عرف عام میں ادیب اس کو کہتے ہیں جو لغت اور صرف و نحو کا علم جانتا ہو، لیکن گروہ صوفیہ کے نزدیک ''الادب الوقوف معَ المستحسنات ومعناه اِنْ تعامِلَ للّٰه فی الادب سراً وّعلانیةً واِذَا کنْتَ کذالک کُنتَ ادیباً واِن کنتَ عجمیا واِن لَمْ تکن کذالک تکون علی ضدّه '' (ادب نام ہے اچھے کردار کو اپنانے کا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ تو پوشیدہ اور علانیہ طور پر اللہ کے ساتھ ادب کا معاملہ کرے، اگر تو ایسا ہو گیا تو تو ادیب ہے اگرچہ تو عجمی ہی کیوں نہ ہو اور اگر تو اس طرح نہ ہو سکا تو اس کے برعکس ہے) کیونکہ

معاملات میں عبارت اور زبان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور تمام احوال میں اچھے عمل کرنے والے بےعمل عالموں سے زیادہ افضل ہوتے ہیں؟ مشائخ میں سے ایک بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ ادب کی شرط کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا میں تجھے ایک بات کے اندر اس کا جواب دیتا ہوں جو میں نے سنی ہے اور وہ یہ ہے کہ ادب اسے کہتے ہیں کہ جب تو بولے تو تمہاری گفتگو سچائی پر مبنی ہو اور اگر عمل کرے تو تیرا عمل حق کے مطابق ہو اور سچی گفتگو اگرچہ تلخ ہوتی ہے لیکن اچھی وہی ہے اور اچھا عمل اگرچہ دشوار ہوتا ہے لیکن بہتر وہی ہوتا ہے پس جب تو کچھ کہے تو تجھے اپنی گفتار میں صداقت پر قائم ہونا چاہئے اور جب تو خاموش رہے تو تجھے اپنی خاموشی میں بھی حق پر قائم رہنا چاہئے۔

لمع کے مصنف حضرت شیخ ابونصر سراجؒ نے اپنی کتاب میں آداب کے متعلق بڑا اچھا فرق بیان کیا ہے چنانچہ آپ کہتے ہیں۔ آداب میں لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں پہلے اہل دنیا کہ ان کے ہاں فصاحت و بلاغت، حفظ علوم، بادشاہوں کے قصوں اور اشعار وغیرہ کو یاد کر لینے کا نام ادب ہے دوسرے اہل دین ہیں کہ ان کے نزدیک نفس کی ریاضت اعضاء کی تادیب شرعی حدود کی نگہداشت اور شہوتوں کو ترک کرنے کا نام ادب ہے جبکہ تیسرے اہل حدیث ہیں کہ ادب ان کے نزدیک دل کی طہارت بھید کی اعانت ایفا عہد وقت کی نگہداشت پراگندہ خیالات کو کم کرنے۔ مقام طلب میں نیک کردار اور اوقات حضور ومقامات قرب میں اچھے عمل کا نام ہے یہ کلام بڑا ہی جامع ہے اور اس کی تفصیل اس کتاب میں پھیلی ہوئی ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اقامت میں آداب توفیق

جب کوئی درویش سفر کی بجائے اقامت اختیار کرے تو اس کیلئے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اس کے ہاں آئے تو اس کی حرمت کا لحاظ رکھتے ہوئے خندہ پیشانی

کے ساتھ اسے پیش آئے،اس کو عزت کے ساتھ قبول کرے اور یوں جانے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں میں سے ایک ہے اور اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے ساتھ کیا تھا یعنی جو کچھ گھر میں موجود ہو بلا تکلف سامنے پیش کردیئے جیسا کہ حق تعالیٰ نے بیان کیا''فَجَاءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ''(پس آپ موٹا تازہ بھنا ہوا بچھڑا لے آئے) اور ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ نہ پوچھے کہ تم کس طرف سے آئے ہو اور کہاں جانا ہے یا تمہارا نام کیا ہے؟ پس ان کے آنے کو حق تعالیٰ کی طرف سے اور ان کا جانا حق تعالیٰ کی طرف اور ان کا نام بندہ خدا سمجھے اور غور کرے کہ اس کی راحت خلوت میں ہے یا صحبت میں! اگر اس کو تنہائی پسند ہے تو کسی تکلف کو بروئے کار لائے بغیر محبت و معاشرت کے مطابق اس کے ساتھ صحبت اختیار کرے اور جب رات کو وہ اپنا سر سرہانے پر رکھ لے تو مقیم کو چاہئے اپنے ہاتھوں اس کے پاؤں دبائے،اگر وہ ایسا نہ کرنے دئے اور کہے کہ مجھے عادت نہیں ہے تو اسے چھوڑ دے تاکہ اس پر گراں نہ گزرے،دوسرے روز صاف ستھرے غسل خانہ میں اسے لے جائے اور غسل خانہ کی گندی جگہوں سے اس کے کپڑوں کو بچائے،کوئی اجنبی خادم اس کی خدمت پر مامور نہ کرے،اور اس کی خدمت اس پورے اعتماد کے ساتھ کرے تاکہ اس کے پاک کرنے سے وہ شخص تمام آفات سے پاک ہو جائے کہ اس کی پشت کھجلائے اس کے گھٹنوں پاؤں کے تلوؤں اور ہتھلیوں کی مالش کرے البتہ اس سے زیادہ ضروری نہیں ہے اور اگر اس مقیم میں نیا لباس بنوا کر دینے کی استطاعت ہو تو ہرگز کوتاہی نہ کرے اور اگر استطاعت نہ ہو تو تکلیف بھی نہ کرے بلکہ اس کے انہی کپڑوں کو پاک وصاف کردے تاکہ وہ غسل خانہ سے باہر آئے تو انہیں پہن لے۔

جب وہ غسل خانہ سے واپس اپنی آرام گاہ میں پہنچ جائے اور دو تین روز نہ گذرے ہوں تو اگر اس شہر میں کوئی بزرگ ہو یا طالبان حق کی جماعت ہو یا ائمہ اسلام میں سے کوئی امام ہو تو اس مسافر سے کہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کی زیارت کرآئیں۔اگر وہ ساتھ چلے

تو ٹھیک اور اگر وہ کہے کہ "جی نہیں چاہتا تو اصرار نہ کرے کیونکہ طالبان حق تعالیٰ پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ان کا دل خود ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ حضرت ابراہیم خواصؒ سے جب لوگوں نے عرض کی کہ اپنے سفروں کے عجائب میں سے کوئی واقعہ ہمیں سنائیے تو آپ نے بیان کیا کہ سب سے عجیب واقعہ تو وہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک دفعہ میرا ہم نشین ہونا چاہا لیکن میں نے اسے قبول نہ کیا کیونکہ میرے دل نے اس کی اجازت نہ دی اور اس وقت میں نے مناسب نہ سمجھا کہ حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کیلئے میرے دل میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت پیدا ہو کہ مجھے اس کا لحاظ کرنا پڑے...... البتہ یہ درست نہیں کہ وہ میزبان مقیم اس مسافر کو اہل دنیا کی سلام گوئی ان کی مہمانوں اور بیمار پرسیوں کیلئے لے جائے اور جس مقیم کو مسافروں سے یہ طمع ہو کہ ان کی اپنی گدائی کیلئے آلہ بناتے ہوئے ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف پھراتا رہے اس کیلئے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ بالکل ان کی خدمت ہی نہ کرے کیونکہ اس طرح کرنا ان کے جسم پر ذلت و رسوائی کو ڈالنے کے مترادف ہے...... مجھ علی بن عثمان ہجویریؒ کو خود اپنے سفروں میں اس سے زیادہ کوئی مشقت اور تکلیف در پیش نہیں آئی کہ جاہل خادم اور ناپاک مقیم کبھی کبھی مجھے اپنے ساتھ لے لیتے اور ایک سردار کے گھر سے دوسرے زمیندار کے گھر لئے پھرتے میں دل میں اس کو بہت ناگوار محسوس کرتا اور مجبوراً ان کے ساتھ چلا جاتا اور بظاہر ہر درگذر سے کام لیتا اور مقیم لوگ میرے ساتھ جس طرح کی بے قاعدگیاں کرتے رہے میں انہیں معاف کرتا ہوں، اگر کسی وقت میں مقیم ہو گیا تو مسافروں کے ساتھ ہرگز ایسا نہ کروں گا۔ اور بے ادب لوگوں کی صحبت میں اس سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا کہ ان کی حرکتیں تجھے ناپسند ہوں تو خود ان کا ارتکاب نہ کرے۔ پھر اگر وہ مسافر درویش خوش ہو اور چند روز مزید صحبت میں رہنا چاہے اور اپنی کسی ضرورت کا اظہار کرے تو مقیم کیلئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اس کی ضرورت پوری کر دے یعنی فی الحال جو کچھ اس کو چاہئے وہ حاضر کر دے اور اگر یہ

مسافر چھوٹا مدعی اور بے ہمت ہو تو مقیم کو بھی اس کے ساتھ بے ہمت اس کی محال خواہشات میں اس کا تابع نہیں ہو جانا چاہئے، کیونکہ دنیا سے کنارہ کش لوگوں کا یہ طرز عمل نہیں ہوتا اور اگر اس کی کوئی ضرورت بازار یا شاہی دربار سے متعلق ہو تو گریز کرنا چاہئے کیونکہ تارک الدنیا حضرات کا بادشاہوں کے ہاں کیا کام ہے؟ کہتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ اپنے اصحاب کے ہمراہ ریاضت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مسافر مہمان آ گیا آپ نے اس کیلئے تکلف کیا اور کھانا اس کے سامنے پیش کیا وہ کہنے لگا مجھے تو ان کے علاوہ فلاں فلاں چیز درکار ہے۔ آپ نے اس کیلئے تکلف کیا اور کھانا اس کے سامنے پیش کیا۔

آپ نے فرمایا تمہیں تو مسجدوں اور خانقاہوں کی بجائے بازار میں جانا چاہئے تھا۔ کیونکہ تم ایک بازاری آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ایک دفعہ میں درویشوں کے ہمراہ دمشق سے حضرت ابن المعلا کی زیارت کیلئے گیا وہ رملہ نامی گاؤں میں رہائش پذیر تھے راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے کہا ہم سب کو اپنے اپنے دل میں کسی درپیش واقع کا خیال رکھنا چاہئے۔ تاکہ وہ بزرگ ہمارے باطن سے ہمیں مطلع کریں اور ہمارا وہ مسئلہ بھی حل ہو جائے، چنانچہ میں نے اپنے آپ سے کہا ''مجھے تو ان سے حسین بن منصورؒ کی منظوم مناجات چاہئے دوسرے نے کہا'' میں ان سے اپنی تلی کے تندرست ہو جانے کی دعا کرانا چاہتا ہوں اور تیسرے نے کہا میں ان سے صابونی حلوے کا خواہش مند ہوں جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کے حکم سے ایک کاغذ پر حسین بن منصورؒ کی مناجات کے اشعار لکھے ہوئے پڑے تھے آپ نے وہ میرے سامنے رکھ دیئے پھر ایک دوسرے کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو اس کی مرض تلی ختم ہو گئی اور بعد ازاں اس تیسرے سے کہا صابونی حلوہ تو شاہی غلاموں اور نوکروں کی خوراک ہے تم اولیاء کا لباس پہنے ہوئے ہو اولیاء کا لباس پہننے والوں کو شاہی غلاموں کا سا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے لہذا ان میں سے کسی ایک چیز کو اختیار کر...... خلاصہ یہ کہ مقیم پر اس کی ضروریات کے علاوہ کوئی چیز واجب نہیں ہے کیونکہ وہ حق

تعالیٰ کی رعایت میں مشغول ہے اور لذتوں کو چھوڑتے ہوئے ہے البتہ اگر کوئی اپنی لذتوں کے حصول پر قائم ہو تو محال ہے کہ دوسرا اس کی لذتوں کے حصول میں اس کے ساتھ موافقت کرے، کیونکہ درویش لوگ ایک دوسرے کے راہبر ہوتے ہیں راہزن نہیں چنانچہ اگر کوئی اپنے نفس کی لذتوں پر قائم رہے تو دوسرے کو چاہئے کہ اس کی مخالفت کرے اور جب وہ نفسانی لذتوں کو چھوڑ دے تو یہ اس کی راحت میں اس کی موافقت کرے تاکہ دونوں حالتوں میں یہ اس کیلئے راہبر ہو نہ کہ راہزن!

احادیث میں مشہور ہے کہ پیغمبر ﷺ نے حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا تھا یہ دونوں اہل صفہ اور ارباب باطن کے سردار اور پیشوا تھے ایک دن حضرت سلمان فارسیؓ سے ملنے ان کے گھر تشریف لائے تو ان کی اہلیہ نے حضرت سلمانؓ کے سامنے شکایت کی کہ آپ کے یہ بھائی نہ دن کو کچھ کھاتے ہیں اور رات کو سوتے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا کوئی کھانے والی چیز تو لے آؤ وہ لائیں تو آپ نے حضرت ابوذرؓ سے کہا بھائی کھانے میں میرے ساتھ موافقت کرنی چاہئے کیونکہ یہ روزہ تم پر فرض تو نہیں ہے حضرت ابوذرؓ نے آپ کے ساتھ موافقت نہ کی اور جب رات ہوئی تو حضرت سلمانؓ نے کہا بھائی تمہیں چاہئے کہ نیند میں بھی میری موافقت کرے کیونکہ "اِن بحسدک علیک حقا وان لزوجک علیک حقاً وان لربک عیک حقا" (تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے اور جب حضرت ابوذرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا "ہم بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو کچھ کل سلمان نے کہا تھا کہ "ان بحسدک علیک حقا" چنانچہ جب حضرت ابوذرؓ نے اپنے نفس کی لذات کو چھوڑ رکھا تھا تو حضرت سلمانؓ نے بھی آپ کے معاملات پر اقامت کی اور اپنے اوراد کو چھوڑ دیا۔ اسی اصل پر جو کچھ بھی تم کرو گے وہ صحیح اور مستحکم ہی ہوگا۔ میں ایک دفعہ عراق میں دنیا کی طلب اور اس کے فنا کرنے میں جرات کر رہا تھا اور مجھ پر بہت سا قرض ہو گیا تھا اور حشوی

لوگ جس کو ضرورت ہوتی میرے پاس بھیج دیتے تھے اور میں ان کی ضروریات کے حصول میں تکلیف درنج میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ وقت کے سادات میں سے ایک سید نے مجھے لکھا کہ اے بیٹے دیکھو تو سہی کہ اپنے دل کو خدا تعالیٰ کی یاد میں ہمہ وقت مشغول رکھنے کی بجائے خواہش پرست لوگوں کے کاموں میں مشعول رکھے ہوئے ہو۔ اگر تم اپنے دل سے زیادہ پیارا کسی کا دل پاتے ہو پھر تو اس کے دل میں اپنے دل کو مشغول رکھنا تمہارے لئے درست ہے ورنہ ان کے کاموں سے ہاتھ کھینچ لے کہ بندگان خدا کیلئے خدا خود ہی کافی ہے۔ اسی وقت مجھے اس پیغام کی وجہ سے فراغت حاصل ہوگئی۔ یہ تھے اختصار کے طور پر مقیم لوگوں کے مسافروں کی صحبت میں رہنے کے احکام!

سفر میں آداب صحبت

اور جب کوئی درویش اقامت چھوڑ کر سفر اختیار کرے تو اس کیلئے ادب کی شرط ہے کہ اولاً تو وہ سفر محض رضائے الٰہی کیلئے کرے نہ کہ خواہشات کے اتباع میں پھر جس طرح کہ ظاہری طور پر سفر کرتا ہے باطنی طور پر بھی اپنی خواہشات سے گریز کا راستہ اختیار کرے ہمیشہ باوضو رہے اور اوراد وظائف کو ضائع نہ کرے اور اس سفر سے اس کی مراد حج بیت اللہ یا جہاد یا کسی مقدس مقام کی زیارت یا فائدے کا جستجو یا کسی بزرگ شیخ اور قبر کی زیارت ہونا چاہیے ورنہ وہ اس سفر میں خطا دار قرار پائے اور اس کیلئے سفر میں گدڑی۔ جائے نماز، لوٹا رسی جوتا یا نعلین اور لاٹھی کے بغیر چارہ نہیں تاکہ گدڑی سے اپنا ستر ڈھانپے مصلے، پر نماز ادا کرے لوٹے سے وضو کرے لاٹھی کے ذریعہ نقصان دہ چیزوں کو اپنے سے دور کرے نیز اس میں اور بھی فوائد ہیں اور جوتے یا نعلین وضو کی حالت پاؤں میں پہن لے تاکہ مصلے پر اس حالت میں آ جائے، اگر کوئی شخص اس سے زیادہ سامان اپنے پاس رکھے اور سنت کے اتباع میں مثلاً کنگھی، ناخن گیر، سوئی اور سرمہ وغیرہ ساتھ لے لے تو یہ بھی جائز ہے اگر کوئی شخص

اس سے زیادہ سامان زیب وزینت اپنے ہمراہ لیتا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ کس مقام میں ہے اگر وہ مقام ارادت میں ہے تو ان میں سے ہر چیز اس کیلئے ایک رکاوٹ ایک بت، ایک قید اور ایک حجاب اور اس کے نفس کا سامان اظہار رعونت ہوگا اور اگر وہ تمکین و استقامت کے مقام میں ہوا تو اس کیلئے یہ سامان اور اس سے زیادہ سامان بھی ساتھ رکھنا درست ہوگا۔ میں نے فارس میں شیخ ابو مسلم غالب الفارسیؒ سے سنا ہے کہ انہوں نے کہا "میں ایک دن شیخ ابوسعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمدؒ کی زیارت کے ارادہ سے حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک تخت پر چار تکیوں کے درمیان پاؤں پر پاؤں عجیب انداز میں رکھے لیٹے ہوئے تھے اور ایک قیمتی مصری چادر اوڑھ رکھی تھی جبکہ میں نے ایسے کپڑے پہن رکھے تھے جو میل کچیل سے چمڑے کی طرح سخت ہو گئے تھے اور میرا جسم تکلیف اور پگھلا ہوا تھا اور تقریباً زرد پڑ چکا تھا ان کو دیکھنے سے میرے دل میں انکار سا پیدا ہو گیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا یہ بھی درویش ہے اور میں بھی درویش ہوں جبکہ یہ اتنے آرام میں ہے اور میں اتنی تکلیف میں۔ پھر کہتے ہیں کہ وہ فوراً میرے باطن پر مطلع ہو گئے اور میری نخوت کو دیکھتے ہوئے فرمایا اے ابو مسلم تم نے کس دیوان میں یہ دیکھا ہے کہ خود بین انسان درویش ہوتا ہے میں نے چونکہ صرف حق کو ہی دیکھا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے مجھے تخت نشین کر دیا اور تو محض اپنی ذات کو دیکھتا ہے اس لئے حق تعالیٰ تجھے نیچے ہی رکھتے ہیں۔ میرا حصہ تو مشاہدہ حق ہے اور تیرا نصیب محض مجاہدہ اور مقامات طریقت کے یہ دونوں الگ الگ مقام ہیں حق تعالیٰ ان سے پاک ہے اور درویش ان مقامات سے فانی اور کنارہ کش ہوتا ہے شیخ ابو مسلم کہتے ہیں یہ سن کر میرے ہوش گم ہو گئے اور جہان مجھ پر تاریک ہو گیا جب میری ہوش ٹھکانے آئی میں نے اپنے خیال سے توبہ کی او انہوں نے میری معذرت قبول کر لی اس وقت میں نے عرض کی اے شیخ مجھے اجازت مرحمت فرمائیے تاکہ میں یہاں سے چلا جاؤں کیونکہ میری حالت آپ کے مقام کو دیکھنے کی متحمل نہیں، آپ نے فرمایا "صَدَقتَ یا اباسملم" (ابو مسلم! تم

نے سچ کہا اور تمثیل کے طور پر یہ شعر پڑھا ؎

آنچہ گوشم فتوانست شنیدن بخبر

ہمہ چشم بعیان یکسرہ دید آں بصر

(میری آنکھ نے وہ سب کچھ ظاہری طور پر دیکھ لیا جو کچھ خبر کے طور پر میرا کان نہ سن سکا تھا پس مسافر کو چاہئے کہ سنت کی حفاظت کرتا رہے اور جب کسی مقیم کے پاس پہنچے تو عزت و احترام کے ساتھ اس کے یہاں داخل ہو اور سلام کہے اور پہلے بایاں پاؤں اپنی جوتی سے باہر نکالے کیونکہ پیغمبر علیہ السلام کی سنت یہی ہے اور جب پاؤں اندر ڈالنے لگے تو پہلے دایاں پاؤں دھوئے پھر بایاں پاؤں اور نفل تحیۃ کی دو رکعت ادا کرے اور اب درویشوں کے حقوق کی رعایت میں مشغول ہو جائے اور کسی حال میں بھی مقیم لوگوں پر اعتراض نہ کرنا چاہئے اور نہ ہی کسی کے ساتھ معاملات میں زیادتی کرے اور نہ ہی اپنے سفر کی سختیوں کو ان کے سامنے بیان کرے اور نہ ہی اپنی معلومات یا حکایات و روایات بیان کرے کیونکہ یہ سب کچھ اپنی رعونت کا اظہار ہوگا اور چاہئے کہ جاہلوں کا رنج برداشت کرے اور رضائے الٰہی کیلئے ان کا بوجھ اٹھائے کہ اس میں بڑی برکات ہیں اور اگر مقیم حضرات یا ان کا کوئی خادم کوئی حکم کرے اور اس کو سلام کرنے یا کسی کی زیارت کیلئے چلنے کی دعوت دیں تو جہاں تک ہو سکے انکار نہ کرے۔ تاہم دل سے اہل دنیا کی رعایت کرنے سے منکر رہے اور ان بھائیوں کے ان افعال کیلئے کوئی عذر اور کوئی تاویل ڈھونڈتا رہے کہ جو کچھ بھی رنج ہے خود برداشت کرے اور ان کے دل پر اس رنج کو نہ ڈالے اور خود ان کو کسی راحت طلبی کیلئے بادشاہوں کے درباروں میں نہ لے جائے اور مسافر و مقیم سب کو صحبت میں حق تعالیٰ کی رضا مطلوب ہونی چاہئے اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن اعتقاد رکھنا چاہئے اور ایک دوسرے کو ایک جیسا سمجھنا چاہئے اور کسی کے پیچھے اس کی غیبت نہ کرنی چاہئے کیونکہ طالب حق کیلئے کسی کی برائی کرنا بہت ہی برا ہے اس لئے کہ محقق لوگ فعل کے دیکھنے میں فاعل کو دیکھتے ہیں اور

جب مخلوق جیسی بھی ہے خداوند تعالیٰ کی ہی پیدا کردہ ہے تو وہ اگر چہ معیوب ہو یا بے عیب اور محجوب ہو یا مکاشف اس کے فعل پر جھگڑا اس کے فاعل کے ساتھ خصومت کرنا ہے اور جب نگاہ آدمیت سے مخلوق میں دیکھے گا تو ہر ایک سے باز رہے گا اور جان لے گا کہ تمام مخلوق مجبور، مقہور مغلوب اور عاجز ہے اور کوئی بھی اس حالت کے علاوہ کسی حالت پر نہیں ہوسکتا جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے اور مخلوق کو حق تعالیٰ کی ملکیت میں کوئی حق تصرف حاصل نہیں اور نہ ہی حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کو کسی کی ذات تبدیل کرنے کا اختیار ہے۔ وباللہ التوفیق۔

کھانے کے آداب

جان لو کہ آدمی کیلئے غذا کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ کھائے پیئے بغیر طبیعتوں کی ترکیب کو قائم نہیں رکھا جاسکتا تاہم مروت کا تقاضہ یہ ہے کہ کھانے پینے کی طلب میں مبالغہ نہ کرے اور دن رات اپنے آپ کو لقمے کی سوچ میں ہی مصروف نہ رکھے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں "مَنْ کَانَ ھمتہ' مَایَدْخل فی جوفِہ کان قیمتہ' مَا یخرج مِنہ' "(جس شخص کی مصروفیت صرف اس چیز میں ہو جو اس کے پیٹ میں داخل ہوتی ہے تو اس کی قیمت صرف وہ ہے جو پیٹ سے نکلتا ہے) راہ حق کے مرید کیلئے زیادہ کھانے سے زیادہ کوئی چیز نقصان دہ نہیں، اس سلسلے میں اسی کتاب کے اندر میں بھوک کے بیان میں کچھ بیان کر چکا ہوں باقی یہاں اتنا ہی مناسب ہے۔ میں نے حکایات میں پایا ہے کہ لوگوں نے حضرت بایزیدؒ سے دریافت کیا کہ آپ بھوک کی بہت زیادہ تعریف کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا اس لئے کہ اگر فرعون بھوکا ہوتا تو "ربکم الاعلی" کا دعویٰ ہرگز نہ کرتا۔ قارون اگر بھوکا ہوتا تو ہرگز سرکشی اختیار نہ کرتا اور ثعلبہ جب تک بھوکا تھا تمام لوگ اس کی تعریف کرتے تھے لیکن جب سیر ہو گیا تو اس نے منافقت کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا ہے" ذَرْھُمْ یَاکُلُوْا وَیَتَمَتَّعُوْ وَیُلْھِھِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ "(انہیں چھوڑ دیجئے کہ کھاتے

رہیں، دنیا سے فائدہ حاصل کرتے رہیں اور اپنی امیدیں دراز کرلیں، پھر عنقریب جان لینگے) اور نیز فرمایا ''وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّھُمْ ''(جو لوگ کافر ہیں وہ دنیا میں فائدہ حاصل کرتے ہیں اور کھاتے ہیں جس طرح جانور کھاتے ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے) حضرت سہل بن عبداللہؒ کہتے ہیں کہ میں شراب سے بھرے ہوئے پیٹ کو اس پیٹ سے زیادہ اچھا سمجھتا ہوں جو حلال کھانے سے بھرا ہوا ہو'' لوگوں نے پوچھا ''یہ کیوں؟'' تو فرمایا ''اس لئے کہ جب پیٹ شراب سے پر ہوتا ہے تو عقل سو جاتی ہے شہوت کی آگ مر جاتی ہے اور لوگ اس کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ ہو جاتے ہیں لیکن جب یہ حلال کھانے سے بھرتا ہے تو فضول آرزوئیں کرتا ہے شہوت زور پکڑتی ہے اور نفس اپنا حصہ حاصل کرنے کیلئے سر اٹھاتا ہے کہ مشائخ رحمہم اللہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں ہی کہہ رکھا ہے کہ ''اکلھم کاکل المرضی ونومھم کنوم الغرقی و کلامھم ککلام الثکلی ''(ان کا کھانا بیماروں کا سا کھانا، ان کی نیند غرق شدہ کی نیند جیسی اور ان کی گفتگو ان عورتوں کی سی ہے جن کا بچہ مر گیا ہو)

پس کھانے کے آداب کی ایک شرط یہ ہے کہ تنہا نہ کھائے اور جو کچھ کھائیں ایک دوسرے پر اس میں ایثار کریں کہ پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ''شر الناس من اکل وحدہٗ وضرب عبدہ و منع رفدہ ''(سب سے برا وہ انسان ہے جو اکیلا کھائے، اپنے غلام کو پیٹے اور اپنی ایلچی کو روکے) اور جب دستر خوان پر بیٹھیں تو خاموش نہ بیٹھیں، خدا کا نام لے کر کھانے کی ابتداء کریں اور چیزوں کو اوپر نیچے نہ کریں کہ اس سے احباب کو کراہت ہوتی ہے، پھر پہلے نمکین لقمہ اٹھائیں اور اپنے رفیق طعام کے ساتھ انصاف کریں..... حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ اس آیت کریمہ ''اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ''(بلاشبہ اللہ تعالیٰ عدل واحسان کا حکم دیتے ہیں) کا کیا معنی ہے؟ تو آپ نے فرمایا عدل یہ ہے کہ کھانے میں اپنے شریک ساتھی کے ساتھ انصاف

کرے اور احسان یہ ہے کہ اس کو کھانے میں اپنے سے بہتر سمجھے"...... میرے شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے ہر وقت کھانے کی سوچ میں مبتلا رہنا ہے" پھر کھانا ہاتھ سے کھانا چاہئے اور اپنے لقمہ کے علاوہ کسی چیز پر نظر نہ رکھے، اور کھانا کھانے کے دوران پانی کم پیئے اور وہ بھی صحیح پیاس کے وقت، اور جب پیئے تو اتنا تھوڑا پیئے کہ اس سے بس جگر تر ہو جائے اور لقمہ بہت بڑا نہ بنائے، اور کھانے اور چبانے میں جلدی نہ کرے کہ یہ بدہضمی کا باعث ہوتا ہے اور خلاف سنت بھی ہے اور جب کھانے سے فارغ ہو جائے تو الحمد للہ کہے اور ہاتھ دھولے! اور اگر پوری جماعت میں سے دو یا تین یا زیادہ آدمی پوشیدہ طور پر کسی دعوت پر چلے جائیں اور وہاں کچھ کھالیں تو بعض مشائخ کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے اور صحبت میں خیانت کے مترادف ہے "اُولٰئِکَ مَایَاکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارُ "(یہ لوگ اپنے پیٹوں میں کھانا نہیں آگ کھا رہے ہیں) اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ اگر کوئی جماعت دعوت کر رہی ہے تو ایک دوسرے کی موافقت میں یہ جائز ہے اور ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ اگر ایک آدمی ہو تو بھی جائز ہے کیونکہ اکیلا ہونے کی صورت میں اس پر انصاف کا اطلاق ہی نہیں، انصاف تو صحبت کی حالت میں لازم آتا ہے چنانچہ جب یہ تنہا ہوگا تو اس وقت حکم صحبت اس سے اٹھ جائے گا اور اس پر اس کی گرفت نہ ہوگی......اور اس مذہب میں مشکل اور اہم ترین اصل یہ ہے کہ کسی درویش کی دعوت رد نہ کرے اور کسی دنیادار کی دعوت قبول نہ کرے اور دنیاداروں کے گھر نہ جائیں اور نہ ان سے کسی چیز کا سوال کریں کیونکہ اس میں اہل طریقت کی کمزوری ہے کہ اہل دنیا درویش کے محرم نہیں ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ کوئی شخص دولت کی کثرت سے دنیادار اور اس کی کمی سے درویش نہیں بن جاتا، بلکہ جو بھی دولتمندی پر فقر کی فضیلت کا قائل ہو وہ دنیادار نہیں ہوتا اگرچہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو اور جو کوئی فقر کا منکر ہو وہ دنیادار ہوتا ہے اگرچہ مجبور و مفلس ہی کیوں نہ ہو اور جب دعوت میں حاضر ہو تو کسی چیز کے کھانے یا نہ کھانے میں تکلیف نہ کرے بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق جو

ملے کھالے اور جب دعوت کرنے والا محرم راز ہوتو یہ بھی درست ہے کہ وہ بچا کھچا اٹھالے جائے اور اگر نامحرم ہوتو اس کے گھر جانا تو جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ کھانا بچایا نہ جائے، کیونکہ حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا ہے کہ "الذلة هی الذلة" (پس خوردہ، بچانا، ذلت ہے۔ وباللہ التوفیق واللہ اعلم بالصواب

چلنے کے آداب

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں "وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" اور خدائے رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری کے ساتھ چلتے ہیں) طالب حق کو اپنا ہر قدم زمین پر رکھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ یہ قدم اپنے نفس کیلئے ہے یا خدا تعالیٰ کیلئے! اگر اپنی ذات کیلئے ہے تو اس پر استغفار کرے اور اگر حق تعالیٰ کی رضا کیلئے ہے تو خدا کا شکر ادا کرے تا کہ حق تعالیٰ کی زیادہ خوشنودی حاصل ہو۔ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دن آپ نے دوائی کھائی ہوئی تھی تو لوگوں نے آپ سے عرض کی کہ تھوڑی دیر اس صحن میں ٹہل لیں تا کہ دوائی کا پورا اثر ظاہر ہو جائے، آپ نے کہا "مجھے شرم آتی ہے کہ اگر قیامت کے دن خدا تعالیٰ مجھ سے سوال کر لیں کہ اپنے نفس کی خواہش کے مطابق کیوں اتنے قدم تم نے رکھے تھے؟ تو میں کیا جواب دوں گا، چنانچہ خداوند بزرگ و جبار کا ارشاد ہے "وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" (اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ کیا کماتے رہے ہیں) پس درویش کو چاہئے کہ بیداری کی حالت میں سر جھکائے ہوئے مراقبے کی صورت میں چلے اور ادھر ادھر ہرگز نہ دیکھے بلکہ بالکل سامنے دیکھتا ہوا چلے، اگر کوئی شخص اس کے سامنے آئے تو اپنے کپڑوں کو سمیٹتا ہوا اپنے آپ کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ مومن اور ان کے کپڑے سب پاک ہی ہوتے ہیں، لہذا یہ چیز اپنی رعونت اور خودنمائی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوگی، البتہ اگر وہ سامنے آنے والا شخص کافر ہو

یا کوئی گندگی اس پر ظاہری طور پر دیکھے تو جائز ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچائے اور دور رکھے۔اور اگر کسی جماعت کے ہمراہ جا رہا ہو تو آگے آگے چلنے کا ارادہ نہ کرے کیونکہ بڑائی چاہنا تکبر کی علامت ہے، نیز بالکل پیچھے چلنے کی کوشش بھی نہ کرے کہ تواضع میں اتنا مبالغہ بھی ایک طرح کا تکبر ہی ہے،اور دن کے وقت اپنے نعلین اور جوتوں کو جہاں تک ممکن ہو ناپاک جگہوں سے بچائے رکھے تاکہ خداوند تعالیٰ اس کی برکت سے رات کے وقت اس کے کپڑوں کو ناپاک ہونے سے بچائے،اور اگر کوئی جماعت یا ایک درویش ہمراہ ہو تو راستے میں کسی کے ساتھ باتیں کرنے کیلئے کھڑا نہ ہونا چاہئے اور یوں اس کو انتظار نہیں کرانا چاہئے اور آہستہ رفتار سے چلے، تیز نہ چلے کہ تیز چلنا حریص لوگوں کی رفتار ہے اور بہت آہستہ آہستہ بھی نہ چلے کہ یہ متکبروں کی چال ہے اور پاؤں زمین پر پورا رکھے،خلاصہ یہ کہ ایک طالب حق کی رفتار اس طرح ہونی چاہئے کہ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو وہ چلتے چلتے ہی کہہ سکے ''اِنِّی ذَاھِبٌ'' اِلٰی رَبِّی سَیَھْدِیْن ''میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں وہ جلد ہی میری رہنمائی کرے گا اور اگر اس کا چلنا ان آداب کے خلاف ہوگا تو اس کی رفتار اس کیلئے وبال ہوگی اس لیے کہ قدموں کا صحیح ہونا سوچوں کے صحیح ہونے سے ہوتا ہے،بس جس کی سوچ مجتمع ہوگی۔حق کی طرف اس کا اقدام اس کی سوچ کے تابع ہوگا......

حضرت بایزیدؒ کے متعلق روایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، مراقبے کے بغیر درویش کی رفتار غفلت کی علامت ہے کیونکہ خود جو کچھ ہے دو قدموں میں حاصل ہو جاتا ہے کہ ایک تو اپنی خواہشات پر قدم اٹھانا ہے اور ایک حق تعالیٰ کے فرمان کے مطابق۔اس ایک قدم کو اٹھائے اور اس دوسرے کی جگہ پر رکھ دیئے.....اور طالب کی روش مسافت کو طے کرنے کی علامت ہوتی ہے جب کہ قرب حق، مسافت سے متعلق نہیں، چنانچہ جب حق تعالیٰ کا قرب، فاصلوں کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تو طالب حق کیلئے محل سکون میں پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کے سوا کیا چارہ ہو سکتا ہے؟......واللہ اعلم التوفیق

سفر وحضر میں سونے کے آداب

جان لو کہ اس معاملے میں مشائخ کا بہت اختلاف ہے، ایک گروہ کے نزدیک یہ ہے کہ مرید حق کیلئے غلبہ نیند کی حالت کے بغیر سونا درست نہیں اور اس وقت سوئے جب خود کو نیند سے باز نہ رکھ سکتا ہو کہ پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے "النوم اخ الموت" (نیند موت کا بھائی ہے) پس زندگانی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور موت ایک مصیبت! لامحالہ نعمت، مصیبت سے زیادہ بزرگ ہے..... حضرت شبلیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا "اطلع الحقُ عَلیَّ فقال مَن فام غَفَلَ وَمَنْ غفلَ حَجب" (اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نگاہ کی اور فرمایا، "جو سو گیا وہ غافل ہو گیا اور جو غافل ہوا وہ حجاب میں ہو گیا) اور ایک گروہ کے نزدیک جائز ہے کہ مرید اپنے اختیار سے سوئے اور حق تعالیٰ کے احکام بجالانے کے بعد نیند میں تکلیف کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "رفع القلم عن ثلاث عن النائم حتی ایقظ وعن الغلام حتی یحتلم و عن المجنون حتی یفیق" (تین آدمیوں سے (حساب کی) قلم اٹھالی گئی ہے، سونے والے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو بچے سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے اور مجنون سے یہاں تک کہ اسے افاقہ ہو جائے) اور جب سوئے ہوئے آدمی سے قلم اٹھالیا جاتا ہے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے تو مخلوق اس کے شر سے محفوظ ہو جاتی ہے اور مخلوق سے اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور اس کا نفس اپنی خواہشات سے معزول ہو چکا ہوتا۔ اور کراماً کاتبین اس کے اعمال لکھنے سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور اس کی زبان دعوؤں سے رکی ہوئی اور جھوٹ وغیبت سے بچی ہوئی ہوتی ہے اور اس کا ارادہ خود بینی اور ریاکاری سے باہر ہو چکا ہوتا ہے کہ "لاَ یَمْلِکُ لِنَفْسِہٖ ضَرًا وَّلاَ مَوْتًاوَلاَ حَیٰوۃً وَّلاَ نُشُوْرًا" (وہ اپنے نفس کیلئے نقصان فائدے، موت، زندگی اور دوبارہ زندہ ہونے کسی چیز کا بھی مالک نہیں ہوتا) اس لئے تو حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں

کہ ''لا شیئُ اشد علی ابلیس مِن نومِ العاصی فاذا نام العاصِی یقول متی ینبة ویقوم حتی یعص اللّٰه ''(ابلیس پر گنہگار آدمی کی نیند سے زیادہ سخت کوئی چیز نہیں کہ گنہگار جب سو جاتا ہے تو ابلیس کہتا ہے یہ کب بیدار ہوگا اور اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا) حضرت جنیدؒ کا حضرت علی بن سہل الاصفہانیؒ سے یہی اختلاف ہے اور اس معاملہ میں وہ خط کافی ہے جو حضرت علی بن سہلؒ نے حضرت جنیدؒ کو لکھا تھا اور وہ امت میں بڑا مقبول ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی بن سہلؒ نے اپنے اس خط میں لکھا تھا کہ ''نیند ایک غفلت اور آرام ہے لہذا اس سے اعراض کرنا چاہئے کہ محبّ کیلئے دن رات میں غفلت اور آرام نہیں ہوتا کیونکہ اگر غنودگی اور غفلت میں رہے گا تو اس حالت میں اس کا مقصود اس سے کھو جائے گا اور اپنے آپ سے اور اپنے معاملہ میں غافل اور حق تعالیٰ سے دور رہ جائے گا جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی تھی کہ ''یا داؤد کذب من اوعی مجتی فاذا جنه اللیل نام عنی ''(اے داؤد علیہ السلام اس نے جھوٹ بولا جس نے میری محبت کا دعویٰ کیا لیکن جب رات آئی تو سو گیا اور میرے ذکر سے غافل ہو گیا۔ اس خط کے جواب میں حضرت جنیدؒ نے تحریر فرمایا جان لو کہ ہماری بیداری ہمارا اپنا معاملہ ہے جب کہ ہماری نیند ہم پر ہمارے خدا کا فضل ہے۔ پس جو کچھ ہمارے اختیار کے بغیر حق تعالیٰ کی طرف سے ہم پر طاری ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ کامل ہے جو محض ہمارے اپنے اختیار سے ہم پر ہوتا ہے ''النوم موھبة من اللّٰه تعالی علی المجین ''نیند، محبّ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے) اس مسئلے کا تعلق صحو اور سُکر کے ساتھ ہے۔ جس کے متعلق پوری طرح ہم کلام کر چکے ہیں، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ حضرت جنیدؒ صاحب صحو بزرگ تھے لیکن اس مقام پر سُکر کو ترجیح دے رہے ہیں شاید اس وقت آپ مغلوب الحال ہوں گے اور ان کی زبان سے اس وقت وہ خود بول رہا ہوگا۔ نیز یہ بھی درست ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو گیا نیند عین صحو ہے اور بیداری عین سکر اس لئے کہ نیند آدمی کی

صفت ہے اور آدمی جب تک اپنے اوصاف کی تاریکی میں ہو صحو کی طرف منسوب ہوتا ہے اور نہ سونا، حق تعالیٰ کی صفت ہے اور جب انسان حق تعالیٰ کی صفت کے سایہ میں ہو سب کی طرف منسوب ہوتا ہے اور مغلوب الحال ہوتا ہے۔ میں نے مشائخ کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ حضرت جنیدؒ کی موافقت میں نیند کو بیداری پر افضل سمجھتے ہیں کیونکہ اولیاء و بزرگان دین اور بہت سے پیغمبروں کا مکاشفہ خواب میں ہی ہوا ہے اور پیغمبر ﷺ نے حق تعالیٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''**ان اللہ تعالیٰ یباھی بالعبد الذی نام فی سجودہ ویقول للملئکۃ انظروا الی عبدی روحہ فی محل النجوٰی وبدنہ علی بساط العبادۃ**'' (بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے پر فخر کرتا ہے جو سجدے کی حالت میں سو جائے اور حق تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں، میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ اس کی روح میرے ساتھ سرگوشی کے محل میں ہے اور ان کا بدن عبادت کے بچھونے پر ہے) نیز پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ''**من نام علی الطھارۃ یوذن لروجہ ان یطوف بالعرش ویسجد اللہ تعالیٰ**'' جو شخص باوضو سو جائے حق تعالیٰ اس کی روح کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ عرش الٰہی کا طواف کرے اور اپنے اللہ کو سجدہ کرے) اور میں نے حکایات میں یہ پایا ہے کہ حضرت شاہ شجاع کرمانیؒ چالیس سال تک بیدار رہے۔ جب ایک رات سوئے تو حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ پھر اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی امید سے سویا کرتے تھے اس معنی میں قیس عامری کہتے ہیں

وانی ال ستنعسُ ومالی نعیسۃ
لَعلَّ خیالاً منک یلقی خیالیاً

(مجھے نیند تو نہیں آ رہی لیکن پھر بھی میں ابھی سو جاؤں گا کہ شاید اس طرح تیرا خیال میرے خیال سے آ ملے)

اور میں نے ایک گروہ کو دیکھا ہے جو حضرت علی بن سہلؒ کی موافقت میں نیند پر

بیداری کوفضیلت دیتے ہیں کیونکہ رسولوں کی وحی اور اولیاء کی کرامات بیداری سے ہی متعلق ہیں...... اور مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں ''لو کان فی النوم خیرا لکان فی الجنة نوم ''(اگر نیند میں کوئی بھلائی یا محبت وقرب الٰہی کیلئے نیند علت ہوتی تو جنت میں بھی نیند ہونی چاہئے تھی) جو کہ قرب الٰہی کا مقام ہے۔ جب بہشت میں نہ حجاب ہوگا اور نہ نیند ہوگی تو ہم جان گئے کہ نیند ایک حجاب ہے اور ارباب لطائف کہتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت میں سوئے تو ان کے بائیں پہلو سے حضرت حوا ظاہر ہوئیں اور آپ کی تمام آزمائشیں حضرت حوا سے ہی تھیں'' اور نیز کہتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا ''اِنِّي اَرٰی فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُکَ '' (میں نے نیند میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کررہا ہوں) تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کی ابا جان ''ھذا جزاء من نام عن حبیه لو لم تنم لما اموت بالذبح '' (جو شخص اپنے محبوب سے غافل ہوکر سوجائے اس کا یہی بدلہ ہے اگر آپ نہ سوتے تو آپ کو ذبح کرنے کا حکم نہ دیا جاتا) آپ کی نیند آپ کو بیٹے سے محروم اور زندگی سے محروم کردے گی تاہم میرا درد تو ایک لحہ کیلئے ہوگا لیکن آپ کا درد ہمیشہ رہے گا حضرت شبلیؒ کے متعلق آتا ہے کہ آپ ہرات نمکین پانی کا ایک پیالہ اور ایک سلائی اپنے سامنے رکھتے تھے، جب نیند آنے لگتی تو ایک سلائی پانی میں ڈبو کر آنکھ میں لگالیتے) اور یوں نیند ختم ہوجاتی)

میں (حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ) نے ایک بزرگ کو دیکھا ہے کہ جب وہ فرائض کی ادائیگی سے فارغ ہوجاتے تو سوجایا کرتے۔ اور شیخ احمد سمرقندیؒ کو میں نے دیکھا جو بخارا میں تھے کہ چالیس سال ہوچکے تھے لیکن رات کو کبھی نہ سوئے تھے البتہ دن کو تھوڑی دیر کیلئے سوجایا کرتے تھے۔ بہرحال اس مسئلے کا رجوع اس بات کی طرف ہوگا کہ اگر کسی کے نزدیک موت زندگی سے زیادہ عزیز ہوتو وہ نیند کو بیداری سے زیادہ عزیز سمجھے گا اور اگر زندگی کو موت سے زیادہ عزیز رکھے گا تو اس کے نزدیک بیداری نیند سے زیادہ عزیز ہونی

چاہیے۔ پس اس چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں کہ تکلف کے ساتھ بیدار رہے بلکہ قیمت اس بات کی ہے کہ حق تعالیٰ اس کو بیدار رکھیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو برگزیدہ کہا اور بلند درجہ پر پہنچایا تھا آپ نہ تو نیند میں تکلف کرتے تھے نہ بیداری میں، تو حق تعالیٰ کا فرمان آیا "قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا" (رات کو عبادت میں قیام کیجئے۔ مگر رات کا تھوڑا حصہ نصف یا اس سے بھی کچھ کم) نیز اس بات کا بھی کوئی جواز نہیں کہ تکلف سے سو جائے بلکہ وقعت اس بات کی ہے کہ حق تعالیٰ خود اس کو سلا دیں، جیسا کہ حق تعالیٰ نے اصحاب کہف کو چن لیا اور اعلیٰ مقام پر پہنچایا اور کفر کا لباس ان کی گردن سے اتار دیا تو وہ نہ نیند میں تکلف کرتے تھے نہ بیداری میں یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے اس پر نیند طاری کر دی اور ان کے اختیار کے بغیر ان کی پرورش کرتا ہے چنانچہ فرمایا "وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ" وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ" (اور تم ان کو بیدار سمجھو گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور ہم ان کی دائیں اور بائیں پہلو پر کروٹ بدلتے ہیں) اور یہ دونوں حالتیں ان کے اختیار کے بغیر ہیں۔ غرضیکہ جب بندہ اس درجے پر پہنچ جائے کہ اس کا اپنا اختیار ختم ہو جائے اور سب سے اس کا ہاتھ منقطع ہو جائے اور اس کا ارادہ غیر سے اعراض کرے تو وہ نیند یا بیداری جس حالت پر بھی ہو عزیز ہی ہوتا ہے۔ پس مرید حق کی نیند کیلئے شرط یہ ہے کہ اپنی ابتدائی عمر کی نیند کو اپنے آخری دور کی نیند کی طرح سمجھے اپنے گناہوں سے توبہ کرے۔ ناراض لوگوں کو راضی کرے اچھی طرح وضو کرے اور داہنے پہلو پر قبلہ رخ ہو کر سوئے دنیا میں کئے ہوئے اچھے کاموں اور اسلام کی نعمت پر خدا کا شکر ادا کرے اور عہد کرے کہ اگر بیدار ہوا تو گناہوں کا ارتکاب نہ کروں گا۔ پس جس شخص نے بیداری میں اپنے یہ کام کر لیے ہوں اسے نیند یا موت سے کوئی خوف نہیں ہوتا۔

حکایات میں مشہور ہے کہ ایک بزرگ، ایک امام کے پاس گئے جو مرتبہ و عزت اور نفس کی رعونت میں مبتلا تھا اور اس سے کہا "اے فلاں! مر جانا چاہیے اس امام کو اس بات

سے رنج ہوا کرتا تھا کہ یہ گدا گر ہر وقت مجھے یہی بات کہتا ہے، ایک دن اس نے سوچا کل میں یہ بات کہنے میں سبقت کروں گا۔ چنانچہ دوسرے روز جب وہ بزرگ اندر آیا تو اس امام نے کہا ''اے فلاں! مرنا چاہیے'' اس بزرگ نے یہ سن کر مصلے بچھایا اور اس پر سر رکھا اور کہنے لگا لو! میں تو مر گیا اور اسی وقت اس کی جان نکل گئی اس سے اس امام کو تنبیہ ہوئی کہ یہ بزرگ اس سے یہ ہی کہا کرتا تھا کہ موت کی تیاری اس طرح کرنی چاہئے جس طرح میں نے کی ہوئی ہے اور ارادہ نہ کرو اور جب بیدار ہو جاؤ تو دوبارہ بھی مت سوؤ کہ مریدان حق کیلئے دوسری نیند حرام ہوتی ہے اور بیکاری و نیند بندہ کیلئے فراموش اور غفلت پیدا کرتی ہے اور اس بارے میں طویل کلام موجود ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بولنے اور خاموش رہنے کے آداب

خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں ''وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحاً'' (اس آدمی سے زیادہ اچھا گفتگو کے اعتبار سے کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے) نیز خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے ''قول معروف'' (اچھی بات) نیز فرمایا ''قُولُوا اٰمَنَّا'' کہو کہ ہم ایمان لائے) جالو کہ اچھی بات کہنے کا حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ایسے ہی حکم دیا گیا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ کی خدائی کے اقرار، اس کی حمد و ثنا کہنے اور مخلوق کو اس کی بارگاہ کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے نطق (بولنا) حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ملنے والی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور انسان اس کے ذریعہ دوسری مخلوقات سے ممتاز ہے اور خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِی آدَمَ'' (ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا فرمائی) مفسرین کرام نے اس کا ایک معنی نطق کیا ہے پس ہر گاہ کہ نطق کا حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر نعمت ہونا ظاہر ہے تاہم اس کی مصیبت بھی بہت بڑی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے ''اخوف ما اخاف علی امتی اللسان'' (جس چیز کے متعلق میں اپنی امت پر سب

سے زیادہ ڈرتا ہوں وہ زبان ہے) غرضیکہ گفتار شراب کی طرح ہے کہ وہ عقل کو مست کرتی ہے اور انسان جب اس کے پینے میں پڑ جاتا ہے تو ہرگز اس سے نکل نہیں سکتا اور اپنے آپ کو اس سے باز نہیں رکھ سکتا۔ جب اہل طریقت کو اس کا علم ہو گیا کہ بولنا ایک آفت ہے تو انہوں نے ضرورت کے بغیر گفتگو ہی نہیں کی۔ یعنی اپنی گفتگو کی ابتداء اور انتہا پر نگاہ رکھی ہے اگر وہ سب کی سب حق کیلئے ہو تو اسے ادا کیا ہے ورنہ خاموش رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ رازوں کو جاننے والے ہیں اور وہ لوگ قابل مذمت ہیں جو حق تعالیٰ کو ایسا نہیں جانتے بقول خدائے عزوجل ''اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰهُمۡ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ '' (کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کے رازوں اور سرگوشیوں کو نہیں سنتے، ہاں ہم سنتے ہیں۔ اور ہمارے فرشتے ان کے پاس سے لکھتے بھی ہیں) اور ہم خود عالم الغیب بھی ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ''مَن صَمَتَ نجی '' جو خاموش ہوا، نجات پا گیا) پس خاموشی میں بڑے فائدے اور کامیابیاں ہیں جب کہ بولنے میں بہت مصیبتیں ہیں۔ مشائخ کا ایک گروہ تو خاموش رہنے کو بولنے پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ بولنے کو خاموش رہنے پر افضل سمجھتا ہے، انہی میں سے حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ الفاظ اور عبارات تمام محض دعوے ہیں، جہاں حقیقت کا اثبات ہو وہاں تمام دعوے بے کار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اختیار کے باوجود انسان قول کے ساقط ہو جانے پر معذور ہو جاتا ہے یعنی کسی خوف کے وقت اس حالت کے برقرار رہنے کی صورت میں گفتگو کی قدرت پر اختیار کے باوجود نہ بولنے کا عذر پیدا ہو جاتا ہے اور یوں بولنے سے انکار کرنا۔ حقیقت معرفت کیلئے نقصان دہ نہیں ہوتا اور کسی وقت بھی بندہ معنی کے بغیر محض دعویٰ سے معذور نہیں ہوتا اس کا حکم منافقوں کا سا ہوتا ہے۔ پس معنی کے بغیر دعویٰ ایک نفاق ہے جب کہ معنی تو ہو لیکن دعویٰ نہ ہو تو یہ اخلاص ہے ''لِاَنَّ من اسّس بنیانه علی بیان لا یستغنی عن اللسان ومن اسَسَ بنیانه علی عیان استغنی فیما بینه و بین ربه من اللسان ''

(جس شخص نے اپنی بنیاد محض بیان پر رکھی وہ زبان سے مستغنی نہیں ہوسکتا جب کہ جس نے اپنی بنیاد حقیقت اور مشاہدہ پر رکھی وہ اپنے اور اپنے رب کے درمیان معاملہ کی وجہ سے زبان سے مستغنی ہو جاتا ہے) یعنی جب بندے پر طریقت کی راہ کھل جائے تو وہ گفتار سے مستغنی ہو جاتا ہے کیونکہ الفاظ تو غیر کی اطلاع کیلئے ہوتے ہیں اور حق تعالیٰ احوال کی تفسیر سے بے نیاز ہیں اور غیر اللہ اس قابل نہیں کہ اس میں مشغول ہو جائے، حضرت جنیدؒ کے قول کا بھی یہی معنی ہے جو انہوں نے فرمایا تھا کہ "مَنْ عَرَفَ اللّٰه کل لسانه" (جو اللہ کو پہچان لیتا ہے، اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے) کیونکہ مشاہدہ میں بیان ایک حجاب ہوتا ہے اور شبلیؒ کے بارے میں روایت آتی ہے کہ آپ حضرت جنیدؒ کی مجلس میں ایک مرتبہ اٹھے اور زور سے نعرہ لگایا "یا هوادی" (اے میری مراد) اور اس سے اشارہ حق تعالیٰ کی طرف کیا۔ حضرت جنیدؒ نے کہا اے ابوبکر! اگر اس سے تیری مراد حق تعالیٰ ہے تو یہ نعرہ لگانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ تو بلند آواز سے مستغنی ہے اور اگر اس کا غیر مراد تھا تو تو نے خلاف کیوں کیا؟ کہ حق تعالیٰ تو تمہارے قول کا جاننے والا ہے تو حضرت شبلیؒ نے اپنے کہے ہوئے پر استغفار کیا اور جو گروہ گفتگو کو خاموشی پر ترجیح دیتا ہے وہ حضرات کہتے ہیں کہ اپنے احوال کو بیان کرنے کا ہمیں حق تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کیونکہ دعویٰ تو معنی کے ساتھ قائم ہے کہ اگر کوئی شخص ہزار سال تک بھی دل اور باطن سے عارف باللہ ہو اور اس کو بیان کرنے سے کوئی ضرورت مانع میں نہ ہو تو جب تک یہ معرفت زبان سے اقرار کے ساتھ پیوست نہ ہوگی اس کا حکم کافروں کا سا ہوگا اور حق تعالیٰ نے تمام مومنوں کو نعمتوں پر شکر اور بزرگی پر اس کی حمد و ثنا کا حکم دیا ہے اور اپنے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے "وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّث" (اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کر) اور تحریف و تحدیث آپ کی گفتار ہی ہے پس ہمارا کلام حق تعالیٰ کے احکام ربوبیت کی تعظیم سے متعلق ہے اور خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ" (مجھے پکارو! میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا) اور نیز فرمایا ہے"

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَادَعَانِ ''(میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں وہ جب بھی پکارتا ہے) اور اسی طرح کی دوسری بہت سی آیات ہیں جن میں یہی مضمون پایا جاتا ہے، مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں جو شخص اپنے حال کو بیان نہیں کرسکتا اس کا کوئی حال ہی نہیں ہوتا کہ تیسرے درجے کو بیان کرنے والا خود تیسرا درجہ ہی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

لِسَانُ الحال أفصح من لِسانی

وَصمتی عن سوالی ترجمانی

(میرے حال کی زبان میری اپنی زبان سے زیادہ فصیح ہے اور میری خاموشی میرے سوال کی ترجمان ہے)

حکایات میں میں نے دیکھا ہے کہ حضرت ابوبکر شبلیؒ ایک دن بغداد کے ایک محلے سے گزر رہے تھے کہ ایک مدعی طریقت کو دیکھا جو کہہ رہا تھا ''السکوت خیر من الکلام فقال الشبلی سکوتک خیر من کلامک لان کلامک لغو و سکوتک هزل و کلامی خیر من سکوتی لان سکوتی حلم و کلامی علم ''(خاموشی بہتر ہے کلام سے۔ پس حضرت شبلیؒ نے کہا تمہاری خاموشی واقعی تمہارے بولنے سے بہتر ہے کیونکہ تمہارا بولنا فضول ہے اور چپ رہنا بے ہودگی جب کہ میرا بولنا میری خاموشی سے بہتر ہے کیونکہ میرا سکوت میری بردباری ہے اور میرا کلام میرا علم) کہ اگر اپنا علم بیان نہ کروں تو اس میں میری بردباری ہے اور اگر اپنا بیان کروں تو یہ میرا علم ہے جب خاموش رہوں گا تو حلیم ہوں گا اور جو بولوں گا تو علیم ہوں گا'' اور میں یعنی علی بن عثمان ہجویریؒ کہتا ہوں کہ تمام کلام بھی دو طرح کے ہوتے ہیں اور تمام سکوت بھی دو طرح کے ہوتے ہیں ایک کلام حق ہے اور دوسرا باطل۔ اور ایک سکوت حصول مقصد اور مشاہدہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور دوسرا غفلت کی وجہ سے۔ پس کلام کرنے اور خاموش رہنے کے وقت ہر شخص کو اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہئے کہ اگر اس

کا کلام حق کیلئے ہے تو اس کی گفتار اس کی خاموشی سے بہتر ہے اور اگر کلام باطل ہے تو پھر سکوت کلام سے بہتر ہے، اسی طرح سکوت اگر غفلت اور حجاب کی وجہ سے ہے تو پھر گفتار خاموشی سے بہتر ہے لوگ اس معاملے میں یوں ہی سرگرداں ہیں اور تصوف کے دعویداروں میں سے ایک گروہ نے نفسانی خواہشات اور معانی سے خالی چند عبارات کو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ گفتار سکوت سے افضل ہے اور جاہلوں کا ایک گروہ جو مینار اور کنوئیں میں تمیز نہیں کرسکتا اپنی جہالت کی وجہ سے خاموش رہتا ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خاموشی، گفتار سے بہتر ہے۔ جب یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کی طرح ہیں تو کس کو بولنے دیں گے اور کس کو خاموش رہنے دیں گے "من نطق اصاب اوغلط ومن انطق عصم من الشطط" (جوکوئی اپنی مرضی سے بولتا ہے وہ یا صحیح بولے گا یا غلط لیکن جس کو حق تعالیٰ بلوائیں گے وہ خطا اور خلال سے محفوظ رہے گا) جیسا کہ ابلیس (اللہ اس پر لعنت کرے) خود بولا کہ "انا خیر منہ" (میں آدم سے بہتر ہوں) اور حضرت آدمؑ کو حق نے بلوایا تو انہوں نے عرض کیا "ربنا ظلمنا انفسنا" (ہمارے رب ہم نے اپنے نفسوں پر زیادتی کرلی ہے پس اس راہ کے داعی اپنے بولنے میں ماموراور مجبور ہوتے ہیں اور اپنی خاموشی میں حیادار اور بے بس ہوتے ہیں کہ "من کان سکوتہ حیاءً کلامہ حیوۃ" (جس شخص کی خاموشی حیا کی وجہ سے ہو اس کا بولنا اس کے دل کیلئے پیغام زندگی ہوتا ہے) کیونکہ ان کی گفتار دیدار الٰہی کی وجہ سے ہوتی ہے اور بغیر دیدار کے بولنا ان کے ہاں ذلت کا باعث ہوتا ہے اور جب تک وہ باہوش ہوتے ہیں نہ بولنا، بولنے سے زیادہ اچھا سمجھتے ہیں اور جب اپنے آپ سے بےخود ہوجاتے ہیں تو لوگ ان کے کلام کو اپنی جان پر لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ نے کہا تھا کہ "من کان سکوتہ لہ ذھبا کان کلامہ بغیرہ مزھبا" (جس کی خاموشی خود اپنے لئے سونا ہوتی ہے اس کا کلام دوسروں کیلئے کیمیا سونا بنانے والا "پارس") ہوتا ہے۔ پس طالب ربانی کو چاہئے کہ اس کی جوسوچ بندگی میں مصروف ہے اسے خاموش ہی کردے تاکہ وہ زبان بولنے لگے

جس کا نطق اقرار ربوبیت ہے اور اس کی عبادت مریدوں کے دلوں کیلئے شکاری بن جائے۔

اور گفتگو کے آداب یہ ہیں کہ حکم خداوندی کے بغیر کچھ نہ کہے اور حق بات کے سوا بھی کچھ نہ کہے جب کہ خاموشی کے آداب یہ ہیں کہ خاموش رہنے والا نہ تو جاہل ہو اور نہ جہالت پر راضی ہو اور نہ ہی غفلت میں مبتلا ہو۔ اور مرید کو چاہئے کہ وہ مرشدوں کی کلام میں نہ دخل دے نہ ہیر پھیر کرے اور نہ اوپری اور الجھی ہوئی عبارت استعمال کرے اور جس زبان کے ساتھ شہادت دی ہے اور توحید کا اقرار کیا ہے اس کے ساتھ پھر جھوٹ اور غیبت نہ کرے، مسلمانوں کو رنج نہ پہنچائے۔ درویشوں کو اچھے القاب کے بغیر صرف نام لے کر نہ پکارے اور جب تک اس سے کچھ پوچھا نہ جائے خود نہ بولے یعنی گفتگو کرنے میں ابتدا نہ کرے اور درویش کی خاموشی کیلئے شرط یہ ہے کہ باطل اور برائی کو دیکھ کر خاموش نہ رہے اور بولنے کی شرط یہ ہے کہ حق کے سوا کچھ نہ بولے...... اس اصل کے فروع بہت ہیں اور لطائف بے شمار ہیں تاہم میں نے اسی مقدار کو پسند کیا ہے تاکہ کتاب طویل نہ ہو جائے۔

سوال کرنے کے آداب

اللہ عزوجل کا فرمان ہے ''لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافاً'' (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) اور جب کوئی ان سے سوال کرے تو وہ روکتے نہیں جیسا کہ حق تعالیٰ اپنے پیغمبر علیہ السلام صلی اللہ کو فرماتے ہیں ''وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَر'' (اور باقی سوال کرنے والے کو مت جھڑکیں) اور جب تک ہو سکے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے سوال نہ کرے اور غیر اللہ کو سوال کے قابل نہ سمجھیں کیونکہ حق تعالیٰ سے غیر حق کی طرف اعراض ہے اور جب بندہ حق تعالیٰ سے روگردانی کرے تو اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ موڑ لیں، میں نے حکایات میں پایا ہے کہ ایک دیندار نے حضرت رابعہ عدویہؒ سے کہا'' مجھ سے کوئی چیز مانگ لو تاکہ میں تیری خوشی حاصل کرلوں'' انہوں نے جواب دیا مجھے تو دنیا کے خالق سے بھی دعا

مانگتے ہوئے شرم آتی ہے تو کیا اپنے جیسے ایک انسان سے مانگتے ہوئے مجھے شرم نہ آئے گی
کہتے ہیں کہ ابو مسلم کے دور میں میں ایک صاحب دعوت درویش کو چوری کے جھوٹے الزام
میں بے گناہ گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ جب آدھی رات ہوئی تو ابو مسلم نے
خواب میں پیغمبر ﷺ کو دیکھا جو اس سے فرما رہے تھے۔ ''اے ابو مسلم! مجھے خداوند تعالیٰ
نے تیری طرف بھیجا ہے کہ میرے دوستوں میں سے ایک دوست کو بغیر کسی جرم کے تمہاری
جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کو رہائی دو'' یہ سن کر ابو مسلم فوراً نیند سے اٹھا اور برہنہ سر، برہنہ
پاؤں دوڑتا ہوا جیل خانے کے دروازے پر پہنچا اور جیل کا دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور
اس درویش کو باہر نکال کر اس سے معذرت کی اور کہا ''اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتائیے''
درویش نے کہا اے امیر! جو شخص ایسا آقا رکھتا ہے جو ابو مسلم کو آدھی رات کے وقت بستر
سے اٹھا کر بھیجے اور اسے مصیبت سے نجات دلائے تو کیا اس کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ دوسروں
سے سوال کرے اور حاجت مانگے؟ یہ سن کر ابو مسلم رونے لگے اور وہ درویش ان کے سامنے
سے چلے گئے پھر ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ درویش کیلئے لوگوں سے سوال کرنا بھی جائز ہے
کہ حق تعالیٰ نے ''لَا یَسْأَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا '' فرمایا ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال تو
کرتے ہیں لیکن اس میں میں زاری اور ضد نہیں کرتے، اور رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنے
صحابہ کی ضروریات کیلئے سوال کیا ہے اور ہمیں بھی کہا ہے کہ ''اطلبوا الحوایج عند حسان
الوجوہ ''(اچھے انداز میں اپنی حاجتیں طلب کرو) اور دوسرے مشائخ نے تین صورتوں
میں سوال کرنا جائز قرار دیا ہے پہلی صورت یہ کہ دل کی فراغت کیلئے سوال کرے کہ یہ ایک
ضروری امر ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دو روٹیوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ دن رات ان
کے انتظار میں ہی گزار دیں اور اس مجبوری کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں روٹیوں کے
علاوہ پیش کرنے کیلئے ہمارے پاس کوئی حاجت ہی نہ ہو اس لئے کہ طعام اور اس کے انتظار
سے زیادہ کوئی چیز حق تعالیٰ کی یاد سے روکنے والی نہیں اسی لئے تو جب حضرت شقیقؒ کا ایک

مرید حضرت بایزیدؒ کی زیارت کیلئے حاضر ہوا اور آپ نے حضرت شقیقؒ کا حال اس سے پوچھا اور اس نے بتایا کہ وہ مخلوق سے بالکل فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ پر توکل کی حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں تو حضرت بایزیدؒ نے فرمایا جب تم لوٹ کر جاؤ تو اس سے کہنا کہ دیکھو! آئندہ اللہ تعالیٰ کو دو روٹیوں کیلئے نہ آزماؤ بلکہ جب بھوک لگے تو اپنے ہم جنسوں سے دو روٹیاں مانگ کر کھا لو اور توکل کی کتاب ایک طرف اٹھا رکھو تا کہ تمہارے ایک عمل کی نحوست سے وہ شہر اور ملک زمین میں نہ دھنس جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ریاضت نفس کیلئے سوال کو جائز قرار دیا ہے تا کہ اس کی ذلت برداشت کریں اور دل پر اس کا رنج رکھیں یوں اپنی قیمت کا اندازہ لگائیں کہ دوسروں کی نظروں میں ان کی کیا حیثیت ہے تا کہ تکبر میں اور کسی کو تکلیف دینے میں مبتلا ہو جائیں، کیا تو نے نہیں دیکھا جب حضرت شبلیؒ، حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت جنیدؒ نے ان سے کہا ''اے ابوبکر! تمہارے ذہن میں ٹیڑھی نخوت بھری ہوئی ہے کہ میں خلیفہ اور امیر سامرہ کے دربانوں کے افسر کا بیٹا ہوں، تم اس وقت تک کوئی کام نہیں کر سکتے جب تک تم بازار میں نکلو تو نظر آنے والے ہر آدمی سے سوال نہ کرو تا کہ تمہیں اپنی قیمت کا علم ہو، حضرت شبلیؒ نے ایسا ہی کیا اور ہر روز آپ کا بازار سست ہوتا گیا حتیٰ کہ چھ سال کے عرصہ میں یہاں تک پہنچ گئے کہ سارے بازار میں گشت کیا لیکن کسی نے کوئی چیز بھی آپ کو نہ دی چنانچہ واپس آئے اور حضرت جنیدؒ سے اپنی حالت بیان کی حضرت جنیدؒ نے فرمایا اے ابوبکر! اپنی قیمت جان لے کہ لوگوں کے ہاں تیری کوئی حیثیت نہیں لہذا اب تو بھی دل ان میں نہ لگا اور کسی قیمت پر بھی انہیں اختیار نہ کر۔ یہ سوال ریاضت کیلئے تھا نہ کہ دنیا کمانے کیلئے حضرت ذوالنون مصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا، میرا ایک دوست تھا جو ہر معاملے میں میرے ساتھ موافقت کرتا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا اور دنیا سے نعمت عقبیٰ کی طرف پہنچا دیا۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ حق تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا اس نے کہا حق تعالیٰ نے مجھے بخش دیا ہے

میں نے پوچھا کس خصلت کی وجہ سے؟ تو اس نے بیان کیا کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور کہا ''میرے بندے! تم نے کمینوں اور بخیلوں سے بڑے رنج اور بڑی ذلت اٹھائی ہے کہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہیں اور پھر اس پر صبر کیا ہے اس لئے میں تجھے بخش رہا ہوں اور تیسری اس صورت میں سوال کو جائز قرار دیا ہے کہ جب حق تعالیٰ کی حرمت وعظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے لوگوں سے سوال کرے کہ وہ دنیا کا تمام مال حق تعالیٰ کی ملکیت سمجھتے ہیں اور مالدار لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا وکیل سمجھتے ہیں، چنانچہ جو چیز ان کے نفس کے حصہ کی طرف لوٹتی ہے وہ حق تعالیٰ سے نہیں مانگتے بلکہ اس کے کسی وکیل سے مانگ لیتے ہیں اور اپنی بات اس وکیل سے کر لیتے ہیں اور ایک شاہد کی نظر میں جو بندہ حق تعالیٰ کی حرمت و اطاعت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے کسی وکیل کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جو خدا تعالیٰ کے سامنے اپنی ضرورت پیش کرتا ہو۔ پس غیر سے ان کا سوال کرنا ان کے بارگاہ الٰہی میں حضور اور کامل توجہ کی علامت ہے نہ کہ غیب اور حق سے روگردانی کی۔

میں نے سنا ہے کہ حضرت یحییٰ بن معاذؒ کی ایک بیٹی تھی ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے ماں نے کہا ''بیٹی! خدا سے مانگو! بیٹی نے عرض کی اماں جان! مجھے شرم آتی ہے کہ اپنی ذاتی ضرورت حق تعالیٰ سے طلب کروں اور جو کچھ آپ مجھے دیں گی وہ بھی تو خدا کے مال سے ہی دیں گی جو میرے لئے اس نے مقدر کر رکھا ہوگا۔

پس سوال کرنے کے آداب یہ ہیں کہ اگر تمہارے سوال کا مقصود تمہیں حاصل نہ ہو تو بھی زیادہ غمگین نہ ہو اور لوگوں کو تو اپنے درمیان نہ دیکھے اور عورتوں سے اور بازاری لوگوں سے سوال نہ کر اور اپنا سوال صرف اس کے سامنے پیش کر جس کے مال کے حلال ہونے کا تمہیں یقین ہو اور جہاں تک ہو سکے صرف اپنی ضرورت کے مطابق سوال کر اور اس سے سامان آرائش و خانہ داری نہ بنا اور اس کو اپنی ملکیت نہ سمجھ۔ صرف وقت کی ضرورت کا خیال رکھ آئندہ کل کا اندیشہ دل پر نہ لا تا کہ ہمیشہ کی ہلاکت میں گرفتار نہ ہو جائے اور حق

تعالیٰ کو اپنی دریوزہ گری کا جال نہ بنا اور اپنی طرف سے تکلفاً پارسائی پیدا نہ کر کہ لوگ تیری پارسائی کو دیکھ کر تجھے کچھ دیں۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا جو باحشمت صوفیہ میں سے تھے کہ وہ جنگل سے فاقے کی حالت میں سفر کی تکلیف اٹھاتے ہوئے کوفہ کے بازار میں آئے اور ایک چڑیا کو اپنے ہاتھ پر بٹھائے ہوئے کہا کوئی اس چڑیا کی خاطر مجھے کچھ دیدے لوگوں نے کہا اے فلاں! تم یہ کیا کہتے ہو؟ انہوں نے فرمایا محال ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے خدا کے واسطے کچھ دو کیونکہ حقیر دنیا کیلئے ایک حقیر چیز کے سوا کسی کی سفارش ہم پیش نہیں کرتے۔

یہ تھوڑا سا بیان اس عنوان پر میں نے اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا ہے حالانکہ اس میں تفصیل کی گنجائش موجود تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے آداب

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے ''ھُنَّ لِبَاس' لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسُ لَّھُنَّ '' (عورتیں تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کیلئے لباس ہو) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تناکحوا تکثرو افانی اباھی بکم الامم یومَ القیمة ولوبا سقط '' (آپس میں نکاح کرو تا کہ تم میں اضافہ ہو بے شک میں قیامت کے دن تمہاری کثرت کی وجہ سے تمام امتوں پر فخر کروں گا اگرچہ اضافہ ادھورے بچے سے ہی ہو۔ نیز فرمایا ''ان اعظم النسا برکة اقلھُنَّ مئونه واحسنھن وجوھاوا حصنھن فروجاً '' (عورتوں میں برکت کے لحاظ سے عظیم عورت وہ ہے جو تھوڑا اخرچ کرے، خوبصورت ہو اور پاکدامن ہو) صحیح احادیث سے ثابت ہے نکاح تمام مردوں اور عورتوں کیلئے مباح ہے اور جو شخص حرام کاری سے پرہیز نہ کر سکے اس پر فرض ہے اور جو شخص اہل وعیال کے حقوق پورے کر سکتا ہو اس کیلئے سنت ہے مشائخ طریقت میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ نکاح شہوت کو دور کرنے کیلئے کرنا چاہئے اور مال دل کی فراغت کیلئے کمانا چاہئے، اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نکاح افزائش نسل کیلئے کرنا چاہئے تا کہ اولاد ہو

اور جب اولاد ہوتو وہ اگر باپ سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائے تو باپ کیلئے شفاعت کا ذکر بنے اور اگر باپ اولاد سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کیلئے دُعا کرتی رہے احادیث میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے سیدہ فاطمہؓ بنت محمد مصطفےٰ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ ام کلثومؓ کیلئے ان کے والد حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے پاس پیغام نکاح بھیجا اور ان سے درخواست کی تو حضرت علیؓ نے کہا وہ بہت کم سن ہے اور آپ بوڑھے آدمی ہیں جب کہ میں سیدہ ام کلثومؓ کا نکاح اپنے بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ ''اے ابوالحسن! دنیا میں بوڑھی عورتیں بہت ہیں ام کلثوم کے ساتھ نکاح سے میرا مقصد شہوت کا دور کرنا نہیں بلکہ نسل کا جاری کرنا ہے کہ میں نے پیغمبر ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا ''کلُّ حسبٍ ونسب ینقطع بالموت الانسبی وحسبی ویروی سبب و نسب ینقطع الاّ حسبی ونسبی '' (ہر حسب ونسب موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے سوائے میرے نسب وحسب کے۔ایک روایت میں یوں ہے کہ ''میرے حسب ونسب کے علاوہ ہر سبب اور نسبت منقطع ہو جائے گی) اب میرا سبب آپ ہیں میں چاہتا ہوں کہ میرا نسب بھی قائم رہے تا کہ میں قرابت رسول اللہ ﷺ میں دونوں جانب محکم کرنے والا ہو جاؤں'' چنانچہ حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی سیدہ ام کلثوم سلام اللہ رضوانہ علیہا حضرت عمرؓ کے نکاح میں دے دیں اور انہی سے زید بن عمرؓ پیدا ہوئے اور پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے ''تنکح النساءَ علی اربعة علی المال و الحسب والحسن والدین فعلیکم بذات الدین فانهٗ مااستفادا مر بعد الاسلام خیر من زوجة مومنة موافقة یسر بهااذا نظر الیها ''(عورتوں کے ساتھ چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے مال یا حسب ونسب یا حسن یا پھر دین کی وجہ سے پس تم دین کی بنیاد پر نکاح کرو کیونکہ کوئی شخص اسلام کے بعد کسی چیز سے استفادہ نہیں کرتا جو ایک موافقت کرنے والی مومنہ بیوی سے زیادہ بہتر ہو کہ جب وہ بیوی کو دیکھے تو اسے خوشی حاصل ہو) یعنی اسلام

کے بعد بہترین فوائد اور اضافے ایک موافقت کرنے والی مومنہ بیوی سے ہی حاصل ہوتے ہیں تاکہ اس سے محبت حاصل کرے، دین کے معاملے میں اس سے قوت حاصل کرے اور دنیا میں اس سے باہمی محبت و تعلق پائے کیونکہ تمام وحشتیں تنہائی میں ہیں اور تمام راحتیں صحبت میں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "الشیطان مع الواحد" (اکیلے آدمی کے ساتھ شیطان ہوتا ہے) درحقیقت مرد یا عورت جب تنہا ہوتے ہیں تو شیطان ان کا ساتھی ہوتا ہے اور ان کے دل میں شہوت کو ابھارتا ہے۔ اگر میاں بیوی میں مجانست اور موافقت ہو تو حرمت و پاکدامنی کے معاملہ میں اس سے بہتر کوئی صحبت نہیں۔ اسی طرح اگر عورت ناموافق ہو تو اس کے ساتھ رہنے میں جو رنج اور ذہنی کوفت ہے اس جیسی کوئی دوسری تکلیف نہیں۔ پس درویش کو چاہئے کہ پہلے وہ اپنے معاملے میں غور کرے اور نکاح کرنے اور مجرد رہنے کے فتنوں کو اپنے دل کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اندازہ کر سکے کہ کون سی آفت کو دور کرنا اس کے لئے زیادہ آسان ہے پھر اس پر عمل کرے۔ خلاصہ یہ کہ مجرد رہنے میں دو آزمائشیں ہیں پہلی حضور ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت کا ترک اور دوسری اپنے دل میں نفسانی شہوت کی پرورش اور حرام کاری میں مبتلا ہونے کا خطرہ اور نکاح کرنے میں بھی دو آفتیں ہیں ایک دل کا غیر حق میں مشغول ہونا اور دوسری جسم کا نفسانی لذت میں مشغول ہونا۔ اس مسئلہ کی اصل خلوت نشینی اور صحبت پسندی کی طرف راجع ہے یعنی جو شخص لوگوں کے ساتھ اختلاط کو اختیار کرتا ہے اس کیلئے نکاح ضروری ہے اور جو شخص مخلوق سے کنارہ کشی کا متلاشی ہے اس کیلئے مجرد رہنا زیادہ خوب ہے پیغمبر ﷺ "سیروا سبق المفردون" (سیاحت کرو کہ تنہا رہنے والے سبقت لے گئے) حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں "نجا المخففون وھلک المثقلون" (ہلکے لوگ نجات پا گئے اور بوجھ والے ہلاک ہو گئے) حضرت ابراہیم خواصؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا "میں ایک دیہات میں موجود ایک بزرگ کی زیارت کیلئے گیا، جب ان کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اسے اس طرح صاف ستھرا پایا

جس طرح اولیاء کرام کے عبادت خانے ہوتے ہیں، اس میں دو محراب بنے ہوئے تھے ایک میں وہ بزرگ تشریف فرما تھے اور دوسرے میں ایک پاکیزہ اور روشن اخلاق بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں کثرت عبادت سے سے بہت زیادہ کمزور ہو چکے تھے، وہ دونوں میری آمد پر بڑے خوش ہوئے میں تین روز تک وہ وہاں رہا اور جب واپس جانا چاہا تو اس بزرگ سے دریافت کیا ''یہ پاکدامنہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟'' انہوں نے کہا ایک طرف سے میرے چچا کی بیٹی ہیں اور ایک طرف سے میری بیوی ہیں'' میں نے کہا میں نے آپ کی صحبت میں گزارے ہوئے ان تین دن میں آپ میں سخت بیگانگی دیکھی ہے انہوں نے کہا ''ہاں پنیسٹھ برس سے یہی کیفیت ہے میں نے کہا مجھے اس کا سبب بتایئے انہوں نے کہا جان لو کہ ہم بچپن میں ایک دوسرے کے عاشق تھے اور اس کا باپ میرے ساتھ اس کا نکاح نہ کرتا تھا کیونکہ ہماری آپس کی محبت اس کے علم میں آ چکی تھی۔ ہم نے کافی عرصہ اس بات کا رنج برداشت کیا یہاں تک کہ اس کا والد فوت ہو گیا میرے والد اس کے چچا بھی تھے انہوں نے میرے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔ جب ہم پہلی رات ایک دوسرے کے پاس پہنچے تو یہ مجھے کہنے لگی'' تم جانتے ہو کہ خدائے تعالیٰ نے ہمیں کس نعمت سے سرفراز فرمایا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا اور ہمارے دلوں کو آزمائشوں اور مصیبتوں سے نجات دے دی۔ میں نے کہا ''ہاں'' تو اس نے کہا تو پھر ہم آج کی رات اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے باز رکھیں گے اور اپنی مراد کو پاؤں تلے کچلتے ہوئے اس نعمت کے شکریہ میں اپنے اللہ کی عبادت کریں گے'' میں نے کہا ٹھیک ہے دوسری رات بھی اس نے یوں ہی کہا اور پھر تیسری رات میں نے کہا دیکھو دو راتیں ہم نے تمہارے کہنے پر نعمت خداوندی کے شکرانے میں گزار لیں ہیں آج کی رات میرے کہنے پر آؤ کہ اللہ کی عبادت کریں آج ساٹھ اور پانچ سال ہو چکے ہیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو چھونے کی نیت سے دیکھا تک نہیں اور تمام عمر نعمت کے شکر میں گزار دی ہے۔

پس جب کوئی درویش کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کی صحبت اختیار کرے تو جب تک اس پردہ نشین عورت کی روزی رزق حلال سے نہ بنا لے اور اس کا مہر مال حلال سے ادا نہ کرے اور جب تک حق تعالیٰ کے احکام الٰہی کو پوری طرح ادا نہ کر چکے اپنے نفس کی لذت میں مشغول نہ ہو اور جب اپنے اوراد و وظائف مکمل کر کے اس کے ساتھ صحبت کا ارادہ کرے تو اپنی مراد کو اپنے اندر قتل کر دے اور مناجات کے طور پر خداوند تعالیٰ کے حضور عرض کرے ''اے میرے پروردگار آپ نے جہان کو آباد کرنے کیلئے بنی آدم کی مٹی میں شہوت کی سرشت رکھ دی ہے اور آپ نے اپنے علم میں یہ چاہا کہ یہ صحبت مجھے حاصل ہو، اے میرے پروردگار میری یہ ہم بستری دو چیزوں کیلئے بنا دے ایک تو اس حلال کے ذریعے مجھے حرام کے ارتکاب سے محفوظ رکھ اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنے اندر مشغول کر لے۔ حضرت سہیل بن عبداللہ تستریؒ کے متعلق آتا ہے کہ انہیں ایک فرزند نصیب ہوا وہ جب بھی اپنی ماں سے کھانے کیلئے طعام مانگتا تو ماں اسے کہتی خدا تعالیٰ سے مانگو! وہ محراب میں جا کر سجدہ ریز ہو جاتا تو ماں اس طرح کھانا اس کے سامنے رکھ دیتی کہ اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ یہ ماں نے رکھا ہے اور یوں اس لئے تھا کہ حق تعالیٰ سے مانگنا اس کی طبیعت بن جائے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ مدرسہ سے واپس آیا تو ماں گھر میں موجود نہ تھی اس نے حسب معمول سر سجدہ میں رکھا تو اللہ نے اسی کی ضرورت اس کو فراہم کر دی ماں گھر آئی اور اس نے اس کے ساتھ کھانا دیکھا تو پوچھا'' بیٹے یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا'' ماں جہاں سے روزانہ آیا کرتا ہے حضرت ذکریا علیہ السلام جب سیدہ مریمؑ کے پاس حجرہ میں داخل ہوئے تو گرمی کے موسم میں سردیوں کے اور سردی کے موسم میں گرمیوں کے پھل موجود پاتے حیران ہو کر دریافت کرتے ''انی لک ھذا '' (اے مریم! یہ تمہیں کہاں سے ملے ہیں) وہ کہتیں'' ھذا من عند اللہ '' (یہ اللہ کی طرف سے ہیں) پس ہونا یوں چاہئے کہ اس سنت کا استعمال درویش کے دل کو طلب دنیا اور مال حرام کی خواہش میں مشغول نہ کر دے، کیونکہ دل کی خرابی میں ہی

درویش کی ہلاکت ہے جس طرح کہ دولتمند آدمی کی خرابی اس کے گھر اور گھریلو سامان کی خرابی میں ہوتی ہے۔ پس جو کچھ درویش کا بگڑ جائے اس کا کوئی عوض نہیں ہوسکتا۔ ہمارے زمانے میں یہ ممکن نہیں رہا کہ کسی کو ایسی عورت نصیب ہو جائے جو زیادہ مطالبات اور فضول و محال امور کو طلب کئے بغیر اس کے ساتھ موافقت کرے، اسی لئے ایک گروہ نے مجرد اور ہلکا رہنا اختیار کرلیا ہے اور اس حدیث مبارکہ پر عمل کرلیا ہے جو پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ''**خیر الناس فی آخر الزمان خفیف الحال قیل یا رسول الله وَمَا خصیف الحال قال الذی لا اهلَ لـهٗ ولد لـه**'' (آخری زمانے میں بہترین لوگ وہ ہوں گے جو خفیف الحال ہوں گے آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ خفیف الحال کون ہوگا؟ تو آپ نے فرمایا وہ جس کی نہ اہلیہ ہوگی نہ اولاد) نیز آپ نے فرمایا ''**سیروا اسبق المفردون**'' (تم سیاحت کرو کہ تنہا رہنے والے سبقت لے گئے) مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ بہترین اور افضل لوگ وہ ہیں جو تجرد کی زندگی گزاریں بشرطیکہ ان کا دل آفات سے خالی ہو اور ان کی طبیعت گناہوں کے ارتکاب کے ارادے اور شہوتوں سے اعراض کرتی ہو۔ عام لوگ نکاح کرنے کیلئے پیغمبر ﷺ کی اس حدیث کو حجت بتاتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''**حببت اِلَیّ مِنْ دنیا کم ثلاث الطیب والنساء وَجعِلَت قره عینی فی الصلوة**'' (تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے تین چیزیں میرے لئے محبوب بنائی گئی ہیں۔ خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اور کہتے ہیں کہ جب عورتیں حضور ﷺ کو محبوب تھیں تو پھر نکاح ہی تجرد سے افضل ہے) میں کہتا ہوں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''**لِی حرفتان الفقرو الجهاد**'' (مجھے دو پیشے پسند ہیں۔ فقر اور جہاد) پس وہ ان پیشوں سے کیوں دست بردار ہو جاتے ہیں کہ اگر عورتیں آپ کو پسند تھیں تو فقر اور جہاد بھی تو آپ کو پسند تھا۔ پس ان خواہش پرستوں کو چونکہ عورتوں کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اپنی خواہش کو پیغمبر ﷺ کی پسند کا نام دے دیتے ہیں، اگر کوئی شخص پچاس سال تک بھی اپنی خواہشات کا تابع ہوتے

ہوئے یہ سمجھتا رہے کہ میں سنت کا متبع ہوں تو بڑی سخت غلطی میں مبتلا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کیلئے جو پہلا فتنہ مقدر ہوا وہ ایک عورت کا فتنہ ہی تھا اور ہابیل وقابیل کے جھگڑے کی صورت میں جو پہلا فساد دنیا میں نمودار ہوا وہ بھی ایک عورت کی وجہ سے ہی تھا اور جب دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو اللہ تعالیٰ نے سزا دینا چاہی تو اس کا سبب بھی ایک عورت ہی تھی اور ہمارے زمانے تک دینی اور دنیاوی تمام فتنے عورتوں کے ہی ہیں۔ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''ماترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء '' (میں نے اپنے بعد مردوں کیلئے عورتوں سے زیادہ ضرر رساں کوئی فتنہ نہیں چھوڑا) پس عورتوں کا فتنہ جب ظاہر میں اتنا بڑا ہے تو باطن میں یہ کتنا بڑا ہوگا اور میں علی بن عثمان ہجویریؒ کو خود گیارہ سال تک خداوند تعالیٰ نے نکاح کی آزمائش سے بچائے رکھا اور پھر یہی مقدر تھا کہ میرے اندر فتنہ پیدا کر دیا اور میرا ظاہر و باطن ایک پری صفت کا اس کے دیکھے بغیر اسیر ہو گیا اور میں ایک سال تک اس میں ایسا مستغرق رہا کہ قریب تھا کہ میرا دین مجھ پر تباہ ہو جائے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کمال الطاف اور اپنے پورے فضل سے میرے دل کو ہلاک ہونے سے بچا لیا اور مجھے اپنی رحمت کے ذریعہ اس سے نجات نصیب فرما دی۔ اللہ کی اس عظیم نعمت پر میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ طریقت کی بنیاد مجرد رہنے پر رکھی گئی ہے، انسان جب نکاح کر کے صاحب عیال بن جاتا ہے تو اس کا حال متغیر ہو جاتا ہے پھر نفسانی خواہشات کے لشکروں میں سے کسی لشکر کی آگ کو بھی بجھایا نہیں جا سکتا کیوں جو خرابی خود تیرے اندر سے پیدا ہوئی ہے اس کے دور کرنے کا سامان بھی تو خود تجھ پر ہی موقوف ہے کسی دوسرے کو کیا ضرورت ہے کہ تیری اس آفت کو تجھ سے دور کرے اور شہوت کا ازالہ دو چیزوں سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ جو انسان کے تکلف اور کوشش سے زیر ہو سکے اور دوسرے یہ کہ وہ انسان کے مجاہدہ اور کسب سے باہر ہو۔ جو چیز انسانی تکلف و کوشش کے تحت ہے وہ تو بھوک ہے کہ اس سے بھی شہوت زائل ہوتی ہے اور جو چیز انسان کے مجاہدہ سے باہر ہے وہ

ہو بیقرار کرنے والا خوف خدا ہے یا پھر حق تعالیٰ کی سچی محبت ہے جو ہمتوں کو کام میں لانے سے مجتمع ہوتی ہے اور محبت کا غلبہ خود بخود جسم کے اعضا میں اس شہوت کو پراگندہ کر دیتا ہے اور تمام حواس کو ان کے شہوانی اوصاف سے معزول کر دیتا ہے اور انسان کو مکمل طور پر شہوت سے دور کر کے تمام بہود گیاں اس سے فانی کر دیتا ہے حضرت احمد سرخسی جو ماوراالنہر میں میرے دوست تھے اور بڑے صاحب حشمت بزرگ تھے ان سے لوگوں نے کہا کہ کیا آپ نکاح کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "نہیں" لوگوں نے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو فرمایا اس لئے کہ میں اپنے معاملے میں کبھی تو حاضر ہوں اور کبھی غائب جب میں غائب ہوتا ہوں تو مجھے کونین میں سے کسی چیز کی یاد نہیں آتی اور جب میں حاضر ہوتا تو اپنے نفس کو اس طرح رکھتا ہوں کہ جب اس کو ایک روٹی مل جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے ہزاروں حوریں مل گئی ہیں پس دل کی مشغولیت بہت بڑا کام ہے جو چیز تمہیں پسند ہے اسے اختیار کر لو! اور ایک اور گروہ کہتا کہ ہم نکاح اور مجرد رہنے والوں کی حالتوں میں اپنا اختیار منقطع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے لئے تقدیر سے اور پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے اگر مجرد رہنا ہمارے حصہ میں آتا ہے تو ہم اس حالت میں پاکدامن رہنے کی کوشش کریں گے اور اگر تقدیر الٰہی سے ہمارے حصہ میں نکاح کرنا آتا ہے ہم سنت کا اتباع کریں گے اور دل کو فارغ رکھنے کی کوشش کریں گے کیونکہ جب بندہ کیلئے حق تعالیٰ کی حفاظت شامل حال ہو تو بندہ کا مجرد رہنا بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ہوتا ہے کہ زلیخا کی آزمائش کے وقت اپنی مراد پر قادر ہونے کے باوجود آپ نے اس سے روگردانی کی اور جب زلیخا نے آپ کے ساتھ خلوت کی تو آپ اپنے نفس کی خواہشات کو مغلوب کرنے اور نفس کے عیوب کو دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح اگر انسان کو حق تعالیٰ کی حفاظت حاصل ہو تو نکاح کی حالت میں اس کا نکاح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح کی طرح ہو گا کہ حق تعالیٰ سے آپ کو جو کامل درجے کا اعتماد حاصل تھا اس کی وجہ سے انہوں نے اپنے

اہل وعیال میں مشغول ہو کر خدا تعالیٰ کو فراموش نہیں کیا یہاں تک کہ جب حضرت سارہؓ کو رشک ہوا اور اپنی غیرت کا مسئلہ بنا لیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سیدہ ہاجرہؓ اور اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو لے گئے اور ایک بے آب وگیاہ وادی (مکہ معظمہ) میں لے جا کر چھوڑ آئے اور خدا کے سپرد کر کے اپنا منہ ان سے موڑ لیا حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں لے کر ان کی خود اپنی مرضی کے مطابق پرورش کی۔ پس انسان کی ہلاکت نہ تو نکاح کرنے میں ہے نہ مجرد رہنے میں، بلکہ اپنا اختیار ثابت کرنے اور اپنی خواہشات کا اتباع کرنے میں اس کی مصیبت وہلاکت ہے۔

پس عیال دار ہونے کے آداب کی شرط یہ ہے کہ نکاح کے بعد روزانہ کے وظائف میں سے کوئی وظیفہ فوت نہ ہونے پائے۔ سلوک کے احوال ضائع نہ ہوں، اوقات کار میں بدنظمی پیدا نہ ہونے پائے۔ اپنے اہل وعیال سے شفقت کا برتاؤ کرے، ان کیلئے امداد نہ لے تاکہ اس طرح جب اس کو کوئی فرزند نصیب ہو تو وہ بھی انہی شرائط کا پابند ہو اور پاک باز و نیک کردار ہو۔ حکایات میں معروف ہے کہ حضرت احمد بن حرب نیشاپوریؒ ایک دن سادات اور روسا کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے جو آپ کو سلام کرنے حاضر ہوئے تھے کہ آپ کا شراب خور بیٹا نشے میں دُھت، ساز بجاتا اور راگ گاتا ہوا اندر داخل ہوا اور بے حرمتی کرتا ہوا بے دھڑک وہاں سے گزر گیا اور کسی کی اس نے پرواہ نہ کی۔ جس سے وہ سب رنجیدہ خاطر ہو گئے۔ حضرت احمدؒ نے جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو پوچھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم سب کی حالت متغیر ہو گئی ہے؟ انہوں نے عرض کی کہ آپ کے اس صاحبزادے کے اس حالت میں آپ کے پاس سے گزرنے پر ہم تشویش زدہ ہو گئے ہیں کہ اس نے آپ کی کوئی پرواہ ہی نہیں کی'' حضرت احمدؒ نے فرمایا'' وہ اس معاملے میں معذور ہے کیونکہ ایک رات ہمارے کھانے کیلئے ہمارے ہمسایہ سے کھانا آیا جسے ہم نے اور میری اہلیہ نے کھا لیا پھر اسی رات ہم نے آپس میں صحبت کی جس سے یہ لڑکا رحم مادر میں

قرار پایا۔ پھر ہم پر نیند کا اس قدر غلبہ ہوگیا کہ اس رات کے تمام اوراد وظائف ہم سے ضائع ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے اپنی اس حالت کی حقیقت معلوم کرنا شروع کی اور اس ہمسایہ سے رجوع کیا کہ جو کھانا اس نے بھیجا تھا وہ کہاں سے آیا تھا، اس نے بتایا کہ وہ ایک شادی والے گھر سے آیا تھا، چنانچہ جب ہم نے مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ شادی والوں کے ہاں وہ کھانا بادشاہ کے گھر سے آیا تھا...... اور مجرد رہنے کے آداب کی شرط یہ ہے کہ آنکھ کو ناشائستہ امور کو دیکھنے سے بچائے اور نہ دیکھنے کے قابل چیزوں کو ہرگز نہ دیکھے اور نہ سننے کے قابل باتوں کو نہ سنے اور جن باتوں کو سوچنا مناسب نہیں ان کو ہرگز نہ سوچے اور شہوت کی آگ کو بھوک سے بجھائے اور دل کو دنیا اور حوادث میں مشغول کرنے سے بچائے اور اپنے نفس کی خواہشات کو علم اور ابہام کا نام نہ دے اور شیطان کی شعبدہ بازیوں کی تاویل نہ کرے تاکہ طریقت کے نزدیک اسے قبولیت کا شرف حاصل ہو جائے صحبت اور معاملہ کے یہ مختصر طور پر آداب تھے۔ واللہ اعلم بالصواب

وسواں کشف حجاب

صوفیہ کے کلام، ان کی اصطلاحات اور حقائق کا بیان

اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت مند کرے جان لو کہ ہر فن والوں اور ہر معاملہ والوں کے آپس میں اسرار بیان کرنے کیلئے کچھ مخصوص عبارتیں اور اصطلاحیں ہوتی ہیں جن کے معنی ان کے علاوہ دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ان اصطلاحوں کو وضع کرنے میں ان کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک تو اچھی طرح سمجھانا اور مشکل باتوں کو آسان کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ مرید کو سمجھانا آسان ہو۔اور دوسرا ان لوگوں سے اسرار رموز کو چھپانا مقصود ہوتا ہے جو اس علم کے اہل نہیں ہوتے اور اس کے دلائل بڑے واضح ہیں۔جیسا کہ اہل لغت اپنی وضع کردہ اصطلاحات میں مخصوص ہیں۔مثلاً فعل ماضی و فعل مستقبل صحیح و معتل واجوف اور مضاعف و ناقص وغیرہ اور علم نحو والے اپنی وضع کردہ عبارات میں مخصوص ہیں مثلاً رفع، ضمہ، نصب، فتح، خفض، کسر، جزم، منصرف اور غیر منصرف وغیرہ۔اور علم عروض اپنی وضع کردہ اصطلاحوں سے مخصوص ہیں جیسا کہ فرد وزدج، ضرب و تقسیم، کعب و جذر، رضافت وتخصیف وتنصیف اور جمع وتفریق وغیرہ۔اور فقہا اپنی وضع کردہ اصطلاحات سے مخصوص ہیں مثلاً علت و معلول قیاس و اجتہاد اور دفع و الزام وغیرہ اور محدثین اپنی بنائی ہوئی عبارات سے مخصوص ہیں مثلاً مسند و مرسل، احاد و متواتر اور جرح و تعدیل وغیرہ اور متکلمین اپنی بنائی ہوئی اصطلاحوں کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً عرض د جوھر، کل و جز و جسم و حدوث جبر و تخیر اور ھیولیٰ وغیرہ پس اس گروہ صوفیہ کے بھی اپنے گفتگو کو ظاہر کرنے اور چھپانے کیلئے الفاظ مخصوص ہیں تاکہ ان کے ساتھ وہ طریقت میں تصرف کریں اور جس کو چاہیں اپنے مقصود سے آگاہ کریں اور جس کو چاہیں اس سے اپنے مقصود کو مخفی رکھیں......پس میں انشاء اللہ ان کلمات کا تشریح کے ساتھ بیان کروں گا اور فرق کردوں گا کہ ایک کلمہ اور دوسرے کلمہ سے صوفیہ کی مراد کیا ہوتی ہے تاکہ

تجھ کو اور اس کتاب کو پڑھنے والے دوسرے لوگوں کو پورا پورا فائدہ ہو اور مجھے نیک دُعائیں حاصل ہوں..... پس ان اصطلاحوں میں سے "حال اور وقت" بھی ہیں اور ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ وقت اس طائفہ کے درمیان ایک مشہور اصطلاح ہے اور اس کے متعلق مشائخ کا بہت سا کلام ہے البتہ میرا مقصد اس کی تحقیق کرنا ہے نہ کہ بیان کو طول دینا۔ پس وقت وہ حالت ہوتی ہے کہ بندہ اس کی وجہ سے ماضی اور مستقبل سے بالکل فارغ ہو جائے چنانچہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل پر ایسی حالت وارد ہو اور اس کا باطن یوں مجتمع ہو جائے جیسا کہ مکاشفہ کی صورت میں ہوتا ہے کہ نہ اس کو گزشتہ زمانے کی یاد آتی ہے اور نہ آئندہ کی کوئی سوچ پس اس معاملہ میں تمام لوگوں کو دسترس حاصل نہیں ہوتی اور وہ نہیں جانتے کہ ہمارا گزرا ہوا وقت کس حالت پر گزرا اور ہماری آئندہ عاقبت کیا ہو گی۔ سوائے ان لوگوں کے جو صاحب وقت ہوتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا علم سابقہ حالت اور انجام کار کا ادراک نہیں کر سکتا اور ہم کو وقت کی حالت میں حق تعالیٰ کے ساتھ ایک اچھی کیفیت حاصل ہے کیونکہ اگر ہم آئندہ کل میں مشغول ہو جائیں یا آئندہ کے اندیشے ہمارے دل پر گزرنے لگیں تو ہم وقت سے محجوب ہو جائیں گے اور حجاب ایک بہت بڑی پریشان حالی ہے پس جس کسی کو وہاں تک دسترس حاصل نہیں ہوتی اس کیلئے اس کو سمجھنا محال ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوسعید خرازؒ کہتے ہیں کہ اپنا وقت عزیز کسی عزیز ترین چیز کے سوا کسی میں مشغول نہ کرو اور بندہ کی عزیز ترین چیز ماضی اور مستقبل کے درمیان اپنے وقت کو خدا تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھنا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "لِیْ مَعَ اللّٰہِ وقت" لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل" "(میرے لئے اللہ کے ساتھ مشاہدہ کا ایک مخصوص وقت ہے کہ اس میں میرے ساتھ نہ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہوتی ہے نہ کسی نبی مرسل کی) یعنی مجھے حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا وقت حاصل ہے کہ اس میں ہزار ہا جہانوں میں سے کسی چیز کا میرے دل پر گزر نہیں ہوتا اور نہ ہی میری نگاہ میں ان کی کوئی قیمت ہوتی ہے یہی وجہ ہے

کہ جب معراج کی رات زمین وآسمان کی تمام خوبصورتیوں کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے کسی چیز کی طرف نگاہ نہ کی یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ''مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی ''(آپ کی نگاہ تجلیات الٰہی سے نہ ہٹی نہ آگے بڑھی) کیونکہ مصطفےٰ ﷺ عزیز تھے اور عزیز کو عزیز کے علاوہ کسی چیز میں مشغول نہیں کرتے۔ پس موحد کے دو وقت ہوتے ہیں ایک حالت فقد کا وقت اور دوسرا حالت وجد کا وقت۔ پہلا تو ان میں حق تعالیٰ سے فراق کے محل میں ہے جب کہ دوسرا وصال کے محل میں اور درویش ان دونوں اوقات میں مجبور ہوتا ہے کیونکہ وصل کی حالت میں اس کا وصل حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے اور فصل کی صورت میں بھی یہ فصل حق تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے اور ان معاملات میں اختیار اور اپنا کا اکتساب ہرگز ثابت نہیں ہوا کرتا کہ اس کو درویش کی صفت قرار دے سکیں چنانچہ جب بندہ کا اپنا اختیار اس کے معاملہ میں ختم ہو جاتا ہے تو وہ جو کچھ بھی کرتا ہے وقت اور مشاہدہ حق کی وجہ سے کرتا ہے...... حضرت جنیدؒ سے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا ''میں نے ایک درویش کو جنگل میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے سخت جگہ پر بڑی مشقت اور ریاضت کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے پوچھا ''اے بھائی اس مشکل ترین مقام پر اور اس حالت میں تجھے کس چیز نے یہاں بٹھا رکھا ہے اس نے جواب دیا کہ ''میں اس لئے یہ تکلیف یہاں برداشت کر رہا ہوں کہ مجھے مقام وقت حاصل تھا جو اس جگہ مجھ سے ضائع ہو گیا ہے اب میں یہاں افسوسناک حالت میں بیٹھا ہوں میں نے پوچھا کتنے عرصہ سے تم یہاں بیٹھے ہو؟ اس نے جواب دیا ''شیخ بارہ سال ہو چکے ہیں اب آپ بھی میرے لئے دُعا کریں کہ مجھے میری مراد حاصل ہو جائے حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں وہاں سے حج کیلئے چلا گیا اور مکہ مکرمہ میں اس کیلئے دُعا کی جو قبول ہوگئی اور وہ درویش اپنی مراد کو پہنچ گیا اور میں جب واپس آیا تو پھر بھی اس کو اسی جگہ بیٹھا ہوا پایا ''میں نے پوچھا ''اے جوانمرد! جب تمہیں تمہارا کھویا ہوا وقت حاصل ہو گیا ہے تو تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ اس نے جواب دیا ''اے شیخ میں نے اس جگہ کو

اب لازم پکڑ لیا ہے کہ جو میرے لئے محل وحشت تھی کہ میں نے اپنا سرمایہ یہاں گم کیا تھا اب کیا میرے لئے یہ مناسب ہے کہ جس جگہ پر میں نے اپنا کھویا ہوا سرمایہ دوبارہ حاصل کیا ہے اور وہ میرے لئے محل انس بن گیا ہے اس کو چھوڑ دوں" شیخ! آپ سلامتی کے ساتھ تشریف لے جائیے۔ میں تو اپنی خاک کو اس جگہ کی مٹی کے ساتھ ملا دوں گا تا کہ قیامت کے دن یہاں سے ہی سر اٹھاؤں کہ یہ جگہ میری محبت کا مقام اور میری خوشیوں کا محل ہے۔ شعر:

فَکل امرِئٍ یُوتی الجمیل محبب"

وَکل مکانٍ ینبت الغری طیب"

(پس جس شخص کے ذریعہ کوئی حسین تحفہ بھیجتا ہے وہ بھی پیارا ہوتا ہے اور جو مکان عزت پیدا کرے وہ بھی پسندیدہ ہوتا ہے)

پس جو آدمی کے اپنے کسب واختیار میں نہ ہو کہ اسے تکلف کے ساتھ حاصل کر سکیں تو وہ اگر مل جائے تو اس کے بدلے میں جان دینی پڑے پھر بھی دے دینی چاہیے کیونکہ اس کو اپنے اندر پیدا کرنا اور اپنے سے دور کرنا اپنے ارادے اور اختیار میں نہیں ہوتا اور اس معاملے میں دونوں طرف برابر ہوتے ہیں اور بندے کا اپنا اختیار اس کی تحقیق میں باطل ہوتا ہے۔ اور مشائخ نے کہا ہے کہ "الوقت سیف قاطع" "(وقت ایک کاٹنے والی تلوار ہے) کیونکہ تلوار کی صفت بھی کاٹنا ہے جب کہ وقت کی صفت بھی کاٹنا ہی ہے کہ وقت ماضی اور مستقبل کے درمیان ہوتا ہے اور گزشتہ کل اور آئندہ کل کا غم دل سے محو کر دیتا ہے پس تلوار کی صحبت پر خطر ہی ہوتی ہے کہ "اما ھلک واما ملک " (یا تو تلوار سے ہلاکت ہوتی ہے یا پھر بادشاہت ملتی ہے) یعنی تلوار یا تو بادشاہ بنا دیتی ہے یا پھر ہلاک کر دیتی ہے اگر کوئی شخص ہزار سال تک بھی شمشیر کی خدمت کرے اور اپنے عزیز کندھے میں اسے حمائل کیے رکھے تو بھی کاٹنے کے وقت وہ اپنے مالک اور اس کے دشمن کی گردن میں کوئی تمیز نہیں کرتی کیونکہ اس کی صفت قہر ہے اور کسی کے اس کو اپنا لینے سے اس کی صفت قہر

زائل نہیں ہو جاتی۔

اور درویش کا حال اس کی طرف سے وقت پر دہ حالت ہوتی ہے جو اس کو مزین کرتی ہے جس طرح کہ روح جسم کو مزین کرتی ہے اور لامحالہ وقت حال کا محتاج ہوگا کیونکہ وقت کی صفائی حال کی وجہ سے ہے اور اس کا قیام بھی اسی کے ساتھ ہے، پس جب صاحب وقت، صاحب حال ہو جاتا ہے تو اس سے تغیر منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے معاملہ میں صاحب استقامت ہو جاتا ہے کیونکہ جب تک وقت حال کے بغیر ہو اس کیلئے زوال ممکن ہوتا ہے لیکن جب حال اس کے ساتھ پیوست ہو جائے تو اس کے تمام حالات وقت ہی ہو جاتے ہیں اور پھر اس پر زوال ممکن نہیں رہتا اور تجلیات الٰہی کی جو آمد ہوتی ہے وہ خفا اور ظہور کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اس سے پہلے صاحب وقت کیلئے نازل ہونے والا وقت ہوتا ہے اور متمکن وقت کیلئے غفلت جائز ہوتی ہے اور جب صاحب غفلت پر نازل ہونے والا حال ہو اور متمکن وقت تو اس پر غفلت طاری نہیں ہوتی کیونکہ صاحب وقت پر تو غفلت ممکن اور جائز ہے لیکن صاحب حال کیلئے غفلت ہرگز جائز نہیں...... اور مشائخ نے یہ بھی کہا ہے کہ **"الحالُ سکوتُ اللسان فی فنون البیان "** (حال یہ ہے کہ صاحب حال کی زبان بیان کے تمام فنون میں خاموش ہو جائے) یعنی صاحب حال اپنی حالت بیان کرنے سے خاموش ہو جائے اور اس کا معاملہ خود اس کے حال کو بیان کرے، یہی وجہ ہے کہ اس بزرگؒ نے کہا تھا کہ **"السوال عنِ الحالِ محال "** (حال کے بارے میں سوال کرنا ہی محال ہے) کیونکہ حال کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں اس لئے کہ حال نام ہی فنائے مقام کا ہے...... اور استاد ابوعلی دقاقؒ کہتے ہیں کہ اگر دنیا یا آخرت میں تجھے خوشی یا رنج حاصل ہے تو تیری اسی کیفیت کا نام وقت ہے کیونکہ یہ سب کچھ وقت کا ہی حصہ ہے جب کہ حال اس طرح نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو حق تعالیٰ کی طرف سے بندے پر وارد ہونے والی ایک واردات ہے کہ جب وہ طاری ہوتی ہے تو ہر چیز کو دل سے نفی کر دیتی ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام چونکہ

صاحب وقت تھے اس لئے کبھی تو حضرت یوسف علیہ السلام کے فراق میں آپ نے اپنی آنکھیں سفید کر لی تھیں اور ایک وقت آیا کہ وصال کی حالت میں وصال کے ذریعہ آپ بینا ہو گئے کبھی تو آپ فراق سے بال کی طرح اور کبھی گریہ سے ریشہ قلم کی طرح اور کبھی روح کے بغیر محض جسم کی طرح اور کبھی خوشی سے سراپا مسرت بن جاتے تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ صاحب حال تھے اس لئے نہ انہوں نے فراق کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ غمگین ہوئے نہ وصال کو کوئی اہمیت دی کہ کوئی خوشی محسوس کرے۔ ستارے چاند اور سورج سب ان کے حال کی مدد کرتے تھے اور آپ ہر چیز کے دیکھنے سے فارغ ہو چکے تھے حتیٰ کہ آپ جس چیز کو بھی دیکھتے اسی میں حق تعالیٰ آپ کو نظر آتا اور آپ کہتے "**لا اُحب الافلین**" (میں چھپ جانے والوں سے محبت نہیں کرتا) پس صاحب وقت کیلئے یہ جہان کبھی تو ایک جہنم بن جاتا ہے کیونکہ وہ مشاہدہ سے غیبت میں ہوتا ہے اور محبوب کو نہ پانے کی وجہ سے اس کا دل وحشت کدہ بن جاتا ہے اور کبھی حق تعالیٰ کی طرف سے ہر وقت اس کو ملنے والی نعمت کی خوشی میں اس کا دل جنت کی طرح ہو جاتا ہے پھر صاحب حال کو حجاب حاصل ہو یا مشاہدہ کی نعمت یا کوئی آزمائش تمام حالتیں اس پر یکساں ہوتی ہیں کیونکہ وہ مقام حال سے وابستہ ہوتا ہے..... پس حال حق تعالیٰ کے مطلوب کی صفت ہے جب کہ وقت مرید کا درجہ ہے۔ ایک تو وقت کی راحت میں اپنے آپ میں باہوش ہوتا ہے اور دوسرا حال کی خوشی میں حق تعالیٰ کے ساتھ مدہوش! پس ان دونوں مرتبوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مقام اور تمکین

صوفیہ کے درمیان رائج اصطلاحات میں سے مقام اور تمکین بھی ہیں ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ "مقام طالب حق کے اپنے مطلوب کے حقوق کو پوری کوشش اور نیک نیتی کے ساتھ پورے کرنے سے عبارت ہے اور مریدان حق میں سے ہر ایک کیلئے

ایک مخصوص مقام ہے کہ ابتدا میں طلب حق کیلئے وہی ان کا سبب ہوتا ہے اور باوجودیکہ طالب ان مقامات میں سے ہر مقام سے واقف ہوتا ہے اور ان سے ہر ایک پر اس کا گزر ہوتا ہے لیکن اس کا قرار ایک پر ہی جا کر ہوتا ہے کیونکہ وہ مقام اور اس کا ارادہ اس کی فطرت اور ترکیب بدنی سے متعلق ہوتا ہے نہ کہ اس کی روش اور معاملہ سے جیسا کہ اللہ عزوجل نے اپنے کلام مقدس میں ہمیں خبر دی ہے "وَمَا مِنَّا اِلَّا لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْم "(اور ہماری طرف سے ہر ایک کیلئے ایک متعین مقام ہوتا ہے) پس حضرت آدم علیہ السلام کا مقام "توبہ" تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا مقام زہد تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام تسلیم تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام انابت تھا حضرت داؤد علیہ السلام کا مقام غم تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام امید تھا حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مقام خوف تھا اور ہمارے پیغمبر ﷺ کا مقام ذکر تھا۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کو تمام مقامات میں سیر حاصل تھی لیکن بالآخر ہر ایک کا رجوع اس کے اپنے اصلی مقام کی طرف ہی تھا۔ میں نے محاسبی حضرات کا مذہب بیان کرتے ہوئے مقامات سے متعلق کچھ بیان کر دیا تھا اور حال و مقام کے درمیان فرق بیان کیا تھا۔ تاہم اس جگہ بھی اتنا بیان کئے بغیر چارہ نہیں لہذا جان لو کہ حق تعالیٰ کا راستہ تین قسم پر ہے ایک مقام دوسرا حال اور تیسرا تمکین۔ حق تعالیٰ اپنے تمام انبیاء کرام کو اپنا راستہ بیان کرنے کیلئے ہی مبعوث فرمایا تھا تاکہ وہ مقامات کا حکم بیان کریں اور اس طرح ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اتنی تعداد میں ہی مقامات کو جانتے ہوئے دنیا میں تشریف لائے تھے اور ہمارے پیغمبر ﷺ کی تشریف آوری سے ہر مقام والے کیلئے ایک حال ظاہر ہوا اور وہ اس درجہ پر پہنچ گیا کہ لوگوں کا کسب ان سے منقطع ہو گیا یہاں تک کہ لوگوں پر دین مکمل ہو گیا اور نعمت خداوندی آخری حد تک پہنچ گئی حتی کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً "(آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور

پر پسند کر لیا تو حضور علیہ السلام کے تشریف لانے اور دین مکمل ہو جانے پر متمکنوں کیلئے تمکین ظاہر ہو گئی...... اور اگر ان تمام کے احوال شمار کرنا چاہوں اور تمام مقامات کی شرح کرنا چاہوں تو اصلی مقصد سے باز رہ جاؤں گا۔ تاہم تمکین محققین کے محل کمال میں اور درجہ اعلیٰ میں اقامت پذیر ہونے سے عبارت ہے۔ پس اہل مقامات کا مقامات سے تو آگے گزرنا ممکن ہے لیکن درجہ تمکین سے آگے گزرنا محال ہے کیونکہ مقام تو مبتدی حضرات کا درجہ ہے جب کہ تمکین منتہی حضرات کی قرارگاہ ہے۔ ابتداء سے انتہا کی طرف گزر تو ہوتا ہے لیکن انتہائی مقام سے آگے گزر جانے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے مقامات راستے کی منزلیں ہیں جب کہ تمکین بارگاہ خداوندی میں قرار کا نام ہے دوستان الٰہی راستے میں غائب اور منازل میں بیگانہ ہوتے ہیں ان کا باطن بارگاہ الٰہی میں ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کے حضور اسباب و آلات ایک آفت اور سامان غیبت ہوتے ہیں...... جاہلیت کے دور میں شعرا اپنے ممدوحین کی مدح میں یہ معاملہ کرتے تھے کہ جب تک کچھ عرصہ نہ گزر جاتا شعر ادا نہیں کرتے تھے چنانچہ کوئی شاعر جب اپنے ممدوح کے سامنے پہنچتا تو اپنی تلوار کھینچ لیتا اور اپنی سواری کے پاؤں کاٹ ڈالتا اور پھر وہ تلوار بھی توڑ ڈالتا اور اس سے یہ ظاہر کرنا مراد ہوتا تھا کہ مجھے سواری کی صرف اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کے حضور پہنچنے کی مسافت طے کر سکوں اور تلوار کی ضرورت اس لئے تھی کہ میں اپنے ان حاسدوں کا مقابلہ کر کے ان کی کوششوں کو ناکام بنا سکوں جو مجھے آپ کی خدمت میں حاضری سے روکنے والے تھے اب جب میں آپ کے حضور پہنچ چکا ہوں تو مسافت طے کرنے والے آلہ کی مجھے کیا ضرورت رہ گئی ہے اس لئے سواری کو قتل کر دیا ہے تیرے دربار سے لوٹ کر جانا میں جائز نہیں سمجھتا اور تلوار کو اس لئے توڑ ڈالا ہے تاکہ آپ کی بارگاہ سے تعلق ختم کرنے کا میرے دل میں خیال بھی نہ گزرے یوں جب چند روز گزر جاتے تو پھر وہ اپنا قصیدہ پڑھ کر سناتا۔ اور حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح فرمایا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جب منازل کو

طے کر کے اور مقامات سے گزر کر تمکین کے محل تک پہنچ گئے اور تغیر کے اسباب آپ سے ساقط ہو گئے تو حق تعالیٰ نے آپ کو فرمایا "فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ وَاَلْقِ عَصَاکَ" (جوتیاں اپنے پاؤں سے نکال دیجئے اور اپنی لاٹھی پھینک دیجئے) کیونکہ یہ آلہ مسافت ہے اور حضور حق میں وصال کے بعد آلات مسافرت کی وحشت کو برداشت کرنا محال ہے پس دوستی کی ابتدا حق تعالیٰ کی طلب ہے اور اس کی انتہا بارگاہ خداوندی میں قرار پکڑنا ہے۔ پانی جب تک ندی میں ہوتا ہے جاری رہتا ہے اور سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ تو قرار پکڑ لیتا ہے اور جب قرار پکڑ لیتا ہے تو اپنا مزہ تبدیل کر لیتا ہے تاکہ جس کسی کو پانی کی ضرورت ہے وہ اس کی صحبت کی طرف رجحان نہ کرے بلکہ اس کی صحبت کی طرف میلان صرف وہ شخص کرے جس کو جواہر کی ضرورت ہو تاکہ وہ جان کی بازی لگائے اور طلب کا بوجھ پاؤں میں باندھ کر سر کو جھکائے ہوئے سمندر میں غوطہ زن ہو پھر یا تو پسندیدہ جواہر اور چھپے ہوئے قیمتی موتی حاصل کرے یا پھر اپنی جان عزیز کو ان کی جستجو میں فنا کر دے اور مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ "التمکین رفع التلوین" (تمکین تلوین کو دور کرنے کا نام ہے) اور یہ تلوین بھی صوفیہ کی اصطلاحات میں سے حال اور مقام کی طرح کی ایک اصطلاح ہے جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور تلوین سے مراد تغیر پذیر ہونا اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف جانا ہے اور مراد اس بزرگ کے مذکورہ کلمہ سے یہ ہے کہ متمکن متردد نہیں ہوتا اور اپنا تمام سامان بارگاہ خداوندی میں لے چکا ہوتا ہے اور غیر اللہ کا خیال اپنے دل سے اس طرح نکال چکا ہوتا ہے کہ نہ تو کوئی ایسا معاملہ درپیش آئے جو اس کے ظاہر میں تبدیلی پیدا کرے اور نہ کوئی حال اس پر ایسا طاری ہو جو اس کے باطن کو متغیر کر دے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام تلوین میں تھے تو حق تعالیٰ نے طور پر ایک نظر سے تجلی ڈالی تو آپ کے ہوش جاتے رہے جیسا کہ اللہ عزوجل کہتے ہیں "وَخَرَّ مُوسیٰ صَعِقاً" (اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے) ان کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ مقام تمکین میں تھے اس لئے

مکہ مکرمہ سے قاب قوسین تک عین تجلی الٰہی کے درمیان سفر کیا لیکن آپ کے حال پر کوئی تغیر واقع نہ ہوا، اور یہ درجہ سب درجات سے اعلیٰ ہے۔ واللہ اعلم

پس تمکین دو طرح کی ہوتی ہے ایک یہ کہ اس کی نسبت حق تعالیٰ کے شاہد کے ساتھ ہو اور دوسری یہ کہ اس کی اضافت اپنے ہی شاہد کی طرف ہو جس شخص کیلئے تمکین کی نسبت اس کے اپنے وجود کی طرف ہو وہ باقی الصفتہ ہوتا ہے اور جو شخص شاہد حق سے متعلق ہو وہ فانی الصفت ہوتا ہے اور فانی الصفت کیلئے مستی و ہوشیاری۔ اتصال و انفصال فنا و بقا اور وجود و عدم درست نہیں ہوتے کیونکہ ان اوصاف کے قائم ہونے کیلئے ایک موصوف ضروری ہے اور جب موصوف ہی حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں مستغرق ہو چکا ہے تو اقامت اور صفا اور صفت کا حکم بھی اس سے ساقط ہے...... اور اس معاملے میں کلام تو بہت ہے لیکن میں اسی پر اختصار کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

محاضرہ اور مکاشفہ

اور انہی اصطلاحات میں سے محاضرہ اور مکاشفہ بھی ہے اور فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ محاضرہ لطائف کے بیان میں دل کے حاضر ہونے پر واقع ہوتا ہے اور مکاشفہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں باطن کے حاضر ہونے پر بولا جاتا ہے پس محاضرہ حق تعالیٰ کی نشانیوں کے مشاہدہ میں ہوتا ہے اور مکاشفہ مشاہدات الٰہیہ کے دیکھنے میں ہوتا ہے اور آیات الٰہی کی رویت میں ہمیشہ متفکر رہنا محاضرہ کی علامت ہے جبکہ مکاشفہ کی علامت حق تعالیٰ کی عظمت کی حقیقت میں ہمیشہ متحیر رہنا ہے پھر جو آدمی افعال خداوندی میں متفکر رہتا ہے اور جو آدمی جلال الوھیت میں متحیر رہتا ہے ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک جو متفکر ہے وہ تو مقام خلت کا ردیف ہے اور جو متحیر ہے وہ محبت کا ہم نشین ہے۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام نے آسمانوں کے ملکوتی نظام میں نگاہ کی اور

اس کے وجود کی حقیقت میں تامل اور تفکر کیا تو آپ کا دل اس کے ساتھ حاضر ہوا اور فضل خداوندی کو دیکھنے سے فاعل حقیقی کا طالب ہو گیا حتیٰ کہ دل کے اس حضور نے فعل کو ہی فاعل کیلئے دلیل بنا دیا یہاں تک کہ آپ نے کمال معرفت میں فرمایا" اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا "(میں نے اپنے چہرے کو اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو صحیح پیدا کیا) اور اللہ تعالیٰ جب اپنے حبیب ﷺ کو عالم ملکوت میں لے گئے تو انہوں نے تمام چیزوں کو دیکھنے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں چنانچہ آپ نے نہ کسی فعل کو دیکھا نہ مخلوق کو دیکھا اور نہ ہی اپنے آپ کو دیکھا اس طرح آپ فاعل حقیقی کا مشاہدہ کرنے والے ہو گئے۔ پس حق تعالیٰ کے کشف میں آپ کا شوق بڑھتا ہی چلا گیا اور ایک بے قراری پر دوسری بیقراری کا اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ آپ نے دیدار الٰہی کی خواہش کی۔ دیدار اور رویت حاصل نہ ہوئی تو آپ نے قرب کا ارادہ کیا۔ جب قرب بھی ممکن نہ ہوا تو وصل کا قصد کیا اور جب وصل کی بھی صورت پیدا نہ ہوئی تو ہر چند کہ دل پر دوست حقیقی یعنی حق تعالیٰ کی پاکیزگی زیادہ ظاہر ہوتی جارہی تھی لیکن شوق پر شوق بڑھ رہا تھا نہ تو روگردانی کی کوئی صورت تھی اور نہ آگے بڑھنے کا امکان۔ آپ متحیر ہو گئے جس جگہ مقام خلت تھا وہاں حیرانی کفر نظر آئی اور جہاں مقام محبت تھا وہاں وصل شرک بن گیا اور حیرانی سرمایہ بن گئی۔ اس لئے کہ وہاں مقام خلت میں حیرانی وجود باری تعالیٰ میں تھی اور یہ شرک ہے اور مقام محبت میں حیرانی حق تعالیٰ کی کیفیت میں تھی اور یہ عین توحید ہے اور اسی معنی میں حضرت شبلیؒ کہا کرتے تھے کہ" یا دلیل المتحیرین زدنی تحیراً "(اے حیرانی میں مبتلا لوگوں کے رہنما میری حیرانی میں اضافہ کر کیونکہ مشاہدہ میں حیرانی کی زیادتی درجہ میں زیادتی اور اضافہ کا موجب ہوتی ہے...... اور حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت ابوسعید خرازؒ نے حضرت ابراہیم سعد علویؒ کے ہمراہ دریا کے کنارے حق تعالیٰ کے اس دوست کی زیارت کی تو اس سے دریافت کیا کہ" حق تعالیٰ کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے؟" اس نے

جواب دیا ''حق تعالیٰ کی طرف جانے کے راستے دو ہیں ایک عوام کا راستہ اور دوسرا خواص کا راستہ انہوں نے عرض کیا اس کی تشریح فرمایئے تو اس نے کہا ''عوام کا راستہ تو یہ ہے کہ تو اس بات پر ہو کہ کسی علت کی وجہ سے تو اسے قبول کرے اور کسی دوسری علت کی وجہ سے اسے رد کردے اور خواص وہ ہیں کہ نہ تو وہ معلل کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی علت کو...... ان حکایات کی حقیقت تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے میری مراد اس کے سوا کچھ نہیں۔ وباللہ التوفیق

قبض وبسط

ان اصطلاحات میں سے قبض اور بسط بھی ہیں جان لو کہ قبض اور بسط ان احوال میں سے دو حالتیں ہیں جن سے بندے کی تکلیف اور اختیار ساقط ہوتا ہے چنانچہ نہ ان کا آنا اختیاری ہوتا ہے اور نہ ان کا جانا انسانی کوشش کا نتیجہ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ ''(اور اللہ ہی قبض کرتا اور کھولتا ہے) پس حق تعالیٰ سے حجاب کی صورت میں دل کے بند ہو جانے کا نام قبض ہے اور بسط عبارت ہے حالت کشف و مشاہدہ میں دل کی کشادگی سے۔ اور یہ دونوں صورتیں حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کے عمل دخل کے بغیر ہوتی ہیں اور عارفان الٰہی کے حال میں قبض بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح مریدوں کے احوال میں خوف ہوتا ہے اور بسط اہل معرفت کے احوال میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح مریدوں کے احوال میں امید ہوتی ہے لیکن یہ صورت ان صوفیہ کے قول کے مطابق ہے جو قبض اور بسط کو مندرجہ بالا معنی پر محمول کرتے ہیں جب کہ مشائخ کا ایک طبقہ اس بات پر ہے کہ قبض کا رتبہ بسط کے رتبہ سے کہیں زیادہ بلند ہے اور اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں قبض کا ذکر مقدم ہے اور دوسری یہ کہ قبض میں نفس کو پگھلاتا اور اس کو مغلوب کرتا ہے جب کہ بسط میں حق تعالیٰ کی نوازش اور مہربانی ہوتی ہے تو لامحالہ صفات بشریت کو پگھلاتا اور نفس کو مغلوب کرنا زیادہ افضل ہے اس کی پرورش اور اس پر

مہربانیوں سے۔ اس لئے کہ وہ بہت بڑا حجاب ہے اور ایک دوسرا گروہ اس طرف گیا ہے کہ بسط کا مرتبہ قبض کے مرتبے سے زیادہ بلند ہے کیونکہ قرآن مجید میں قبض کے ذکر کو مقدم کرنا اس بات کی علامت ہے کہ بسط فضیلت کے اعتبار سے مقدم ہے کیونکہ عربوں کا عرف عام اور عادت یہ ہے کہ جو چیز فضیلت کے اعتبار سے موخر ہو اس کو ذکر میں مقدم کرتے ہیں جیسا کہ حق عزوجل نے فرمایا ہے کہ "فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللّٰهِ" (پس لوگوں میں سے بعض اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض درمیانہ رو ہیں اور بعض اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں) اور نیز فرمایا "اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" (بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک وصاف رہنے والوں کے ساتھ محبت کرتا ہے) اور نیز فرمایا "يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" (اے مریم اپنے پروردگار کی فرمانبردار ہو جا اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ) نیز وہ حضرات کہتے ہیں کہ بسط میں سرور ہوتا اور قبض میں ہلاکت ہوتی ہے اور عارفوں کی خوشی تو معرفت کے حاصل ہونے کے سوا کسی حالت میں نہیں ہوتی اور ان کی ہلاکت مقصود ومطلوب سے جدائی کے علاوہ کسی اور صورت میں نہیں ہوتی۔ پس محل وصل میں قرار حاصل کرنا محل فراق میں ٹھہرنے سے بہتر ہے...... اور میرے شیخ فرماتے تھے کہ قبض اور بسط دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو حاصل ہوتے ہیں کہ جب وہ معنی دل پر ظاہر ہوتے ہیں تو یا تو باطن ان سے مسرور ہوتا ہے اور نفس مغلوب اور یا پھر نفس مسرور ہوتا ہے۔ کسی انسان کیلئے تو دل کے قبض ہونے میں نفس کی کشادگی ہوتی ہے اور کسی کیلئے دل کے کشادہ ہونے میں اس کے نفس کا قبض ہوتا ہے جو شخص ان معنی کے علاوہ اس کی کوئی تعبیر کرتا ہے وہ اپنا وقت ضائع کرتا ہے...... اور یہی وجہ ہے کہ حضرت بایزیدؒ کہتے ہیں کہ "قبض القلوب فی بسط النفوس وبسط القلوب فی قبض النفوس" (دلوں کا قبض ہونا نفسوں کی کشادگی میں

ہے اور دلوں کی کشادگی نفسوں کے قبض ہونے میں ہے) پس قبض ہونے والا نفس ہر قسم کے خلل سے محفوظ ہوتا ہے اور مبسوط دل، ذلت اور خطا سے محفوظ ہوتا ہے اس لئے کہ محبت میں غیرت قابل مذمت چیز ہے اور قبض حق تعالیٰ کی غیرت کی علامت ہے اور محبوب کا محبّ کے ساتھ عتاب کرنا دوستی کی شرط ہے اور بسط اسی عتاب کرنے کی علامت ہے......اور آثار میں مشہور ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جب تک زندہ رہے روتے ہی رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تک دنیا میں رہے ہنستے ہی رہے اس لئے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام حالت قبض میں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام حالت بسط میں جب ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوتی تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کہتے ''اے عیسیٰ آپ جدائی سے بے خوف ہو گئے ہیں'' تو حضرت عیسیٰؑ جواب میں کہتے ''اے یحییٰ کیا آپ حق تعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہو چکے ہیں؟ پس نہ تو تمہارا رونا حق تعالیٰ کے حکم ازلی کو پھیر سکتا ہے اور نہ ہی میرا ہنسنا فیصلہ شدہ معاملات کو لوٹا سکتا ہے'' لاقبض وَلاَ بَسطٌ وَلاَ لَحمسَ ولاَ انسَ وَلاَ مَحوَ وَلاَ صَحوَ وَلا لحق وَلاَ عَجزَ وَلاَ جَهلَ اِلاَّ مِنَ اللّٰهِ تعالی ''(بندے کا قبض اور بسط ملنا اور محبت کرنا، مدہوش ہونا اور ہوشمند ہونا۔ وصال حاصل کرنا اور عاجز رہنا......اور جاہل ہونا نہیں ہے مگر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا مگر وہی جو اللہ کی طرف سے مقرر کیا جا چکا ہے۔

انس و ہیبت

جان لو اللہ تعالیٰ تمہیں سعادت مند بنائے کہ انس اور ہیبت بھی صوفیہ کی اصطلاحوں میں سے ہیں اور ہیبت اور انس راہ حق میں چلنے والوں کے احوال میں سے دو حالتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کے دل پر جلالی شہود کے ساتھ تجلی کرتے ہیں تو اسے اس حالت میں ہیبت نصیب ہوتی ہے اور جب بندے کے دل پر اپنے جمالی

شہود کے ساتھ تجلی کرتے ہیں تو اسے انس حاصل ہوتا ہے حتی کہ اہل ہیبت جلال خداوندی سے مشقت میں ہوتے ہیں اور اہل انس جمال الٰہی سے خوشی اور مسرت میں ہوتے ہیں پس اس دل میں جو جلال خداوندی سے محبت کی آگ میں جل رہا ہو اور اس دل میں جو جمال الٰہی سے مشاہدہ کے نور میں روشن ہو چکا ہو بڑا ہی فرق ہے..... پس مشائخ کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ ہیبت عارفان الٰہی کا درجہ ہے جب کہ انس مریدان حق کا۔ کیونکہ جس شخص کو بھی بارگاہ الٰہی میں اور حق تعالیٰ کے اوصاف کی پاکی بیان کرنے میں جتنا زیادہ وصول حاصل ہوگا اس کے دل پر ہیبت کا غلبہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور انس سے اس کی طبیعت اتنی ہی نفرت کرنے والی ہوگی اس لئے کہ انس تو ہم جنسوں سے ہوتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے ساتھ ہم جنس اور ہم شکل ہونا بندے کیلئے محال ہے تو حق تعالیٰ کے ساتھ انس کی صورت بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پھر حق تعالیٰ کی طرف سے بھی مخلوق کے ساتھ انس محال ہوگا اور اگر انس ہوا بھی تو وہ اس کے ذکر کے ساتھ ہی ممکن ہو سکتا ہے اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ ذکر حق ''ذات حق کا غیر ہے کیونکہ یہ بندے کی صفات میں سے ہے اور محبت میں ذات محبوب کے غیر کے ساتھ آرام گیر ہونا جھوٹ محض دعویٰ اور غرور باطل ہے اور پھر ہیبت حق تعالیٰ کی عظمت کے مشاہدہ سے ہوتی ہے اور عظمت حق تعالیٰ کی صفت ہے..... اور اس بندے میں جس کا کام اپنی طرف سے اور اپنے ہی ساتھ ہو..... اور اس بندے میں جس کا کام حق تعالیٰ کی بقا کے ساتھ اپنی فنا سے ہو۔ بڑا ہی واضح فرق ہے..... حضرت شبلیؒ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ''میں اتنا عرصہ یہی سمجھتا رہا ہوں کہ میں حق تعالیٰ کی محبت میں خوشی حاصل کر رہا ہوں اور اس کے مشاہدہ سے انس حاصل کئے ہوئے ہوں لیکن اب مجھے علم ہوا کہ انس تو ہم جنس کے علاوہ کسی سے ہو ہی نہیں سکتا..... پھر ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ ''ہیبت، فراق اور سزا کا قرینہ ہے جب کہ انس وصل اور رحمت کا نتیجہ ہوتا ہے تو دوستوں کو ہیبت جیسی حالتوں سے محفوظ ہی رہنا اور انس کے ساتھ ہم نشین رہنا چاہئے کیونکہ لامحالہ انس

محبت کا تقاضہ کرتا ہے اور جس طرح محبت کیلئے ہم جنس ہونا محال ہے اسی طرح انس کیلئے بھی محال ہے۔

میرے شیخؒ کہتے تھے کہ مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ انس ممکن نہیں ہوتا۔ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے "اِنَّ عبادی" (بے شک میرے بندے) "قُلْ لِعِبَادِیْ" (میرے بندوں سے کہہ دیجئے) "وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ" (اور جب آپ سے میرے بندے سوال کرتے ہیں) "یَا عِبَادِیْ لاَ خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلاَ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" (اے میرے بندو! آج کے دن تم پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے) لامحالہ جب بندہ اپنے اوپر حق تعالیٰ کی اتنی مہربانیوں کو دیکھتا ہے تو اس سے محبت کر لیتا ہے اور جب اس کو دوست بنالیتا ہے تو اس سے انس کر لیتا ہے اور اس لئے بھی کہ دوست سے ہیبت محسوس کرنا بیگانگی کی دلیل ہے اور انس یگانگی و اپنائیت کی علامت اور انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر انعام کرنے والے کے ساتھ انس کرتا ہے اور جب حق تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس قدر نعمتیں اور ہمیں اس کی معرفت حاصل ہے تو محال ہے کہ ہم اس سے ہیبت کی بات کریں...... اور میں علی بن عثمان ہجویری کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے باوجود یہ دونوں گروہ راستی اور صحبت پر ہیں کیونکہ ہیبت کا غلبہ نفس اور اس کی خواہشات اور اس سے اوصاف بشریت کو فنا کرنے کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ انس کا غلبہ دل کے ساتھ اور دل میں معرفت کی پرورش کے ساتھ ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے جلال کی تجلی سے دوستوں کے نفس کو فنا کرتے ہیں اور اپنے جمال کی تجلی سے ان کے دل اور باطن کو باقی کر دیتے ہیں...... پس جو لوگ اہل فنا میں سے ہیں وہ ہیبت کو مقدم سمجھتے ہیں اور جو حضرات اہل بقا ہیں وہ انس کو فضیلت دیتے ہیں۔ اس کی شرح اس سے قبل فنا اور بقا کے باب میں بھی گزر چکی ہے۔

قہر و لطف

انہی اصطلاحات میں سے قہر اور لطف بھی ہیں اور فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں وہ ہیں کہ جن سے یہ لوگ اپنے احوال کی تعبیر کیا کرتے ہیں اور ان کے نزدیک قہر سے مراد تمام خواہشات کو فنا کرنے اور نفس کو اپنی تمام آرزوؤں سے باز رکھنے میں حق تعالیٰ کی تائید ہے۔ کیونکہ ان کی مراد اسی چیز میں ہے اور لطف سے ان کی مراد باطن کی بقا مشاہدے کے دوام اور درجہ استقامت میں حال کے قرار میں حق تعالیٰ کی تائید ہے حتیٰ کہ صوفیہ کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے مراد کا حاصل ہو جانا کرامت ہے اور یہ اہل لطف حضرات تھے جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ کرامت یہ ہے کہ حق تعالیٰ بندے کو اپنی مراد اور مرضی کے ساتھ اس کی اپنی مراد سے روک دے اور بندے کو اس کی نامرادی میں مقہور و مغلوب کر دے۔ چنانچہ اگر وہ تشنگی کی حالت میں دریا پر جائے تو وہ بھی خشک ہو جائے..... کہتے ہیں کہ بغداد میں بڑے رتبے کے فقرا میں سے دو درویش تھے ایک ان میں سے صاحب قہر تھا اور دوسرا صاحب لطف دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ جھگڑتے ہی رہتے تھے اور ہر ایک اپنے حال کو دوسرے کے حال پر ترجیح دیتا تھا۔ ایک ان میں سے کہتا کہ بندے پر حق تعالیٰ کا لطف تمام چیزوں سے اشرف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے "اَللّٰهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهٖ" (اللہ اپنے بندوں پر بڑا لطف کرنے والا ہے) اور دوسرا کہا کرتا تھا کہ بندے پر حق تعالیٰ کا قہر تمام چیزوں سے زیادہ کامل ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ" (اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے) ان کے درمیان یہ بحث طویل ہو گئی یہاں تک کہ اس صاحب لطف درویش نے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن مکہ مکرمہ نہ پہنچا بلکہ ایک جنگل میں بیٹھ کر ریاضت میں مشغول ہو گیا کئی سال تک کسی کو اس کی کوئی خبر نہ ہوئی حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک شخص مکہ مکرمہ سے واپسی پر یہاں سے

گزرا تو اس درویش کو سر راہ دیکھا اس درویش نے کہا ''اے بھائی! جب تم عراق پہنچو تو بغداد کے محلہ کرخ میں میرے اس دوست سے کہنا کہ ''اگر تم جنگل کو اس کی مشقتوں کے باوجود کرخ بغداد کی طرح اس کے عجائب کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہو تو یہاں آ جاؤ! کہ یہ جنگل بھی میرے لئے کرخ بغداد کی طرح ہی ہے..... اس درویش نے جب کرخ بغداد میں پہنچ کر اس درویش کے اس دوست کو تلاش کر کے اس کا پیغام دیا تو اس رفیق نے کہا ''جب تم واپس جاؤ تو اسے کہہ دینا کہ اس چیز میں کوئی شرف اور عزت نہیں کہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے پر مشقت جنگل کو کرخ بغداد کی طرح کر دیا ہے تا کہ تم جنگل کی تکلیفوں سے تنگ آ کر) درگاہ خداوندی سے بھاگ ہی نہ جاؤ بلکہ شرف تو اس میں ہے کہ حق تعالیٰ نے کرخ بغداد کو ہی اپنی تمام تر نعمتوں اور عجائب کے باوجود ہمارے لئے پر مشقت جنگل کی طرح کر دیا ہے اور ہم اسی میں خوش وخرم ہیں.....' اور حضرت شبلیؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ''آپ اپنی مناجات میں کہا کرتے تھے بار خدایا! اگر آپ آسمان کو میری گردن کا طوق، زمین کو میرے پاؤں کی زنجیر اور تمام جہان کو میرے خون کا پیاسا بنا دیں تب بھی میں آپ سے منہ نہ موڑوں گا..... اور میرے شیخؒ نے بیان کیا تھا کہ ایک سال اولیاء اللہ کا اجتماع ایک جنگل میں ہوا تھا اور میرے شیخ حضرت حصریؒ مجھے اپنے ہمراہ لے گئے تھے میں نے اولیاء کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ان میں سے ہر بزرگ ایک تخت پر آ رہا تھا اور کسی گروہ کو تخت پر بٹھا کر لایا جا رہا تھا اور کوئی گروہ اڑتا ہوا چلا آ رہا تھا ان میں سے جو کوئی بھی آتا حضرت حصریؒ ان کی طرف قطعاً کوئی التفات نہ فرماتے یہاں تک کہ میں نے ایک جوان کو دیکھا جس کی جوتیاں پھٹی ہوئی اور لاٹھی ٹوٹی ہوئی تھی پاؤں بیکار ہو چکے تھے سر برہنہ تھا اعضا جلے ہوئے اور جسم نحیف و کمزور ہو چکا تھا۔ وہ جب سامنے نمودار ہوا تو حضرت حصریؒ بڑی تیزی سے اٹھے اور اس کا استقبال کیا اور اس کو بلند مقام پر لا کر بٹھایا'' میرے شیخ کہتے ہیں کہ ''میں بڑا حیران ہوا اور اس اجتماع کے ختم ہو جانے کے بعد اپنے شیخ سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا

کہ ''وہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے ایسا ولی تھا جو ولایت کے تابع نہ تھا بلکہ ولایت اس کے تابع ہے اور وہ کرامات کی طرف بالکل کوئی توجہ نہیں دیتا...... بہر حال جو کچھ ہم اپنے لئے خود اختیار کرتے ہیں وہ ہمارے لئے مصیبت ہوتا ہے اور میں صرف اسی چیز کی خواہش کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لئے چاہتے ہیں تا کہ حق تعالیٰ خود ہی اس چیز میں میری حفاظت کریں اور میرے نفس کے شر سے مجھے بچائے رکھیں، اگر اللہ تعالیٰ مجھے اپنے قہر میں رکھیں تو میں لطف کی تمنا نہ کروں گا اور اگر اپنے لطف میں رکھیں تو میں قہر کا ہرگز ارادہ نہ کروں گا کیونکہ ہمیں حق تعالیٰ کے اختیار پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔

نفی و اثبات

ان اصطلاحات میں سے نفی اور اثبات بھی ہیں اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مشائخ طریقت رحمہم اللہ تائید الٰہی کے اثبات اور صفات بشریت کے محو ہو جانے کو نفی و اثبات کہتے ہیں۔ یعنی نفی سے صفات بشریت کی نفی مراد لیتے ہیں اور اثبات سے حق تعالیٰ کے اوصاف حقیقی اور ان کے غلبے کا اثبات مراد لیتے ہیں کیونکہ کل کا مٹ جانا محو کہلاتا ہے اور کل کی نفی صفات پر ہی بولی جاتی ہے کیونکہ صفات بشریت کے موجود ہوتے ہوئے ذات پر نفی متصور نہیں ہوتی۔ پس بری صفات کی نفی اور قابل تعریف صفات کا اثبات ہونا چاہئے، یعنی حق تعالیٰ کی محبت میں معنی کو ثابت کرتے ہوئے دعویٰ کی نفی کی جائے کیونکہ دعویٰ نفس کی رعونتوں میں سے ہے اور صوفیا کی عادت کے مطابق جب ان کی بشری صفات حق تعالیٰ کی صحبت کے غلبہ سے مغلوب ہو جاتی ہیں تو وہ یوں کہا کرتے ہیں کہ ''بقائے حق کے اثبات سے صفات بشریت کی نفی ہو گئی'' اس بارے میں اس سے قبل باب فقر و صفوت اور باب فنا و بقا میں گفتگو ہو چکی ہے لہذا اب اسی پر اختصار کرتا ہوں...... نیز صوفیہ کہتے ہیں کہ ''اس سے حق تعالیٰ کے اختیار کو ثابت کرنے اور بندہ کے اختیار کو نفی کرنا مراد ہے اسی لئے تو اس

باتوفیق بزرگ نے کہا تھا ''اختیار الحق بعبدہ مع علمہ بعبدہ خیر'' مِن اختیار عبدہ لنفسہٖ مع جھلہ بربہٖ '' (حق تعالیٰ کا اپنے بندے کو جانتے ہوئے اس کیلئے کسی چیز کو اختیار کرنا بہتر ہے اس بات سے کہ بندہ اپنے رب کی مرضی سے جاہل ہوتے ہوئے اپنے لئے کسی چیز کو اختیار کرے) کیونکہ محبت نام ہے محبوب کے اختیار پر اپنے اختیار کو نفی کر دینے کا اور یہ بات تو سب کے نزدیک قابل تسلیم ہے..... میں نے حکایات میں پڑھا ہے کہ ایک درویش دریا میں ڈوب رہا تھا کہ کسی شخص نے کہا ''بھائی کیا تم غرق ہونے سے بچنا چاہتے ہو؟ درویش نے جواب دیا ''نہیں'' اس نے پوچھا ''تو کیا تم غرق ہو جانا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا ''نہیں'' وہ شخص کہنے لگا ''عجیب بات ہے کہ نہ ہلاکت کو اختیار کرتے ہو اور نہ نجات کو درویش نے کہا ''مجھے نجات کو اختیار کرنے سے کیا سروکار ہے کہ میرا اختیار تو وہی ہے جو حق تعالیٰ میرے لئے اختیار کرے..... مشائخ نے کہا ہے کہ محبت میں کمترین درجہ یہ ہے کہ اپنے اختیار کو نفی کر دیا جائے پس حق تعالیٰ کا اختیار تو ازلی ہے اس کی نفی ممکن نہیں ہو سکتی جب کہ بندے کا اختیار عارضی ہے کہ اس کی نفی ہو سکتی ہے، اس لئے اپنے عارضی اختیار کو پاؤں تلے کچل ڈالنا چاہئے تا کہ ازلی اختیار بقا حاصل کر لے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر حالت انبساط میں تھے کہ حق تعالیٰ سے دیدار کی تمنیٰ کرتے ہوئے اپنے اختیار کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور کہا ''ربِ ارنی '' (اے میرے رب مجھے اپنا آپ دکھا) حق تعالیٰ نے کہا ''لَنْ ترانی '' (تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی ''بار خدایا تیرا دیدار حق ہے اور میں اس کا مستحق ہوں پھر روکا کیوں جا رہا ہے؟'' فرمان آیا کہ ''ہاں دیدار تو حق ہے لیکن محبت میں اپنا اختیار باطل ہے..... اور اس بارے میں کلام تو بہت ہے لیکن اس سے زیادہ بیان کرنا میرا مقصد نہیں تھا تا کہ تمہیں علم ہو جائے کہ صوفیہ کے ہاں نفی اور اثبات سے مراد کیا ہے ''وبا للّٰہ التوفیق '' اس بارے میں جمع وتفرقہ فنا وبقا اور غیبت وحضور کا پورا ذکر صوفیہ کے مذاہب کے بیان میں وہاں گزر چکا ہے جہاں میں

نے صحو وسکر کا ذکر اور اس بارے میں اشکال وغیرہ بیان کئے تھے۔ تفصیل کیلئے اسی طرف رجوع کرنا چاہئے کیونکہ ان سب کا بیان وہاں موجود ہے تاہم ضروری مقدار میں نے یہاں بھی بیان کر دی ہے تاکہ ہر بزرگ کا مذہب شرح کے ساتھ بیان ہو جائے۔ واللہ اعلم

مسامرہ محادثہ

انہی اصطلاحات میں سے مسامرہ ومحادثہ بھی ہیں اور فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں طریق حق کے کاملوں کے احوال میں سے دو حالتوں سے عبارت ہیں۔ محادثہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک باطنی راز ہے جسے بیان کرنے سے زبان قاصر ہے اور مسامرہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ باطنی راز کو چھپانے کی خوشی کا نام ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ مسامرہ بندے کو حق تعالیٰ کے ساتھ رات کو اور محادثہ دن کو حاصل ہونے والے ایک وقت کا نام ہے کہ اس وقت میں بندے کو حق تعالیٰ کے ساتھ ظاہری اور باطنی سوال وجواب کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے اسی لئے رات کی مناجات کو مسامرہ اور دن کی دُعاؤں کو محادثہ کہتے ہیں پس دن کی حالت تو ظاہر اور کشف پر مبنی ہوتی ہے اور رات کی کیفیت پوشیدہ ہوتی ہے اور محبت حق میں مسامرہ کی کیفیت محادثہ سے زیادہ کامل ہوتی ہے اور مسامرہ کا تعلق تو ہمارے پیغمبر ﷺ کے حال سے تھا کہ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ آپ کو راز و نیاز کا وقت حاصل ہو تو جبرئیل علیہ السلام کو براق دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا تاکہ آپ کو رات کے وقت مکہ معظمہ سے "قاب قوسین" تک پہنچا دیں اس طرح آپ حق تعالیٰ سے اپنا راز کہیں اور حق تعالیٰ سے کلام سنیں۔ چنانچہ جب آپ آخری منزل تک پہنچ گئے تو آپ کی زبان مبارک جلال خداوندی کے مشاہدے کی وجہ سے خاموش ہو گئی اور آپ کا دل عظمت الٰہی کی حقیقت میں حیران ہو گیا اور آپ کا علم ذات حق تعالیٰ کے ادراک سے عاجز آ گیا اور آپ کی زبان اس کیفیت کو بیان کرنے سے درماندہ ہو گئی تو آپ نے اعترافاً کہا "لا

اُحْصِی ثناءً علیک" (میں تیری حمد وثنا کو بیان نہیں کر سکتا) جب کہ محادثہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حال سے تھا کہ جب انہوں نے خواہش کی کہ حق تعالیٰ کے ساتھ انہیں سوال و جواب کا وقت حاصل ہو تو آپ چالیس روز کے وعدہ اور انتظار کے بعد دن کے وقت کوہ طور پر حاضر ہوئے اور کلام الٰہی کو سنا حتی کہ خوش ہو گئے پھر دیدار کا سوال کیا لیکن اس مراد سے عاجز رہے اور ہوش آپ کے جاتے رہے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہا "تُبْتُ الیک" (میں اپنے خیال سے تیری بارگاہ میں رجوع کرتا ہوں) یہ سب کچھ اس لئے ہوا تاکہ اس ذات میں جسے لایا گیا تھا جیسا کہ فرمایا "سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا" (پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے محمد ﷺ کو رات کے وقت) اور اس شخصیت میں جو خود اپنی خواہش سے آئے تھے جیسا کہ فرمایا "وَلَمَّا جَاءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا" (اور جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے مقام وعدہ پر آئے) فرق ظاہر ہو جائے..... پس رات دوستوں کی خلوت کا وقت ہے جبکہ دن بندگان خدا کی خدمت کا وقت ہے اور یہ ضروری امر ہے کہ جب بندہ مقررہ حد سے تجاوز کر جائے تو اسے ڈانٹ پلاتے ہیں لیکن دوست کیلئے کوئی حد ہی نہیں ہوتی کہ وہاں سے تجاوز کرنے پر وہ مستحق ملامت قرار پائے کیونکہ دوست جو کچھ بھی کرتا ہے وہ دوست کیلئے پسندیدہ ہی ہوتا ہے۔

علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

ان اصطلاحات میں سے علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین بھی ہیں اور فرق ان میں یہ ہے کہ "جان لو کہ اصولی طور پر ان تمام اصطلاحات سے مراد یہ ہے کہ بندے کو اپنے معلوم کا علم حاصل ہو اور اپنے معلوم کے بیان کی صحت پر یقین کے بغیر اسے جاننا علم نہیں ہوتا اور جب علم حاصل ہو جاتا ہے تو پوشیدہ چیز بھی اس کی وجہ سے ظاہر کی طرح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کل قیامت کے دن مومن لوگ جب حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے تو اسی شکل و

صورت میں دیکھیں گے جس میں آج اس کو اپنے ذہن میں جانتے ہیں اگر اس کے برخلاف دیکھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو قیامت کے دن انہیں دیدار ہی صحیح حاصل نہیں ہوا یا پھر آج دنیا میں حق تعالیٰ کا صحیح علم انہیں حاصل نہیں ہوا۔ اور یہ دونوں صورتیں توحید کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ آج دنیا میں مخلوق کا علم حق تعالیٰ کے بارے میں درست ہے اور کل قیامت میں ان کا دیدار کرنا صحیح ہوگا۔ پس مومن لوگوں کا توحید الٰہی کے بارے میں علم الیقین، عین الیقین کی طرح ہوگا اور حق الیقین، علم الیقین کی طرح اور جو صوفیہ حق تعالیٰ کی رویت میں حق تعالیٰ کا پورا پورا علم حاصل ہونے کو عین الیقین کہتے ہیں یہ محال ہے اس لئے کہ رویت بھی سماع وغیرہ کی طرح حصول علم کا ایک آلہ اور سبب ہے جب پورا پورا علم سماع سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ تو رویت سے حاصل ہونا بھی محال ہے پس ان حضرات کی مراد اس علم الیقین سے حق تعالیٰ کے احکام اور اوامر کے ذریعہ دنیا کے معاملات کا علم ہے اور عین الیقین سے مراد نزع کی کیفیت اور دنیا سے جانے کے وقت کا علم ہے اور عین الیقین سے جنت میں دیدار خداوندی کے ظاہر ہونے اور اس کے احوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا علم مراد ہے۔ پس علم الیقین علما امت کا مقام ہے کہ وہ ہی حق تعالیٰ کے احکام پر استقامت کے ساتھ جمے رہتے ہیں اور عین الیقین عارفان الٰہی کا مقام ہے کہ وہ بروقت موت کیلئے مستعد رہتے ہیں اور حق الیقین دوستان الٰہی کی فنا گاہ ہے کہ وہی تمام موجودات سے اعراض کئے ہوئے ہوتے ہیں۔

عارفان الٰہی کا مقام ہے کہ وہ بروقت موت کیلئے مستعد رہتے ہیں اور حق الیقین دوستان الٰہی کی فنا گاہ ہے کہ وہی تمام موجودات سے اعراض کئے ہوئے ہیں پس علم الیقین محنت ومجاہدہ سے حاصل ہوتا ہے اور عین الیقین محبت الٰہی سے حاصل ہوتا ہے اور حق الیقین مشاہدہ حق سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں سے ایک علم الیقین عام ہے اور دوسرا عین الیقین خاص ہے اور تیسرا حق الیقین خاص الخاص ہے۔ واللہ اعلم۔

علم و معرفت

انہی اصطلاحات میں سے علم اور معرفت بھی ہیں علمائے اصول نے علم اور معرفت کے درمیان فرق نہیں کیا بلکہ ان دونوں کو ایک ہی کہا ہے سوائے اس بات کے کہ انہوں نے کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو عالم کہنا چاہئے لیکن عارف نہیں کہنا چاہئے کیونکہ نص قرآنی میں حق تعالیٰ کو کہیں بھی عارف نہیں کہا گیا تاہم مشائخ طریقت اس علم کو جو عمل اور حال کے ساتھ ملا ہوا ہو اور عالم اپنے حال کو اس سے تعبیر کرے تو اس کو معرفت کہتے ہیں اور اس کے عالم کو عارف کہتے ہیں اور ہر اس علم کو جو معنی سے مجرد ہو عمل سے خالی ہو اس کو علم کہتے ہیں اور اس کے جاننے والے کو عالم کہتے ہیں پس جو شخص کسی چیز کے معنی اور اس کی حقیقت کو جانتا ہو اس کو عارف کہتے ہیں اور جو شخص فقط عبارت کو اور اس کے معنی کے بغیر اس کے حفظ کو جاننے والا ہو اس کو عالم کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب صوفی لوگ اپنے دوسرے ہمعصر صوفیوں کی تحقیر کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو دانشمند کہتے ہیں عوام کو یہ بات بری لگتی ہے حالانکہ ان کا مقصد کسی کو عالم کہنے سے اس کی برائی بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان کی مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا "لِاَنَّ العالِم قائِم" بنفسِہ والعارفُ قائِم" بربہ" (اس لئے کہ عالم اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور عارف اپنے رب کے ساتھ قائم ہوتا ہے) اس بارے میں "کشف حجاب معرفت" میں کافی گفتگو ہو چکی ہے اور اس جگہ اتنا ہی کافی ہے۔

شریعت و حقیقت

انہی اصطلاحات میں سے شریعت اور حقیقت بھی ہیں اور صوفیہ کے ہاں یہ دونوں ایسی عبارات ہیں کہ ان میں سے ایک ظاہری حال کی درستی کو بیان کرتی ہے اور دوسری باطنی حال کی اقامت وصحت بیان کرتی ہے ان کے معنی میں دو گروہ غلطی پر ہیں ایک

علمائے ظاہر کا جو کہتے ہیں کہ ہم ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے کیونکہ شریعت بعینہ حقیقت ہے اور حقیقت بعینہ شریعت اور دوسرا گروہ ملحدوں کا جو ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے بغیر ہی درست سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب حقیقت کی حالت ظاہر ہو جائے تو شریعت اٹھ جاتی ہے اور یہ قول مشتبہین، قرامطہ، شیعہ اور وسوسہ ڈالنے والوں کا ہے...... اور حکم میں شریعت کے حقیقت سے الگ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تصدیق ایمان کے معاملہ میں قول سے جدا ہے اور اصل میں تصدیق کے قول سے جدا نہ ہونے پر دلیل یہ ہے کہ تصدیق بغیر زبانی قول کے ایمان نہیں ہوتی اسی طرح محض زبانی اقرار تصدیق کے بغیر ایمان نہیں ہوتا اور قول و تصدیق کے درمیان فرق بڑا واضح ہے..... پس حقیقت اس معنی سے عبارت ہے جس پر نسخ درست نہیں ہوتا اور حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے جہانوں کے فنا ہونے کے وقت تک اس کا حکم ایک طرح کا رہتا ہے مثلاً حق تعالیٰ کی معرفت اور اپنے معاملات کو خلوص نیت کے ساتھ درست رکھنا...... اور شریعت اس معنی سے عبارت ہے کہ جس پر نسخ اور تبدیلی روا ہو۔ جیسے کہ احکام اور اوامر خداوندی..... پس شریعت بندے کا اپنا فعل ہوگا اور حقیقت حق تعالیٰ کی نگہبانی اور حفظ و امان کا نام ہوگا پس حقیقت کے وجود کے بغیر شریعت کا قائم کرنا محال ہوتا ہے اور اسی طرح حقیقت کا قیام بھی شریعت کی حفاظت کے بغیر محال ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک شخص روح کی وجہ سے زندہ ہوتا ہے اور جب روح اس سے جدا ہو جاتی ہے تو وہ مردار ہو جاتا ہے اور روح اس کے ساتھ اس طرح ہوتی ہے کہ جسم اور روح دونوں کی قدر و قیمت ایک دوسرے کے ساتھ ملے رہنے سے ہوتی ہے اسی طرح شریعت، حقیقت کے بغیر ریا کاری ہوتی ہے اور حقیقت، بغیر شریعت کے منافقت ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' (جو لوگ ہمارے بارے میں محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے کی رہنمائی کرتے ہیں) مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت اس کی حقیقت ایک تو ان میں سے بندے کا اپنی ذات پر ظاہری

احکام کی حفاظت کرنا ہے جب کہ دوسرا حق تعالیٰ کا بندے پر اس کے باطنی احوال کی حفاظت کرنا ہے۔ پس شریعت بندے کے دائرہ کسب ومحنت سے تعلق رکھتی ہے اور حقیقت کا تعلق عطیہ خداوندی سے ہے۔ صوفیہ کے درمیان رائج اصطلاحات میں ایک دوسری قسم کی اصطلاحات بھی ہیں جو ان کے کلام میں استعارہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ان کی تفصیل اور شرح بہت مشکل ہے تاہم میں اس نوع کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہوں۔

اصطلاحات کی دوسری نوع

الحق: حق سے صوفیائے کرام کی مراد خداوند تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی میں سے یہ بھی ایک نام ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے ''**ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَق**'' (یہ بات اس لئے ہے کہ اللہ حق ہے)

الحقیقہ:۔ اس لفظ سے صوفیہ کی مراد بندے کا وصل الٰہی کے محل میں اقامت پذیر ہونا اور اس کے باطن کا حق تعالیٰ کے مقام تنزیہہ میں ٹھہرنا ہے۔

الخطرات ----- احکام تفرقہ میں سے جو کچھ دل پر گزرے۔

الوطنات ----- معارف الٰہیہ میں سے جو کچھ باطن میں جاگزیں ہو۔

الطمس ----- اپنی ذات کی اس طرح نفی کرنا کہ اس کا اثر باقی نہ رہے۔

الرمس ----- کسی چیز کی اصل کا دل سے نفی کرنا۔

العلائق ----- وہ اسباب جن کے ساتھ طالبان حق تعلق پیدا کریں اور اپنے مقصود سے قاصر ہو جائیں۔

الوسائط ----- وہ اسباب جن سے تعلق پیدا کر کے طالبان حق مراد کو پہنچتے ہیں۔

الزوائد ----- دل میں انوار خداوندی کی کثرت۔

الفوائد ----- باطن کا اپنے لئے ضروری چیزوں کا ادراک کر لینا۔

الملجاء ----- دل کا اپنی مراد کو حاصل کر لینے کا اعتماد۔

المنجاء ----- دل کا محل آفت سے خلاصی پانا۔

الکلیہ -----اوصاف بشریت کو مکمل طور پر پالینا۔

اللوائح ----- اوصاف بشریت کی نفی سے مراد کا ثابت کرنا۔

اللوامع ----- دل پر نور کا اپنے فوائد کو باقی رکھتے ہوئے ظاہر ہونا۔

الطوالع ----- دل پر معارف الہیہ کے انوار کا طلوع ہونا۔

الطوارق-----رات کی مناجات میں دل پر بشارت یا زجر کے ساتھ کیفیت کا وارد ہونا۔

اللطائف-----حال کی باریکیوں سے دل میں لطیف اشارہ پیدا ہونا۔

السرّ ----- محبت کے احوال کو مخفی رکھنا۔

النجویٰ ----- غیر کی اطلاع سے آفات کو مخفی رکھنا۔

الاشارہ-----زبانی عبارت کے بغیر غیر کو مراد کی خبر دینا۔

الایماء ----- عبارت اور اشارہ کے بغیر تعریفاً خطاب کرنا۔

الوارد -----معانی کا دل میں وارد ہونا۔

الانتباہ -----دل سے غفلت کا زائل ہونا۔

الاشتباہ-----حق اور باطل کے درمیان حال کا مشتبہ ہونا۔

القرار -----حقیقت حال سے تردد کا زائل ہو جانا۔

الانزعاج-----وحدانیت کے حال میں دل کا حرکت کرنا۔

صوفیہ کی بعض اصطلاحات کے یہ معنی تھے جو اختصار کے طور پر بیان ہوئے۔ واللہ اعلم۔

اصطلاحات کی تیسری نوع

تیسری قسم کی اصطلاحات وہ ہیں جنہیں یہ حضرات توحید الٰہی اور حقائق میں اپنے اعتماد کو استعارے کے بغیر بیان کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی اصطلاح ہے۔

العالم...... یہ اصطلاح حق تعالیٰ کی مخلوقات سے عبارت ہے اور صوفیہ کہتے ہیں کہ اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ پچاس ہزار عالم ہیں۔ جب کہ فلسفی لوگ کہتے ہیں کہ عالم صرف دو ہیں ایک عالم علوی اور دوسرا عالم سفلی اور علمائے اصول کہتے ہیں کہ عرش سے لے کر زمین کے نیچے تک جو کچھ ہے وہ تمام ایک ہی عالم ہے۔ غرضیکہ تمام عالم مختلف جنسوں کا مجموعہ ہے اور اہل طریقت بھی عالم ارواح اور عالم نفوس میں عالم کو تقسیم کرتے ہیں لیکن ان کی مراد وہ نہیں جو فلاسفہ کی ہے کیونکہ ان کی مراد ارواح اور نفوس کا اجتماع ہے۔

المحدث ------ وہ جو وجود میں متاخر ہو یعنی پہلے نہ تھا اور بعد میں پیدا ہوا۔

القدیم ------ جو اپنے وجود میں ہمیشہ سے ہے اور جس کی ذات تمام موجودات سے پہلے تھی اور یہ خداوند تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

الازل ------ وہ جس کی ابتداء نہ ہو۔

الابد ------ وہ جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

الذات ------ کسی چیز کا وجود اور اس کی حقیقت۔

الصفتہ ------ جو موصوف نہ بن سکے کیونکہ وہ خود قائم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کی صفت ہوتا ہے۔

الاسم ------ جو مسمٰی نہ ہو۔

التسمیہ ------ جو مسمٰی کی خبر (نام) ہو۔

النفی ------ جو ہر غیر موجود اور قابل نفی چیز کے عدم کا تقاضہ کرے۔

الاثبات ------جو ہر موجوداور قابل وجود چیز کا اثبات کرے۔

الشیئان ------وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے کا وجود جائز ہو۔

الضدان ------وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کے ہوتے ہوئے ایک ہی حال میں درست نہ ہو۔

الغیر ان ------وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کے فنا کے ساتھ جائز ہو۔

الجوہر ------کسی چیز کا اصل جو بذات خود قائم ہو۔

العرض ------جو کسی جوہر کے ساتھ قائم ہو۔

الجسم ------جو پراگندہ اجزا سے مرکب ہو۔

السوال ------کسی حقیقت کا طلب کرنا۔

الجواب ------مضمون سوال کی خبر دینا۔

الحسن ------جو حکم کے مطابق ہو۔

القبح ------جو حکم کے مخالف ہو۔

السفہ ------حکم کا ترک کرنا۔

الظلم ------کسی چیز کو اس کے محل کے علاوہ جگہ پر رکھنا۔

العدل ------ہر چیز کو اس کے اپنے مقام و محل میں رکھنا۔

الملک ------وہ جس کے کسی کام پر اعتراض نہ کر سکیں۔

مختصراً یہ وہ اصطلاحیں ہیں کہ جن کے بغیر طالب حق کیلئے کوئی چارہ نہیں۔

اصطلاحات کی چوتھی نوع

چوتھی قسم کی وہ اصطلاحیں ہیں جن کی شرح کرنے کی ضرورت ہے اور وہ صوفیائے کرام میں رائج ہیں اور ان سے صوفیہ کا مقصد وہ ہوتا ہے جو اہل لغت کو معلوم ہوتا ہے۔

الخاطر...... خاطر کے ظاہری لفظ سے اس معنی کا حصول مراد لیتے ہیں جو دل میں تیزی سے پیدا ہوتا ہے لیکن پھر دوسرے خیال کے آتے ہی زائل ہو جاتا ہے اور صاحب خیال کو دل سے اسے زائل کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے تاہم اہل خاطر امور میں پہلے خیال کا ہی اتباع کرتے ہیں کیونکہ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے بندے کے دل میں بغیر کسی علت کے پیدا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خیر نساجؒ کے دل میں خیال نمودار ہوا کہ حضرت جنیدؒ دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے اس خیال کو دل سے دور کر دینا چاہا لیکن اس خواہش کی تردید میں ایک اور خیال آ گیا اور آپ اس کو دور کرنے میں مشغول ہو گئے لیکن تیسری دفعہ بھی وہی خیال پیدا ہونے پر آپ باہر آئے تو حضرت جنیدؒ کو دروازے پر کھڑے دیکھا، حضرت جنیدؒ نے فرمایا اے خیر اگر مشائخ کی سیرت اپناتے ہوئے پہلے خیال کی ہی اتباع کر لیتے تو مجھے اتنی دیر دروازے پر کھڑا نہ رہنا پڑتا...... مشائخ نے کہا ہے کہ اگر خاطر وہی تھا جو حضرت خیرؒ کے دل پر واقع ہوا تو پھر جو حضرت جنیدؒ کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا اس کا کیا مقام ہے کہتے ہیں کہ چوں کہ حضرت جنیدؒ، حضرت خیر کے پیر تھے اس لئے لامحالہ پیر اپنے مرید کے باطنی احوال پر مطلع ہوتا ہے۔

الواقع...... واقع سے وہ معنی مراد لیتے ہیں جو دل میں پیدا ہو اور دل میں باقی رہے بخلاف خاطر کے...... اور طالب کو کسی حالت میں بھی اس کو دور کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں "خطر علی قلبی وَوَقَعَ فی قلبی" (میرے دل پر ایک خیال گزرا اور ایک بات میرے دل میں واقع ہوئی) پس تمام دل خاطر کا محل تو ہوتے ہیں

لیکن واقع صرف اسی دل میں صورت پذیر ہوتا ہے جس میں سب کچھ حق تعالیٰ کی بات ہی ہو یہی وجہ ہے کہ جب مرید کو حق تعالیٰ کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس کو قید کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو ایک واقعہ یعنی مشکل پیش آ گئی اہل لسان تو واقعہ سے سائل میں اشکال مراد لیتے ہیں اور جب کوئی اس اشکال کا جواب دے دے اور اشکال رفع ہو جائے تو کہتے ہیں کہ واقعہ حل ہو گیا۔ لیکن اہل تحقیق کہتے ہیں کہ واقعہ وہ ہوتا ہے جس کا حل ہونا ممکن نہ ہو اور جو حل ہو جائے وہ خاطر ہوتا ہے واقعہ نہیں ہوتا کیونکہ اہل تحقیق کی بندش اور رکاوٹ کسی حقیر چیز میں نہیں ہوتی کہ ہر وقت اس کا حکم بدل جائے اور حال تبدیل ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

الاختیار...... اختیار سے یہ حضرات یہ مراد لیتے ہیں کہ انسان اپنے اختیار پر حق تعالیٰ کے اختیار کو ترجیح دے یعنی حق تعالیٰ نے ان کیلئے خیر اور شر میں سے جو کچھ بھی اختیار کیا ہے اسی کو کافی سمجھیں اور بندے کا حق تعالیٰ کے اختیار کو ترجیح دینا بھی حق تعالیٰ کے اختیار سے ہی ہے۔ کیونکہ اگر حق تعالیٰ نے ہی اس کو بے اختیار نہ کیا ہوتا تو یہ خود ہرگز اپنے اختیار کو نہ چھوڑ سکتا۔ حضرت بایزیدؒ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ ''امین کون ہوتا ہے؟ آپ نے جواب دیا ''امین وہ ہوتا ہے جس کا اپنا اختیار باقی نہ رہا ہو اور حق تعالیٰ کا اختیار ہی اس کا اختیار بن گیا ہو...... اور حضرت جنیدؒ کے متعلق آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ کو بخار ہو گیا تو آپ نے دُعا کی بار خدایا مجھے صحت عطا فرما آپ کے باطن سے ندا آئی کہ تو کون ہوتا ہے ہماری ملک میں گفتگو کرنے والا ہم اپنی ملکیت میں تم سے بہتر طور پر تدبیر کرنا جانتے ہیں۔ تم ہمارے اختیار کو ہی اختیار کرو اور اپنے آپ کو خود مختار ظاہر نہ کرو......

الامتحان...... صوفیائے کرام اس لفظ سے اولیاء اللہ کے دل کا امتحان مراد لیتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کے دل پر خوف، حزن، قبض اور ہیبت جیسی طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہوتا ہے جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے ''اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ مُتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ'' (یہ وہی لوگ ہیں جن کے

دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کیلئے آزمایا ان کیلئے مغفرت اور بڑا اجر ہے) اور یہ درجہ بڑا ہی اعلیٰ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

البلا...... بلا سے اولیاء اللہ کے جسموں کی تکلیف بیماری اور غم وغیرہ مراد لیتے ہیں اور بندہ پر مصیبت جتنی قوی ہوتی ہے اتنا ہی حق تعالیٰ کے ساتھ اس بندے کا قرب زیادہ ہوتا ہے کیونکہ آزمائش و مصیبت اولیاء اللہ کا لباس برگزیدہ لوگوں کا گہوارہ اور انبیاء کرام کی غذا ہوتی ہے کیا تو نے دیکھا نہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ''نحن معاشر الانبیاء اشد الناس بلاءً'' (ہم انبیاء کا گروہ لوگوں میں سب سے زیادہ تکلیف برداشت کرتے ہیں) نیز آپ نے فرمایا ''اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الاولیاء ثم الامثل فالامثل'' (لوگوں میں سب سے زیادہ تکلیف انبیاء کو پہنچتی ہے پھر اولیاء کو پھر ان جیسوں کو اور پھر ان جیسوں کو) بہر حال بلاء نام ہے اس رنج کا جو مومن بندہ کے دل اور جسم پر پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس کی حقیقت ایک نعمت ہے اور اس لئے کہ اس کا راز بندے پر پوشیدہ رہتا ہے اور اس کو برداشت کرنے سے اسے ثواب ملتا ہے پھر جو مصیبت کافروں پر ہوتی ہے وہ بلا نہیں ہوتی بلکہ شقاوت و بدبختی ہوتی ہے اور کافر لوگ اس شقاوت سے ہرگز شفایاب نہیں ہو سکتے پس بلاء کا مرتبہ امتحان کے مرتبہ سے زیادہ اعلیٰ ہے کیونکہ امتحان کا اثر جسم پر ہوتا ہے جب کہ اس بلاء کا اثر دل اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

التحلی...... کسی قابل تعریف گروہ کے ساتھ عمل کے بغیر صرف قول میں مشابہت اختیار کرنے کو تحلی کہتے ہیں اور پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے ''لیس الایمان بالتحلی والتمنی لکن ما وقر فی القلوب وصدق العمل'' (کسی قوم کی مشابہت اور اس جیسا بننے کی آرزو کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان نام ہے اسی بات کا کہ حق تعالیٰ کے متعلق دل میں یقین جم جائے اور عمل سے اس کی تصدیق کی جائے) پس حقیقی عمل کے بغیر اپنے آپ کو کسی قوم کی مانند کرنے کا نام تحلی ہے اور جو لوگ اپنے اچھا ہونے کی نمائش کرتے ہیں لیکن حقیقت

میں اچھے نہیں ہوتے وہ بہت جلد رسوا ہو جاتے ہیں اور ان کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے حالانکہ اہل تحقیق کے نزدیک وہ پہلے ہی رسوا ہوتے ہیں اوران کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔

التجلی...... حق تعالیٰ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونے کی وجہ سے بارگاہ خداندی کے مقبول حضرات کے دل پر انوار حق کی جو تاثیر پیدا ہوتی ہے اس کو تجلی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرات اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ دل کے ساتھ حق تعالیٰ کو دیکھ لیں، اس ولی رویئیت اور ظاہری رویت میں فرق واضح ہے کہ صاحب تجلی دیکھنا چاہےتو دیکھ لےاور دیکھنا نہ چاہےتو نہ دیکھے یا کسی وقت دیکھ لےاور کسی وقت نہ دیکھےلیکن ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والے جنت میں اگر حق تعالیٰ کو دیکھنا نہ چاہیں گےتو بھی ایسا نہ کرسکیں گے کہ وہ نہ دیکھیں کیونکہ تجلی یعنی دل کی رویت پر تو وہ جائز ہےلیکن ظاہری آنکھ سے دیکھنے پر حجاب روا نہیں ہوتا...... واللہ اعلم

التخلی...... جو اشغال بندے کو قرب حق حاصل کرنے سے مانع ہوتے ہیں ان سے اعراض کرنے کا نام تخلی ہےان میں سے ایک تو دنیا ہے کہ ہاتھ اس سے خالی کرے۔ دوسرا عقبیٰ کا خیال ہے کہ دل کو اس سے خالی کرلے تیسرا خواہشات کا اتباع ہے کہ باطن کو اس سے خالی کرے اور چوتھا لوگوں کی صحبت ہے کہ اپنے آپ کو اس سے خالی کرے اور ان کے خیال سے خالی کرے۔

الشرود...... طلب حق میں تمام آفات اور حجابوں سے خلاصی پانے اور اس میں بیقراری محسوس کرنے کو شرود کہتے ہیں کیونکہ طالب حق کو حجاب کی صورت میں ہی تمام مصیبتیں محسوس ہوتی ہیں پس طالبان حق کے گروہ کو حجاب کے کشف کرنے میں جو سفر درپیش ہوتے ہیں اور اس مقصد کیلئے جس چیز کے ساتھ بھی تعلق پیدا ہوتا ہےاس کو شرود کہتے ہیں کیونکہ طالب حق اپنی طلب کی ابتدا میں بہت زیادہ بیقرار ہوتا ہے اور انتہا میں وصل حاصل ہو جانے کی وجہ سے بہت زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

القصود...... قصود سے صوفیہ کے نزدیک مقصود حقیقی کی تلاش میں صحیح ارادہ مراد ہوتا ہے اوران حضرات کا قصود حرکت وسکون سے وابستہ نہیں ہوتا کیونکہ دوست اپنی دوستی اور محبت میں اگر چہ بظاہر ساکن ہی ہولیکن درحقیقت وہ قاصد ہوتا ہے اور یہ چیز عام عادت کے خلاف ہے کیونکہ یا تو ارادہ کرنے والوں کے ظاہر پر اس ارادے کا کوئی اثر ہوتا ہے یا پھر ان کے باطن پر اس کی کوئی علامت ضرور ہوتی ہے سوائے دوستان حق کے کہ وہ بغیر کسی علت کے حق تعالیٰ کی طلب کرتے ہیں اور اپنی حرکات کے بغیر بھی قاصد ہوتے ہیں اور ان کی تمام صفات بذات خود ایک قصد ہوتی ہیں کیونکہ وہ انتہائی درجے کا قصد کرتے ہیں جو محبت حاصل ہو جاتی ہے وہ گویا تمام کی تمام قصد ہی ہوتی ہے۔

الاصطناع...... اس اصطلاح سے صوفیہ وہ کیفیت مراد لیتے ہیں کہ حق تعالیٰ کسی بندے کو اس کے تمام نصیبوں کو فنا کر کے اور اس کی تمام نفسانی لذات کو زائل کر کے مہذب کر دیں اور اس کے نفس کے تمام اوصاف اس میں اس طرح تبدیل کر دیں کہ وہ لذتوں کے زوال اور نفسانی اوصاف کی تبدیلی سے اپنے آپ سے بیخود ہو جائے...... اور یہ درجہ انبیاء کیلئے مخصوص ہے اولیاء کو حاصل نہیں ہوتا اور مشائخ کا ایک گروہ اولیاء کیلئے بھی اس درجے کے جواز کا قائل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

الاصطفاء...... اصطفاء یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بندہ کے دل کو اپنی معرفت کیلئے دوسری تمام چیزوں سے فارغ کر دیں تا کہ اپنی صفائی کی معرفت اس کے دل میں پیدا کر دیں اور اس درجہ میں خاص اور عام گنہگار اور اطاعت شعار اور ولی و نبی تمام مومن یکساں ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں "ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْھُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ " (پھر ہم نے ان لوگوں کو اپنی کتاب کی وراثت دی جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا پھر بعض ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض میانہ رو ہیں اور بعض نیکیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔

الاصطلام...... اصطلام وہ تجلیات حق ہیں جو بندے کے اپنے ارادے کو نفی کر کے اور نرم آزمائش کے ذریعہ اس کو مکمل طور پر مغلوب کر دیں اور قلب ممتحن (آزمایا ہوا دل) اور قلب مصطلم (مغلوب شدہ دل) دونوں ایک ہی معنی میں آتے ہیں البتہ اصطلام امتحان سے زیادہ خاص اور نرم ہے اہل طریقت کی مروجہ اصطلاحات میں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الرین...... رین، دل پر ایک ایسا حجاب ہوتا ہے جس کا کشف ایمان کے بغیر نہیں ہوسکتا اور یہ کفر اور گمراہی کا حجاب ہوتا ہے چنانچہ خدائے عزوجل نے اپنے ارشاد میں کفار کے دل کو اس کے ساتھ موصوف کیا ہے "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" (ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے اپنے کسب (شرک و کفر) کی وجہ سے ان کے دلوں پر پردہ ہے) اور ایک گروہ کہتا ہے کہ رین وہ ہوتا ہے جس کو خود زائل کرنا ہرگز ممکن نہیں ہوتا کیونکہ کافروں کا دل تو اسلام قبول ہی نہیں کرتا باقی کافروں میں جو لوگ اسلام قبول کر لیتے ہیں وہ حق تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہی مومن ہوتے ہیں۔

الغین...... دل پر پڑ جانے والے اس پردے کو غین کہتے ہیں جو استغفار کرنے سے اٹھ جاتا ہے اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک خفیف اور دوسرا غلیظ۔ غلیظ پردہ تو اہل غفلت اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے ہوتا ہے جب کہ خفیف پردہ سب کیلئے ہوتا ہے خواہ کوئی ولی ہو یا نبی۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ "انّہ لیغانُ علی قلبی و انی لاستغفرُ اللہ فی کل یوم مائۃ مرۃ" (میرے دل پر ہلکا سا پردہ آ جاتا ہے اور بے شک میں ہر روز ایک سو مرتبہ اپنے اللہ سے استغفار کرتا ہوں) پس غلیظ پردے کیلئے تو توبہ ضروری شرط ہے جب کہ خفیف پردے کیلئے حق تعالیٰ کی طرف سچا رجوع ضروری ہے گناہ سے اطاعت کی طرف لوٹنے کا نام توبہ ہے جب کہ اپنی ذات سے حق تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا نام رجوع ہے پس توبہ جرم سے کرتے ہیں اور حق تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی بندوں کا جرم ہے جب کہ دوستان حق کا جرم ارادت حق کی مخالفت ہوگا۔ پس بندوں کا جرم معصیت

کھلائے گا اور دوستان حق کا جرم اپنے وجود کو دیکھنا ہے اگر کوئی شخص غلطی سے حق بات کی طرف رجوع کرے تو اسے توبہ کرنے والا کہتے ہیں اور کوئی شخص صحیح کام سے زیادہ صحیح کی طرف رجوع کرے تو اسے راجع کہتے ہیں...... میں نے یہ سب باتیں توبہ کے باب میں بیان کر دی ہیں......واللہ اعلم

التلبیس...... کسی چیز کو لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کے خلاف ظاہر کرنے کو تلبیس کہتے ہیں۔جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَلَلَبِسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ '' (اور ہم نے ان پر ملتبس کر دیں جو وہ حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہیں) اور یہ صفت حق تعالیٰ کے علاوہ کسی کیلئے محال ہے کیونکہ حق تعالیٰ ہی کافر کو مومن کی صفت میں اور مومن کو کافر کی صفت میں ظاہر کرتے ہیں حتیٰ کہ ہر شخص میں اس کے حکم اور حقیقت کے اظہار کا ایک خاص وقت ہوتا ہے اور جب اس گروہ میں سے کوئی شخص اپنی قابل تعریف خصلتوں کو مذموم باتوں سے چھپاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ تلبیس کرتا ہے اور اس صورت کے علاوہ کہیں بھی اس اصطلاح کو استعمال نہیں کرتے اور منافقت اور ریاکاری کو تلبیس نہیں کہتے ہیں اگرچہ بنیادی طور پر یہ تلبیس ہی ہے کیونکہ تلبیس کی اصطلاح حق تعالیٰ کے فضل کو قائم کرنے کے سوا کسی جگہ استعمال نہیں ہوتی۔

الشرب...... بندگی کی مٹھاس بزرگی کی لذت اور محبت کی راحت کو یہ لوگ شرب کہتے ہیں اور کوئی شخص لذت شرب کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کر سکتا۔جس طرح جسم کا شرب پانی سے ہوتا ہے اسی طرح دل کا شرب بندگی کی راحتوں اور مٹھاس سے حاصل ہوتا ہے......

میرے شیخ رحمتہ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ بے شرب مرید اور بے شرب عارف ارادت اور معرفت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔اس لئے کہ مرید کو اپنے کردار سے ایسا شرب حاصل ہونا چاہئے کہ وہ ارادت میں طلب کا حق ادا کر دے۔البتہ عارف کو حق تعالیٰ کے بغیر شرب حاصل نہیں ہونا چاہئے یا ایسا شرب نہ ہونا چاہئے کہ وہ اس سے اپنے نفس کی طرف۔

لوٹتا ہو کیونکہ اس طرح اس کو آرام حاصل نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الذوق...... ذوق بھی شرب کی طرح ہی ہوتا ہے تاہم شرب صرف راحتوں میں مستعمل ہوتا ہے جب کہ ذوق رنج اور راحت دونوں کا متحمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ کہتے ہیں "ذُقْتُ اطلاوة وزقت البلاءَ وَذقتُ الراحة" (میں نے بندگی کی صورت کو چکھا اور میں نے رنج وراحت کو چکھا) یہ سب درست ہے۔ پھر شرب کو کہتے ہیں "شربت بکاس الوصل اَوْبکاسِ الوُد" (میں نے وصل یا محبت کا پیالہ پیا) کیونکہ حق تعالیٰ نے جب شرب کی بات بیان کی تو فرمایا "كُلُوْا وَاشْرَبُوْ اهَنِيْاءً" (خوشگوار حالت میں کھاؤ اور پیو) اور جب ذوق کا تذکرہ کیا تو فرمایا "ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْم" (عذاب کو چکھو کہ تم بڑے عزت و بزرگی والے ہو) اور دوسری جگہ پر فرمایا "ذُوْقُوْمَسَّ سَقَر" (دوزخ کا چھونا چکھو)...... یہ تھے صوفیہ کے درمیان مروج اصطلاحات کے معانی جو میں نے بیان کردئے۔ اگر میں ان سب کو لکھتا تو کتاب بڑی طویل ہو جاتی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

گیارھواں کشف حجاب

سماع کا بیان

جان لو کہ حصول علم کے اسباب پانچ ہیں پہلا سننا، دوسرا دیکھنا، تیسرا چکھنا، چوتھا سونگھنا اور پانچواں چھونا...... اور اللہ تعالیٰ نے دل کیلئے یہ پانچ دروازے پیدا کر دئے ہیں اور علم کی ہر قسم کی ان میں سے ایک کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، جیسے کہ سننے کیلئے آوازوں اور خبروں کا علم، دیکھنے کیلئے رنگوں اور جسموں کا علم چکھنے کیلئے مٹھاس اور کڑواہٹ کا علم، سونگھنے کیلئے بدبو اور خوشبو کا علم اور چھونے کیلئے سختی اور نرمی کا علم اور اللہ تعالیٰ نے ان پانچ حواس میں سے چار کو مخصوص محل میں رکھا ہے اور ایک کو جسم کے تمام اعضا میں پھیلا دیا ہے، یعنی سننے کا محل کان کو بنا دیا ہے دیکھنے کا محل آنکھ کو، چکھنے کا زبان کو اور سونگھنے کا محل ناک کو بنا دیا ہے جب کہ چھونے کو تمام اعضا میں جاری کر دیا ہے اس لئے کہ آنکھ کے بغیر دیکھ نہیں سکتے۔ کان کے بغیر سن نہیں سکتے، ناک کے بغیر سونگھ نہیں سکتے اور زبان کے بغیر چکھ نہیں سکتے لیکن پورا جسم کسی چیز کو چھونے سے نرم سخت اور گرم و سرد جان لیتا ہے۔ تاہم جواز کے طور پر تو یہ بھی جائز ہے کہ ان میں سے ہر ایک تمام اعضا میں شائع ہو جائے جس طرح کہ لمس تمام اعضا میں شائع ہے...... معتزلہ کے نزدیک ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص محل کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ ہر ایک کیلئے ایک محل مخصوص ہے لیکن ان کا یہ قول حاسہ لمس کی وجہ سے باطل ہے کیونکہ اس کیلئے تو کوئی محل مخصوص نہیں اور جب ان پانچ میں سے ایک کیلئے محل مخصوص نہیں اور اس ایک میں یہ صفت جائز ہے کہ تمام اعضا میں یہ جاری ہو تو دوسروں کیلئے بھی یہ جائز ہے کہ وہ اس صفت سے موصوف ہوں تاہم اس جگہ یہ ماجرا بیان کرنا میرا مقصد نہیں لیکن معنی کی تحقیق کو بیان کرنے کیلئے مذکورہ مقدار کے بغیر بھی چارہ نہ تھا...... پس ایک حاسے یعنی سمع کے علاوہ باقی چاروں حواس جن کا ذکر گزر چکا ہے کہ ایک ان میں سے دیکھتی ہے دوسری

سونگھتی ہے تیسری چکھتی ہے اور چوتھی چھوتی ہے اور ان میں جائز ہے کہ اس عجیب وغریب دنیا کو دیکھنا، اچھی چیزوں کو سونگھنا بہترین نعمتوں کا چکھنا، نرم چیزوں کو چھونا اور آوازوں کو سننا عقل کیلئے دلیل بن جائے اور اپنے خدا تعالیٰ کو پہچاننے کی طرف رہنمائی کرے اس لئے کہ ان حواس کے ذریعہ عقل جان لیتی ہے کہ عالم حادث اور محل تغیر ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہو وہ حادث ہی ہوتی ہے اور عقل یہ بھی جان لیتی ہے کہ اس حادث جہان کا کوئی پیدا کرنے والا بھی ہے جو اس کی جنس سے نہیں کیونکہ یہ عالم مکون (پیدا کیا ہوا ہے) اور اس کو پیدا کرنے والا مکون (پیدا کرنے والا) ہے یہ مجسم (جسم والا) اور اس کو پیدا کرنے والا مجسم (جسم عطا کرنے والا) اس کا خالق لامتناہی ہے اور یہ عالم متناہی ہے اور وہ خالق تمام چیزوں پر قادر اور تمام کاموں پر طاقت والا ہے اور وہ تمام معلومات کا عالم ہے اور تمام ملک میں اسی کا تصرف درست ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اس نے اپنے رسولوں کو سچی برھان دے کر بھیجا ہے لیکن اس کے رسولوں پر ایمان لانا اس وقت تک ضروری نہیں ہوتا جب تک حق تعالیٰ کی معرفت اور جو چیزیں دین اور شریعت میں واجب ہیں رسول سے سن کر انہیں معلوم نہ کرے یہی وجہ ہے کہ اہل سنت اس تکلیف کے گھر (دنیا) میں سننے کو دیکھنے پر فضیلت دیتے ہیں۔ اگر کوئی خطا کار یہ کہے کہ سننا خبر کا محل ہے اور دیکھنا نظر کا محل ہے تو جب حق تعالیٰ کا دیدار اس کا کلام سننے سے زیادہ افضل ہوگا تو ہونا یہ چاہئے کہ نظر کو سمع پر زیادہ افضل سمجھا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نے تو سن کر یہ علم حاصل کیا ہے کہ جنت میں مومنوں کو حق تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا کیونکہ رویت باری تعالیٰ کے عقلی طور پر جائز ہونے کا حجاب تو اس کے کشف سے زیادہ بہتر نہیں ہے اس لئے کہ ہم نے تو حضور ﷺ کی خبر سے ہی معلوم کیا ہے کہ مومنوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا اور ان کی آنکھوں کے سامنے سے حجاب اٹھ جائے گا تا کہ وہ اللہ عزوجل کو دیکھ سکیں۔ پس سننا زیادہ افضل ہوا دیکھنے سے۔ نیز شریعت کے تمام احکام کا سننے پر ہی دارومدار ہے کہ اگر سننا نہ ہوتا تو ان کا ثبوت ہی محال ہوتا...... نیز

جتنے انبیاء کرام بھی تشریف لائے ہیں پہلے انہوں نے حق تعالیٰ کی توحید اور اپنی نبوت کو زبان سے بیان کیا ہے یہاں تک جنہوں نے ان کے پیغام کو غور سے سنا وہ ان کے گردیدہ ہو گئے اب انبیاء کرام سے معجزے ظاہر ہوئے اور معجزہ دیکھنے میں بھی تاکید سننے سے ہی ہوئی۔ ان دلائل کے باوجود جو شخص سننے کی افضیلت کا انکار کرے وہ گویا پوری شریعت کا انکار کرتا ہے اور احکام شریعت اپنے اوپر پوشیدہ کرتا ہے......اب میں انشاء اللہ اس کا پورا حکم ظاہر کروں گا۔

قرآن کا سماع

سنے جانے کے قابل چیزوں میں سے دل کیلئے فوائد باطن کیلئے ترقیوں اور کانوں کیلئے لذتوں کے اعتبار سے سب سے بہترین سماع اللہ تعالیٰ کے کلام کا سماع ہے اس کے سننے کا تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے اور انسانوں اور جنوں میں سے تمام کافر بھی اس کو سننے کے مکلّف ہیں......قرآن مجید کے معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی انسان اس کو بکثرت پڑھنے اور سننے سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا کیونکہ اس میں بڑی رقت ہے حتیٰ کہ کفار قریش رات کے وقت چھپ چھپ کر آتے اور پیغمبر ﷺ نماز کی حالت میں قرآن مجید کی جو تلاوت کرتے اسے آ کر سنتے تھے اور اس (کی فصاحت و بلاغت اور اعجاز) پر حیران ہوتے تھے مثلاً نضر بن حارث جو ان میں سب سے زیادہ فصیح تھا اور عتبہ بن ربیع جس کی بلاغت میں جادو تھا اور ابوجہل بن ہشام جو خطابت اور دلائل میں ید بیضا رکھتا تھا اور اس کی گفتگو میں بڑا نظم ہوا کرتا تھا اسی طرح کے دوسرے لوگ بھی خفیہ طور پر قرآن مجید سننے کیلئے آتے تھے یہاں تک کہ ایک رات حضور ﷺ ایک سورہ کی تلاوت کر رہے تھے کہ عتبہ کے ہوش جاتے رہے اور وہ ابوجہل سے کہنے لگا مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے'' اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو (قرآن مجید کا سماع کرنے کیلئے) بھیجا تھا حتیٰ کہ وہ

جوق در جوق آئے اور پیغمبر علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کا کلام سننے لگے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ "فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا" (پس وہ (جنات) کہنے لگے ہم نے عجیب قرآن سنا ہے) اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنات کے اس قول کی خبر دی کہ یہ قرآن بیمار دلوں کیلئے سیدھے راستے کی رہنمائی کرنے والا ہے اور کہا کہ "یَّهْدِیْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا اَحَدًا" (وہ قرآن بھلائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے پس ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے) پس قرآن کی نصیحت تمام نصیحتوں سے زیادہ اچھی۔ اس کے الفاظ تمام الفاظ سے زیادہ بلیغ اس کے احکام تمام احکام سے زیادہ لطیف، اس کی نہی تمام مناہی سے زیادہ ڈرانے والی۔ اس کا وعدہ تمام وعدوں سے زیادہ دلربا اس کی وعید تمام وعیدوں سے زیادہ جانگداز، اس کے واقعات تمام واقعات سے زیادہ پرتاثیر اور اس کی مثالیں تمام مثالوں سے زیادہ فصیح ہیں، اس کے سماع نے ہزاروں دلوں کو شکار کیا ہے اس کے لطائف نے ہزاروں جانوں کو مصیبت میں مبتلا کیا ہے تو اس نے دنیوی عزت والوں کو ذلیل اور دنیا کے اعتبار سے ذلیل لوگوں کو صاحب عزت بنا دیا ہے...... حضرت عمر بن الخطابؓ نے جب سنا کہ بہن اور بہنوئی مسلمان ہو گئے ہیں تو آپ نے ان کو قتل کرنے کا قصد کر لیا۔ شمشیر کھینچے ہوئے ان کے قتل کیلئے تیاری کی اور اپنے دل کو ان کی محبت سے خالی کر لیا۔ لیکن حق تعالیٰ نے اپنے لطف کا لشکر سورۃ طٰہٰ کی کمین گاہوں میں بٹھا دیا چنانچہ جب بہن کے گھر کے دروازے پر آئے تو ہمشیرہ تلاوت کر رہی تھی "طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى" (اے میرے رسولؐ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں بلکہ یہ یاددہانی ہے اس کیلئے جو ڈرتا ہے) یہ سن کر آپ کی جان قرآن کی باریکیوں کا شکار ہو گئی اور آپ کا جدائی میں بندھا ہوا دل اس کے لطائف سے کھل گیا آپ نے صلح کا راستہ اختیار کیا اور جنگ کا لباس اتار پھینکا اور مخالفت سے موافقت کی طرف آ گئے...... اور

معروف ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام کے سامنے یہ آیت پڑھی کہ "اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّجَحِیۡمًا وَّطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا" (بے شک ہمارے ہاں بیڑیاں، جہنم کی آگ گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے) تو اسے سن کر حضور علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے...... اور کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی "اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ مَّا لَہٗ مِنۡ دَافِعٍ" (بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں) حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگ آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر لے گئے اور آپ اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر سے ایک مہینہ تک بیمار پڑے رہے...... اور کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ کے سامنے یہ آیت "لَہُمۡ مِّنۡ جَہَنَّمَ مِہَادٌ وَّ مِنۡ فَوۡقِہِمۡ غَوَاشٍ" (کفار کیلئے (آتش) دوزخ کے بچھونے اور ان کے اوپر اسی کے چھت ہوں گے) پڑھی تو ان پر گریہ طاری ہو گیا یہاں تک کہ راوی کہتا ہے کہ میں نے سمجھ لیا کہ ان کی روح ان سے پرواز کر جائے گی۔ اس وقت آپ اٹھے تو لوگوں نے کہا اے استاد! تشریف رکھئے آپ نے فرمایا اس آیت کریمہ کی ہیبت مجھے بیٹھنے سے روک رہی ہے...... اور کہتے ہیں کہ بعض حضرات نے حضرت جنیدؒ کے سامنے یہ آیت کریمہ "یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ" (اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں) پڑھی تو حضرت جنیدؒ نے کہا بار خدایا "ان قلنا قلنابک وان فعلنا فعلنا بتوفیقک فاین لنا القول والفعل" (اگر ہم نے کچھ کہا ہے یا اگر کچھ کام کیا ہے تو صرف تیری توفیق سے ہی کہا اور کیا ہے پھر قول اور فعل ہمارا کہاں ہوا...... اور حضرت شبلیؒ کے متعلق آتا ہے کہ لوگوں نے آپ کے سامنے "وَاذۡکُرۡ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیۡتَ" (اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے) پڑھا تو آپ نے کہا ذکر کی شرط بھول جانے میں ہے اور سارا جہان اس کے ذکر میں لگا ہوا ہے یہ کہہ کر آپ نے ایک چیخ ماری اور آپ کے ہوش جاتے رہے جب ہوش میں آئے تو فرمایا میں اس جان پر

حیران ہوں جس نے حق تعالیٰ کا کلام سنا ہے اور پھر روح جسم سے نکل نہیں گئی...... مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت کر رہا تھا ''وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ '' (اس دن سے ڈرو! جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) کہ ایک غیبی ہاتف نے آواز دی بہت آہستہ آواز سے پڑھو کہ اس آیت کی ہیبت سے چار جن مر گئے ہیں...... ایک درویش کہتے ہیں کہ مجھے دس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے نماز میں صرف اتنی مقدار میں قرآن پڑھا ہے جس سے نماز جائز ہو جائے اس سے زیادہ میں نے نہ پڑھا ہے اور نہ ہی سنا ہے، لوگوں نے پوچھا ''کیوں؟'' تو جواب دیا اس ڈر سے کہ وہ مجھ پر حجت ہو جائے گا...... ایک دن میں حضرت شیخ ابو العباس شقانی کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے پایا ''ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ '' (اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے غلام کی مثال بیان کی ہے جو دوسرے کا مملوک ہو اور کسی چیز پر قادر نہ ہو) یہ پڑھ کر آپ رونے لگے اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے میں نے سمجھا کہ دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، میں نے کہا ''اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ آپ نے جواب دیا ''گیارہ سال سے میرا ورد ابھی تک یہاں پہنچا ہے اور اس جگہ سے آگے گزرنے کی مجھ میں طاقت نہیں...... حضرت ابو العباس عطاؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ شیخ آپ ہر روز کتنا قرآن مجید پڑھ لیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس سے پہلے تو رات دن میں دو دفعہ قرآن مکمل پڑھ لیتا تھا لیکن اب چودہ سال ہو گئے ہیں کہ ابھی سورہ انفال تک آج پہنچا ہوں...... کہتے ہیں کہ حضرت ابو العباسؒ نے ایک قاری سے کہا کہ پڑھو اس نے پڑھا ''یٰاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ '' (اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے خاندان والوں کو سخت تکلیف نے چھوا ہے اور ہم حقیری پونجی غلہ لینے کیلئے لائے ہیں) آپ نے پھر فرمایا پڑھو اس نے پڑھا ''قَالُوْا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ '' (کہنے لگے اگر اس نے چوری کی ہے تو بے شک اس کا بھائی بھی اس سے قبل چوری کر چکا ہے) آپ نے پھر فرمایا

''اور پڑھو'' اس نے پڑھا ''لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُم '' (آج تم پر کوئی ملامت نہیں اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کردے) اب آپ نے دُعا کی ''بارخدایا میں جفا میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے بڑھ کر ہوں اور آپ کرم کے لحاظ سے حضرت یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر ہیں۔ میرے ساتھ وہ معاملہ کیجئے گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا...... اور اس سب کچھ کے باوجود تمام اہل اسلام خواہ فرمانبردار ہوں یا نافرمان قرآن مجید کو غور سے سننے کا انہیں حکم دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے'' وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْ لَہٗ وَاَنْصِتُوا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ '' (اور جب قرآن پڑھا جائے تو خوب غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے) یعنی جب کوئی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو تو اس کو خاموشی کے ساتھ غور سے سننے کا حکم دیا ہے اور نیز فرمایا ہے ''فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ '' (پس خوشخبری دیجئے ان کو جو ہمارا کلام توجہ سے سنتے ہیں پھر اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں) یعنی اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور اس کو تعظیم کے ساتھ سنتے ہیں۔ نیز فرمایا ہے ''اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ '' (وہ لوگ کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں) یعنی قرآن کو توجہ سے سننے والوں کے دل پر حق تعالیٰ کا خوف طاری ہو جاتا ہے نیز فرمایا ہے ''اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ '' (جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے ساتھ مطمئن ہوتے ہیں آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اس جیسی اور بہت سی آیات ہیں جو اس بات کے حکم کی تاکید کرتی ہیں اور پھر اس کے برعکس ان لوگوں کیلئے ملامت آئی ہے جو کلام الٰہی کو اس طرح نہیں سنتے جیسے اس کو سننے کا حق ہے اور کانوں سے دل کی طرف اسے راہ نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ '' (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی

آنکھوں پر پردہ ہے) یعنی ان کے سننے والے عضو پر مہر لگا دی ہے نیز حق تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ دوزخ والے قیامت کے دن کہیں گے ''لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ'' (اگر ہم حق کے ساتھ قرآن کو سنتے اور سمجھتے تو ہم جہنم والوں میں نہ ہوتے) اور اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا'' (اوران میں سے بعض آپ کی طرف توجہ سے سنتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے کہ وہ اسے سمجھ سکیں اوران کے کانوں میں بوجھ ہے) یعنی ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ آپ سے قرآن سنتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر حجاب ہوتا ہے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہوتا ہے گویا وہ اس طرح ہوتے ہیں جیسے انہوں نے سنا ہی نہیں اور نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے ''وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ'' (اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے) یعنی شکایت کے طور پر کہتے ہیں کہ اس گروہ کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتا ہے کہ ہم نے اس قرآن مجید کو سنا ہے لیکن وہ نہیں سنتے۔ یعنی سنتے تو ہیں لیکن دل سے نہیں صرف کانوں سے سنتے ہیں اور اس طرح کی بہت سی آیتیں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں موجود ہیں اور پیغمبر علیہ السلام کے متعلق احادیث میں آتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا ''اِقْرَأْ عَلَيَّ فقالَ انا اقراه عليك وَعليكَ اُنزلَ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اِني اُحِبُّ اَن اَسمعَه مِنْ غيرى'' (مجھے قرآن کی تلاوت سناؤ تو انہوں نے عرض کی ''کیا میں آپ کے سامنے قرآن پڑھوں گا حالانکہ آپ پر وہ نازل کیا گیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ہاں'' میں اس چیز کو پسند کرتا ہوں کہ میں قرآن کا اپنے علاوہ دوسرے سے سماع کروں) یہ اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ قرآن سننے والے کا حال پڑھنے والے سے زیادہ کامل ہوتا ہے کہ آپ نے فرمایا ''میں اس بات کو زیادہ محبوب رکھتا ہوں کہ اپنے علاوہ کسی سے اس کی تلاوت سنوں۔ اس لئے کہ قاری یا تو حال سے پڑھے گا یا بغیر حال کے

لیکن سننے والا حال کے بغیر نہیں سنتا کیونکہ پڑھنے میں ایک طرح کا تکبر ہوتا ہے جب کہ سننے میں ایک طرح کی تواضع ہوتی ہے..... نیز پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "شیبتنی سورۃ ھود " (سورہ ھود (کی سماعت نے) مجھے بوڑھا کر دیا ہے) علما کہتے ہیں کہ یہ اس لئے تھا کہ سورہ ھود کے آخر میں یہ آیت کریمہ موجود ہے کہ "فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ " (پس آپ اس طرح استقامت پر رہئے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے) اور انسان حق تعالیٰ کے حکم کے مطابق استقامت کا حق ادا کرنے سے عاجز ہے کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ پس جب آپ نے "فاستقم كما أُمرتَ " کا حکم سنا تو آپ سخت حیران ہو گئے اور فرمایا "یہ کس طرح ہو سکے گا کہ میں اس حکم کے مطابق عمل کرسکوں" چنانچہ اس رنج کی وجہ سے آپ کی قوت جاتی رہی اور دن بدن یہ غم بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ ایک دن اپنے گھر اٹھ کر کھڑے ہونے لگے تو دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر زور لگا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کی "یا رسول اللہ علیہ السلام یہ کیا حال ہے؟ آپ تو ابھی جوان اور تندرست ہیں" آپ نے فرمایا سورہ ھود نے مجھے بورھا کر دیا ہے یعنی اس کے سماع نے میرے دل پر اس قدر زور پکڑا ہے کہ میری قوت ساقط ہوگئی ہے صحابہ کرامؓ میں سے ایک بزرگ صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ "كنت في عصابة فيها ضُعَفاء المهاجرين وان بعضهم لَيستُر بعضاً مِنَ العُرىٰ وقارِى يقراء علينا ونحن نستمعُ القراة قالَ فجاءَ رسولُ اللّٰهِ صلى اللّٰهِ عليه وسلم حتى قام علينا فلما راى القارى سكت. قال فسلم فقال ماذا لصنعُون قلنا كان قارى يقرا علينا ونحنُ نستمع بقرا ته فقال النبى صلى الله عليه وسلم الحمد للّٰه الذى جعَلَ فى امته مَن امِرتُ اَنْ اصبرَ نفسى معهُم قالَ ثُم جلَسَ وسطنا ليعدِلَ نفسه فينا ثُم قال فكانوُ ضعَفاء المهاجرين فقال النبى صلى الله عليه وسلم البشروا صعاليک المهاجرينَ ابلفوز التا يومَ القيمةِ تدخلونَ الجنة قبل المنياء كُم بنصفِ يومٍ كان مقداره خَمْسَ مائة عامٍ "

(میں ایک جماعت میں بیٹھا تھا جس میں کمزور مہاجرین تھے اور برہنگی کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو پردہ کیئے ہوئے تھے اور ایک قاری ہم پر تلاوت قرآن مجید کر رہا تھا اور ہم سن رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے آئے اور ہمارے سروں پر کھڑے ہو گئے جب قاری نے آپ کو دیکھا تو وہ خاموش ہو گیا، پیغمبر ﷺ نے ہمیں سلام کہا اور پوچھا تم لوگ کس کام میں مصروف تھے؟'' میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ قاری، تلاوت کر رہا تھا اور ہم اس کی قرات کا سماع کر رہے تھے اب حضور ﷺ نے فرمایا اس ذات باری تعالیٰ کا شکر ہے جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جن کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کے ساتھ صبر کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے، پھر آپ ہمارے بالکل درمیان میں اس طرح بیٹھ گئے کہ اپنے آپ کو ہم میں سے ہر ایک کے برابر کر لیا پھر ہمیں اپنے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا تو سب نے آپ کے اردگرد حلقہ بنا لیا کہ اس وقت کوئی شخص ہم میں سے رسول اللہ ﷺ کو پہنچانہ سکتا تھا گویا کہ یہ سب کمزور مہاجر ہی تھے، پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے درویش مہاجرو! تمہیں قیامت کے دن پوری پوری کامیابی کی بشارت ہو کہ تم مالداروں سے نصف دن پہلے جنت میں داخل ہو گے۔ جس دن کی مقدار پانچ سو سال جتنی ہو گی) اس حدیث کو چند طریقوں سے مختلف الفاظ میں روایت کیا گیا ہے تاہم یہ اختلاف صرف الفاظ میں ہے معنی تمام طرق روایت کا ایک ہی ہے اور بالکل درست ہے......

فصل

حضرت زرارۃ بن ابی اوفیٰؓ حضور ﷺ کے جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے تھے۔ ایک دفعہ آپ نماز میں لوگوں کی امامت کرا رہے تھے کہ ایک آیت کریمہ پڑھی اور اس کی ہیبت و جلال کی وجہ سے ایک نعرہ بلند کیا اور جان دے دی...... حضرت ابو جعفر رحمتہ اللہ علیہ بزرگ تابعینؒ میں سے ایک تھے ایک دفعہ حضرت صالح مریؒ نے ان کے سامنے

ایک آیت تلاوت کی تو ان کے اندر سے ایک آواز بلند ہوئی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے..... حضرت ابراہیم نخعیؒ روایت بیان کرتے ہیں کہ میں کوفہ کے دیہاتوں میں سے ایک گاؤں میں گیا تو وہاں ایک بزرگ عورت کو دیکھا جو نماز میں کھڑی تھی اور اس پر نیکی کے آثار ظاہر تھے جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے تبرک کے طور پر اسے سلام کیا وہ مجھے کہنے لگی کیا تم قرآن جانتے ہو؟ میں نے کہا "ہاں کہنے لگی تو پھر کوئی آیت پڑھو میں نے ایک آیت کی تلاوت کی تو سن کر اس نے ایک چیخ لگائی اور جان حق تعالیٰ کے حضور پیش کر دی۔ اور حضرت احمد بن ابی الحواریؒ روایت بیان کرتے ہیں کہ میں نے جنگل میں ایک نوجوان کھردری گدڑی پہنے ہوئے دیکھا جو ایک کنوئیں کے کنارے کھڑا تھا مجھے (دیکھ کر) کہنے لگا "اے احمد بڑے وقت پر آئے ہو کہ مجھے سماع کی طلب ہو رہی ہے تا کہ میں جان دے دوں۔ کسی آیت کریمہ کی تلاوت تو کر وحضرت احمدؒ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے مجھے الہام کیا اور میں نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی "اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْ رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" (بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر ڈٹے رہے) آیت کریمہ سن کر وہ جوان کہنے لگا اے احمد رب کعبہ کی قسم تم نے وہی آیت پڑھی ہے جو اسی وقت مجھ پر ایک فرشتے نے پڑھی ہے اور اسی حال میں جان دے دی..... اگر اس معنی اور مضمون سے وابستہ تمام حکایات کو بیان کروں تو میرا مقصد فوت ہو جائے گا۔ وباللہ التوفیق

شعر کا سماع

شعر کا سننا مباح ہے پیغمبر ﷺ نے اشعار سنے ہیں اور صحابہ کرامؓ نے کہے بھی ہیں اور سنے بھی ہیں۔ حضور ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "اِنَّ من الشعرِ لحکمة" (بے شک بعض شعر حکمت ہیں) نیز فرمایا ہے "الحکمة ضالةُ المومن حیثُ وَجَدَهَا فَهوَاحُ بِهَا" (دانائی، مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں اسے پائے وہی اس کا زیادہ حقدار

ہے) شعر سے مراد وہ شعر ہے جس میں دانائی ہو اور حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے جو اس سے غائب ہے جہاں بھی اس کو پائے وہی اس کا زیادہ مستحق ہے نیز پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اصدق کلمة قالتها لعرب قول لبید" (سب سے سچا کلمہ جو کسی عرب نے کہا ہے وہ لبید شاعر کا شعر ہے:۔

اَلا کل شئٍ مَا خَلا اللّٰہَ باطِل

وَکَلَّ نعیمٍ لامحَالَۃَ زائل

(آگاہ رہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر شی باطل ہے اور اس کے سوا ہر ایک نعمت بہر حال زائل ہونے والی ہے)

اور حضرت عمرو بن الشریدؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ "اِستَنشد فلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ھَل تروی مِنَ شعرِ امیة ابن الصلت شیاً فانشدته مائة قافیة مجعلت کُلھا مروت علی بیتٍ قال ھیه فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یسلم فی شعرہٖ " کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے شعر پڑھنے کا کہتے ہوئے کہا کیا تم امیہ بن ابی صلت کے اشعار میں سے کچھ سنا سکتے ہو؟ پس میں نے سو اشعار پڑھے ہر شعر کے اختتام پر آپ فرماتے اور پڑھو پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ امیہ شعروں کی حد تک تو مسلمان تھا) اس طرح کی حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے بہت سی روایات آتی ہیں اور حضرت عمرؓ شعر کہتے بھی تھے لیکن لوگوں نے اس معاملے میں غلط روش اختیار کی ہے کہ کچھ لوگ تو ہر قسم کے اشعار سننے کو حرام کہتے ہیں اور دن رات مسلمانوں کی غیبت کرتے رہتے ہیں اور کچھ لوگ ہر قسم کے اشعار کو حلال کہتے ہیں اور دن رات غزلوں میں محبوب کے حسن کی تقریب اور زلف و خال کی باتیں سنتے رہتے ہیں اور اس معاملے میں ایک دوسرے کے خلاف دلائل بیان کرتے رہتے ہیں میری مراد ان کے اقوال کی تائید یا تردید یا ان کے سماع کی حمایت و مخالفت نہیں ...... لیکن مشائخ تصوف رحمہم اللہ کا اس بارے

میں اندازوہ ہے جو کہ صحابہؓ کے حضور علیہ سے اشعار کے بارے استفسار پر حضور علیہ نے فرمایا تھا کہ "کلام حسنه حسن و قبیحه قبیح" (شعر ایک ایسا کلام ہے جس کا اچھا اچھا ہے اور برا برا) یعنی جو کچھ نثر میں سننا حلال ہے مثلاً دانائی، وعظ و نصیحت، حق تعالیٰ کی نشانیوں میں استدلال اور مظاہر قدرت میں غور و فکر تو یہ نظم میں بھی حلال ہے خلاصہ کلام یہ کہ جس طرح اس حسن و جمال کو دیکھنا جو آفت میں ڈال دے حرام اور ممنوع ہے اس کو نظم اور نثر میں سننا حرام و ممنوع ہے اور اسی طرح اس کی صفت کو اس انداز میں سننا بھی حرام و ممنوع ہے اور جو شخص اس چیز کو مطلقاً حلال کہتا ہے دیکھنے اور سننے کو بھی حلال کہنا چاہتا ہے تو یہ کفر اور بے دینی ہے اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ "میں تو محبوب کی آنکھ خدوخال اور زلف وغیرہ تمام چیزوں میں حق کو ہی سنتا ہوں اور حق کو ہی طلب کرتا ہوں تو اس سے تو لازم آتا ہے کہ یہ دوسرے آدمی سے کہے کہ میں اس لئے ایک آدمی کو دیکھنا جائز سمجھتا ہوں کہ کوئی دوسرا اس کی صفات سننے کو جائز سمجھتا ہے اور دوسرا محض اس بنیاد پر اس کو دیکھنا روا سمجھتا ہو اور کہتا ہو کہ میں تو اس میں حق کو ہی تلاش کرتا ہوں اور کہے کہ کسی معنی کے ادراک کیلئے ایک طرح چاہنا۔ دوسری طرح چاہنے سے زیادہ بہتر تو نہیں ہوتا۔ یوں تو تمام کی تمام شریعت باطل ہو جائے گی اور رسول اللہ علیہ کے اس ارشاد کہ "العینان تزنیان" (آنکھیں زنا کرتی ہیں) کا حکم بھی اٹھ جائے گا اور نامحرم کے کسی غیر محرم کو چھونے کی ملامت بھی ختم ہو جائے گی اور شرعی حدود بھی تمام کی تمام ساقط ہو جائیں گی اور یہ بڑی واضح گمراہی ہے...... جب جاہل اور نام نہاد صوفیوں نے حال میں مستغرق سماع کرنے والوں صوفیوں کو دیکھا کہ وہ سماع کر رہے ہیں تو انہوں نے ان کے حال سے یہ سمجھا کہ وہ نفسانی خواہش سے سماع کر رہے ہیں، چنانچہ جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو کہنے لگے کہ سماع حلال ہے کہ اگر حلال نہ ہوتا تو یہ حضرات بھی نہ کرتے، اس طرح ان جاہل صوفیوں نے ان کی تقلید کی اور ظاہر کو اختیار کر کے باطن کو چھوڑ دیا حتی کہ خود بھی ہلاک ہوئے اور ایک پوری قوم کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اور

یہ اس زمانہ کی آفات میں سے ایک ہے اور میں انشاء اللہ اس کی شرح اپنی جگہ پر پوری طرح بیان کروں گا۔ وباللہ التوفیق

اچھی آواز کا سماع

پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''زینوا اصواتکم بالقرآن ''(اپنی آوازوں کی تلاوت قرآن سے آرائش کرو) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''یزید فی الخلق مایشاءُ ''(اللہ تعالیٰ خلقت میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے) مفسرین کرام کہتے ہیں کہ اس سے مراد آواز کا حسن ہے اور پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مَنْ ارادَ اَن یسمع صوتَ دائود فیسمع صوت ابی موسی الاشعری ''(جو آدمی حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز سننا چاہتا ہو وہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی آواز سن لے) اور احادیث میں مشہور ہے کہ جنت میں جنتیوں کو سماع حاصل ہوگا اور وہ اس طرح ہوگا کہ ہر درخت سے ایک مختلف نوعیت کی خوبصورت آواز آئے گی اور جب مختلف قسم کی آوازیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں تو طبیعت کو ان سے بڑی لذت اور نشاط حاصل ہوتا اور سماع کی یہ قسم انسانوں اور دوسری جاندار مخلوقات میں عام ہے کیونکہ روح ایک لطیف چیز ہے اور خوش الحانی میں بھی ایک ایسی لطافت ہے کہ جب روحیں اس کو سنتی ہیں تو جنس اپنی جنس کی طرف مائل ہوتی ہے میں نے جو بیان کیا یہ تو اطبا کے ایک گروہ کا قول ہے لیکن اہل علم میں سے جو لوگ تحقیق کے مدعی ہیں اس بارے میں ان کا کلام بھی بہت ہے انہوں نے تو خوش آوازی کی تالیف و ترکیب سے متعلق کتابیں لکھی ہیں اور اس علم کو بڑی عظمت دی ہے اور ان کے اس فن کے اثرات تو آلات موسیقی میں ظاہر ہیں جو انہوں نے نفسانی خواہشات کی تقویت اور لہو ولہب کیلئے شیطان کی موافقت و پیروی میں بنائے ہیں حتی کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسحاق موصلی ایک باغ میں راگ گا رہے تھے اور ایک بلبل بھی نغمہ سرا تھی بلبل اسحاق موصلی کے راگ کی لذت سے خاموش

ہوگئی اور سماع کرتی رہی یہاں تک اس میں مست ہو کر درخت سے گری اور وہیں مرگئی......
میں نے ان لوگوں کی بیان کردہ حکایتیں تو بہت سنی ہی ہیں لیکن میری مراد ان کے اقوال سے بالکل مختلف ہے کہ طبیعتوں کی ترکیب کی تمام راحتیں آوازوں اور خوش الحانی کی ترکیب سے ہیں...... حضرت ابراہیم خواص ؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ میں پہنچا اور ایک امیر کے مہمان خانے پر نزول کیا۔ میں نے وہاں ایک حبشی غلام کو دیکھا جو طوق اور زنجیروں میں جکڑا ہوا خیمے کے دروازے پر دھوپ میں پڑا ہوا ہے۔ میرے دل میں اس کیلئے بڑی شفقت پیدا ہوئی اور میں نے ارادہ کرلیا کہ اس کو امیر سے سفارش کر کے لےلوں گا۔ چنانچہ جب وہ کھانا میرے سامنے لائے تو مہمان کی تکریم کے طور پر امیر بھی ساتھ آیا تا کہ کھانے میں میرے ساتھ موافقت کرے جب اس امیر نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے کھانے سے انکار کر دیا اور عربوں پر اس سے زیادہ سخت کوئی بات نہیں ہوتی کہ کوئی ان کے کھانے سے انکار کر دے امیر کہنے لگا۔ اے جوانمرد میرا کھانا کھانے سے کونسی چیز تمہیں روک رہی ہے؟ میں نے کہا ''میں آپ کے ایک احسان کی آپ سے امید رکھتا ہوں'' اس نے کہا ''میری تمام املاک تمہارے لئے حاضر ہیں بس تم میرا کھانا کھاؤ میں نے کہا ''مجھے آپ کی املاک کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس غلام کو میرے کام کیلئے مقرر کر دیجئے اس نے کہا ''تم پہلے اس کا جرم تو مجھ سے پوچھ لو پھر بے شک اس کو چھڑا لینا کہ تمہیں میری تمام املاک پر مہمان ہونے کی وجہ سے تصرف حاصل ہے میں نے کہا ''تو پھر بتائیے اس کا جرم کیا ہے؟ اس نے بیان کیا کہ ''تمہیں معلوم ہو کہ یہ غلام بڑا اچھا حدی خواں اور خوش آواز ہے میں نے اس کو چند اونٹ دے کر اپنی جاگیر پر بھیجا تا کہ یہ وہاں سے غلہ لا دلائے اس نے ہر اونٹ پر دو دو اونٹوں کا بوجھ لا دیا اور راستے میں حدی خوانی کرتا رہا اور اونٹ تیزی سے دوڑتے رہے یہاں تک کہ تھوڑے سے وقت میں میرے کہے ہوئے بوجھ سے دوگنا غلہ لے کر یہاں پہنچ گیا اور جب اونٹوں سے بوجھ اتارا گیا تو سب اونٹ ایک

ایک کر کے ہلاک ہو گئے۔ حضرت ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا اے امیر! آپ کی شرافت آپ کو غلط بیانی کی ہرگز اجازت نہیں دیتی تاہم مجھے اس بیان پر کوئی دلیل چاہیے ہم ابھی اسی گفتگو میں ہی مصروف تھے کہ چند اونٹ جنگل سے کنوئیں پر پانی پلانے کیلئے لائے گئے امیر نے ان شتربانوں سے پوچھا کہ تمہارے ان اونٹوں نے کتنے دن سے پانی نہیں پیا ہے؟ انہوں نے کہا ''تین روز سے'' امیر نے اس غلام کو حکم دیا تو اس نے حدی خوانی کی آواز نکالنی شروع کی۔ اونٹ اس کی حدی خوانی اور خوش آوازی میں اس طرح مست ہو گئے کہ کسی نے بھی پانی کی طرف منہ تک نہ کیا۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے اچانک بھاگ اٹھے اور جنگل مین جا کر منتشر ہو گئے پھر امیر نے اس غلام کو کھول کر مجھے بخش دیا...... اور ہم نے بعض اوقات خود مشاہدہ کیا ہے کہ دوران سفر جب شتربان اور گدھوں والا ترنم سے آوازیں لگاتا ہے تو اونٹ اور گدھے سرور میں آ جاتے ہیں۔ خراسان اور عراق کے علاقوں میں عادت ہے کہ شکاری لوگ رات کے وقت ہرن پکڑتے ہیں اور وہ اس طرح کہ وہ ایک طشت بجاتے ہیں کہ جب تک ہرن اس کی آواز سنتے رہتے ہیں اپنی جگہ پر کھڑے رہتے ہیں اور شکاری ان کو پکڑ لیتے ہیں...... اور مشہور ہے کہ ہندوستان میں ایک گروہ ہے وہ لوگ جنگل میں جاتے ہیں اور سریلی آوازوں میں ان گیتوں کی لذت سے ہرن اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور پھر سو جاتے ہیں اور یہ لوگ ان کو پکڑ لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں بھی یہ بات ظاہر ہے کہ جب وہ جھولے میں رونے لگتے ہیں تو کوئی شخص انہیں لوری دیتا ہے اور وہ خاموش ہو جاتے اور وہ سریلی آواز سننے لگتے ہیں۔ طبیب لوگ ان بچوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی حس بالکل درست ہے اور یہ بڑے ہی زیرک اور دانشمند ثابت ہوں گے...... یہی وجہ ہے کہ ملک عجم کا ایک بادشاہ فوت ہو گیا اور اس کا ایک ہی بچہ تھا جس کی عمر دو سال تھی وزرا نے اس کو تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں حکیم بوذرجمہر سے مشورہ کیا اس نے کہا یہ فیصلہ تو درست ہے لیکن یہ تو دیکھنا چاہیے

کہ اس کی حس بھی درست ہے تا کہ اس سے کوئی امید وابستہ کی جائے یا نہیں انہوں نے پوچھا کہ اس کی تدبیر کیا ہو؟ اس نے حکم دیا اور چند گانے والوں نے اس کے سرہانے گیت گانا شروع کر دیے تو وہ بچہ گیت سن کر سرور میں آ گیا اور ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کر دیے بوذرجمہر نے کہا ہاں اس سے بادشاہ بننے پر ملک کو صحیح چلانے کی امید کی جا سکتی ہے......اور اچھی آوازوں کی تاثیر عقلا کے نزدیک اس قدر ظاہر ہے کہ اس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور جو شخص یہ کہے کہ مجھے سرود سریلی آواز اور مزاحیہ اچھے نہیں لگتے تو وہ یا تو جھوٹ اور منافقت کی بنیاد پر کہتا ہے یا پھر وہ حس نہیں رکھتا اور انسانوں کے تمام طبقات اور صوفیوں سے باہر ہے۔ جو گروہ اس چیز سے منع کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی رعایت کرتے ہوئے اس سے منع کرتا ہے تاہم تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ جب لہو ولعب کے آلات نہ ہوں اور اس خوش الحانی کو سننے سے دل میں بدکاری اور گناہ کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہو تو اس کا سننا مباح ہے اور اس اباحت پر وہ بہت سی روایات اور احادیث بیان کرتے ہیں چنانچہ وہ سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا سے روایت لاتے ہیں کہ ''قالت کانت عندی جاریة تغنی فاستاذن عمر فلما احسته وسمعت حِسّه' فرت فلما دَخَلَ عُمر تبسّم رسول اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم فقالَ لَه' عمر ماَ اضحکک یا رسول اللّٰه قال کانت عندنا جاریة تغنی فلما سمعت حسّک فَرت فقال عمر لاَ اَبرَح حتی اَسمع مَاکَانَ سَمعَ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فد عارسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وَسَمعَ''

(حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میرے پاس ایک لونڈی گیت گا رہی تھی کہ حضرت عمرؓ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، جب اس لونڈی کو ان کے آنے کا احساس ہوا اور ان کی آہٹ سنی تو وہ بھاگ گئی پس جب حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو حضور ﷺ مسکرائے تو حضرت عمرؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو کس چیز نے ہنسایا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا ہمارے پاس ایک لونڈی تھی جو کچھ گا رہی تھی لیکن جب اس نے تمہاری آہٹ سنی تو وہ بھاگ

گئی ہے تو حضرت عمرؓ نے عرض کی میں تو اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں گا جب تک وہ کچھ سن نہ لوں جو رسول اللہ ﷺ سن رہے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس لونڈی کو بلایا اور انہوں نے اس سے گیت سنا اور بہت سے صحابہؓ سے بھی اس طرح کی روایات بیان کی ہیں۔ اور شیخ ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ نے ان سب روایات کو اپنی تصنیف ''کتاب السماع'' میں جمع کر دیا ہے اور اس کی اباحت کو قطعی بنا دیا ہے لیکن مشائخ تصوف کے ہاں سماع سے مراد اس مباح سماع کے علاوہ وہ سماع ہے جس سے اعمال میں فائدہ حاصل ہو کیونکہ محض اباحت کو تلاش کرنا تو عوام کا کام ہے عقلمند اور مکلف بندوں کو تو ایسے کاموں کے درپے ہونا چاہئے جن سے کوئی فائدہ حاصل ہو...... ایک دفعہ میں مرو میں تھا کہ آئمہ اہلحدیث میں سے ایک نے جو ان میں سے بہت مشہور تھا۔ مجھ سے کہا کہ ''میں نے سماع کی اباحت میں ایک کتاب تصنیف کی ہے'' میں نے کہا ''پھر تو دین میں ایک بہت بڑی مصیبت پیدا ہو گئی کہ جناب امام نے ایک ایسے لہو کو حلال کر دیا ہے جو تمام بدکاریوں اور گناہوں کی بنیاد ہے اس نے کہا پھر اگر آپ حلال نہیں سمجھتے تو سماع کرتے کیوں ہیں؟ میں نے جواب دیا ''اس کا حکم کئی وجوہ پر ہے کہ کسی ایک چیز پر قطعی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔ اگر دل میں حلال کام کی تاثیر پیدا ہو تو سماع حلال ہے اور اگر تاثیر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے اور اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے۔ جس چیز کا ظاہری حکم فسق پر ہو لیکن باطن میں اس کا حال روشن ہو اس کی کئی وجوہ ہیں کہ اس کا اطلاق ایک چیز پر کرنا محال ہوتا ہے۔

سماع کے احکام

جان لو کہ جس طرح دلوں میں ارادے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح طبیعتوں میں اختلاف کی وجہ سے سماع کے احکام بھی مختلف ہیں اور یہ ظلم ہوگا کہ کوئی اس کا ایک ہی قطعی حکم بیان کرے...... بہرحال سماع کرنے والے دو طرح کے ہیں ایک وہ جو معنی کو سنتے ہیں اور

دوسرے وہ جو صرف الفاظ کا سماع کرتے ہیں اور ان دونوں میں کچھ فائدے بھی ہیں اور کچھ نقصان بھی اس لئے کہ سریلی آوازوں کے سننے میں غلبہ اس چیز کا ہوتا ہے جو اس آدمی کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا ہے اگر وہ طبعی جذبہ حق ہے تو سماع حق ہوگا اور اگر وہ باطل ہے تو یہ بھی باطل ہوگا اگر کسی شخص کی طبیعت میں سرمایہ ہی فساد کا ہے تو وہ جو کچھ بھی سن لے سب فساد ہی ہوگا اور یہ تمام معانی حضرت داؤد علیہ السلام کی حکایات میں آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اپنا خلیفہ بنایا تو ان کو بڑی خوبصورت آواز دی اور ان کے گلے کو مزامیر (ساز) بنا دیا۔ پہاڑوں کو آپ کے ترنم کو بکھیرنے کا ذریعہ بنا دیا حتی کہ وحشی جانور اور پرندے پہاڑوں اور صحراؤں سے آپ کی آواز سننے کیلئے دوڑتے چلے آتے بہتا ہوا پانی رک جاتا اور پرندے فضا میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑتے تھے روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جس جنگل میں اپنی خوش الحانی کا جادو جگاتے اس صحرا میں رہنے والے جانور ایک ماہ تک کچھ نہ کھاتے بچے نہ روتے نہ دودھ مانگتے اور جب لوگ اس جگہ سے واپس لوٹتے تو بہت سے آدمی آپ کے کلام خوش الحانی اور سریلی آواز کی لذت سے مر چکے ہوتے، یہاں تک کہ کہتے ہیں ایک دفعہ سات سو لڑکیاں شمار کی گئیں جو مر چکی تھیں اور بارہ ہزار بوڑھے بھی مر چکے تھے...... پھر جب حق تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ محض اچھی آوازوں کا سماع اور خواہش طبیعت کا اتباع کرنے والوں کو اہل حق اور معانی و حقیقت کا سماع کرنے والوں سے جدا کر دیں تو ابلیس کا طبعی اضطراب قوت پکڑ گیا اور انسان کے دل میں وسوسہ ڈالنے کا ارادہ اس کے دل میں پیدا ہو گیا اور اس نے لوگوں کے ساتھ اپنے حیلے ظاہر کرنے کی درخواست کی جو منظور ہو گئی چنانچہ اس نے ایک بنسری اور ایک طنبور بنا لیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی مجلس سماع کے بالکل سامنے اس نے ایک مجلس جمالی۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی مترنم آواز سننے والے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ بدبخت لوگوں کا اور دوسرا سعادت مند لوگوں کا بدبخت لوگوں کا ٹولہ تو ابلیس کے آلات موسیقی کی طرف مائل

ہو گیا اور سعادت مند لوگوں کی جماعت حضرت داؤد علیہ السلام کی خوبصورت آواز کے ساتھ موجود رہی۔ پھر ان میں سے جو لوگ اہل معنی تھے ان کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز نہ تھی بلکہ وہ تو سب کچھ حق کو ہی دیکھتے تھے کہ اگر وہ ابلیس کے مزامیر سنتے تو ان میں انہیں حق سے ایک آزمائش نظر آتی اور اگر حضرت داؤد علیہ السلام کی خوبصورت آواز سنتے تو اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے ہدایت جانتے یہاں تک کہ وہ تمام سے کنارہ کش اور اس کے متعلقات سے روگرداں ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک کی حقیقت یعنی صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط دیکھ لیا۔ پس جس شخص کا سماع اس طرح کا ہو وہ جو کچھ بھی سنے سب حلال ہے..... تصوف کے مدعی لوگوں میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ "ہمارے لئے تو سماع اس کے برخلاف واقع ہوتا ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں ہے لیکن یہ محال ہے کیونکہ ولایت کا کمال یہ ہے کہ ہر چیز کو بالکل اسی طرح دیکھو جس طرح حقیقت میں وہ ہے تا کہ دیکھنا درست ہو اگر اس کی حقیقت کے برخلاف دیکھتے ہو تو تمہارا دیکھنا ہی درست نہیں..... کیا تم نے نہیں دیکھا کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا "اللّٰھُمَ ارنا حقائق کل الاشیاء کما ھِیَ" (اے اللہ! تو ہمیں تمام چیزوں کی حقیقت اس طرح دکھا جس طرح کی وہ ہیں) جب چیزوں کو صحیح دیکھنا ہے کہ تم ان کو اسی صفت پر دیکھو جس پر وہ حقیقت میں ہیں تو پھر سماع بھی صرف وہی درست ہو گا کہ تم ہر چیز کو بالکل اسی طرح سنو جس طرح کہ وہ صفت اور حکم میں ہے اور جو لوگ مزامیر اور آلات موسیقی کے فتنہ میں مبتلا ہو کر خواہشات اور شہوت سے وابستہ ہو گئے ہیں وہ انہی میں سے ہیں جو کسی چیز کی حقیقت کے برخلاف اسے سنتے ہیں کیونکہ اگر وہ اس چیز کے حکم کے مطابق اس کا سماع کرتے تو تمام فتنوں سے رہائی پا جاتے، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اہل ضلالت نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سنا تو ان کی گمراہی کا اضافہ ہی ہوا جیسا کہ نضر بن الحارث نے کہا "ھٰذا اساطیر الاولین" (یہ قرآن پہلے لوگوں کے قصے ہی تو ہیں) اور عبداللہ بن ابی سرح نے جو کاتب وحی بھی رہ چکا تھا کہا "سانزلُ مثل ما انزل اللّٰہ" (عنقریب میں بھی ایسا

کلام اتاروں گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے) "فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ" (پر برکتوں والا ہے اللہ بہت پیدا کرنے والا) اور ایک گروہ نے اس آیت "لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِکُ الْاَبْصَارَ" (آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھ سکتا ہے) کو رویت باری تعالیٰ کی نفی کیلئے دلیل بنالیا اور ایک گروہ نے "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْش" (پھر وہ اپنے عرش پر بیٹھا) کو اللہ تعالیٰ کیلئے مکانی اور جہت ثابت کرنے کی دلیل بنالیا اور ایک گروہ نے "وَجَاءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا" (اور آیا تیرا رب اور فرشتہ صفیں باندھے ہوئے) کو اپنے دعویٰ کیلئے دلیل بنالیا چونکہ ان کا دل گمراہی کا محل تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا...... لیکن ایک موحد جب کسی شاعر کے شعر میں غور کرتا ہے اور اس کی طبیعت کو پیدا کرنے والے خدا کو دیکھتا ہے اور اس کے باطن کو آراستہ کرنے والے کا اس میں مطالعہ کرتا ہے تو فعل کا اعتبار کرتے ہوئے اس کے حقیقی فاعل پر اس کو دلیل بنالیتا ہے حتیٰ کہ اس گمراہ گروہ نے تو کلام خداوندی سن کر بھی راہ ہدایت کو گم کرلیا اور اس گروہ صوفیہ نے باطل کلام میں بھی کوئی نہ کوئی راہ ہدایت تلاش کر ہی لی...... اور اس حقیقت کا انکار بڑا ہی واضح مکابرہ ہے۔ واللہ اعلم

فصل

سماع کے متعلق مشائخ رحمہم اللہ کے انتہائی لطیف کلمات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ یہ کتاب ان سب کی متحمل ہو سکے۔ تاہم انشاء اللہ ممکن حد تک میں ان اقوال میں سے اس فصل میں بیان کروں گا۔ تاکہ پورا پورا فائدہ حاصل ہو...... چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں "السماع وارد الحق تزعج القلوب اِلَی الحقِ فمن اصغی الیہِ بحق تحقق وَمَن اصغیٰ الیہِ بنفسٍ تزندق" (سماع حق تعالیٰ کی طرف سے وارد ہونے والا ایک فیضان ہے جو دلوں کو حق تعالیٰ کی طرف برانگیختہ کرتا ہے اور طلب حق میں حریص کرتا

ہے جو شخص اس کو حقیقی معنی میں سنتا ہے وہ راہ حق پالیتا ہے اور جو شخص اس کو اپنے نفس کے ساتھ سنتا ہے وہ زندیق ہو جاتا ہے) اس بزرگ کی مراد اس سے یہ نہیں کہ سماع وصل حق کا سبب بن جائے گا بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ سماع کرنے والے کو چاہئے کہ محض آواز کو نہ سنے بلکہ اس کے معنی کو حق کے ساتھ سنے تا کہ اس کا دل حق تعالیٰ کی واردات کا محل ہو جائے پس جب وہ معنی دل تک پہنچیں گے تو اس کو طلب کیلئے ابھاریں گے اور جو شخص اس طرح اپنے سماع میں حق کا اتباع کرنے والا ہوگا اسے مشاہدہ حق نصیب ہوگا اور جو شخص خواہشات نفسانی میں معانقہ کرے گا اور اس کا اتباع کرے گا وہ حق سے حجاب میں رہے گا اور تاویلات سے متعلق ہو جائے گا تو اب گویا اس سماع کا ثمرہ تو مشاہدہ حق ہوا اور اس سماع کا نتیجہ حجاب ہوا...... پھر یہ زندقہ فارسی لغت کا لفظ ہے جسے عربی بنایا گیا ہے اور زبان میں زندقہ کا معنی تاویل ہو گیا اسی لئے وہ کسی کتاب کی تفسیر کو زندہ باز ند کہتے ہیں اسی لئے جب عربوں نے آتش پرستوں کا کوئی خصوصی نام رکھنا چاہا تو ان کا نام زندیق رکھا کیونکہ مجوسی کہا کرتے تھے کہ جو بات بھی یہ مسلمان کہتے ہیں اس میں تاویل ہو سکتی ہے اس لئے کہ ظاہری حکم اس کی حقیقت کے برعکس ہوتا ہے چونکہ دیانت میں داخل ہونا تنزیل ہے اور دیانت سے باہر نکلنا تاویل اس لئے مجوسیوں کو زندیق کہا گیا کہ وہ دیانتداری سے باہر نکلے ہوئے تھے اور احکام میں تاویلات کا قول کرتے تھے آج کل انہی کے بچے کھچے مصر کے شیعہ بھی وہی کچھ کہتے ہیں جو وہ محسوس کہا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ زندیق کا نام ان کیلئے اسم علم بن گیا۔ پس حضرت ذوالنون کی مراد اس قول سے یہ ہی تھی کہ اہل تحقیق تو سماع میں اور زیادہ محقق ہو جاتے ہیں لیکن خواہش پرست لوگ اس میں مادل ہوتے ہیں کہ اس کیلئے بڑی دور کی تاویل کرتے ہیں اور یوں فسق (گناہ) میں مبتلا ہو جاتے ہیں حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں ''السماعُ ظاھرہ فتنة وَبَاطنه عبرة'' فَمَنْ عرفَ الاشارة حَل لَهُ سماع العبرةِ وَالاّ فقد استدعی الفتنة ولعَرَّض البلية '' (سماع کا ظاہر تو فتنہ ہے لیکن اس کا باطن عبرت ہے پس جو شخص

اشارہ کو پہچانتا ہے اس کیلئے تو عبرت کا سماع حلال ہے ورنہ اس نے فتنہ کو طلب کیا اور مصیبت میں مبتلا ہو گیا) یعنی جس شخص کا دل پوری طرح حق کی بات میں مستغرق نہیں ہے اس کیلئے سماع ایک مصیبت اور آفت گاہ ہے..... حضرت ابو علی رودباریؒ سے جب کوئی سماع کے بارے میں سوال و جواب کرتا تو آپ کہتے ''یتنا نخلص منه راسا براسٍ'' (کاش ہم اس سے پوری طرح خلاصی پا جاتے) کیونکہ انسان تمام چیزوں کا حق ادا کرنے سے عاجز ہے اور جب کسی چیز کا حق فوت ہو جاتا ہے تو بندہ اپنی کوتاہی کو دیکھتا ہے اور جب اپنی کوتاہی ہی دیکھنی پڑتی ہے تو کاش کہ ہم اس سے بالکل ہی چھٹکارا حاصل کر لیں...... مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں ''السماعُ بینة الاسرارِ لِمَا فیها من المفیبات'' (سماع دلوں کو ان باتوں کے مشاہدے پر ابھارتا ہے جو اس میں چھپی ہوئی ہیں) تاکہ ان کی وجہ سے بارگاہ حق میں مسلسل حاضر رہیں کیونکہ مدعیان تصوف کے دل کا بارگاہ الٰہی سے غیب رہنا ان کیلئے قابل ملامت اور ان کے اوصاف میں سب سے زیادہ قابل مذمت وصف ہے اس لئے کہ دوست اگرچہ ظاہری طور پر دوست سے غائب بھی ہو تو دلی طور پر حاضر ہی ہوتا ہے اور جب دلی طور پر بھی غیبت آ جائے تو دوستی اٹھ جاتی ہے..... میرے شیخ فرماتے ہیں ''السماع زاد المصطرینَ فَمَنْ وَصَلَ استغنی عن السماع'' (سماع تو درماندہ لوگوں کا سامان سفر ہے پس جو منزل پر پہنچ جاتا ہے، سماع سے مستغنی ہو جاتا ہے) کیونکہ محل وصل میں سماع کا حکم معزول ہو جاتا ہے کہ سننا تو خبر کا ہوتا ہے اور خبر کسی غائب چیز کے متعلق ہوتی ہے جب آنکھوں سے مشاہدہ ہو جاتا ہے تو سننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی...... اور حضرت حصریؒ کہتے ہیں ''اَلَیشَ اَعْمَل بالسماع ینقطع اِذا انقطع ممن یسمع منه ینبغی ان یکون سماعکَ متصلاً غیر منقطع'' (میں اس سماع کو کیا کروں جس کا اثر پڑھنے والے کے خاموش ہونے پر منقطع ہو جاتا ہے تمہارا سماع تو اس طرح ہونا چاہئے جو مسلسل ہو اور ہرگز منقطع نہ ہو) اس بات نے گلشن محبت میں ہمت کے مجتمع ہونے کا پتہ دیا ہے کیونکہ جب بندہ

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو تمام پتھر، مٹی اور سارا جہاں اس کا سماع سنتا ہے اور یہ مقام بڑا ہی بزرگ اور اعلیٰ ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

سماع میں صوفیہ کا اختلاف

سماع کے بارے میں مشائخ اور محققین کا اختلاف ہے چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے کہ سماع غیبت کا آلہ ہے اور اس کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ مشاہدہ کی حالت میں سماع محال ہوتا ہے کیونکہ محل وصل میں دوست۔ اپنے دوست کو دیکھنے کی حالت میں اس کے سماع سے مستغنی ہوتا ہے اس لئے کہ سماع تو کسی خبر کا ہوتا ہے اور محل مشاہدہ میں خبر دوری حجاب اور مشغول ہوتی ہے۔ پس سماع متبدی لوگوں کیلئے آلہ ہے کہ اس آلہ سے ان کی غفلت کی پراگندگیاں مجتمع ہو جاتی ہیں اور جس کی طبیعت پہلے سے ہی مجتمع ہو وہ لامحالہ اس سماع سے پراگندہ اور منتشر المزاج ہو جائے...... پھر ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ سماع بارگاہ خداوندی میں حاضری کا آلہ ہے کیونکہ محبت پوری طرح محویت کا تقاضہ کرتی ہے جب تک محب پوری طرح محبوب میں مستغرق نہ ہو وہ محبت میں ناقص ہوتا ہے پس جس طرح محل وصل میں دل کا حصہ محبت، باطن کا حصہ مشاہدہ، روح کا حصہ وصل اور جسم کا حصہ خدمت ہے اسی طرح کان کا بھی حصہ ہونا چاہئے جس طرح آنکھ کیلئے دیدار میں سے ایک حصہ ہے کسی شاعر نے محل ہزل میں کتنی اچھی بات کہی ہے کہ جب وہ شراب کی دوستی کا دعویٰ کرتا ہے۔

اَلَا مَاسقنِي خمراً وقُل لِي هِيَ الخمر
وَلَا تَسقِنِي سِرًّا اِذَا امكنَ الجهر

(اے دوست مجھے شراب پلا اور مجھے یہ کہہ دے کہ یہ شراب ہے اور اگر علانیہ طور پر شراب پلانا ممکن ہے تو پھر چھپ کر نہ پلا)

یعنی اے دوست مجھے اس طرح شراب دے کہ میری آنکھ اسے دیکھ لے۔ ہاتھ

اسے چھولے تالوا سے چکھ لے اور ناک اسے سونگھ لے اس وقت ایک حاسہ اس سے محروم رہے گا اور وہ کان ہے اس لئے تم کہہ دو کہ یہ شراب ہے تا کہ کان بھی اپنا نصیبہ حاصل کرے اور یوں میرے تمام حواس اس سے مل جائیں اور لذت حاصل کر لیں...... اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سماع حضوری کا آلہ ہے کیونکہ غائب تو خود غائب ہوتا ہے اور غائب اس کا منکر ہوتا ہے اس کا اہل نہیں ہوسکتا...... پس سماع کی دو قسمیں ہیں ایک بالواسطہ اور دوسری بلا واسطہ۔ جو شخص کسی عام پڑھنے والے سے سنتا ہے وہ سماع آلہ غیبت ہوتا ہے اور جو اپنے محبوب سے سنتا ہے وہ سماع آلہ حضور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ نے کہا تھا کہ میں مخلوقات کو اس مقام پر نہیں سمجھتا کہ ان کی کوئی بات سنوں یا ان کی بات کروں سوائے خاصان حق کے ......واللہ اعلم بالصواب۔

سماع میں صوفیہ کے مراتب

جان لو کہ صوفیہ میں سے ہر ایک کیلئے سماع میں ایک خاص مرتبہ ہے کہ اس کا ذوق اور طریق سماع میں اس کے مرتبے کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے والا جو کچھ بھی سنتا ہے وہ اس کیلئے حسرت و ندامت کا معاون ہوتا ہے۔ اسی طرح مشتاق دیدار کیلئے شوق اور دیدار کا سرمایہ صاحب یقین کے یقین میں تاکید، مرید کیلئے بیان کی تحقیق محبّ کیلئے تمام تعلقات سے علیحدگی اور فقیر کیلئے ہر چیز سے ناامید ہونے کی بنیاد ہو جاتی ہے اور اصل سماع کی مثال آفتاب جیسی ہے کہ تمام چیزوں پر چمکتا ہے لیکن ہر چیز کو اپنے مرتبے کی مقدار اس سے ذوق اور مشرب ہوتا ہے چنانچہ وہ ایک تو جلا دیتا ہے دوسرے کو روشن کر دیتا ہے اور کسی کو محروم رکھتا ہے اور کسی کو نواز دیتا ہے یہ تمام گروہ جو میں نے بیان کئے ہیں تحقیق کے اعتبار سے تین مرتبوں پر ہیں ایک ان میں سے مبتدی، دوسرا متوسط اور تیسرا کامل حضرات کا درجہ ہے میں انشاءاللہ ان میں سے سماع کے متعلق ہر ایک کیلئے ایک الگ فصل بیان کروں گا

تاکہ یہ مسئلہ تمہاری سمجھ کے قریب تر ہو جائے۔

فصل

جان لو کہ سماع ایک فیضان حق ہے اور انسانی جسم کی ترکیب ہزل اور لغو سے ہوئی ہے اور کسی حالت میں بھی مبتدی کی طبیعت کلام حق سننے کے قابل نہیں ہوتی اور ان ربانی معانی کے ورود سے طبیعتیں زیروزبر ہوتی ہیں اور انہیں سوز و اضطراب نصیب ہوتا ہے چنانچہ ایک گروہ تو سماع کے دوران بیہوش ہو جاتا ہے اور ایک گروہ بالکل ہلاک ہو جاتا ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں رہتا کہ اس کی طبیعت حد اعتدال سے باہر نہ ہو اور اس کیلئے دلیل بڑی ظاہر ہے...... مشہور ہے کہ روم کے ایک شفا خانے میں ایک بڑی عجیب چیز انہوں نے تیار کی جسے وہ ''انکلیون'' کہتے ہیں ویسے جس چیز میں بھی بہت سے عجائب موجود ہوں روم کے لوگ اسے اسی نام سے پکارتے ہیں چنانچہ صحیفوں اور مانی وغیرہ کی مصنوعات کو ''انکلیون'' ہی کہتے ہیں اور اس سے مراد ان کی حکم کا اظہار ہوتا ہے وہ ''انکلیون'' سارنگی کی طرح کا ایک ساز تھا جس سے مترنم آوازیں آتی تھیں اور اس شفا خانے کے معالج بیماروں کو ہفتہ میں دو مرتبہ وہاں لے جا کر وہ ساز بجانا شروع کر دیتے تھے اور ہر بیمار کو اس کی بیماری کی مقدار آواز سنواتے تھے اور پھر وہاں سے باہر نکال لاتے تھے اور اگر وہ کسی مریض کو ہلاک کرنا چاہتے تو اس کو زیادہ دیر تک اس جگہ رکھتے حتی کہ وہ ساز سنتا سنتا ہلاک ہو جاتا...... درحقیقت موت کا وقت تو تقدیر میں لکھا ہوا ہے لیکن پھر بھی موت کے کچھ ظاہری اسباب ہوتے ہیں جنہیں طبیب لوگ ہمیشہ سنتے رہتے ہیں لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ یہ ان کی طبیعت کے تو موافق ہوتا لیکن مبتدی لوگوں کی طبیعت کے خلاف ہوتا ہے اس لئے ان پر اس کا اثر ہوتا ہے...... اور میں نے ہندوستان میں دیکھا ہے کہ زہر قاتل میں ایک کیڑہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی زندگی اسی زہر کے ساتھ ہی متعلق ہے کیونکہ وہ خود سرتاپا زہر ہی ہوتا

ہے...... اور ترکستان میں اسلام کی سرحد پر ایک شہر میں میں نے دیکھا کہ ایک پہاڑ میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ جل رہا ہے اور اس کے پتھروں سے نوشادر ابل رہی ہے اور اس آگ کے درمیان ایک چوہا موجود تھا لیکن جب وہ اس آگ سے باہر آیا تو فوراً ہلاک ہو گیا۔ ان تمام مثالوں سے مراد یہ ہے کہ فیضان الٰہی کے وقت مبتدی حضرات کا اضطراب اس لئے ہوتا ہے کہ ان کا جسم ابھی اس کیفیت کے مخالفت ہوتا ہے لیکن جب یہ کیفیت متواتر ہو جاتی ہے تو مبتدی کو اس میں سکون مل جاتا ہے کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جب جبرئیل علیہ السلام ابتداء میں آئے تو پیغمبر ﷺ کو ان کے دیکھنے کی طاقت نہ ہوئی لیکن جب درجہ نہایت پر پہنچ گئے تو اگر جبرئیلؑ ایک ساعت کیلئے بھی نہ آتے تو حضور ﷺ تنگدل ہو جاتے اور اس کے شواہد بہت زیادہ ہیں اور یہ حکایات بھی مبتدی لوگوں کے اضطراب اور منتہی حضرات کے سکون پر بڑی واضح دلیل ہیں...... مشہور ہے کہ حضرت جنیدؒ کا ایک مرید تھا جو سماع میں بڑا ہی بیقرار ہوتا تھا اور تمام درویش اس کو سنبھالنے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ چنانچہ مریدوں نے شیخ سے شکایت کی تو حضرت جنیدؒ نے اس سے کہا ''اگر آج کے بعد تم نے سماع کے دوران اس طرح اضطراب ظاہر کیا تو میں تمہیں اپنی صحبت میں نہیں رکھوں گا۔ ابومحمد جریری کہتے ہیں کہ سماع کی محفل میں اس درویش کو دیکھتا کہ اس کے ہونٹ خاموش ہیں اور اس کے جسم کے ہر بال سے ایک چشمہ ابل رہا ہے حتیٰ کہ اس کے ہوش جاتے رہتے ایک دن وہ اسی طرح بے ہوش تھا کہ میں سوچتا رہا کہ یہ درویش یا تو سماع میں سب سے زیادہ درست حال ہے اور یا پھر اپنے مرشد کی حرمت اس کے دل پر سب سے زیادہ قوی ہے......

کہتے ہیں کہ ایک مرید نے سماع کی حالت میں ایک نعرہ بلند کیا تو اس کے مرشد نے اسے کہا ''خاموش رہو'' مرید نے سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور جب اس کو دیکھا گیا تو وہ مردہ ہو چکا تھا...... حضرت شیخ ابومسلم فارس بن غالب الفارسیؒ سے میں نے سنا کہ انہوں نے بیان کیا ایک درویش سماع کی حالت میں بیقراری کا اظہار کیا کرتا تھا ایک شخص نے اس کے سر پر

ہاتھ رکھ کر اسے کہا ''بیٹھ جاؤ'' اس کا زمین پر بیٹھنا تھا کہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ حضرت جنیدؒ کہتے تھے کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا کہ اس نے سماع کی حالت میں ہی جان دے دی...... نیز آپ دراج سے روایت کرتے تھے کہ اس نے کہا، میں ابن القرطی کے ہمراہ بصرہ اور ابلہ کے درمیان دریائے دجلہ کے کنارے جا رہا تھا کہ ہم ایک محل کے نیچے پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک شخص اس میں بیٹھا ہوا ہے اور ایک لونڈی اس کے سامنے گیت گا رہی ہے اور یہ شعر پڑھ رہی تھی۔

فی سبیل اللّٰہ ودکان منی لک یبذلُ

کُل یوم قبلون غیر ھذا لک اَجمل

(میں تو تیرے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کیلئے محبت کیا کرتا تھا۔ پھر ہر روز تیرا یوں رنگ بدلنا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے) اور میں نے ایک نوجوان کو اس محل کے نیچے دیکھا جو ایک لوٹا لئے کھڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ اے لونڈی تمہیں خدا کی قسم ہے یہ شعر دوبارہ پڑھ دو کہ میری زندگی ایک سانس ہے زیادہ باقی نہیں رہی تا کہ ایک بار پھر اس شعر کے سماع سے بس یہ ختم ہی ہو جائے'' لونڈی نے شعر دوبارہ پڑھنے کی اس کی فرمائش پوری کی تو اس جوان نے ایک چیخ ماری اور اس کی جان ختم ہو گئی۔ محل کے مالک نے اس لونڈی سے کہا'' تو اب آزاد ہے'' اور خود نیچے آ کر اس جوان کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گیا بصرہ کے رہنے والے تمام لوگوں نے اس پر نماز جنازہ پڑھی اور پھر وہ شخص لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اعلان کیا کہ اے بصرے والو! میں جو فلاں فلاں کا بیٹا ہوں'' اپنی تمام املاک کو اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں اور اپنے تمام غلاموں کو آزاد کرتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور پھر کسی کو اس کی خبر معلوم نہ ہوئی'' اس حکایت کا فائدہ یہ ہے کہ غلبہ سماع کی حالت میں مرید حق کا حال اس طرح ہونا چاہئے کہ اس کا سماع فاسقوں کو فسق سے نجات دے...... اس زمانے میں گمراہوں کا ایک گروہ فاسقوں کے سماع میں حاضر ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم تو حق کے

ساتھ سماع کرتے ہیں اور وہ فاسق لوگ چونکہ ان گمراہ لوگوں کی موافقت کرتے ہیں اس لئے اس سماع سے وہ فسق و فجور میں اور زیادہ حریص ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ خود بھی اس میں ہلاک ہو جاتے ہیں...... اور لوگوں نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا کہ ''اگر ہم عبرت کے طور پر گرجے میں چلے جائیں اور اس سے مقصد ہمارا یہ ہو کہ وہاں جا کر کافروں کی ذلت کا مشاہدہ کریں اور اسلام کی نعمت پر حق تعالیٰ کا شکر کریں تو کیا یہ جائز ہے؟ حضرت جنیدؒ نے جواب دیا ''اگر تم گرجے میں اس طرح جا سکتے ہو کہ جب تم باہر آؤ تو اہل کلیسا میں سے چند انسانوں کو اپنے ہمراہ درگاہ الٰہی میں لیتے آؤ تو بے شک چلے جاؤ ورنہ ہرگز نہیں پس عبادت خانے والا اگر شراب خانے چلا جائے تو وہ بھی شراب خانے والا بن جاتا ہے اور اگر شراب خانے والا عبادت خانے میں آ جائے تو وہ بھی عبادت خانے والا بن جاتا ہے...... کبار مشائخ میں سے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں ایک درویش کے ہمراہ بغداد میں گزر رہا تھا کہ ہم نے ایک مغنی کی آواز سنی جو یہ شعر گا رہا تھا۔

مُنیٰ اِن یکن حقاً یکن احسن المنی

وَالاَّ فَقد عِشنا بِهَا زمناً وغلاً

(آرزو اگر حق ہے تو یہ بڑی ہی اچھی آرزو ہے ورنہ ہم نے تو اس آرزو میں ایک زمانہ گزار دیا ہے۔) یہ شعر سن کر اس درویش نے ایک نعرہ بلند کیا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی طرح حضرت ابو علی رودباریؒ کہتے ہیں کہ ایک درویش کو میں نے دیکھا کہ جو ایک مغنی کی آواز میں مشغول ہو رہا تھا اس نے بھی کان لگا دیا کہ سنوں تو سہی وہ کیا پڑھ رہا ہے وہ بڑی غمگین آواز میں یہ مصرع گا رہا تھا۔

اَمُد کفِی بالخضوع اِلَی الذی جاوَبالا صفاء

میں بڑی عاجزی سے اپنا ہاتھ اس شخص کی طرف بڑھاتا ہوں جو سننے کی سخاوت کرتا ہے اس درویش نے اسی جگہ ایک آواز بلند کی اور گر پڑا۔ جب میں اس کے قریب ہوا

تو اس کو مرا ہوا پایا۔ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم خواصؒ کے ہمراہ ایک پہاڑی راستے پر گزر رہا تھا کہ میرے دل میں ایک گونہ خوشی پیدا ہوئی اور میں نے پڑھنا شروع کر دیا

صح عند الناسِ انی عاشقٌ

غیران لَمْ یعرفوا عشقی لِمَن

لوگوں کا یہ علم بالکل صحیح ہے کہ میں عاشق ہوں لیکن انہیں یہ علم نہیں کہ یہ عشق کس کیلئے ہے۔

لیسَ فی الانسان شئٌ حسن　　الّا واحسن منه صوت الحسنِ

انسان کے وجود میں جو بھی حسین چیز ہے اچھی آواز ان سب سے زیادہ حسین ہے) یہ اشعار سن کر حضرت ابراہیم خواصؒ نے مجھ سے کہا یہ شعر دوبارہ پڑھو میں نے دوبارہ پڑھے تو آپ نے وجد کے طور پر چند قدم زمین پر مارے جب میں نے دیکھا تو آپ کے قدم موم کی طرح پتھر میں گڑ چکے تھے پھر آپ بیہوش ہو کر گر پڑے۔جب ہوش میں آئے تو مجھ سے کہا ''میں تو بہشت کے باغ میں تھا لیکن تم نے مجھے نہیں دیکھا''......اس قسم کی حکایتیں اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ یہ کتاب ان کی متحمل ہو سکے۔میں نے خود ایک درویش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ آذربیجان کے پہاڑوں میں چلا جا رہا تھا اور ایک شخص پریشانی کے عالم میں تیز تیز چلتا ہوا یہ شعر پڑھ رہا تھا اور گریہ زاری کر رہا تھا......اشعار

واللّٰهِ مَا طلعت شمس وَلاَ غربت　　الّاوانتَ فی قلبی ووسواسی

وَلاَ جَلَسْتُ اِلیٰ قومٍ اُحدِّثُهم　　اِلاَ وانت فی حدیثی بین جلاسی

وَلاَ ذَکرتُکَ مخزوناً وَلاَ طرباً　　الّا وَحبُّکَ مقرون بانفاسِی

وَلاَ هَمَمْتُ بشُرب الماء مِن عطشٍ　　اِلّا رایتُ خیالاً منک فی الکاسِی

فَلَوْ قدرتُ عَلَیَ الاتیان رزقُکم

فجیا عَلیق الوجهِ اَو مشیاً علی الراس

(اللہ کی قسم! کسی ایسے دن پر سورج طلوع یا غروب نہیں ہوا کہ تو میرے دل اور میرے

خیالوں میں موجود نہ ہو۔ اور میں جب بھی کسی قوم کے ساتھ گفتگو کیلئے بیٹھتا ہوں میرے ہم نشینوں کے درمیان تیرا ہی ذکر ہوتا ہے اور ہر خوشی اور غم کے وقت جب میں تیرا ذکر کرتا ہوں تو تیری محبت میرے سانسوں میں بسی ہوئی ہوتی ہے اور میں جب بھی پیاس کی وجہ سے پانی پینے لگتا ہوں تو میرے پیالے میں تیرا ہی پیکر مجھے نظر آتا ہے پس اگر مجھے تمہارے دیدار کیلئے آنے کی ہمت ہوتی تو میں منہ کے بل گھسٹتا ہوا یا سر کے بل چلتا ہوا آتا)......

درویش کی حالت ان اشعار کے سماع سے متغیر ہو گئی اور وہ تھوڑی دیر بیٹھا پھر ایک پتھر کے ساتھ پیٹھ ٹیک لی اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر رحمت ہو۔

فصل

اور مشائخ تصوف میں سے ایک گروہ قصیدوں اور اشعار کا سماع کرنے اور قرآن مجید کو اس طرح کے لحن سے پڑھنے کو "جس سے حروف اپنے مخارج کی حدود سے نکل جائیں" مکروہ سمجھتا ہے اپنے مریدوں کو اس سے روکتا ہے اور خود اس سے پرہیز کرنے میں بڑا غلو کرتا ہے۔ ان حضرات کے چند گروہ ہیں اور ہر گروہ کے نزدیک ایک الگ علت اور کراہت ہے۔ ایک گروہ تو ان میں سے ان حضرات کا ہے جن کے پاس سماع کے حرام ہونے کیلئے کئی احادیث ہیں اور اس معاملے وہ سلف صالحین کا اتباع اور تقلید کرتے ہیں۔ وہ روایات مثلاً حضور ﷺ کا حضرت حسان بن ثابتؓ کی لونڈی شیریں کو گیت گانے سے ڈانٹتے ہوئے منع کرنا۔ حضرت عمرؓ کا اس صحابی کو درہ مارنا جو غنی کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ کا حضرت امیر معاویہؓ پر اعتراض کرنا کہ انہوں نے گانے والی کنیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ حضرت علیؓ کا حضرت حسنؓ کو اس حبشیہ عورت کا نظارہ کرنے سے روکنا جو گیت گایا کرتی تھی کہ یہ تو شیطان کی سہیلی ہے اور اس طرح کی دوسری بہت سی روایات ہیں۔ نیز یہ حضرات کہتے ہیں کہ غنا کے مکروہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے مکروہ ہونے پر ہمارے اور ہم سے پہلے کے ہر زمانے

میں امت کا یہاں تک اجماع رہا ہے کہ ایک گروہ نے تو اس کو مطلقاً حرام کہا ہے اور اسی بارے میں وہ حضرت ابوالحارث بنانیؒ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ میں سماع کرنے میں بڑا ازور دیا کرتا تھا۔ ایک رات میرے عبادت خانے کے دروازے پر ایک شخص آیا اور کہنے لگا "درگاہ حق تعالیٰ کے طالبوں کی ایک جماعت جمع ہو چکی ہے اور شیخ کے دیدار کی مشتاق ہے اگر ان پر احسان کرتے ہوئے قدم رنجہ فرمائیں تو زہے نصیب! میں نے کہا "تم چلو میں باہر آ رہا ہوں" چنانچہ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھوڑی دور تک ہی میں چلا تھا کہ ایک جماعت کے پاس پہنچ گیا۔ جو ایک بوڑھے کے اردگرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے میری انتہائی درجے کی تکریم کی اور اس بوڑھے نے پوچھا "اگر آپ اجازت دیں تو چند اشعار پڑھے جائیں؟ میں نے اس کی خواہش کو قبول کر لیا تو دو شخص بڑی خوش الحانی کے ساتھ ایسے اشعار پڑھنے شروع ہو گئے جیسے اشعار شاعر لوگ محبوب کے فراق میں کہا کرتے ہیں۔ وہ سب لوگ ان اشعار کو سن کر وجد کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اچھے اچھے نعرے لگانے لگے اور آپس میں بڑے لطیف اشارے کرنے لگے اور میں ان کے اس حال سے تعجب و حیرانی میں مبتلا ہو گیا۔ صبح کا وقت قریب آنے تک وہ اسی خوشی کی حالت میں مصروف رہے۔ اب اس بوڑھے نے مجھ سے کہا "اے شیخ آپ نے مجھ سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کون ہوں اور یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟ میں نے کہا دراصل آپ کی وجاہت نے مجھے کچھ پوچھنے سے روکے رکھا ہے۔

حضرت ابوالحارث فرماتے ہیں اسے بوڑھے نے کہا میں خود عزازیل ہوں جسے اب ابلیس کہا جاتا ہے اور باقی سب میرے فرزند ہیں...... اور ان کے درمیان بیٹھنے اور یوں غنا اور اس کا سماع کرنے کے مجھے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ اس طرح میں اپنے فراق کی مصیبت کا مداوا اور اپنے عروج کے دنوں کو یاد کرتا ہوں اور دوسرا یہ کہ اس طرح میں پارسا لوگوں کو راہ حق سے گمراہ کرتا ہوں...... حضرت ابوالحارث فرماتے ہیں بس اسی وقت سے

سماع کا ارادہ میرے دل سے نفی ہو گیا۔۔۔۔ اور میں علی بن عثمان ہجویریؒ نے حضرت امام ابو العباس الاشقانیؒ سے سنا ہے کہ انہوں نے کہا "میں ایک دن ایسے مجمع میں تھا کہ لوگ اس میں سماع کر رہے تھے اور میں نے وہاں جنوں کو دیکھا جو برہنہ حالت میں ان کے درمیان ناچ رہے تھے اور سب لوگ ان کی طرف دیکھ رہے اور ان کی وجہ سے گرم ہو رہے تھے۔۔۔۔۔ اور ایک دوسرے گروہ کے حضرات صرف اس خوف سے سماع نہ کرتے اور سماع کرنے والوں میں نہ بیٹھتے تھے کہ ان کی وجہ سے ان کے مرید کہیں مصیبت اور گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں، اور ان کی تقلید کرتے ہوئے کہیں توبہ کا خیال چھوڑ کر معصیت کے مرتکب نہ ہونے لگیں، اور نفسانی خواہش ان کے اندر قوت نہ پکڑ لے اور کہیں ہوس رانی کا ارادہ ان کی اصلاح اور نیکی کو فسخ نہ کر دے کیونکہ یہ سماع مصیبتوں میں مبتلا ہونے کا محل اور فتنے کا سرمایہ ہے۔۔۔۔ اور حضرت جنیدؒ کے متعلق آیا ہے کہ آپ نے اپنے ایک مرید کو اس کی توبہ کے ابتدائی حال میں فرمایا "اگر تم اپنے دین کی سلامتی چاہتے ہو اور اپنی توبہ کے تقاضے پورے کرنا چاہتے ہو تو صوفی لوگ جو سماع کرتے ہیں اس سے نفرت کر اور جب تک تو جواں ہے اپنے آپ کو سماع کا اہل نہ سمجھ اور جب تو بوڑھا ہو جائے تو سماع کر کے دوسرے جوانوں کیلئے گناہ میں واقع ہو جانے کا سبب نہ بن۔

ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ سماع کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو لاہی (لہو و لعب کرنے والے) ہیں اور دوسرے وہ جو الٰہی اللہ والے) ہیں۔ لاہی تو عین فتنہ میں ہوتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں جب کہ الٰہی، مجاہدات، ریاضات مخلوقات سے دل کو منقطع کرنے اور باطن کو مخفی چیزوں سے بچانے کی بنا پر اپنے آپ کو فتنہ سے دور کئے ہوئے ہیں اور سماع کے نقصانات سے محفوظ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہم چونکہ نہ اس گروہ سے ہیں نہ اس گروہ سے اس لئے اس کو ترک کرنا ہمارے لئے بہتر اور کسی ایسی چیز میں مشغول ہونا جو ہمارے وقت کے موافق ہو تو بہت زیادہ بہتر ہے۔۔۔۔۔ اور ایک اور گروہ کے حضرات

کہتے ہیں کہ جب سماع کرنے میں عوام کیلئے فتنہ ہے اور ہمارے سماع کرنے سے لوگوں کے اعتقاد خراب ہوتے ہیں اور ہمارا درجہ بھی لوگوں سے حجاب میں ہے اس لئے وہ ہماری وجہ سے گناہگار ہو سکتے ہیں تو ہم عوام پر مشقت کرتے ہوئے اور خواص کو نصیحت کرنے کیلئے اور لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے سماع سے دست بردار ہوتے ہیں...... یہ طریقہ بھی بڑا ہی پسندیدہ ہے اور ایک اور گروہ کہتا ہے کہ پیغمبر علیہ فرماتے ہیں ''وَمِنْ حُسْنِ اسلامِ المرءِ ترک مَالاَ یعنیہ''(آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے) یعنی جن کاموں سے گریز کیا جا سکتا ہے ہم ان سے دست بردار ہو جائیں۔ کیوں لایعنی کاموں میں مشغول ہونا وقت کو ضائع کرنا ہے اور دوست اپنے پیارے دوستوں کے ساتھ وقت ضائع نہیں کیا کرتے اور خواص میں سے ایک اور گروہ نے کہا ہے کہ سماع ایک خبر ہے اور مراد کو پالینا اس کی لذت ہے جب کہ یہ بچوں کا کام ہے کیوں مشاہدہ میں خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوئی۔ پس مشاہدہ سے غرض ہونی چاہئے نہ کہ خبر سے...... سماع کے یہ احکام تھے جنہیں میں نے اختصار کے طور یہاں بیان کر دیا ہے۔ اب میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صوفیہ کے وجد۔ وجود اور تواجد کے بارے میں ایک باب مرتب کرتا ہوں۔

باب

وجد، وجود، تواجد اور اس کے مراتب

جان لو کہ وجد اور وجود دونوں مصدر ہیں ایک غم کے معنی میں اور دوسرا کسی چیز کو پا لینے کے معنی ہیں۔ اور ان دونوں کا فاعل ایک جیسا ہوتا ہے فاعل میں "وجد یجد وجوداً اور وجداناً جب کوئی شخص کسی چیز کو پا لینے والا ہو اور "وَجَدَ یجدُ وجداً" جب کوئی شخص غمگین ہو، ان دونوں کے درمیان مصدر کے سوا فرق نہیں کیا جا سکتا اسی طرح وجد یجد جدہ جب کوئی شخص غنی ہو جائے اور وجد یجد موجد جب وہ غصے میں ہو ان سب میں فرق مصدروں کی وجہ سے ہے نہ کہ افعال کی وجہ سے اور وجد اور وجود سے صوفیہ کی مراد وہ دو حال ثابت کرنا ہوتا ہے جو ان کو سماع کرتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں کہ ایک ان میں سے غم کے قریب ہوتا ہے اور دوسرا پا لینے سے متصل ہوتا ہے غم کی حقیقت تو محبوب کا کھو بیٹھنا اور مراد سے محروم ہو جاتا ہے جب کہ پا لینے کی حقیقت مراد کا حصول ہے اور حزن الم اور وجد بمعنی غم کے درمیان فرق یہ ہے کہ حزن اس غم واندوہ کا نام ہے جو اپنے نصیب میں ہو جب کہ وجد اس غم واندوہ کا نام ہے جو غیر کے نصیب میں ہو اور یہ محبت کے طور پر ہو، اور یہ تمام تبدیلیاں طالب کی صفات ہیں اور "الحق لا یتغیر" (حق بدلنے والی چیز نہیں ہے) اور وجد کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ وہ دیکھنے میں ایک الم ہے اور غم والم کو احاطہ قلم میں نہیں لایا جا سکتا۔ بس وجد طالب اور مطلوب کے درمیان ایک راز ہے کہ کشف کی حالت میں اس کی مقدار تو بیان ہو سکتی ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے اس کو نشان زد اور اس کی طرف اشارہ کرنا درست نہیں اس لئے کہ مشاہدہ کی حالت میں یہ ایک خوشی ہے اور کوئی خوشی طلب کے ذریعہ نہیں پائی جاتی۔ پس وجود محبوب کی طرف سے محبت کے ساتھ ایک فضل ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت سے اشارہ زائل ہوتا ہے۔ اور میرے نزدیک وجد فرحت یا رنج اور تھکاوٹ یا خوشی

کی وجہ سے دل کو پہنچنے والے الم کا نام ہے جب کہ وجود دل میں کسی آلے یا ذریعے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا اور اس کا صادق آنا ہی طالب کی مراد ہوتا ہے اور واجد کی صفت یا حالت حجاب میں واقع ہونے والے غلبہ شوق میں حرکت ہوگی یا پھر کشف کی حالت میں حاصل ہونے والے مشاہدہ کی صورت میں سکون ''اما زفیرٌ واما نفیر واما حنین'' واما انین واما عیشٌ واما طیش واما کرب واما طرب '' (یعنی واجد کی صفت یا قرار ہوگا یا بیقراری نالہ ہوگا یا مسکراہٹ عیش ہوگا یا طیش اور کرب ہوگیا یا مسرت) مشائخ کا اس معاملے میں اختلاف ہے کہ وجد زیادہ کامل ہے یا وجود چنانچہ ایک گروہ کہتا ہے کہ وجود مرید کی صفت ہے اور وجد عارفوں کی صفت ہے۔ جب عارفوں کا درجہ مریدوں کے درجہ سے زیادہ بلند ہے تو ہونا یہ ہی چاہئے کہ عارفوں کا وصف بھی مریدوں کے وصف سے زیادہ بلند تر اور کامل تر ہو۔ اس لئے کہ جو چیز بھی حصول کے تحت آتی ہے وہ مدرک ہوتی ہے اور یہ جنس کی صفت ہے کیونکہ ادراک کسی نہ کسی حد کا تقاضہ کرتا ہے جب کہ حق تعالیٰ لامحدود ہیں پس بندے نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہو وہ ایک شرب کے سوا کچھ نہیں اور جو کچھ نہیں پایا اس سے اس کا طالب لاتعلق ہوگیا اور اس کی طلب سے عاجز اور حق تعالیٰ کی حقیقت سے محروم ہوگا...... اور ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وجد مریدوں کا سوز ہے اور وجد محبوں کا تحفہ ہے اور محبوں کا درجہ مریدوں سے بلند ہوتا ہے کیونکہ طلب میں جلنے کے مقابلے میں تحفے کے ساتھ آرام زیادہ کامل ہوتا ہے اور یہ معنی ایک حکایت کے بغیر واضح نہ ہوسکیں گے اور وہ حکایت یہ ہے کہ ایک دن حضرت شبلیؒ اپنے حال کے جوش میں حضرت جنیدؒ کے ہاں آئے اور آپ کو اندوہناک حالت میں دیکھا اور پوچھا ''اے شیخ! آپ کو کیا ہوا ہے؟'' حضرت جنیدؒ نے فرمایا ''مَنْ طَلَبَ وَجَدَ'' (جس نے طلب کی اس نے پالیا) حضرت شبلیؒ نے فرمایا ''لَا بَلْ مَنْ وَجَدَ طَلَبَ'' (نہیں بلکہ جو غمگین ہوا اس نے طلب کیا) اس جگہ پر مشائخ نے اس میں کلام کیا ہے کیونکہ ان بزرگوں میں سے ایک نے تو وجد کا نشان دیا ہے اور دوسرے نے وجود کی

طرف اشارہ کیا ہے اور میرے نزدیک حضرت جنیدؒ کا قول زیادہ معتبر ہے اس لئے کہ بندہ جب یہ جان لیتا ہے کہ اس کا معبود فلاں جنس سے ہے تو اس کا غم واندوہ دراز ہو جاتا ہے اس بارے میں اسی کتاب میں گفتگو گزر چکی ہے۔ تاہم مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ غلبہ علم، غلبہ وجد سے زیادہ قوی تر ہوتا ہے کیونکہ جب غلبہ وجد کو قوت حاصل ہوتی ہے واجد خطرے کے مقام میں ہوتا ہے لیکن جب غلبہ علم کو قوت حاصل ہوتی ہے تو عالم محل امن میں ہوتا ہے اس جملے سے مراد یہ ہے کہ طالب کو چاہئے کہ وہ تمام احوال علم اور شریعت کا تابع رہے کیونکہ جب وہ وجد کی وجہ سے مغلوب ہو جائے تو اس سے احکام الہیہ کا خطاب اٹھ جاتا ہے اور جب خطاب اٹھ جائے تو ثواب وعذاب بھی اٹھ جاتا ہے اور جب ثواب وعذاب برخاست ہو جائیں تو عزت اور ذلت بھی اٹھ جاتی ہے پس اس وقت اس کا حکم مجنوں کا سا ہو جاتا ہے نہ کہ اولیاء کرام اور مقربین حق کا سا...... لیکن جب علم کی بادشاہی حال کی سلطنت پر غالب ہو جاتی ہے تو بندہ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی پناہ گاہ میں ہوتا ہے اور عزت کے پردہ سرا میں ہمیشہ ذکر میں مصروف اور مشکور ہوتا ہے پھر جب حال کی سلطنت، علم کی سلطنت پر غالب ہو جاتی ہے تو بندہ تمام حدود سے خارج اور خطاب خداوندی سے محروم ہو کر اپنی کمزوری کے محل میں یا تو معذور ہو جاتا ہے یا پھر غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے بعینہ اس معنی کے مطابق حضرت جنیدؒ کا وہ قول ہے کہ جو انہوں نے فرمایا کہ محبوب حقیقی کی راہ یا تو علم سے حاصل ہوتی ہے یا پھر عمل وکردار سے لیکن علم کے بغیر محض عمل اگر چہ نیک ہی ہو جہالت اور نقص ہوتا ہے جبکہ علم اگر چہ عمل کے بغیر ہی ہو ایک عزت اور شرف ہے۔ اسی لئے تو حضرت بایزیدؒ نے فرمایا ہے کہ "کفر اهل الهمة اشرف من اسلام اهل المنية" (ارباب ہمت کا کفر اہل آرزو کے اسلام سے زیادہ اشرف ہے) یعنی ارباب ہمت پر کفر اور ناشکری متصور ہی نہیں ہوتی لیکن بفرض محال کفر اور ناشکری آ بھی جائے تو وہ اس کفر کے باوجود آرزوؤں پر جینے والوں کے ایمان سے کامل تر ہوتے ہیں...... اور حضرت جنیدؒ نے حضرت شبلیؒ سے کہا

تھا کہ "الشبلی سکران" ولوا فاق من سکرہ لجاء منذراً ما ینتفع بہٖ " (شبلی ایک مست ہیں اور اگر انہیں اس حالت سکر سے افاقہ ہو جائے تو وہ ایسے ڈراؤنے ہو جائیں کہ ان سے کچھ نفع حاصل نہ کیا جا سکے) اور حکایات میں مشہور ہے کہ حضرت جنیدؒ، حضرت محمد بن مسروقؒ اور حضرت ابو العباس بن عطاؒ ایک جگہ جمع تھے اور قوال اشعار پڑھ رہا تھا یہ دونوں حضرات تواجد کر رہے تھے لیکن حضرت جنیدؒ پر سکون حالت میں تھے لوگوں نے کہا اے شیخ! آپ کو اس سماع سے کوئی حصہ حاصل نہیں ہوا؟" حضرت جنیدؒ نے ان پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تلاوت کی "تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّ هِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ" (تم ان کو دیکھ کر گمان کر دگے کہ وہ جامد ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے) تاہم وجد لانے میں تکلف کرنے کو تواجد کہتے ہیں اور یہ گویا حق تعالیٰ کے انعامات اور شواہد کو دل پر پیش کرنا ہے اور وصل کی سوچ اور مردانگی کی تمنا کرنا ہے...... اور ان صوفیوں کا ایک گروہ محض رسمی ہے کہ وہ لوگ ان صوفیوں کی ظاہری حرکات، ترتیب رقص اور خوبصورت اشاروں کی ہی تقلید کرتے ہیں حالانکہ یہ محض حرکات و رسوم نہیں بلکہ احوال کی جستجو اور درجہ تصوف کی طلب ہوتا ہے اور پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ "مَنْ تشبہ بقومٍ فَھُوَ مِنْھُمْ" (جس شخص نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں شمار ہوگا) نیز پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ "اِذا قرأتم القران فابکوا ان لَمْ تبکوا فتباکُوا" (جب تم قرآن کی تلاوت کرو تو روؤ، اور اگر رونا نہ آئے تو بتکلف روؤ) یعنی رونے والوں کی صورت اختیار کر لو! اور یہ حدیث تواجد کی ریاضت پر دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ اس بزرگ نے فرمایا تھا کہ میں ہزار میل جھوٹ کے ساتھ چلتا ہوں تو پھر ایک قدم اس سچائی سے آتا ہے...... اس باب میں کلام تو اس سے کہیں زیادہ تھا لیکن میں نے اسی پر اختصار کیا ہے...... واللہ اعلم بالصواب۔

باب

رقص اور اس کے متعلقات

اور جان لو کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی اصل اور سند نہیں کیونکہ تمام عقلا اس بات پر متفق ہیں کہ رقص اگر حد کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے تو یہ ایک لہو ولعب ہے اور اگر بیہودگی کے ساتھ کیا جائے تو یہ لغو ہوتا ہے۔ مشائخ صوفیہ میں سے کسی بزرگ نے بھی اس کی تعریف نہیں کی اور نہ ہی اس میں غلو کیا ہے۔ حشوی فرقہ کے لوگوں نے اس کے جواز میں جو دلائل بیان کئے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ چوں کہ وجد والوں کی حرکات اور اہل تواجد کے معاملات رقص سے ملتے جلتے ہیں اس لئے بیہودہ لوگوں کے ایک گروہ نے اس کی تقلید کرتے ہوئے اس میں غلو شروع کر دیا اور اس کو ایک مذہب بنا لیا ہے۔ میں نے عوام کے ایک گروہ کو دیکھا ہے جس نے یہ سمجھتے ہوئے کہ تصوف کا مذہب رقص کے سوا کچھ نہیں اس کو اختیار کر لیا ہے اور ایک دوسرے گروہ نے اس کے اصل کا ہی انکار کر دیا ہے۔ بہر حال پاؤں مارنا (ناچنا یا رقص کرنا) شرعی اور عقلی طور پر سب بزرگوں کے نزدیک برا فعل ہے اور یہ محال ہے کہ جو حضرات دوسرے لوگوں سے افضل ہیں وہ اس کا ارتکاب کریں تاہم جب دل میں خفت اور سبکی پیدا ہو جاتی ہے اور خفقان سر پر غالب آ جاتا ہے تو وقت قوت پکڑ لیتا ہے اور حال اپنا اضطراب پیدا کر دیتا ہے اور رسوم کی ترتیب اٹھ جاتی ہے اس طرح جو اضطراب پیدا ہوتا ہے وہ نہ تو رقص اور ناچ ہوتا ہے اور نہ ہی نفس پروری کا سامان بلکہ وہ تو جان گدازی ہوتی ہے اور جو شخص اس کو رقص کہتا ہے وہ سیدھے راستے سے بہت دور جا گرتا ہے اور یہ وہ حال ہوتا ہے جس کو زبان سے بیان کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا ''وَمَنْ لَمْ يَذُقْ لَايَدرِي النظر في الاحداثِ'' (اور جس نے اس کو چکھا نہیں وہ نوجوانوں میں نظر کرنا نہیں جانتا) خلاصہ یہ کہ نوجوانوں میں نظارہ کرنا اور ان کی صحبت اختیار کرنا ممنوع ہے

اور اس کو جائز سمجھنے والا کافر ہے اور جو کوئی دلیل بھی اس کے جواز میں لاتے ہیں وہ باطل اور جہالت ہے...... اور میں نے جاہلوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ اس کی تہمت کی وجہ سے اہل تصوف کا ہی انکار کرتے ہیں اور میں نے دیکھا ہے کہ انہوں نے اس کو ایک مذہب ہی بنا لیا ہے۔ تاہم تمام مشائخ نے ان سب باتوں کو آفت ہی سمجھا ہے اور یہ اثر اور مذہب حلولی لوگوں کا مذہب ہے اللہ تعالیٰ ان پر لعنت کرے...... واللہ اعلم

باب

گدڑی کا بیان

جان لو کہ لباس کو پھاڑنا صوفیہ میں معتاد ہے اور بڑے بڑے مجمعوں میں جہاں بزرگ مشائخ موجود ہوتے ہیں یہ گروہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے اور میں نے علما میں سے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ وہ اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ درست لباس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہرگز درست نہیں اور یہ ایک فساد کا کام ہے اور یہ محال ہے کہ ایسا فساد اصلاح اور درستی بن جائے جس سے کہ درستی مراد ہو اور تمام لوگ ٹھیک ٹھاک کپڑوں کو لے جائیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیں اور پھر ان کو سیتے رہیں جیسا کہ آستین، آگا پیچھا، تریز اور جیب کو ایک دوسرے سے جدا کریں اور پھر ان کو درست کرتے رہیں...... اگر ایک آدمی اپنے لباس کے سوٹکڑے کرے اور پھر ان کو سیئے اور دوسرا پانچ ٹکڑے کر کے ان کو سیئے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں باوجود اس کے کہ جو ٹکڑا بھی وہ کرتے ہیں اور پھر اس کو سیتے ہیں اس سے ایک مومن کے دل کی راحت اور اس کی یہ حاجت پوری کرنا ہوتی ہے کہ وہ گدڑی سی رہا ہے اور باوجودیکہ طریقت میں لباس پھاڑنے کی کوئی بنیاد اور اصل نہیں البتہ سماع کی حالت میں حال کے درست ہوتے ہوئے ایسا ہرگز نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ محض اسراف ہی ہے تاہم اگر سماع کرنے والے پر غلبہ ظاہر ہو جائے جیسا کہ اس سے خطاب اٹھ جاتا اور بیخبر ہو جاتا ہے تو وہ معذور شمار ہوگا اور اگر کسی شخص پر یہ کیفیت طاری ہو جائے اور کوئی جماعت اس کی موافقت میں اپنے لباس پھاڑ ڈالے تو یہ جائز ہے۔

اہل طریقت کی تمام گدڑیاں تین طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جسے سماع کی حالت میں غلبے کی وجہ سے درویش خود ٹکڑے ٹکڑے کرے اور دوسرے وہ جسے درویشوں کی کوئی جماعت اور ہم صحبت اپنے پیر اور مقتداء کے حکم سے ٹکڑے ٹکڑے کریں۔ ایک ان میں سے کسی جرم سے استغفار کی حالت میں ہو اور دوسری مستی کے عالم میں وجد کی وجہ سے ہو۔ اور تیسرا اور مشکل ترین خرقہ، خرقہ، سماعی ہے اور وہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک پھٹا ہوا اور دوسرا درست حالت میں۔ پھر پھٹے ہوئے خرقہ کیلئے دو چیزیں شرط ہیں یا تو یہ کہ جماعت کے لوگ اسی کیلئے

سیئیں اور اسی کو لوٹا دیں اور یا پھر آپس میں سے کسی ایک درویش کو دے دیں اور دوسرے سب ایثار کریں اور یا پھر اس پوری گدڑی کو ٹکڑے ٹکڑے کریں اور آپس میں تبرک کے طور پر تقسیم کر لیں لیکن اگر وہ گدڑی صحیح سالم ہوئی تو ہم دیکھیں گے کہ سماع کرنے والے نے جس درویش پر وہ لباس پھینکا ہے اس کی مراد کیا ہے، اگر قوال کو دینا اس کا مقصد تھا تو وہ قوال کو دے دی جائے گی اور اگر درویشوں کی جماعت کو دینا اس کی مراد تھی تو ان کو دے دی جائے گی اور اگر کسی خاص کو مراد بنائے بغیر پھینکی ہو تو پیر کو اختیار ہوگا کہ وہ فرمان جاری کرے کہ پوری جماعت کو دی جائے کہ وہ آپس میں ٹکڑے کر لیں۔ یا کسی ایک کو ان میں سے عطا کی جائے یا پھر قوال کو دی جائے، پس اگر قوال کو دی گئی تو درویش کی مراد دوسرے اصحاب کی موافقت میں ہونی ضروری نہیں، کیونکہ وہ گدڑی اس کے اہل کو نہیں دی جارہی۔ اس درویش نے اپنے اختیار سے دی ہو یا اضطراری حالت میں دوسروں کیلئے اس میں کسی قسم کی موافقت شرط نہیں، پس اگر جماعت کو دینے کیلئے درویش نے لباس اپنے جسم سے جدا کیا ہو تو اس میں پوری جماعت کی موافقت شرط ہے اور جب تمام درویشوں نے لباس اتار پھینکنے میں موافقت کی ہو تو پیر کو یہ نہ کرنا چاہئے کہ وہ ان درویشوں کا لباس قوال کو دے دے۔ تاہم یہ جائز ہے کہ ان درویشوں کے ساتھ محبت کرنے والا کوئی شخص قوال پر کوئی اور چیز فدا کر دے اور ان کے لباس ان درویشوں کو لوٹا دے یا وہ سب ٹکڑے ٹکڑے کریں اور آپس میں تقسیم کر لیں...... اور اگر لباس غلبہ کی حالت میں پھینکا ہے تو مشائخ رحمہم اللہ کا اس بارے میں اختلاف ہے تاہم زیادہ حضرات حضور ﷺ کے ارشاد "ومَنْ قَتَلَ قتیلاً فلَه سلبُه" (جس مسلمان سپاہی نے کسی کافر فوجی کو قتل کیا تو مقتول کا سارا سامان جنگ قاتل کیلئے ہوگا) کی موافقت میں یہ کہتے ہیں کہ وہ قوال کا حق ہوگا اور اگر وہ قوال کو نہ دیں گے تو وہ طریقت کی شرط سے باہر آجائیں گے...... اور دوسرا گروہ کہتا ہے اور میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں کہ جس طرح مقتول کے سامان جنگ کے متعلق بعض فقہاء امام کی اجازت کے بغیر مقتول کا سامان قاتل کو نہیں دیتے اسی طرح یہاں بھی پیر کے فرمان کے بغیر یہ لباس قوال کو نہیں دیا جائے گا۔ تاہم اگر درویش کسی کو نہ دینا چاہتا ہو اور پیر کسی کو دے دے تو کوئی حرج نہ ہوگا...... واللہ اعلم بالصواب۔

باب

سماع کے آداب

جان لو کہ سماع کے آداب کی شرطیں یہ ہیں کہ...... جب تک اس کی ضرورت نہ ہو نہ کرے، اور اس کو اپنی عادت نہ بنائے...... اور سماع دیر سے کیا جائے تا کہ دل سے اس کی تعظیم جاتی نہ رہے...... اور جب تک تم سماع کرو، تمہارا پیر وہاں موجود رہنا چاہئے...... اور سماع کی جگہ عوام سے خالی ہو...... اور قوال شریعت کا احترام کرنے والا دین دار ہو...... دل، دنیا کے کاموں سے فارغ ہو...... اور طبیعت لہو ولعب سے متنفر ہو...... اور ہر قسم کا تکلف درمیان سے اٹھا دیا گیا، اور جب قوت پیدا ہو جائے تو ضروری نہیں کہ اس کو دور کرے...... قوت کے تابع رہو جس کام کا وہ تقاضہ کرے وہ کرو کہ اگر وہ کوئی جنبش پیدا کرے تو جنبش کرے اور اگر وہ ساکن رکھے تو ساکن رہو...... اور تمہیں طبیعت کی قوت اور وجد کی جلن کے درمیان فرق کرنا چاہئے...... سماع کرنے والے میں مشاہدے کی اتنی زیرکی اور ذہانت تو ہونی چاہئے کہ جب حق تعالیٰ کی طرف سے کسی کیفیت کا ورود ہو تو وہ اسے قبول کر سکے۔ اور اس کی داد نہ دینی چاہئے...... اور جب اس کا غلبہ دل پر پیدا ہو جائے تو اس کو بتکلف اپنے آپ سے دور نہ کرے۔ اور جب اس کی قوت ختم ہو جائے تو بتکلف اپنی طرف اسے جذب نہ کرے...... اور حرکت کی حالت میں کسی سے آنکھ نہ ملانی چاہئے البتہ اگر کوئی دوسرا آنکھ ملائے تو اسے منع نہ کرے...... اور اس کی مراد کو اپنی نیست کے ترازو پر نہ تولے کہ اس میں آزمانے والے کیلئے بڑی پراگندگی اور بے برکتی ہوتی ہے...... اور سماع میں کوئی شخص دخل نہ دے تا کہ سماع کرنے والے کا وقت خراب نہ ہو...... اور اس کے روزگار میں تصرف نہ کرے...... اور اگر قوال اچھا پڑھ رہا ہو تو اسے یہ نہ کہے کہ تم بہت اچھا پڑھ رہے ہو) اور اگر خوبصورتی سے نہ پڑھ رہا ہو تو اسے نہ کہیں...... اور یا اگر کوئی ایسا ناموزوں شعر کہے کہ جو

طبیعت کو پراگندہ کرے تو اسے یہ نہ کہے "اس سے بہتر پڑھو ..... اور دل میں اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ کرے..... اور اس کو درمیان میں نہ دیکھے بلکہ اسے حق کے حوالہ کر دے..... اور اچھی طرح سنے..... اور اگر سماع کسی گروہ پر طاری ہو چکا ہو اور اس کیلئے اس میں سے حصہ نہ ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اپنی ہوشمندی کی وجہ سے اس کی مستی سے نفرت نہ کرے..... اور اپنے وقت سے آرام پانا چاہئے تا کہ اس کو اس سے حصہ مل جائے اور وقت کے سلطان کو متمکن کرے تا کہ اس کی برکتیں اسے حاصل ہو..... اور میں علی بن عثمان ہجویریؒ میں اس بات کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع نہ کرنے دیں تا کہ ان کی طبیعت پراگندہ نہ ہو کیونکہ اس میں بڑے عظیم خطرے اور بہت بڑی بڑی آفتیں ہیں۔ اس لئے کہ عورتیں، چھتوں سے یا مکانوں سے سماع کی حالت میں مصروف درویشوں کو دیکھتی ہیں اور اس وجہ سے سماع کرنے والوں کو بڑے مشکل ترین حجاب پڑ جاتے ہیں..... اور نوجوانوں کو بھی سماع کرنے والوں میں نہ بیٹھنے دینا چاہئے حالانکہ نام نہاد جاہل صوفیوں نے ان تمام خرابیوں اور ناجائز حرکتوں کو اپنا مذہب بنالیا ہے اور درمیان سے صداقت کو بالکل اٹھا دیا ہے..... اور اس طرح کی جو آفتیں خود میرے ساتھ گزر چکی ہیں میں ان پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی درخواست کرتا ہوں اور حق تعالیٰ سے امداد کا خواہاں ہوں کہ حق تعالیٰ میرے ظاہر اور باطن کو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھے اور میں اس کتاب کو پڑھنے والوں کو اس کتاب کے حقوق کی رعایت رکھنے کی وصیت کرتا ہوں.....

"وباللہ التوفیق ۔ والحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمدٍ وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین وسلم تسلیماً کثیراً کثیرا"

تمت بالخیر

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سیدنا ومولانا محمدنِ النبی الامی وعلی والہٖ واصحابہٖ واتباعہ وبارک وسَلِم